حدیثِ دردِ دل

(مجلہ ”المآثر“ اور ماہنامہ ضیاء الاسلام (والاسلام) کے اداریوں کا مجموعہ)

مؤلف

مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی

صدر المدرسین مدرسہ شیخ الاسلام، شیخوپور، اعظم گڑھ، یوپی

مرتب

مولانا ضیاء الحق خیرآبادی

ناشر
مکتبہ ضیاء الکتب
مدرسہ شیخ الاسلام، شیخوپور، ضلع اعظم گڑھ (یوپی)
Pin : 276121, Mobile : 9235327676

حدیثِ دردِ دل

(مجلہ "المآثر" اور ماہنامہ ضیاء الاسلام (والاسلام) کے اداریوں کا مجموعہ)

مولف

مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی

(صدر المدرسین مدرسہ شیخ الاسلام، شیخوپور، اعظم گڈھ، یوپی)

مرتب

مولانا ضیاء الحق خیرآبادی

ناشر

مکتبہ ضیاء الکتب

مدرسہ شیخ الاسلام، شیخوپور، ضلع اعظم گڈھ (یوپی)

پن کوڈ: 276121 (موبائل: 9235327576)

تفصیلات

نام کتاب	حدیث دردِ دل (اداریوں کا مجموعہ)
مولف	مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی
مرتب	ضیاء الحق خیرآبادی
باہتمام	// // //
صفحات	584
قیمت	300/ روپئے
سنہ طباعت	مارچ ۲۰۱۲ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

فہـــــــرست	صفحہ نمبر
صدائے دل (از: مرتب)	۸
تقریب (از: مولف)	۱۳

مجلّہ ''المآثر'' مئو کے اداریئے

المآثر کا پہلا اداریہ	۱۷
تازیانۂ عبرت	۲۲
ذوقِ انفرادیت کا ضرر	۲۶
احتسابِ نفس	۳۲
جماعت اہل حدیث کا تازہ کارنامہ	۳۵
ایک بری خصلت	۳۹
تصوف ہمارا قیمتی سرمایہ	۴۳
تنقید کا دوہرا معیار	۵۰
بے لگام سلفیت	۵۷
امر بالمعروف ونہی عن المنکر	۶۴
بارہ ربیع الاول کے ہنگامے	۶۹
من عادیٰ لی ولیاً	۷۴

اللہ کے شعائر کا احترام	۷۹
احتساب سے گرانی	۸۲
یہ فقہی سیمینار؟	۸۶
تقاضائے بندگی	۹۱
ظلم وطغیان کا جواب	۹۸
پریشانی اور اس کا علاج	۱۰۵
فتنوں کی ہمہ گیری اور اس سے بچنے کی تدبیر	۱۱۲
احتساب میں المآثر کا رویہ	۱۱۹
فتنوں کی یورش اور مسلمانوں کے لئے لائحۂ عمل	۱۲۶
مال رحمت بھی ہے اور فتنہ بھی!	۱۳۲
سفرِ حج کے برکات اور تقاضے	۱۳۸
یہود کی گستاخیاں اور شعائر اللہ کا ادب	۱۴۴
جو غلط ہے اسے غلط ہی کہئے	۱۵۲
تصویر سازی کا ذوق	۱۶۰
ماہنامہ ''انوار العلوم'' جہاناگنج کا پہلا اداریہ	۱۷۱

ماہنامہ ''الاسلام وضیاء الاسلام'' کے اداریئے

حق تعالیٰ سے ناامید نہ ہوں	۱۷۶
مصائب کا اصل سرچشمہ؟	۱۷۹
امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سلیقہ	۱۸۳
رمضان کا پیغام	۱۸۶

رمضان شریف اور قرآن شریف کی مناسبت	۱۸۹
بدنیتی کا خمیازہ	۲۰۱
حوادث و مصائب کا سرچشمہ	۲۰۴
دخل در معقولات	۲۰۹
ماہنامہ ضیاء الاسلام (والاسلام) کے اجراء کی داستان	۲۱۴
اقتصادی بدحالی اور اس کا حل	۲۱۶
الیکشن کا موسم	۲۲۰
حالات کے بحران میں دستور العمل	۲۲۴
طاقت کا نشہ اور اس کا انجام	۲۲۹
ماہِ رمضان کی برکتیں	۲۳۴
طالبان رحمت یا زحمت؟	۲۳۸
اعظم گڈھ کا حادثۂ کبریٰ	۲۴۹
گجرات کا انسانیت سوز فساد	۲۵۱
کفر کی ایذا رسانی	۲۵۳
عدیم الفرصتی کا بحران	۲۵۶
میڈیا اور پروپیگنڈے کی حقیقت	۲۶۲
اہل اسلام کی ذمہ داریاں	۲۶۵
عالم کی لغزش	۲۷۱
درسِ قرآن کی ضرورت اور فوائد	۲۸۰
ظالموں کی طرف میلان جرم ہے	۲۸۶
حفاظت دین و ایمان کی حکمت اور مدارس اسلامیہ	۲۹۱

چراغ تلے اندھیرا	۲۹۷
فتنوں کی طغیانی	۳۰۳
تماشائے عبرت	۳۲۳
مسلمانوں کے معاشرہ میں اخلاق کی حالتِ زار	۳۲۸
اعتذار	۳۳۳
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے	۳۳۸
تصویرسازی! ایک عام گناہ	۳۵۰
بدعت اور اہل بدعت	۳۵۶
فکر اور سوچ کی دو راہیں: فکر دنیاوی وفکر ایمانی	۳۷۱
اسوۂ نبوی کی جامعیت	۳۸۰
سیرت طیبہ کے دو اہم پہلو: ذکر اور حلم	۳۸۷
انسان کو کیا چاہئے؟ دل کا سکون یا طبیعت کا اضطراب	۴۰۲
آدمیوں کا ہجوم معیارِ کامیابی نہیں	۴۱۰
سیاست کی ساحری	۴۱۶
مروجہ جلسے! بے اعتدالیاں اور ان کی اصلاح	۴۲۲
ولکنه ؤخلد إلی الارض واتبع هواه	۴۳۷
ایک خاص اور اہم دعا	۴۴۲
سفرِ حج (۱۴۲۹ھ)	۴۵۱
احتجاج ومظاہرہ کی سیاست	۴۸۰
مسلمانانِ ہند اور جمہوری حکومت	۴۹۰
عقل مند کون؟	۴۹۸

مدارس اسلامیہ اور اقتصادیات کی تعلیم: بے جا مشورے	۵۰۳
مسلمانوں کے نام ایک اہم پیغام	۵۱۰
سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانی اور ان کی تعلیمات	۵۲۱
ملت کے نوجوانوں سے خطاب	۵۲۸
عہدۂ و منصب کی تفویض! ایک نازک مرحلہ	۵۴۰
دارالعلوم دیوبند کا منصب اہتمام	۵۴۵
نمازوں کا پیغام اور باہمی اتحاد کی اہمیت	۵۴۹
سنت کی اہمیت	۵۵۶
دینی شعائر کا ادب	۵۶۴
مدارس اسلامیہ: دورِ حاضر کی نعمتِ عظمیٰ	۵۶۸
صدمات کی یورش اور پروردگار کی مہربانیاں	۵۷۴
منیٰ کا حادثہ (سفرِ حج ۱۴۱۷ھ/ ۱۹۹۷ء)	۵۸۳

* * *

فہرست تصانیف مؤلف	۵۸۸

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صدائے دل

”میری عین خواہش اور دعا یہی رہی ہے کہ تم لوگ سچے طالب علم بن کر حصول علم میں کوشاں رہو، علم صرف ذہانت وذکاوت ہی سے نہیں ملتا ممکن ہے دنیا کا علم اسی طرح حاصل ہوتا ہو لیکن جس کو میں علم کہتا ہوں اس کا حساب وکتاب اور ہے، یہ ضرور ہے کہ ذہانت ممد ومعاون ہے، اس سے راہِ علم میں سلوک کی سہولت ہوتی ہے، تاہم اس کی حیثیت اَساسی اور بنیادی نہیں ہے، دین کا علم زیادہ تر خلوص نیت، عزم وعمل اور مسلسل محنت وکاوش سے حاصل ہوتا ہے، ہم نے بہت سے ذہین دیکھے ہیں جو درمیان میں گر پڑ کے ختم ہو گئے، وہ نہ تو اپنے علم سے خود فائدہ اٹھا سکے، اور نہ ہی دوسروں کو کچھ دے سکے، اور بہت سے غبی، کندذہن جن کو حصول علم کے زمانہ میں اساتذہ کے نزدیک بالکل وقعت حاصل نہ تھی، وہ اپنے اپنے دور کے شمس العلماء بنے۔

آج ضرورت بہت زیادہ ذہین علماء کی نہیں، ایسوں کی ضرورت ہے جن کے پاس علم کے ساتھ فراست ایمانی بھی ہو، اور یہ فراست حاصل ہوگی تصحیح نیت سے۔ میرے عزیزو! مجھے اس وقت سخت تکلیف ہوتی ہے جب میں سنتا ہوں کہ عربی پڑھنے والا طالب علم کسی سرکاری ملازمت کے لئے جدوجہد کر رہا ہے، یا وہاں چلا گیا ہے، میرے نزدیک یہ چیز غلط نہیں ہے، بلکہ میں اس کو محمود سمجھوں اگر یہ اس نیت سے کیا جائے کہ سرکاری اداروں میں ہمیں دین کی خدمت کے جو مواقع میسر ہوں گے ان سے دریغ نہ کریں گے، بلکہ سچے دین کی سچی خدمت میں مصروفِ کار رہیں گے۔ پھر یہی کام ذخیرۂ آخرت بن جائے گا مگر تم جاننے والوں کے احوال کو پرکھو، جانچو، دیکھو کتنوں کی نیت یہ رہتی ہے اور کتنے اس قسم کا اقدام کرتے ہیں، تو کیا ایک مسلمان ذی علم کے سامنے حصولِ زر کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں ہے، کیا وہ اسی لئے علم دین حاصل کر رہا ہے کہ اس کے عوض میں معمولی متاع دنیا خریدے گا، اگر یہی ہے تو پھر اس میں اور علمائے یہود میں کیا فرق باقی رہ جاتا ہے، جن کی مذمت قرآن میں تم پڑھ چکے ہو۔ إشتروا بآیات اللہ ثمناً قلیلاً

درحقیقت یہ اس دور کا ایک بڑا المیہ ہے کہ وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں زمانے کی باگ ڈور ہونی چاہئے تھی وہ مذہب کی قبا تار تار کر کے اس کی دھجیاں فروخت کر رہے ہیں۔

فوا أسفاہ دل جلتا ہے، طبیعت سلگتی ہے لیکن کون جانے دل کا حال!

میرے عزیزو! یہ سچ ہے کہ معاش کا بحران انسان کو بے رحمی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار رہا ہے، ہر شخص پیٹ کا نعرہ لگا رہا ہے، معاشرہ حصولِ معاش کی چکی کے دو پاٹوں کے درمیان اس طرح پس رہا ہے کہ اس کو اپنے دین وایمان کا ہوش ہی باقی نہ رہا، یہ مسئلہ اگر صرف ان تک محدود ہوتا جو خدا کی لامحدود قوت پر ایمان نہیں رکھتے تو چنداں قابل تعجب نہ ہوتا کہ ان کا دستور فطرت یہی ہے، لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ اس آتش سوزاں میں وہ لوگ بھی دھڑا دھڑ اپنا خرمن ایمان ویقین پھینک پھینک کر جلا رہے ہیں جن کو خدا کی عظیم قوتوں پر بھروسہ کا دعویٰ ہے۔ اس مصیبت کو کس سے کہوں کہ گھر کا سرمایہ لٹ رہا ہے، تجوریوں پر ڈاکہ پڑ رہا ہے، جائیداد برباد ہورہی ہے اور ہم برتنوں، سوئی دھاگوں کی حفاظت کی فکر کر رہے ہیں، یہ کس درجہ غم واندوہ کی بات ہے، یہ تو یقین ہے کہ جو اللہ طوفان کے ہیجان خیز تھپیڑوں میں سے ایک شیر خوار بچے کو نکال لے جانے والا ہے وہ اپنے ملت ومذہب کو بچالے گا، مگر سوچو ہمارا تمہارا کیا حشر ہوگا، کس کو ہم منہ دکھا سکیں گے۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ حصول علم سے نیت وعزم محض خدمت دین ہونی چاہئے یقین کا سرمایہ ساتھ رکھو، حطامِ دنیا تو جوتیوں میں آکر پڑا رہے گا، تم لوگ جس علاقے کے رہنے والے ہو جہاں تک میرا اندازہ ہے اس میں خالص مجاہد قسم کے علماء کی حاجت ہے اور تم لوگ ایک بہت بڑی ذمہ داری اپنے سر لے رہے ہو، اس لئے ہر قسم کی دنیاوی آلائش سے پاک ہو کر تحصیل علم کی ضرورت ہے، میری بڑی تمنا یہ ہے کہ میں اپنے شاگردوں کو دین پر قربان ہوتا ہوا دیکھوں، اس سلسلے میں ہر طرح کی مدد وتعاون کے لئے تیار ہوں، انشاء اللہ آخر دم تک تم لوگ مجھے اپنا رفیق پاؤ گے۔

عزیزانِ من! کیا بتاؤں امیدوں کے سہارا آج کے نوجوان طلباء ہی ہیں، لیکن جگر کٹ کر ٹکڑے ہوجاتا ہے جب ان کا رُخ دین مصطفیٰ سے پھرا ہوا دیکھتا ہوں، امید ہے کہ تم لوگ میرے درد کو سمجھو گے۔" (حدیث دوستاں ص: ۲۴۴)

ہر انسان کا عموماً اور ہر مسلمان کا خصوصاً فرضِ اولین ہے کہ وہ اپنے مالک ومعبود اور خالق ومربی کی رضا اور خوشنودی کے لئے کوشاں رہے، عشاق اپنے محبوب کے لئے جان کی بازی لگا دینا آسان سمجھتے ہیں، خدا کی رضا کے لئے اگر جان کی بازی لگائی جائے تو عین مناسب ہے کہ ہر مسلمان نے کلمۂ توحید پڑھ کر خدا سے عہد وفا باندھا ہے کہ خدایا! ہم آپ کی اطاعت کریں گے، اور طالب علم نے تو مدرسہ میں داخل ہو کر اور وراثت نبوی کو حاصل کرنے کی نیت کر کے اس عہد وپیمان کی تجدید کی ہے، اسے تو ہر وقت اپنا یہ عہد وپیمان مستحضر رکھنا چاہئے، اس کی کوتاہی عجب نہیں کہ ناقابل معافی جرم بن جائے، ہر وقت دیکھ

> بھال رکھنی ضروری ہے، ہمارے مورثِ اعلیٰ سید الموجودات سرور کائنات فخر بنی آدم سیدنا ومولانا حضرت محمد رسول اللہ **فداہ ابی وامی وروحی وقلبی علیہ الف الف تحیۃ وصلوۃ** ہیں، آپ ہمارے روحانی باپ ہیں، جن کا ترکہ حاصل کرنا ہے، پھر
>
> باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو   پھر پسر قابل میراثِ پدر کیونکر ہو
>
> اگر ان سے ہماری نسبت اور ہمارا رشتہ منقطع ہوگیا تو یقیناً ہم ترکہ پانے سے محروم رہیں گے۔ دیکھو وارث اور مورث کے دین میں تباین ہو، یا وارث نے مورث کو قتل کردیا ہو تو وہ اپنے حق سے محروم کردیا جاتا ہے، بس یوں ہی سمجھ لو کہ حضرت رسول مقبول ﷺ کا دین اور طریقہ تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت وخوشنودی کا حصول ہے، اگر ہم نے اپنا مذہب نافرمانی بنالیا یا کم ازکم فرمانبرداری کی لگن سے ہم خالی ہوگئے تو طریقہ بدل گیا، یا اگر ہم نے آپ کی سنتوں اور طریقوں کو ترک کرنا اپنا دستور بنالیا یا کم ازکم ان کا اہتمام باقی نہیں رکھا تو ہم ....معاذ اللہ سو بار اللہ کی پناہ! **أعاذنا الله منه وسائر المسلمين** .... آپ کی لائی ہوئی شریعت کے قاتل ثابت ہوں گے، سوچو کیسی محرومی کی بات ہے، کیا اس کے بعد بھی آپ کا ترکہ ہمیں ملے گا۔
>
> دیکھو یہ سطریں لکھتے ہوئے میرا دل کانپ گیا، بے اختیار آنکھیں ڈبڈبا گئیں، کیا ہم نے اپنے آپ کو اس سطح پر اتار لیا ہے، جہاں ہم کو اس طرح خطاب کیا جائے؟ اللہ سے توفیق مانگو، استعاذہ کرو، **اللّٰھم نسألک علماً نافعاً ورزقاً طیباً وعملاً متقبلاً ونعوذبک من علم لا ینفع وقلبٍ لایخشع ومن دعوةٍ لا یستجاب لها** (اے اللہ! ہم آپ سے سوال کرتے ہیں علمِ نافع کا، رزقِ پاکیزہ کا، عملِ مقبول کا اور ہم آپ کی پناہ میں آتے ہیں ایسے علم سے جو نافع نہ ہو، ایسے قلب سے جو خشوع سے خالی ہو، اور ایسی دعا سے جو قبولیت سے محروم ہو) (حدیث دوستاں ص: ۳۰۷)

اخلاص وللّٰہیت اور درد وسوز میں ڈوبے ہوئے یہ کلمات وحروف آپ نے ملاحظہ فرمالئے! یہ اس استاذ ومربی کی صدائے دردِ دل ہے، جو اپنے تلامذہ ومتعلقین کے بارے میں چاہتا ہے کہ وہ اللہ کے مخلص بندے، رسول کے سچے امتی، شریعت الٰہی کے علمبردار اور دین متین کے صحیح حامل وپاسدار بنیں، اسی کے لئے اس نے اپنی زندگی تج دی، اسی محنت وکوشش میں وہ جوانی سے کہولت اور اب بڑھاپے کی سرحد کی داخل ہورہا ہے۔ جس کے دل میں یہ تڑپ اور تقاضا ہمہ وقت موج زن رہتا ہے کہ ”اہل ایمان اپنے نفس، اپنی طبیعت اور

اپنے گردوپیش کے مختلف تقاضوں کو فنا کرکے، ان سے منہ موڑ کر محض اللہ ورسول کی اطاعت ووابستگی کے لئے یکسو ہوجائیں۔ زندگی کا مرکز ومحور صرف وہ ہو جس کی دعوت اللہ کے آخری پیغمبر جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے دی ہے، اس کے خلاف جتنی راہیں ہیں، سب سے قطعی اجتناب کیا جائے۔"

یہ ہیں میرے محسن ومشفق اور باکمال استاذ مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی، جنھوں نے انشاوتحریر، وعظ وتقریر اور درس وتدریس کے ذریعہ اللہ ورسول کے پیغام کو عام کرنے میں اپنی پوری توانائی صرف کردی۔ میں تقریباً ٢٠/سال سے مسلسل مولانا کے ساتھ..... سفر وحضر میں..... رہا ہوں، اس لئے پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ بات لکھ رہا ہوں۔ میں نے ہدایۃ النحو سے جلالین شریف تک تمام کتابیں مولانا ہی سے پڑھی ہیں، میں نے دیکھا کہ تعلیم کے ساتھ تربیتی پہلو پر بھی مولانا کی نظر بہت زیادہ رہتی تھی، اس انداز سے تربیت فرماتے کہ اللہ ورسول اور شعائر دین کی محبت وعظمت قلب ودماغ میں راسخ ہوجائے، کبھی کبھی اسباق میں کسی مناسبت سے رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرام اور بزرگان دین کا ذکر خیر نکل آتا تو اس وقت آپ کی محویت قابل دید ہوتی، پوری گھنٹی تذکیر وموعظت میں تمام ہوجاتی، اس وقت آپ فرماتے کہ میں تم لوگوں کو دین پڑھا رہا ہوں، چنانچہ شوق علم کے ساتھ عملی پہلو بھی اطمینان بخش تھا، دوسروں کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن مجھے اس سے بے حد نفع پہونچا، ان کے فیض صحبت سے مزاج میں دینداری، عبادات پر استقامت، اللہ کی ذات پر یقین وتوکل کی کیفیت، اخلاق حسنہ کا حصول، گرچہ ناتمام ہی سہی! یک گونہ حاصل ہوگیا، مولانا کے عمل کو دیکھ کر دنیا کی بے حقیقتی ایک بدیہی چیز بن گئی، ان کے نزدیک دنیا کی کوئی وقعت نہیں تھی، چنانچہ بڑے سے بڑا دنیاوی نقصان ہوجائے یا کوئی کام حسب منشاء نہ ہوسکا تو اس کا کوئی اثر طبیعت پر نہیں دیکھا، فرماتے کہ اللہ کی مرضی یہی تھی، اور دنیا اتنی اہم شے نہیں ہے کہ اس کے لئے دل دماغ کو اتنا مشغول کردیا جائے کہ انسان اسی کا ہوکر رہ جائے، اس اندازِ تربیت کی وجہ سے تعلیم کا عملی پہلو کبھی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوا۔

مولانا کی تحریر وتقریر سے مجھے جو دینی نفع ہوا، اس کی وجہ سے زمانۂ طالب علمی ہی سے میرے دل میں یہ بات جم گئی تھی کہ مولانا کے پیغام کو عام کرنے کے لئے جو بھی ممکنہ کوشش وکاوش مجھ سے ہوسکے گی اس سے دریغ نہ کروں گا، تاکہ متلاشیانِ حق اس کی روشنی میں بآسانی اپنی منزلوں تک رسائی حاصل کریں، اور اپنے افعال وکردار کو سنت وشریعت کے سانچے ڈھال سکیں۔ اگر اس سے کسی ایک شخص کی دینی زندگی سنور گئی تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت وکاوش ٹھکانے لگ گئی۔ چنانچہ میں نے اسی قت سے آپ کی ایک ایک تحریر کو حرزِ جاں بنا کر رکھا، اور اپنی تمام چیزوں سے زیادہ اس کی حفاظت کی، اور جب بتوفیق الٰہی اس کی اشاعت کے مواقع میسر آئے تو اب یہ تمام تحریریں شائع ہوکر منظر عام پر آگئیں۔

اب تک تقریباً ۲۵؍ کتابیں اور رسائل منظر عام پر آچکے ہیں، اور اس سلسلے کی یہ آخری کڑی ہے، اب میرے پاس قدیم تحریروں کا کوئی ذخیرہ موجود نہیں، ایک دو کتابیں زیر تالیف ہیں، جب ان کی تکمیل ہوجائے گی تو وہ منظر عام پر آئیں گی، انشاء اللہ

یہ کتاب مولانا کے ان اداریوں کا انتخاب ہے، جو مجلّہ ''المآثر'' مئو، ماہنامہ انوار العلوم جہاناگنج اور ماہنامہ الاسلام وضیاء الاسلام شیخوپور کے لئے لکھے گئے۔ جو اداریے کسی خاص موضوع پر لکھے گئے تھے وہ کتابی شکل میں پہلے شائع ہوگئے ہیں، جیسے مدارس سے متعلق اداریے ''مدارس اسلامیہ، مشورے اور گزارشیں'' میں۔ وفیات سے متعلق اداریے ''کھوئے ہوؤں کی جستجو۔۔۔'' میں۔ اس کے علاوہ بعض اداریے الگ سے رسائل کی صورت میں شائع ہوئے، جیسے ''اہل حق واہل باطل کی شناخت'' ''مالی معاملات کی کمزوریاں'' اور ''فتنوں کی طغیانی'' وغیرہ۔

خدا کرے دیگر تحریروں کی طرح اس کا نفع بھی عام اور تام ہو۔

ضیاء الحق خیرآبادی
۲۴؍ ربیع الاول ۱۴۳۳ھ
۱۷؍ فروری ۲۰۱۲ء جمعہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقریب

میں طبعًا مدرّس اور معلّم ہوں، مطالعۂ کتب میرا شوق ہے، طلبہ کو پڑھانا میرا ذوق ہے، اطاعت وسپردگی میری طبیعت ہے، ذکرِ الٰہی میری غذا ہے، فکرِ آخرت میری سوچ ہے۔ طبیعت اسی رنگ میں ڈھلی ہوئی ہے، اس دائرے میں قرطاس وقلم کا کوئی خانہ نہیں ہے، سچ پوچھئے تو تحریر وانشاء سے مجھے مناسبت کم ہے، یا شاید نہیں ہے، نہ لکھوں تو لکھنے کا کوئی تقاضا نہیں ہوتا۔ لکھتا ہوں تو طبیعت میں روانی نہیں ہوتی، بس وہ جذبۂ اطاعت ہے جس کے دباؤ میں کچھ لکھ لیتا ہوں، کوئی وقتی شدید تقاضا ہوا، یا دوستوں اور بزرگوں میں سے کسی کا حکم ہوا، یا کسی اپنے طالب علم کی فرمائش ہوئی، تو قلم کو جنبش ہوتی ہے، لیکن ان تقاضوں، ان احکام اور ان فرمائشوں کے نتیجے میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کی مقدار اتنی ہوگئی ہے کہ جاننے والوں اور پڑھنے والوں کو غلط فہمی ہوجاتی ہے کہ یہ خاکسار بھی شاید مرتب ومصنف اور انشاء پرداز ہے۔ درحقیقت اس غلط فہمی کا بڑا سبب عزیز محترم مولانا حافظ ضیاء الحق خیرآبادی سلّمہٗ کی محبت اور کوشش وکاوش ہے، کہ میں اپنی تحریروں کو جہاں تہاں چھوڑ کر بے پروا ہوجاتا تھا، جب سے عزیز موصوف کی رفاقت ہوئی ہے، انھوں نے میرے حرف حرف کو جمع اور محفوظ کرنے کا اہتمام کیا، اور اس طرح مضامین کی اشاعت وطباعت کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔

اس اشاعت وطباعت کا آغاز مجلّہ ''المآثر'' سے شروع ہوا۔ محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی صاحب علیہ الرحمہ کی وفات (رمضان ۱۴۱۲ھ) کے بعد ان کی یادگار میں ان کے صاحبزادۂ گرامی قدر حضرت مولانا رشید احمد الاعظمی مدظلہ کے حکم سے سہ

ماہی ’’الماٰثر‘‘ کا اجرا ہوا، اوراس کی تحریر کا شعبہ اس خاکسار کے سپرد ہوا۔ ہر تین ماہ پر اس کے لئے مضمون کا شدید تقاضا ہوتا اور میں مجبوراً لکھتا، یہ سلسلہ چلتا رہا۔ میرے دوست مولانا عبد الرب صاحب اعظمی مدظلہ نے اپنے مدرسہ انوار العلوم جہانا گنج سے ایک ماہانہ رسالہ ’’انوار العلوم‘‘ کے نام سے جاری کیا، اس کے لئے بھی اداریہ لکھنے کی ذمہ داری اس خاکسار کے سپرد کی، مگراس کی عمر کم تھی، سال بھر نکلا اور بند ہوگیا۔ اس کے بند ہونے کے بعد میرے بعض احباب کا تقاضا ہوا، خاص طور سے عزیز موصوف مولانا ضیاء الحق صاحب کا، کہ ’’انوار العلوم‘‘ کے طرز پر ایک ماہنامہ نکالنا چاہئے، جس میں عام فہم دینی واصلاحی مضامین ہوں، الماٰثر کا علمی معیار خاصا بلند ہے، اس سے اہل علم ہی استفادہ کر سکتے ہیں، عامۃ الناس کے ذوق اور فہم کی چیزیں اس میں نہیں ہوتیں، اس لئے انوار العلوم کے معیار کے ایک رسالہ کی اشاعت ہونے چاہئے، اس کے لئے نگاہیں مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور پر جمیں۔ یہاں سے ابتداءً ’’الاسلام‘‘ کے نام سے پھر گورنمنٹ کی منظوری کے بعد ’’ضیاء الاسلام‘‘ کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ کا اجرا ہوا، اس رسالہ نے اوراس کے مدیر مولانا حافظ ضیاء الحق خیرآبادی سلّمہٗ نے تحریر کے ایک گونگے کو قلم کی زبان عطا کی۔ ان رسالوں میں میرے مضامین مسلسل نکلتے رہے، جن کے مجموعوں سے مدیر موصوف نے دسیوں کتابیں بنائیں۔

اب خیال ہوا کہ ان جرائد وصحائف کے اداریوں کو اکٹھا کر دیا جائے، تو اچھا خاصا مجموعہ تیار ہو جائے گا، چنانچہ عزیز موصوف اداریوں کے جمع وتدوین میں لگ گئے، اوراس سلسلے کی اب تک کی تحریروں کو انھوں نے یکجا کر دیا، انھوں نے نظر ثانی کے لئے میرے حوالے کیا۔ میں نے از سر نو انھیں جب مسلسل پڑھا تو ذہن میں یہ خیال جما کہ یہ مضامین اگرچہ مختلف اوقات میں مختلف تقاضوں اور مختلف پس منظر میں لکھے گئے ہیں، مگر روح سب کی ایک ہے۔ اور وہ ہے، اس بات کی تڑپ کہ اہل ایمان اپنے نفس، اپنی طبیعت اور اپنے گرد وپیش کے مختلف تقاضوں کو فنا کر کے، ان سے منہ موڑ کر محض اللہ ورسول کی اطاعت ووابستگی کے لئے یکسو ہو جائیں۔ زندگی کا مرکز ومحور صرف وہ ہو جس کی دعوت اللہ کے آخری

پیغمبر جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے دی ہے، اس کے خلاف جتنی راہیں ہیں، سب سے قطعی اجتناب کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: **لا یومن أحدکم حتیٰ یکون هواه تبعاً لما جئتُ به** ۔ آدمی اس وقت تک صاحب ایمان نہیں ہوگا جب تک اس کے ارادے اور اس کی خواہش میرے لائے ہوئے دین کے مطابق نہ ہو جائے۔

ان اداریوں کی دعوت اسی حدیث کی تعمیل ہے، مختلف انداز سے، اسی موضوع پر دل کے تاثرات قلم سے ٹپک ٹپک کر کاغذ کے سینے پر ثبت ہوئے۔ میں سوچتا رہا کہ اس مجموعے کا نام ''حدیث دردِ دل'' ہونا مناسب ہے۔ خدا کرے یہ دردِ دل عام ہو، اور اللہ تعالیٰ اس کے واسطے سے قلوب واحوال میں خواش گوار تبدیلی پیدا فرمائیں۔

اعجاز احمد اعظمی

۱۷؍ربیع الاول ۱۴۳۳ھ

۱۰؍فروری ۲۰۱۲ء جمعہ

☆☆☆☆☆

مجلّہ

﴿المآثر مئو﴾

کے

اداریئے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجلّہ المآثر کا
پہلا اداریہ

الحمدللہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ سیدالمرسلین وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین۔

اب سے تقریباً ایک صدی قبل غیر منقسم ہندوستان کے ایک چھوٹے سے صنعتی قصبہ مئو کے اُفُق پر علم وفضل کا ایک ہلال نمودار ہوا، جو باوجود بے سروسانی اور قصبہ کی علمی تنگ دامانی کے چرخِ کمال پر بڑھتا رہا، چڑھتا رہا، یہاں تک کہ تھوڑی ہی مدت میں وہ آسمانِ علم کا بدرِ کامل بن کر چمکنے لگا۔ کچھ لوگوں نے اسے پہچانا اور بہت سے لوگ اس کے رتبہ سے واقف نہ ہوسکے، لیکن اس کی عظمت سب کے قلوب پر چھائی رہی، سب کو اس کی دستگاہِ علم کی بلندی کا اعتراف رہا۔ اس نے اپنی زندگی کا تقریباً تمامتر حصہ مئو میں گذارا، مگر اس کی شہرت کا آوازہ عرب وعجم میں گونجا، وہ خود نہایت خاموش تھا، مگر اس کا چرچا شہر درشہر تھا، اس نے خود کو ہمیشہ چھپا اور دبا کر رکھا، مگر خدا نے اسے ظاہر کیا اور ابھارا۔ اُسے متعدد علوم میں مہارتِ تامّہ حاصل تھی، مگر خصوصیت سے علم حدیث اور اس کی ذیلی شاخ فن اسماء الرجال میں اسے جو حذاقت ومہارت حاصل تھی اس کی دورِ حاضر میں نظیر نہ تھی، وہ حدیث رسول کا سچا اور مخلص خادم تھا، اسے رسول کی ذات سے عشق تھا، والہانہ لگاؤ تھا، اس لئے حدیثِ رسول اس کے لئے سرمایۂ زندگی اور آبِ حیات تھی، اس کے دن حدیثی ذخائر کی جستجو میں صرف ہوتے، اور اس کی راتیں ان کے مطالعہ وتحقیق میں بسر ہوتیں۔ اس کا حافظہ زبردست تھا، اس نے آبِ

زمزم پیتے وقت فیضانِ الٰہی سے حافظ ذہبیؒ اور حافظ ابن حجرؒ جیسے علم کی درخواست کی تھی، اس کی ذکاوت بے مثال تھی، اس کی دقّتِ نظر عجیب تھی، اس کا مطالعہ وسیع تھا اور عمیق بھی! ان خصوصیات نے اسے علم وتحقیق بالخصوص علومِ حدیث کی ایک زندہ علامت بنا دیا تھا، وہ علماء وفضلاء کا مرجع تھا، تحقیق کی الجھی ہوئی گتھیاں اس کے یہاں سلجھتی تھیں، حدیث وقرآن کی مشکلات کا تشفی بخش حل اس کے پاس تھا۔ علم رجال کے مخفی خزانوں پر اس کی دسترس تھی، فقاہت اس کی طبیعت تھی، وہ سراپا علم تھا۔

یہ بدرِ تاباں! نہیں! آسمانِ فضل وکمال کا آفتابِ درخشاں ۹۳؍سال تک مئو کے افق پر چمکتا رہا، اور دنیائے علم کو روشنی اور حرارت بخشتا رہا، آخر میں اس کا جسم انتہائی نحیف ونزار ہو گیا تھا، قُویٰ جواب دے گئے تھے، بینائی نے نظریں چرالی تھیں، مگر دل ودماغ بالکل تازہ دم اور نشیط تھے، حالت یہ ہے کہ بستر علالت پر جسمِ بیمار پڑا ہوا ہے، آنکھیں بند ہیں اور حدیث کے ایک مشہور ذخیرہ ''مُصَنَّفُ اَبِیْ شَیْبَہ'' کی تحقیق جاری ہے، ایک ایک لفظ پر غور ہو رہا ہے، غلطیوں کی نشاندہی کی جارہی ہے، حواشی املا ہو رہے ہیں، اسی دوران خالق کائنات کی طرف سے بلاوا آ گیا، کتابِ دنیا بند کردی گئی، آخرت کا دروازہ کھول دیا گیا، زندگی بھر کی کاوش وکوشش کا صلہ ملنے کا وقت آ گیا۔ کچھ عرصہ تک یہ آفتاب موت وحیات کی کشمکش میں جھلملاتا رہا، بالآخر ۱۰؍رمضان المبارک کی شام کو جب دنیا کو روشنی بخشنے والا آفتاب غروب ہو رہا تھا اور رمضان المبارک کا مقدس مہینہ عشرۂ مغفرت میں داخل ہو رہا تھا، ٹھیک اسی وقت علم وفضل کا یہ آفتاب دنیا کے افق سے غروب ہو کر حق تعالیٰ کی آغوشِ رحمت میں جا پہونچا۔ إنا لله وإنا إليه راجعون

یہ عظیم ہستی مئو اور اس کے اطراف میں ''**بڑے مولانا**'' کے نام سے معروف تھی اور علماء وفضلاء اسے ''**محدث جلیل، فاضل اَجل، ابوالمآثر حضرت علامہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی**'' کے نام سے جانتے تھے۔

حضرت محدث اعظمیؒ دنیا سے تشریف لے گئے، وہ اپنی بے لوث خدمات کا صلہ

بارگاہِ خداوندی سے اور اپنی محبت وعشق کی داد وتحسین بارگاہِ رسالت سے پا رہے ہوں گے، محدثین کبار کی ارواحِ مقدسہ نے ان کا استقبال کیا ہوگا، جس طرح ان کے جنازے میں لاکھوں روزہ داروں کا ہجوم تھا، کیا عجب کہ عالم ارواح میں بھی لاکھوں ارواحِ طیبہ اور نفوسِ قدسیہ نے ان کو خوش آمدید کہا ہو۔

جانے والا اس دنیا کو......رنج ومحن سے بھری دنیا کو......خیر باد کہہ کر چلا گیا، لیکن وہ اپنے بعد والوں کو علم کا بے بہا خزانہ دے گیا۔ حضرت محدث اعظمی کے علمی کارناموں کو بہت سے لوگ شاید تفصیلاً نہ جانتے ہوں گے، کیونکہ وہ خاموش اور بے نیاز طبیعت کے مالک تھے، وہ علم وفضل کی نمائش کے فن سے واقف نہ تھے، وہ نام ونمود اور تمنائے ستائش سے ہمیشہ دور رہے، وہ ابتداء ہی سے فقیرانہ زندگی کے عادی تھے اور اخیر تک اسی حالت پر قائم رہے۔ ان کی ظاہری حالت دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ علم کے کیسے ''جبل عظیم'' کے سامنے موجود ہے، لیکن ان کی تحریرات، ان کے مضامین، ان کی حدیثی تحقیقات کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے وہ ہماری صدی کے آدمی نہ ہوں، وہ حافظ شمس الدین ذہبی اور حافظ ابن حجر وغیرہ کے دور کے آدمی تھے، ان کے حافظے کی گہرائی اور مطالعہ کی وسعت کو دیکھ کر اگلے محدثین یاد آجاتے ہیں۔ وہ اس دور میں اسلام کی حجتِ بالغہ تھے، ۱۱؍ رمضان ۱۴۱۲ھ کو روزہ دار مسلمانوں نے محض ایک شخصیت کو نہیں دفن کیا، بلکہ پوری ایک امت کو دفن کیا، اور علم وتحقیق کے مکمل کتب خانہ کو تہِ خاک چھپایا۔

مولانا کے وصال کے بعد دلوں میں یہ بات بہت شدت کے ساتھ آئی کہ انھوں نے جن علمی ذخائر کو اپنی میراث چھوڑا ہے، ان کی حفاظت کی جائے، ان کی اشاعت کی جائے، کیونکہ ان کی اشاعت عین دین کی اشاعت ہے، ان کا تعارف کرایا جائے، گو کہ آج کی دنیا، دنیاداری کی دوڑ میں اتنا آگے بڑھتی جا رہی ہے، کہ خالص اُخروی چیزوں کی قیمت اس کے آگے گرتی جا رہی ہے، دنیا کی چمک دمک نے نگاہوں کو خیرہ کر رکھا ہے، آخرت فراموش ہوتی جا رہی ہے، لیکن غفلت وخدا فراموشی کے اس سنّاٹے میں آج بھی اللہ کے فضل

سے ایسے لوگ موجود ہیں جن کے سینے فکر آخرت سے معمور اور جن کی نگاہیں علمی ذخائر کی جستجو میں مشغول ہیں۔ انھیں شوق ہے کہ قرآن وسنت کا علم انھیں حاصل ہو، ایسے لوگوں کے حق میں ناانصافی ہوگی اگر ان علمی خزانوں کو عام نہ کیا جائے۔

اسی جذبے کے تحت قصد ہوا کہ حضرت محدث کبیر کی وہ علمی یادگاریں، جو اَب دستیاب نہیں ہیں، انھیں جدید اُسلوب کے مطابق تحقیقات وتعلیقات کے ساتھ مزیّن کرکے دوبارہ علم وتحقیق کے قدردانوں کے ہاتھوں میں پہونچایا جائے، چنانچہ یہ کام شروع ہو چکا ہے۔

اسی دوران یہ بھی خیال ہوا کہ ایک علمی ودینی مجلّہ حضرت اقدسؒ کی یادگار میں جاری کیا جائے، جس میں مختلف دینی موضوعات پر تحقیقی مقالات کی اشاعت کے ساتھ ساتھ حضرت کی کتابوں کا تعارف بھی پیش کیا جائے، اور ان کے وہ قدیم مطبوعہ مقالات ومضامین جو اَب کہیں نظر نہیں آتے، یا ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں، انھیں بھی منظر عام پر لایا جائے، نیز اکابر اور بزرگوں کے احوال وحکایات کی روشنی عام جائے، تاکہ دلوں سے آخرت فراموشی کی سیاہی دور کی جاسکے۔

غرض ایک ایسا دلآویز اور روح پرور علمی وروحانی مرقع تیار کیا جائے، جو اہل علم وتحقیق کے ذوق بلند کو مزید بلندی بخشے، اور اس کی ضمانت حضرت اعظمی کے علمی نوادرات وتحقیقات ہیں، اور محبت ومعرفت کے شیدائیوں کی آسودگی وسیرابی کا سامان مہیا کرے، نیز مسلمانوں میں صحیح علمی ودینی ذوق بیدار کرے، اور اگر کسی طرف سے مسلک حق اور مذہب اہل حق پر آنچ آنے کا اندیشہ ہو تو اسے دور کرنے اور قلوب کو مطمئن کرنے کا فریضہ بھی انجام دے۔

دلوں میں خیالات آئے، احباب سے مشورے ہوئے، اہل علم نے ہمت افزائی کی، گو علم کے اس کساد بازاری کے دور میں بالخصوص ہمارے ملک میں جہاں اردو پڑھنے والوں ہی کی تعداد کتنی ہے؟ پھر ان میں سے دین اور علم دین ے دلچسپی رکھنے والے کتنی محدود

اور مختصر گنتی میں ہیں؟ نیز یہاں وسائل و ذرائع بھی ناپید ہونے کے درجے میں ہیں، آخر مجلّہ چھاپیں کیسے؟ اور جیسے تیسے چھاپ لیا تو پڑھے گا کون؟ یہ سوالات ایسے ہیں جو ہمت کو پست کر دیں، پاؤں ڈگمگا دیں، حوصلوں کو توڑ کر رکھ دیں، تاہم بنامِ خدا امید و بیم کے ساتھ اس کام کا آغاز کیا جاتا ہے۔

مجلّہ ”المآثر“ کا پہلا شمارہ ہم ناظرین کے ہاتھوں میں پیش کر کے خدا کے حضور دست بدعا ہیں کہ الٰہ العالمین! دلوں کو سچا خلوص، نگاہوں کو صحیح نظر، دماغوں کو متوازن فکر، ہاتھوں کو محتاط قلم اور پاؤں کو جادۂ استقامت عطا فرمانے والے آپ ہیں۔ ہم کمزوروں اور ناتوانوں نے آپ کی قوت و توانائی کے اعتماد پر قلم کا سفر شروع کر دیا ہے، حقیقی منزل تک پہونچانے والے اور جد و جہد کو قبول کرنے والے آپ ہیں، آپ سے امیدوار ہیں، اور آپ سے امید رکھنے والا ناکام نہیں ہوتا۔

(جلد نمبر ۱، شمارہ نمبر ۱، محرم، صفر، ربیع الاوّل ۱۴۱۳ھ / جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۹۲ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تازیانۂ عبرت

الحمدللہ رب العالمین والعاقبة للمتقین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدالمرسلین وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ اجمعین۔

بابری مسجد کی شہادت ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ایک قیامت صغریٰ تھی، جس کے بعد قتل وخون کا ایک سیلاب اہل اسلام کے سروں سے گزر گیا۔ اس حادثۂ کبریٰ سے مسلمانوں کے دلوں کو جیسی چوٹ لگی ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔ اس سے پہلے باوجودیکہ ہندوستان میں سینکڑوں فسادات ہوچکے تھے، اور باوجودیکہ مسلمانوں کے ساتھ ناروا امتیازی سلوک ہوتے چلے آرہے تھے، لیکن بہرحال آزاد ہندوستان میں یہ احساس باقی تھا کہ جیسا شہری ایک ہندو ہے، ویسا ہی مسلمان بھی ہے۔ اکثریت اور اقلیت کا فرق تو فطری ہے، مگر مسلمان اپنے کو بے بس اور دوسروں کے رحم وکرم پر نہیں سمجھتا تھا، مگر بابری مسجد کیا شہید ہوئی کہ دلوں کی دنیا زیروزبر ہوگئی، اس ایک مسجد کی شہادت نے احساسات تک بدل ڈالے ہیں۔ اب اقلیت واکثریت کا فرق وامتیاز جارحانہ علامتوں کے ساتھ نمایاں ہونے لگا ہے، ہندوستان کی سرزمین روز بروز فرزندانِ توحید پر بظاہر تنگ ہوتی جارہی ہے، حسّاس اور باشعور افراد مسلمانوں کے مستقبل کو سوچ سوچ کر ہراساں ہیں۔ ان حالات میں حکومت کا کیا فرض ہے؟ مسلمان اس سے اپنے حقوق کا مطالبہ کس طرح کریں؟ اس سلسلے میں اخبارات کی دنیا میں دھوم مچی ہوئی ہے۔

لیکن یہ بات بار بار دل میں آتی رہی، بہت سے لوگوں کے دلوں میں آتی رہی، اور بجا طور پر لوگ سوچتے رہے کہ حالات کی اس اُلٹ پلٹ میں، اور کچھ ہو یا نہ ہو، لیکن اتنا

ضرور ہوگا، کہ مسلم معاشرہ میں، افراد میں، خاندانوں میں، آبادیوں میں، شہروں میں، دیہاتوں میں، دینی احساس بیدار ہوگا۔ باہر فرقہ پرستی اور مذہب کے نام پر جارحیت کا عفریت منہ پھاڑے ہوئے کھڑا ہے، تو کم از کم اندرونی طور پر مسلمان اپنی ذاتی رنجشیں اور عداوتیں بھلا کر محبت واُخُوّت کی فضا بنانے کی کوشش کریں گے۔ بین الاقوامی احوال ایسے ہیں کہ کوئی اسلامی ملک بھی بجز ہمدردی کے چند بول کے کوئی عملی قدم اٹھانے سے مجبور ہے۔ اب تو بجز غیبی نصرتِ الٰہی کے اور کوئی سہارا نہیں ہے۔ اب یہ امید بجا تھی کہ مسلمان خلوصِ قلب کے ساتھ اللہ کے حضور رُجوع کریں گے، اسلام کے بنیادی فرائض واحکام کی بجا آوری میں مستعد ہوں گے، ایک مسجد کھوئی ہے، تو اس کے عوض میں بہت سی وہ مسجدیں جو عین مسلمانوں کی آبادیوں کے درمیان رہ کر نمازیوں کو ترس رہی ہیں، آباد ہوں گی، کسب مال میں حلال وحرام کے درمیان رہ کر امتیازی نشان کھینچ دیا جائے گا، حرام کے دروازے بند کردئے جائیں گے، اور حلال پر اکتفا کیا جائے گا۔ مختلف نجی اور اجتماعی تقریبات میں اسرافِ بے جا سے احتراز کیا جائے گا۔ مسلمان عرصہ سے ٹولیوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے باہم ایک دوسرے سے الجھے ہوئے ہیں، اب کم از کم ایک دوسرے کا گریبان چھوڑ کر اپنے اپنے گریبان کی فکر کریں گے، چند فروعی عقائد ومسائل کو بنیاد بنا کر ایک دوسرے کو ملت اسلام سے کاٹنے کے بجائے، ایک دوسرے سے گلے ملنے میں پہل کریں گے، اگر دینی علوم میں کمال واستحکام نہیں پیدا کرتے تو محنت وکوشش کر کے دنیوی علوم میں ہی میں مرتبہ بلند حاصل کریں گے۔

مگر کیا ایسا ہوا؟ یا اس کا کوئی حصہ نمایاں ہوا؟ اس سوال کا جواب بڑا دردناک ہے، جی نہیں چاہتا کہ ان مسائل کو چھیڑا جائے، کہ اپنا ہی زخم ہے، اور اپنا ہی درد ہے، لیکن احتساب بھی ایک فریضہ ہے، تکلیف دہ سہی، ناخواشگوار سہی، مگر ہے ضروری۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان حوادث وآفات کے بعد ہمارا معاشرہ زوال اور گراوٹ کی طرف کچھ اور تیز رفتاری سے بڑھ رہا ہے، باہمی نزاع اور اختلاف ہی نہیں، دنگے فساد،

آپسی خونریزی، معمولی معمولی باتوں پر جان لینے اور دینے کا مزاج اس میں تیزی سے ترقی کررہا ہے، کہ اس کی زد میں مسلمانوں کی چھوٹی بڑی بیشتر آبادیاں آتی چلی جارہی ہیں، جس جگہ جائیے بجائے اس کے کہ لوگ صلح وآشتی کی باتیں کریں، ہمہ وقت جنگ وجدل اور ایک ودسرے کی ایذارسانی کی بلا میں مبتلا ہیں، سنجیدہ حضرات دم بخود ہیں کہ کسی کو کوئی سمجھائے تو کیونکر سمجھائے؟ نفسانیت کے آگے کوئی کچھ سننے کو تیار ہی نہیں ہے، معاشرہ کی سب سے زیادہ تباہی ان باہمی خانہ جنگیوں کی وجہ سے ہے، دوآدمی کسی معمولی بات پر لڑ جاتے ہیں، پھر پارٹیاں سجنے لگتی ہیں، ہر پارٹی خود کو مضبوط اور طاقتور بنانے کے لئے اپنے اور فریق مخالف دونوں کے مشترکہ دشمن کا سہارا لیتی ہے، وہ دشمن کب چاہے گا کہ یہ لوگ باہم صلح وآشتی کے ساتھ رہیں، فتنہ کی آگ بجھتی دیکھتا ہے تو ایک لکڑی پھینک دیتا ہے، جو مال اپنی اور ملت کی فلاح وبہبود میں خرچ ہوتا، وہ مقدمات کی پیروی، ناجائز رشوتوں اور بالکل غلط قسم کی دعوتوں میں خرچ ہوتا ہے۔

اسلام کے بنیادی فرائض کا یہ حال ہے کہ مسجدوں میں چندلوگ نماز ادا کررہے ہیں، اور ٹھیک اسی وقت اسی مسجد کے آس پاس بلکہ سامنے بہت سے لوگ بیٹھے گپیں ہانک رہے ہیں، لڑ رہے ہیں، جھگڑ رہے ہیں بلکہ بعض ستم ظریف تو ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈ بھی بجارہے ہیں، جس آبادی میں آپ جائیں یہ مکروہ منظر دیکھ سکتے ہیں۔ نماز کا ادا کرنا تو ایک طرف رہا، جماعت اور مسجد کا احترام بھی قلوب سے رخصت ہو چکا ہے، خود نہیں پڑھتے تو شرمندہ ہوتے، سرنگوں رہتے، شور وشغب نہ کرتے، مگر یہاں تو معاملہ برعکس ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: **کل امتی معافی الا المجاهرین** (بخاری شریف) ساری امت درگذر کی مستحق ہے، سوائے ان کے جو علی الاعلان مبتلائے معصیت ہوتے ہیں۔ غور کیجئے، علانیہ فسق وفجور کا ارتکاب کرنے والے بلکہ اس پر فخر کرنے والے، ہمارے معاشرے میں کس بہتات کے ساتھ ہیں، بلکہ اب تو یوں ہوتا ہے کہ ملک میں کوئی عظیم طوفان کھڑا ہوتا ہے، یا دنیا میں کہیں کوئی ہنگامہ برپا ہوتا ہے جیسا کہ ابھی ماضی قریب میں ہوا تھا، یا کوئی کھیل

کود ہورہا ہوتا ہے، اوران کی خبریں ریڈیوایسے وقت میں نشر کررہا ہوتا ہے، جب نماز کا وقت ہوتا ہے، تو ایک بڑی تعداد نماز سے غافل ہوکر ریڈیو پر ٹوٹ پڑتی ہے، جبکہ یہی خبریں وہ دوسرے ذرائع اور دوسرے اوقات میں حاصل کرسکتے ہیں، لیکن دین ودنیا دونوں کو پس پشت ڈال کر ریڈیو کو قبلۂ مقصود بنالیتے ہیں۔

کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

اسی پر دوسرے معاملات کو بھی قیاس کرلیجئے، ہم کو کہاں ہونا تھا اور ہم کہاں ہیں؟ اب سے پلٹنے کی ضرورت ہے، کتاب وسنت کا علم حاصل کریں، اور اللہ ورسول کو خوشنودی کو قبلۂ توجہ بنائیں، خدا کو راضی کرنے کے لئے ساری دنیا ناراض ہوجائے تو پروانہیں، اور خدا کو ناراض کرکے ساری دنیا راضی رہے تو بجز ضرر کے نفع کچھ نہیں۔ فَہَلْ مِنْ مُّدَّکِرْ

(جلد نمبر ۱، شمارہ نمبر ۴، شوال تا ذی الحجہ ۱۴۱۳ھ/ اپریل تا جون ۱۹۹۳ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ذوقِ انفرادیت کا ضرر

امام ابوعبداللہ بن عبد الرحمٰن الدارمی (المتوفی: ۲۵۵ھ) اپنی مشہور تصنیف سنن دارمی میں جسے بعض علماء صحاحِ ستہ میں بجائے ابن ماجہ کے شمار کرتے ہیں، اپنی سند سے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا ایک اثر نقل کرتے ہیں:

”قال معاذ یفتح القرآن علی الناس حتیٰ یقرأ المرأۃ والصبی والرجل فیقول الرجل: قد قرأت القرآن فلم اتبع، واللہ لاقومن بہ فیھم لعلی اتبع، فیقوم بہ فیھم فلایتبع فیقول: قد قرأت القرآن فلم اتبع وقد قمت بہ فیھم فلم اتبع لاحتظرن فی بیتی مسجداً لعلی اتبع فیحتظر فی بیتہ مسجداً فلایتبع، فیقول: قد قرأت القرآن فلم اتبع وقد قمت بہ فیھم فلم اتبع وقد احتظرت فی بیتی مسجداً فلم اتبع واللہ لاٰتینھم بحدیثٍ لایجدونہ فی کتاب اللہ ولم یسمعوہ عن رسول اللہ لعلی اتبع قال معاذ فإیاکم وماجاء بہ فإن ماجاء بہ ضلالۃ (سنن دارمی، ج:۱، ص:٦٧، **باب تغیر الزمان وماحدث فیہ**)

اس ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ ایک زمانے میں قرآن کا پڑھنا اور اس کا علم عام ہوجائے گا، عورت، مرد اور بچے سب اس کو پڑھیں گے۔ ایسے وقت میں آدمی سوچے گا کہ میں نے قرآن کا علم حاصل کیا، مگر میں مقتدا نہ بن سکا، اچھا لاؤ میں لوگوں کے درمیان اس کا نماز وغیرہ میں خوب اہتمام کروں، شاید اس سے لوگ میری مقتدائیت تسلیم کرلیں، پھر وہ خوب اس کا اہتمام کرے گا، مگر تب بھی اس کی پیروی نہ کی جائے گی، تب وہ کہنے لگے گا کہ

میں نے قرآن پڑھا مگر مقتدا نہ بن سکا، اس کا زبردست اہتمام کیا، یعنی نمازوں میں پڑھا، لوگوں میں اس کی اہمیت ظاہر کی، تب بھی لوگوں نے مجھے نہیں مانا، اچھا اب گھر میں مسجد بنا کر بیٹھ رہتا ہوں، شاید اس سے لوگوں کے نزدیک میری اہمیت ہو، پھر وہ گھر میں مسجد بنا کر خلوت نشینی اختیار کرے گا، مگر اس کے باوجود بھی اسے کوئی نہیں پوچھے گا، وہ کہے گا: میں نے قرآن پڑھا، تب کسی نے نہیں پوچھا، میں نے قرآن کا اہتمام کیا، تب بھی لوگ میرے پیچھے نہ چلے، میں اپنے گھر میں مسجد بنا کر بیٹھ گیا، تب بھی کسی نے نہ پوچھا، اچھا اب اللہ کی قسم ایسی باتیں لاؤں گا جن کا پتہ نہ اللہ کی کتاب میں ہوگا، اور نہ انھوں نے اللہ کے رسول سے وہ باتیں سنی ہوں گی، شاید تب لوگ میری پیروی کریں۔ حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ خبردار جو بات وہ لایا ہے، اس سے دور ہی رہو، کیونکہ وہ سراسر گمراہی ہے۔

جس دور میں حضرت معاذ بن جبلؓ نے یہ بات ارشاد فرمائی تھی، اس قت ایسے لوگ مسلمانوں میں نہ تھے، وہ زمانہ خیر کا تھا، حضراتِ صحابہ کا وجود شمعِ ہدایت بن کر جگمگا رہا تھا، اخلاص وللٰہیت کی دولت فراواں سے ان کے قلوب مالا مال تھے، اللہ کا خوف طبیعتوں میں راسخ تھا، احکامِ الٰہی کی عظمت کے سامنے نفس کی خواہشات پامال تھیں، مگر جوں جوں زمانہ پیچھے ہٹتا گیا خلوص وللٰہیت کا سرمایہ کم ہوتا گیا۔ خوفِ خدا کی جگہ ہوائے نفس کا غلبہ ہوتا گیا، پھر ایسے لوگوں کی بتدریج کثرت ہونے لگی جن کی نشاندہی حضرت معاذ بن جبلؓ نے کی ہے، اور پندرہویں صدی کے اس بعیدتر دور میں ستم ظریفوں کی یہی ٹولی خود کو اسلام کی محافظ وترجمان قرار دینے پر تلی ہوئی ہے۔

حضرت معاذ بن جبلؓ نے اپنے اس ارشاد میں جس انسانی کمزوری پر انگلی رکھی ہے، وہ بہت اہم ہے۔ بکثرت لوگوں میں بالخصوص وہ لوگ جن کو ذہانت وذکاوت اور ہمت وحوصلہ کی وافر مقدار قدرت کی جانب سے عطا ہوئی ہے، اور انھوں نے نفس کا تزکیہ نہیں کیا ہے، ایسے افراد میں خودنمائی اور عوام الناس کی مقتدائیت اور اپنی انفرادیت کے اظہار کا زبردست جذبہ ہوتا ہے، لیکن اس کا ظہور اس کے اصلی رنگ وروپ میں نہیں ہوتا، کیونکہ اس

صورت میں ان کی کوئی حیثیت باقی نہ رہے گی اور مقصد ہی فوت ہوجائے گا۔ یہ کمزوری کبھی علم وفضل کے لباس میں نمایاں ہوتی ہے، کبھی تدین وتقویٰ کے رنگ میں ظہور کرتی ہے، کبھی اصلاح ورہبری کا لباس پہن کر آتی ہے، ایسے لوگ بظاہر نہایت دردمند، قوم کے بہی خواہ، دین وملت کے لئے مضطرب اور اسلام اور اہل اسلام کی ہمدردی میں بے قرار نظر آتے ہیں، اور اس کے ساتھ اعلیٰ درجہ کے اخلاص اور نیک نیتی کا راگ الاپتے ہیں، مگر یہ سب کچھ ظاہری نمائش سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا، اندرون طبیعت میں صرف ایک جذبہ ہوتا ہے کہ کسی طرح لوگوں کی مقتدائیت حاصل ہوجائے، یا کم ازکم لوگوں میں ان کی انفرادیت کا سکہ بیٹھ جائے، عوام وخواص میں شہرت حاصل ہوجائے، تعریفیں ہوں، سب پر چھا جائیں، ہر ایک ان کے پیچھے چلنے پر مجبور ہو، باطن میں یہ نیت شعوری یا غیر شعوری طور پر تہ نشین ہوتی ہے، لیکن اگر کوئی شخص اس نیت کا اعلان کرکے میدان میں اترے تو کون اس کی بات پوچھے گا؟ اس لئے وہ دینی رنگ میں تدبیریں اختیار کرتا ہے، پھر اگر ان تدبیروں میں انفرادیت نہیں پاتا تو بالکل اجنبی راہ اختیار کرنے پر تل جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب قرآن کا علم سب میں عام ہوجائے گا تو اس میں کیا انفرادیت باقی رہ جائے گی۔ پس وہ اسی میں انفرادیت کی ایک راہ نکالے گا، کہ زیادہ سے زیادہ نماز وغیرہ کا اہتمام کرے گا، بار بار اس کا نام لے گا، اس سے اپنا گہرا تعلق طاہر کرے گا، لوگوں میں قرآن کی دہائی دے گا، دردمندی کا اظہار کرتے ہوئے قرآن کو سب سے زیادہ مظلوم کتاب قرار دے کر اس کی دادرسی کرنا چاہے گا، مگر جب اس کے باوجود لوگوں کا التفات نہیں پاتا تو کچھ اور تدبیر اختیار کرتا ہے، مثلاً یہ کہ اپنے گھر میں عبادت گاہ بنا کر خلوت نشین ہوجاتا ہے کہ شاید اس طرح اس کی بزرگی اور زہد وتقویٰ کا چرچا ہو، مگر محسوس کرتا ہے کہ اس راہ سے بھی خاطر خواہ شہرت نہیں حاصل ہورہی ہے، تو پھر بالکل نئی راہ نکالنے کو سوچنے لگتا ہے، ایسی راہ جس کا قرآن وسنت میں پتہ نہ ہو۔ اس کا دعویٰ یہ ہوتا ہے، اور بڑی بلند آہنگی سے ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ پیش کررہا ہے وہی دین ہے، اسلاف نے جو کچھ اس کو نہیں ذکر کیا، تو یہ ان کا قصور فہم تھا، ان کی سادگی تھی، ان کی سادہ لوحی

تھی وغیرہ وغیرہ۔

جن لوگوں کو اللہ کی طرف سے دین کی صحیح بصیرت عطا ہوئی ہے، اور انھیں معرفتِ الٰہی کا نور نصیب ہوا ہے وہ اپنی فراستِ ایمانی سے دل کے اس مخفی چور کو بھانپ لیتے ہیں، مگر چور نے جو دینی رنگ کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے اس کو دیکھ کر وہ ہچکچاتے ہیں، عام نگاہیں صرف یہی لبادہ دیکھتی ہیں، اگر ان کی حقیقت واضح کی جائے تو ناواقف لوگ بھڑک اٹھیں گے۔ اسی گومگو میں عرصہ تک وہ پڑے رہتے ہیں اور گمراہی عام ہوتی رہتی ہے۔

انفرادیت کے اس جذبے اور لوگوں سے اپنی پیروی کرانے کی ہوس نے نہ جانے کتنی قیامتیں برپا کی ہیں، ہم کسی فرد یا تحریک کے بارے میں قطعیت اور بالکل یقین کے رنگ میں تو اس کا فیصلہ نہیں کرسکتے، تاہم زمانہ ''صیرفیٔ کائنات'' ہے، ایک عرصہ تک تجربہ کرتے رہنے سے، سرد وگرم احوال میں دیکھتے اور پرکھتے رہنے سے، نیز نوائب وحوادث کے الٹ پھیر میں، دلوں کی نیتیں زبان وعمل میں ظہور کرنے لگتی ہیں، اور بالآخر زمانہ فیصلہ کردیتا ہے کہ کون سی تحریک اور کون سا فرد کس نیت کو لے کر کھڑا ہوا تھا۔

ہمارا دین عقلی اور قیاسی تیر تکّوں کی بنیاد پر نہیں ہے، اس کی بنیاد تعامل وتوارث اور طبقۃً بعد طبقۃٍ نقل وروایات پر ہے، اور امت کا سوادِ اعظم جس کی تعبیر جمہور علماءِ امت سے کی جاتی ہے، وہ کبھی کسی مسئلہ پر قطعی ضلالت پر مجتمع نہیں ہوسکتا۔ ابن ماجہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: **إن امتی لاتجتمع علیٰ ضلالۃ فإذا رأیتم اختلافاً فعلیکم بالسواد الاعظم** (کتاب الفتن) میری امت گمراہی پر مجتمع نہیں ہوگی، لہٰذا تم جب باہمی اختلاف دیکھو تو سوادِ اعظم کا اتباع کرو۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جمہور کے مسلک کی پیروی اور ان کی راہ کو اختیار کرنا فرمانِ رسول کی تعمیل ہے، جو لوگ اپنی انفرادی رائے پر زور دیتے ہیں یا کسی مختلف فیہ مسئلہ میں کسی ایک رائے کو قطعی طور پر حق وصواب قرار دے کر دوسری جانب کو بالکل غلط اور گمراہی قرار دیدیتے ہیں، یہ لوگ جمہور کے طریقے سے انحراف کرکے رسول اللہ ﷺ کے حکم

کی خلاف ورزی کرتے ہیں، ان لوگوں کا سب سے پہلا وار جمہور امت پر پڑتا ہے، کہ ان کی رگ کاٹ دی جائے تو انفرادیت کا راستہ صاف ہو جائے۔

ہم اس دور میں عرصہ سے یہ تماشا دیکھ رہے ہیں کہ جو کوئی حوصلہ مند اور ذہین ہوا، اس کے پیٹ میں پہلے یہی درد اٹھتا ہے کہ لوگ اس کی پیروی کیوں نہیں کرتے، پھر وہ الٹے سیدھے نظریات وضع کرتا ہے، اور ان پر ایسا اصرار کرتا ہے کہ جیسے اگر انھیں نہ تسلیم کیا جائے تو اسلام کی عمارت ہی منہدم ہو کر رہ جائے گی، ایسے لوگوں سے ہمیشہ چوکنّا رہنے کی ضرورت ہے، ہر چمکدار چیز سونا نہیں ہوتی

اے بسا ابلیس آدم روئے است

مگر عمومی طور پر سطحیت بڑھ گئی ہے، جہاں کوئی نیا نعرہ لگتا ہے، ایک بھیڑ جمع ہو جاتی ہے۔

ابن ماجہ ہی کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ لوگ (آٹے کی طرح) چھن جائیں گے، اور صرف وہی لوگ باقی رہ جائیں گے، جو بھوسی کے مانند ہوں گے۔ ان کے عہد اور ان کی امانتیں فاسد ہو کر رہ جائیں گی، اور آپس میں وہ اس طرح گتھ جائیں گے، جیسے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم گتھ جاتی ہیں، فرمایا کہ اس وقت تم لوگوں کا کیا حال ہوگا؟ صحابہ نے عرض کیا کہ جب ایسا ہو تو یا رسول اللہ ہم کیا کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

تاخذون ماتعرفون وتدعون ماتنكرون وتقبلون علىٰ خاصتكم وتذرون أمر عوامكم (کتاب الفتن)

جو تمہاری جانی پہچانی چیزیں ہیں، انھیں لے لو اور اجنبی و نامانوس باتوں کو چھوڑ دو، اور اپنے خاص لوگوں پر توجہ دو، اور عوام کے معاملہ کو ترک کر دو، یعنی ان کا زیادہ اہتمام نہ کرو۔

دین کی فکر کرنے والوں کے لئے اس حدیث میں بصیرت کا بڑا سامان ہے، دین کا معاملہ بہت اہم ہے، آخرت میں اور دنیا میں مدار کار اسی پر ہے، آج رنگ رنگ کے اہل قلم

پیدا ہوگئے ہیں، الگ الگ ڈفلیاں بج رہی ہیں، جس کے منہ میں اللہ نے زبان دے دی ہے اور الفاظ پر اسے قدرت ہے، ہر ایک نیا نیا جلوہ لے کر آتا ہے۔ کوشش یہی ہوتی ہے کہ ایسی بات کہو اور لکھو، جو پہلے سے نہ جانی ہو، تاکہ وہ بات اسی کی طرف منسوب ہو، اور اس کے واسطے سے اس کی شہرت ہو، کچھ لوگ اس کا ساتھ دیں، ایسے حالات میں سلامتی کی راہ وہی ہے جس کی رہنمائی رسول اللہ ﷺ نے فرمائی کہ دین کے باب میں اسلاف کرام سے جو باتیں معروف اور جانی پہچانی چلی آتی ہیں، بس انھیں پر اکتفا کیا جائے، اور جو نئی نئی چیزیں تحقیقات کے خوشنما نام سے آرہی ہیں، ان کی طرف قطعاً التفات نہ کیا جائے، اور ہمیشہ اس کا اہتمام کیا جائے کہ قدم، جمہور علماء کی راہ سے منحرف نہ ہونے پائے۔ جو لوگ قرآن کی تفسیر و تاویل میں، احادیث کے ردّ و قبول کے معیار میں اور فقہی مسائل میں نئی نئی باتیں کرتے ہیں، ان کی نئی باتیں انھیں کے حوالے کر دینی چاہئے۔ ہمارے سامنے ان نئی باتوں کی ایک طویل فہرست ہے، کبھی موقع ہوا تو انھیں ذکر کریں گے، بعض ایسی چیزوں پر احتساب اس شمارے میں آپ پڑھیں گے۔ ہم نے اس وقت صرف اشارات کئے ہیں، دین کی سمجھ رکھنے والوں کے لئے یہ بات بہت کافی ہے۔

(جلد نمبر۲، شمارہ نمبر۴، شوال تا ذی الحجہ ۱۴۱۴ء/اپریل تا جون ۱۹۹۴ء)

☆☆☆☆☆

﷽

احتسابِ نفس

یہ دنیا جسے آدمی لطف وکیف میں ہوتا ہے، تو عالم رنگ وبو کہتا ہے، اور جب غم واندوہ کے احوال سے دوچار ہوتا ہے، تو عالم فانی وناپائیدار کہتا ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ اس دنیا کا رنگ ہمہ آن متغیر ہوتا رہتا ہے، یہ تغیر دوطرح کا ہوتا ہے، کبھی خوبی سے خرابی کی جانب اور کبھی خرابی سے خوبی کی جانب، آدمی ان تغیرات کو بالخصوص جب کوئی خرابی رونما ہوتی ہے تو طبعی اسباب وعوامل کی طرف منسوب کر کے مطمئن ہوجاتا ہے، اور خود کو سارے تماشے سے الگ کرلیتا ہے، گویا خود اس کی ذات اور اس کے اعمال وافعال کا ان تغیرات میں کوئی دخل نہیں ہے، سمجھتا ہے کہ حالات کی رفتار یہی ہے اور اس کا منطقی نتیجہ یہی نکلتا ہے، لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نتائج کچھ اس صورت میں نکلنے لگتے ہیں اور حالات ایسے پیدا ہونے لگتے ہیں کہ منطق منھ دیکھتی رہ جاتی ہے، اسباب طبعی ہکا بکا رہ جاتے ہیں، ذہانتیں گنگ ہوجاتی ہیں۔

عام احوال وحوادث میں بھی اس کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے اور حکومتوں کے عزل ونصب کے خصوصی حالات میں بھی اس کا تماشا ہوتا رہتا ہے، لیکن انسان بڑا خود فراموش ہے، وہ ان باتوں کی بھی ایسی توجیہ کرلیتا ہے، کہ اپنی ذات اور اپنے کردار پر کوئی آنچ نہ آئے، لیکن قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ ان تغیرات وانقلابات میں انسانی نیتوں، ارادوں، اور انسانی افعال واعمال کا بڑا دخل ہوتا ہے، یہ سب کچھ صرف اتفاقاً نہیں ہوجاتا بلکہ ان کے پیچھے آدمی کے اپنے احوال کی بنیاد پر حق تعالیٰ کے تصرفات کا کرشمہ ہوتا ہے۔

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (سورہ روم)

لوگوں کے اعمال کی وجہ سے خشکی وتری میں فساد پھوٹ پڑا، اس لئے تا کہ کچھ اعمال کا بدلہ انھیں چکھا دے، شاید وہ باز آ جائیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ۔

اللہ کسی قوم کی اچھی حالت کو اس وقت تک تبدیل نہیں کرتے جب تک لوگ خود ہی اپنے حالات کو بدل نہ ڈالیں۔ (سورہ رعد)

اس سے معلوم ہوا کہ احوال کے اُلٹ پھیر اور حکومتوں کے عزل ونصب میں انسانوں کے کاموں کا بڑا دخل ہے، مگر کوئی شخص اپنے اوپر اس ذمہ داری کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہے۔ زبانی طور پر قبول کرنا نہیں بلکہ اس طرح ذمہ داری قبول کرنا کہ اس کے بعد اپنے احوال واعمال کی اصلاح وترمیم کے لئے آدمی مستعد ہو جائے اور بالآخر سدھار پیدا کر لے، اس کے لئے کوئی آمادہ نہیں ہے۔ دیکھا یہی جاتا ہے کہ ایک حکومت آئی، لوگ اس کی شکایت لے کر بیٹھ جاتے ہیں، پھر دوسری حکومت آئی، اور اس کے ظلم کا ڈنڈا چلنے لگا تو لوگوں کی زبانوں اور تبصروں کا رُخ ادھر پھر گیا، اب جہاں دیکھئے اسی کا چرچا ہے، بالخصوص ہمارے ملک میں تو لوگوں کا یہی مشغلہ بن گیا ہے، گھنٹوں لوگ حکومتوں، پارٹیوں، اور دوسروں کے ظلم وستم اور مکائد ودسائس کا تذکرہ اور ان پر تبصرہ کرتے رہتے ہیں، ایسے لوگ جو خود اپنی نجی زندگی میں انھیں برائیوں میں ملوث ہوتے ہیں، جن کی وہ دوسروں پر تہمت رکھتے ہیں، لیکن مجال نہیں کہ اک ذرا بھی حرکت اپنی اصلاح کے لئے ہو، یا معمولی سی تنقیدی نظر اپنے اوپر پڑے، اس طرح حالات میں اور بھی بگاڑ ہوتا چلا جاتا ہے۔ حدیث قدسی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

إن الله تعالىٰ يقول: أنا الله لاإله إلا أنا مالك الملوك وملك الملوك قلوب الملوك في يدي وإن العباد إذا أطاعوني حولت قلوب الملوك بالرحمة والرافة وإن العباد إذا عصوني حولت قلوبهم بالسخطة والنقمة فساموهم سوء العذاب فلا تشغلوا أنفسكم بالدعاء على الملوك

ولكن اشغلوا أنفسكم بالذكر والتضرع كي أكفيكم

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اللہ ہوں ، میرے سوا کوئی معبود نہیں ، میں ہی بادشاہوں کا مالک ہوں ، میں بادشاہوں کا بادشاہ ہوں ، بادشاہوں کے دل میرے قبضۂ قدرت میں ہیں ، بندے جب میری اطاعت کرتے ہیں تو میں بادشاہوں کے دلوں میں رحمت وشفقت ڈال دیتا ہوں ، اور جب وہ میری نافرمانی کرتے ہیں، تو میں ان کے قلوب میں شدید غصہ اور انتقامی کیفیت پیدا کر دیتا ہوں ، تو وہ انھیں مبتلائے عذاب کر دیتے ہیں ، لہٰذا اے لوگو! تم بادشاہوں پر بددعا کرنے میں اپنے آپ کو نہ لگاؤ، بلکہ مجھ سے دعا وتضرع میں لگ جاؤ، پھر میں تمہارا بہتر انتظام کردوں گا۔ (مشکوٰۃ شریف، کتاب الامارۃ)

اس حدیث کو بار بار پڑھنا چاہئے ، جب بددعا کرنے کی ممانعت ہے، تو فضول تبصروں اور لغو تنقیدوں کی اجازت بھلا کب ہوسکتی ہے ، جو کام کرنے کا ہے اسے کرنا چاہئے۔

(جلد نمبر ۴، شمارہ نمبر ۱، محرم، صفر، ربیع الاوّل ۱۴۱۶؁ء/ جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۹۵؁ء)

(ماہنامہ ضیاء الاسلام: جنوری ۲۰۱۰؁ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جماعت اہل حدیث کا تازہ کارنامہ

جماعت اہل حدیث! کیا شے ہے جماعت اہل حدیث؟ سنت وشریعت کی خادم! لیکن چڑچڑی، ضدی اور بے لگام! خدمت کا انداز نرالا رکھتی ہے، اور لاریب کہ یہ اندازِ خدمت دوسروں پر بالا ہے۔ یہ پھلجڑیاں چھوڑتی ہے، پٹاخے پھوڑتی ہے، ہوائی فائر کرتی ہے، راہ گیروں کو چونکا دیتی ہے، انھیں اغل بغل سے ہوشیار کر دیتی ہے، تھوڑی دیر کیلئے آتش بازی کی وجہ سے راستہ چلنا مشکل ہو جاتا ہے، مگر پھر مسافر اپنا راستہ لیتا ہے اور یہ دوسری طرف پٹاخے پھوڑنے میں مشغول ہو جاتی ہے، اور مسافر ہوشیار اور چوکنا رہنے لگتا ہے۔

اس جماعت کا وجود اور تشخص، احناف کے منھ پر پھلجڑیاں چھوڑنے سے ہوا، اس نے ایک شوشہ نکالا، کہ احناف کا طریقۂ عبادت سنت کے مطابق نہیں ہے، نمازوں میں یہ رفع یدین نہیں کرتے، آمین بالجہر کے یہ قائل نہیں ہیں، قرأۃ خلف الامام پر یہ عامل نہیں ہیں، وغیرہ۔ چار فقہی مسالکِ فکر صدیوں سے چلے آ رہے تھے، ان میں مسائل ودلائل کا اختلاف تھا مگر کوئی یہ کہنے کی جرأت نہیں کرتا تھا کہ فلاں مکتبِ فکر طریقۂ رسول کے خلاف ہے، یہ پٹاخہ ہندوستان میں چھوڑا گیا کہ احناف کا طرزِ عمل خلافِ سنت ہے، اور اس پر مزید ایک رَدّا یہ رکھا گیا کہ تقلید شرک ہے، اس رَدّے نے چاروں مذاہبِ فقہیہ کو چونکا دیا۔

احناف ایک عرصہ سے اپنے مسلک کو رسول اللہ ﷺ کی عین تابعداری سمجھ کر مطمئن تھے، اس اطمینان سے ان میں ایک طرح کا ٹھہراؤ محسوس ہونے لگا تھا، ایسا لگتا تھا جیسے ان پر جمود طاری ہو گیا ہو، حالانکہ حقیقت یہ نہ تھی، تاہم جب سنت کی اس خدمت گزار جماعت نے ہنگامہ بپا کیا تو احناف چونکے، ان میں نئی حرکت پیدا ہوئی۔ انھوں نے دلائل کتاب وسنت کے ذخیروں کو ازسرنو کھنگالنا شروع کیا، انھیں محسوس ہوا کہ حنفی مسلک مضبوط بنیادوں

پر کھڑا ہے، البتہ وہ بنیادیں لوگوں پر ظاہر نہ تھیں، ان کے شور و ہنگامہ کے بعد محققین نے ان دلائل و براہین کو نمایاں کیا، جن سے لوگ غافل تھے، اس ضمن میں علوم و معارف کا ایک نیا دبستاں کھل گیا، محدثین کی ایک گراں فوج سامنے آ کھڑی ہوئی، اس سے دنیا کو ایک زبردست علمی فائدہ پہونچا، احناف کو شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ جماعت اہل حدیث کی ایک بے محل چھیڑ اور بے وقت کی چیخ و پکار سے علم و تحقیق اور ہدایت کا ایک نیا باب مفتوح ہوا۔

یہ قافلہ تو آگے نکل گیا، پٹاخوں کی دھائیں دھائیں کم ہونے لگی، قریب تھا کہ اس کا تشخص ختم ہو جائے، کہ اچانک آواز آئی کہ وادی نجد میں دولت و ثروت کا خزانہ زمین کی تہوں سے نکل آیا ہے، یہ ادھر متوجہ ہوئے تو دیکھا کہ وہاں ان کے حریف بھی کچھ کچھ پہونچ رہے ہیں، پھر تو پھلجڑیوں کا طوفان اٹھنے لگا، اتنا دھواں اٹھایا کہ فضا مکدر ہوگئی۔ کبھی عقائد کا مسئلہ، کبھی طلاقِ ثلاثہ کا مسئلہ، کبھی تراویح کا مسئلہ! لیکن اسی دوران نجد کے فرزند اکبر خادم الحرمین الشریفین الملک فہد کے عظیم الشان پریس سے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ دیوبندی کا ترجمہ قرآن مع فوائد عثمانی کے چھپ کر تقسیم ہونے لگا، اس سے اس ٹولہ کا اضطراب بڑھ گیا، پھر بہت دُند مچائی۔ وہی تفسیر جو آج سے نہیں، عرصۂ دراز سے پڑھی پڑھائی جا رہی ہے، جماعت اہل حدیث کے علماء بھی اس کے مطالعہ سے محروم نہیں ہیں، اور اس میں کوئی خرابی نظر نہ آتی تھی، جب وہ مدینہ منوہ کے شاہی پریس سے چھپ کر نکلی، اور لکھوکھا کی تعداد میں تقسیم ہونے لگی تو اس میں شرک و بدعت کے کیڑے نظر آنے لگے، بلکہ گمراہیوں کے شعلے لپکنے لگے، ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہ اس کی تقسیم بند ہو جائے، اعتراضات کی جھڑی لگا دی، علماء دیوبند چونکے، جن چیزوں کو کبھی قابل اعتراض نہیں سمجھا گیا تھا، جب انھیں پر تعصب کی چاند ماری ہونے لگی، تو علماء کو تنبہ ہوا، اور سلف کے حوالوں سے ثابت کر دیا کہ جو کچھ اس ترجمۂ و تفسیر میں ہے، وہ عین حق ہے، اس جماعت کی پھلجڑی بجھ گئی، لیکن پرانا قابل اتباع علم زندہ ہوگیا اور ہدایت کی راہ خس و خاشاک سے پاک ہوگئی، جماعت اہل حدیث کا ایک بار اور شکریہ!

ادھر تقریباً تین چوتھائی صدی سے تبلیغی جماعت ایک خاص انداز سے مسلمانوں کی دینی خدمت میں مشغول ہے، اسے خدمت کرتے ہوئے لمبا عرصہ گزر گیا، اس کا دائرۂ کار بڑھتا ہی جارہا ہے۔ اس کا حلقۂ اثر اب عرب وعجم کو محیط ہونے لگا ہے، عرب علماء وعوام نے اس کی خدمت کو پسند کیا، عرب ممالک کے قافلے سرگرم سفر نظر آنے لگے، ہندوستان میں بھی کثیر تعداد میں ان کی جماعتیں آنے لگیں، یہ خالص عوامی طرز کی خدمت ہے، جو سادگی کے ساتھ انجام پاتی ہے اس کے ذریعہ بے شمار ایسے لوگ جو خدا کے آستانہ سے نہ صرف محروم بلکہ باغی اور مجرم تھے، یکایک اللہ کے دربار میں حاضر ہوکر سجدہ ریز ہونے لگے، جنھیں اسلام کی ابتدائی چیزوں کی خبر نہیں تھی وہ اس میں لگ کر دین وایمان کے نمونے بن گئے، ایمان کی ایک تازہ بہار چمنستان اسلام میں خیمہ زن ہونے لگی، تبلیغی جماعت میں اسلام کے نام لیوا سبھی جماعتوں کے صالح افراد شامل ہونے لگے، حتیٰ کہ اہلحدیث طبقہ کی بھی خاصی تعداد اس قافلہ میں شریک ہوگئی۔ اس کا نتیجہ غیر ارادی طور پر یہ نکلا کہ پٹاخے داغنے والی سب جماعتیں سکڑنے لگیں، کیونکہ تبلیغی جماعت کا طریقۂ کار مثبت اور مفید ہے، اور مفید بھی ایسا کہ لگے ہاتھوں فائدہ دکھائی دینے لگتا ہے، مسجدیں نمازیوں سے بھرنے لگتی ہیں، چہروں پر اسلام کا نور جھلکنے لگتا ہے، پھر تبلیغی جماعت کے بڑے بڑے اجتماعات بھی ہوتے ہیں، جن میں شریک ہونے والے ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں گنے جاتے ہیں، اس کا اثر اس ''خادم سنت'' طبقہ پر پڑا، اس کے پیٹ میں حسب معمول مروڑ اٹھنے لگا اور لوگ اس کے باعث بل کھانے لگے، اور نتیجہ میں جو ''خدمت'' اس کے بطن سے خارج ہوئی، اسے ایک اشتہار کے ذریعے مشتہر کیا، کہنے کو تو وہ ایک عربی کالم کی تحریر کا ترجمہ ہے، لیکن اردو سے عربی میں ترجمہ کرکے ناقص بلکہ غلط معلومات فراہم کرنے والی یہی جماعت ہے، ورنہ بے چارہ عرب عالم اردو تقریروں اور تحریروں کو کیا سمجھے، یہ بالکل وہی کارنامہ ہے جو بریلی کے مولوی احمد رضا خان نے ۱۳۲۴ھ میں عرب جاکر انجام دیا تھا۔ اب تقریباً ایک صدی کے بعد ۱۴۱۶ھ میں طبقۂ اہلحدیث نے اس کی تجدید کی ہے، اشتہار کے تیور ملاحظہ ہوں۔

(۱) تبلیغی جماعت کی دعوت ”شیطانی دعوت“ جی ہاں! فرقۂ اہلحدیث کے نزدیک نماز روزہ اور کلمۂ وایمان کی دعوت شیطانی دعوت ہے، پھر جانے ایمانی دعوت کسے کہیں گے۔

(۲) ”تبلیغی جماعت والوں کو مسجد میں نہ آنے دو“ ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِىْ خَرَابِهَا﴾ کا کوئی نیا مصداق ہونا چاہئے، تجدد کا تازہ ترین شوق!

(۳) ”تبلیغی نصاب، منکر وموضوع احادیث سے بھرپور ہے“ جی ہاں! جو حدیث آپ کے مطلب کی نہ ہو، وہ سب بے تکلف منکر وموضوع ہے، تبلیغی نصاب کی حدیثیں شاید آپ کا ساتھ نہیں دیتیں، اس لئے اس میں جو کچھ ہے سب منکر وموضوع ہے۔

(۴) ”تبلیغی جماعت کی توحید مشرکین سے بڑھ کر نہیں ہے، یہ لوگ توحید اُلوہیت وعبادات میں فقیر ومعدوم ومفلس ہیں، بلکہ مشرک ہیں“ چلئے چھٹی ہوئی، تبلیغی جماعت اسلام سے خارج کردی گئی، اب کس کی مجال ہے کہ اس میں داخل کرے۔

(۵) ”تبلیغی جماعت والوں کا کسب وکمال خبیث ہے، اور شرک وبدعت وعقائد فاسدہ میں ملوث تبلیغی جماعت کے مشائخ بھی خبیث ہیں“۔

جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

(۶) تبلیغی جماعت والوں کا لٹریچر بھی بدعت وضلالت اور شرک کی دعوت پر مشتمل ہے، واقعی سچ ہے۔

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

آپ یہ نہ سوچئے کہ یہ دین کی خدمت نہیں ہے، اس سے بڑی خدمت کیا ہوگی، کہ خدمت گاروں کو گھونسہ لگا کر جگاتے رہا جائے، کہیں یہ لوگ سونہ جائیں۔

شکریہ جماعت اہلحدیث کا! بار بار شکریہ!!

(ربیع الثانی تا جمادی الثانی ۱۴۱۶ھ / اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۵ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایک بری خصلت

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہود اور منافقین کی ایک بری خصلت کا ذکر فرما کر اس پر عذاب الیم کی وعید سنائی ہے۔ یہ خصلت چونکہ خاص طور پر یہود اور منافقین میں پائی جاتی تھی، اس لئے ان کا ذکر خصوصیت سے آیا ہے، ورنہ درحقیقت یہ خصلت ہی محل وعید ہے، اور مسلمانوں کو بھی بڑے اہتمام سے اس سے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے، کیونکہ اللہ کا یہی حکم ہے، اور اسی کے مطابق ہر مسلمان کی دعا ہے کہ جس قوم پر اللہ کا غضب ہوا ہے، اس راستے سے اللہ تعالیٰ ہم کو بچائے ہی رکھیں، تو جو آیت یہود اور منافقین کو ان کی کسی عادت بد پر دھمکی سنا رہی ہو، مسلمان یہ کہہ کر مطمئن نہیں ہو سکتے کہ یہ بات ہم کو نہیں کہی گئی ہے۔ قرآن جو اہل تقویٰ کے لئے نسخۂ ہدایت ہے اس کی کسی آیت سے مسلمان صرف اس لئے کیوں کر صرف نظر کر سکتا ہے کہ اس میں فلاں قوم کا ذکر ہے، وہ آیت ملاحظہ ہو۔ ارشادِ ربانی ہے۔ لَاتَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَفْرَحُوْنَ بِمَا اَتَوْا وَیُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا فَلَاتَحْسَبَنَّھُمْ بِمَفَازَۃٍ مِّنَ الْعَذَابِ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (سورہ آل عمران، ۱۸۱) جو لوگ ایسے ہیں کہ اپنے کام پر خوش ہوتے ہیں اور جو کام نہیں کیا ہے اس پر چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف ہو، سو ایسے شخصوں کو ہرگز ہرگز مت خیال کرو کہ وہ عذاب سے بچاؤ میں رہیں گے، اور ان کیلئے دردناک عذاب ہے۔

اس آیت کی تشریح میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:

”یہود غلط مسئلے بتاتے، رشوتیں کھاتے اور پیغمبر علیہ السلام کی صفات و بشارات جان بوجھ کر چھپاتے پھر خوش ہوتے کہ ہماری چالاکیوں کو کوئی پکڑ نہیں سکتا، اور امید رکھتے

> ہیں کہ لوگ ہماری تعریف کریں کہ بڑے عالم اور دین دار حق پرست ہیں۔ دوسری طرف منافقین کا حال بھی ان کے مشابہ تھا۔ جب جہاد کا موقع آتا، گھر میں چھپ کر بیٹھ رہتے، اور اپنی اس حرکت پر خوش ہوتے کہ دیکھو کیسے جان بچائی، جب حضور جہاد سے واپس تشریف لاتے تو غیر حاضری کے جھوٹے عذر پیش کر کے چاہتے کہ آپ سے اپنی تعریف کرائیں، ان سب کو بتلا دیا گیا کہ یہ باتیں دنیا وآخرت کے عذاب سے چھڑا نہیں سکتیں، اول تو ایسے لوگ دنیا میں فضیحت ہوتے ہیں، اور کسی وجہ سے یہاں بچ گئے تو وہاں کسی تدبیر سے نہیں چھوٹ سکتے۔ (**تنبیہ**) اس آیت میں گو تذکرہ یہود یا منافقین کا ہے، لیکن مسلمانوں کو بھی سنانا ہے کہ برا کام کر کے خوش نہ ہوں، بھلا کر کے اترائیں نہیں، اور جو اچھا کام کیا نہیں اس پر تعریف کے امیدوار نہ رہیں بلکہ کرنے کے بعد بھی مدح سرائی کی ہوس نہ رکھیں‘‘

اس اس آیت پر اور اس کے مضمون پر نہایت سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہئے اور ہم اسلام کے نام لیواؤں کو دیکھنا چاہئے کہ ہمارے افراد میں اور ہمارے اجتماعی معاشرہ میں یہ مرض پھیلا ہوا تو نہیں ہے؟ انفرادی طور پر ہمارا یہ حال دیکھنے میں آرہا ہے کہ آدمی گناہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کے حکم کو توڑتا ہے، کسی نے کسی کو ستایا، اس کا مال دبایا، کسی کی زمین غصب کی، کاروبار میں کسی کو دھوکہ دیا، قرض لیا اور ادا کرنے میں ٹال مٹول کیا، یا بالکل ہی ادا نہیں کیا، نماز کو ترک کیا، روزہ سے جان بچائی، زکوٰۃ کا مال ہضم کرلیا، یہ سب وہ گناہ ہیں، جن کے گناہِ کبیرہ ہونے میں کسی مسلمان کو تردد نہیں ہے، لیکن ہوتا یہ ہے کہ ان پر شرمندگی تو کیا ہوتی؟ ان کے کرنے پر آدمی جھینپتا تو کیا؟ الٹے ان پر فخر کیا جاتا ہے، اپنی چالاکی اور عقلمندی کی شہادت انھیں سمجھا جاتا ہے، اور یہ بات کوئی اکادکا واقعات کی صورت میں نہیں ظاہر ہوتی، بلکہ اس کا عام چلن ہے۔

اور اجتماعیت کا حال دیکھئے تو اور بھی دگرگوں ہے۔ آج کل اجتماعیت نام ہے تنظیموں کا، جماعتوں کا، انجمنوں کا، اداروں کا، مکاتب فکر کا، یہاں سیاسی پارٹیوں اور بے

دینی کے جتھوں کا ذکر نہیں ہے، ان اداروں اور جماعتوں کا ذکر ہے، جو مسلمانوں کی خدمت کیلئے ان کی صحیح رہنمائی کیلئے قائم ہوئی ہیں، ان کی تحریریں پڑھئے، ان کی تقریریں سنئے، کیا ان میں یہ مرض نظر نہیں آتا؟ کیا ایسا نہیں ہے کہ الٹا سیدھا جو کام ان سے وجود میں آتا ہے چاہے وہ مسلمانوں کے حق میں مضر ہی ہو، خواہ اس سے اللہ تعالیٰ کی صریح نافرمانی ہی ہوتی ہو، لیکن ان پر تحریراً وتقریراً خوشی بلکہ فخر کا اظہار کیا جاتا ہے اور جو کام نہیں کیا ہے، امیدوار رہتے ہیں کہ ان پر ان کی مدح وستائش ہوگی، بلکہ اب تو اس کا بھی انتظار نہیں ہوتا کہ دوسرے ہمارے کئے کاموں پر ہماری مدح سرائی کریں۔ بھلا اس کا انتظار کون کرے۔ ہمارا اجتماعی معاشرہ اس سے ترقی کر کے خود ہی اپنی مدح وستائش کا راگ الاپتا ہے، اور نام اس خودستائی کا ''تعارف'' رکھا جاتا ہے، اور یہ تاویل کی جاتی ہے زمانہ تشہیر وپروپیگنڈے کا ہے، اس کے بغیر کام اور نام دب جاتا ہے، ممکن ہے یہ تاویل کسی حد تک درست ہو، لیکن غور کرنے والے غور کریں کہ کہیں یہ یہود ومنافقین کی پیروی تو نہیں ہے؟ بالخصوص اس وقت جب کہ یہ بھی دیکھا جاتا ہے، کہ بہت سے ادارے، بہت سی انجمنیں ان خوبیوں سے خالی ہوتی ہیں، ان کا اندرونی نظام خود ان کے کارکنوں کیلئے باعث مصیبت بنا ہوتا ہے، وہ خود تفرق وانتشار کا شکار ہوتی ہیں۔ ان کی بے عملی اور ناکارگی کی شکایتیں عام ہوتی ہیں، لیکن جب تعارف شائع ہوگا تو اس طرح شائع ہوگا کہ جیسے دین کی اور مسلمانوں کی خدمت ان کے علاوہ کسی اور جانب سے ہوتی ہی نہیں، کتنے مکاتب فکر ہیں، جو اپنی ظاہری وباطنی غلطیوں کے باوجود خود کو معصوم ثابت کرنے پر تلے رہتے ہیں، یہ صورت حال خودستائی اور اپنی مدح سرائی کی بہت تشویشناک ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ هُوَ أَعْلَمُ اِذْ أَنْشَأَ كُمْ مِنَ الْاَرْضِ وَاِذْ أَنْتُمْ أَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ أُمَّهَاتِكُمْ فَلَا تُزَكُّوْا أَنْفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى (النجم،۳۲) تم کو وہ خوب جانتا ہے جب بنا نکالا تم کو زمین سے، اور جب تم بچے تھے ماں کے پیٹ میں، سو مت بیان کرو اپنی خوبیاں، وہ خوب جانتا ہے، اس کو جو بچ کر نکلا۔ (ترجمہ شیخ الہند)

یعنی اگر تقویٰ کی کچھ توفیق اللہ نے دی تو شیخی نہ مارو، اور اپنے کو بہت بزرگ نہ

بناؤ وہ سب کی بزرگی اور پاکیزگی کو خوب جانتا ہے اور اس وقت سے جانتا ہے جب تم نے ہستی کے اس دائرہ میں قدم بھی نہ رکھا تھا، آدمی کو چاہئے کہ اپنی اصل کو نہ بھولے جس کی ابتدا مٹی سے تھی پھر بطن مادر کی تاریکیوں میں ناپاک خون سے پرورش پاتا رہا، اس کے بعد کتنی جسمانی وروحانی کمزوریوں سے دوچار ہوا، آخر میں اگر اللہ نے اپنے فضل سے ایک بلند مقام پر پہونچادیا تو اس کو اس قدر بڑھ چڑھ کر دعویٰ کرنے کا استحقاق نہیں، جو واقعی متقی ہوتے ہیں، وہ دعویٰ کرتے ہوئے شرماتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اب بھی پوری طرح کمزوریوں سے پاک ہوجانا بشریت کے حد سے باہر ہے، کچھ نہ کچھ آلودگی سب کو ہوجاتی ہے الا من عصمه الله (فوائد عثمانی)

یہ بات جس طرح ایک فرد کے حق میں صحیح اور قابل غور ہے، اسی طرح اجتماعی اداروں کے اوپر بھی منطبق اور ان کیلئے لائق توجہ ہے۔ واللہ ولی التوفیق

(رجب تا رمضان ۱۴۱۶ء / جنوری تا مارچ ۱۹۹۶ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تصوف ہمارا قیمتی سرمایہ

ادھر چند برسوں میں اہل اسلام کے درمیان سے علم وفضل اور زُہد وتقویٰ کے لحاظ سے ممتاز، اتنی بڑی بڑی شخصیتیں مسلسل اٹھتی چلی گئی ہیں کہ کم از کم ہندوستان کے دینی بلکہ انسانی حلقوں میں ایک ناقابل تدارک خلاء محسوس ہونے لگا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے گناہوں کی تاریکی اور دھوئیں میں یہ نورانی ہستیاں گھٹن اور وحشت محسوس کرنے لگی تھیں، اس پر حق تعالیٰ نے یکے بعد دیگرے ایک بڑی تعداد کو اپنی آغوشِ رحمت میں بلالیا۔

یہ تو حقیقت ہے کہ انسان دنیا میں مسافرانہ وارد ہوا ہے، اس کا سفر برابر طے ہو رہا ہے، ہر روز ایک انسانی قافلہ شب و روز کی راہ قطع کرتا ہوا عدم کی منزل میں گم ہو جاتا ہے، تاہم ہر روز ایک نیا قافلہ اس دنیا میں وارد ہو کر جانے والوں کی جگہ پُر کر لیتا ہے، لیکن انھیں جانے والوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا جانا دنیا کو بہت محسوس ہوتا ہے، وہ رحمت وبرکت کا سرچشمہ ہوتے ہیں۔ ان کے سائے میں ایک عالم کا عالم راحت پاتا ہے، ان کے وجود سے دلوں میں روشنی محسوس ہوتی ہے، ان کی صحبت میں سکون واطمینان کی چادر سی تنی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہ لوگ جب چلے جاتے ہیں تو بے شمار انسان بے سایہ اور بے سہارا لگنے لگتے ہیں، پھر دنیا کے ستائے ہوئے لوگ، مصیبت کے مارے ہوئے لوگ، علم وعمل کے پیاسے لوگ، گزر جانے والوں کا بدل تلاش کرتے ہیں اور نہیں پاتے، تو انھیں دہری مصیبت کا احساس ہونے لگتا ہے۔

ہم کئی سال سے جن شخصیتوں کو کھوتے چلے جا رہے ہیں، وہ اسی شان کی تھیں جس

کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ہر شخصیت ایسی ہی تھی کہ آج ان کا بدل تلاش کرنے سے نہیں ملتا۔ یہاں ان سطروں میں ہم ان بزرگانِ رفتہ کا ماتم نہیں کرنا چاہتے، بلکہ اس پر غور کرنا چاہتے ہیں، اور اپنے اخوان واحباب کو دعوتِ فکر دینا چاہتے ہیں کہ گزر جانے والی نسل میں وہ کیا خاص بات تھی جس کی وجہ سے وہ ساری انسانیت کے لئے پناہ گاہ بن گئے تھے، اور ان کے سائے میں ہر آنے والا سکون اور خنکی محسوس کرتا تھا، اور موجودہ نسل سے وہ کیا چیز گم گئی ہے کہ اس کے پاس سوزش، تکلیف، پیاس اور بے اطمینانی کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔

لوگوں کے رُجحانات بدلے ہوئے ہیں، ہوا کا رُخ کچھ اور ہے، اس سے ہٹ کر گفتگو کرنا اپنے آپ کو موردِ طعن بنانا ہے، لیکن جو بات کہنے کی ہے اسے ’’حلقۂ یاراں‘‘ میں لانا ضروری ہے، شاید دلوں کی آنکھ کھلے، شاید کسی کو نفع ہو۔

جب ہم ان بزرگوں کی زندگی اور ان کی سیرت وشمائل پر غور کرتے ہیں تو یہ حقیقت نمایاں طور پر نظر آتی ہے کہ جن کمالات کی وجہ سے انھیں دنیا نے اپنے دل میں جگہ دی ان کا اصل منبع اور سرچشمہ وہی چیز ہے جسے آج کل اسلام میں شجرِ ممنوعہ قرار دیا جا رہا ہے، وہ کیا ہے؟ وہ تصوف ہے۔ یہ سارے حضراتِ اکابر تصوف کے ذوق آشنا ہی نہیں عملاً اس کوچہ کے رہ نورد اور اس طریق کے سالک تھے، اسی تصوف نے ان کی زندگیوں میں اس درجہ حلاوت، کیف اور چاشنی بھر دی تھی کہ جو بھی ان کی صحبت میں پہونچ گیا وہ ان میں جذب ہو کر رہ گیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا أُمِرُوْا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۔ ان کو جو حکم ہے وہ یہی ہے کہ اللہ کی عبادت اخلاص کے ساتھ کریں۔ اور اسی اخلاص میں آدمی ترقی کرتا ہے تو اسے مرتبۂ احسان حاصل ہوتا ہے، جو عبادت اور دین کا اصل جوہر ہے، اس کو حاصل ہونے کے بعد آدمی کا رُواں رُواں صدا دینے لگتا ہے کہ إِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۔ بے شک میری نماز، میری قربانی بلکہ میری زندگی اور موت محض اللہ کے لئے ہے جو سارے عالم کا پروردگار ہے۔

اسی اخلاص اور احسان کو حاصل کرنے کا طریقہ اور اس تک پہونچنے کا راستہ

تصوف کے نام سے معروف ہے۔ اب خواہ کوئی اس نام سے بھڑکے یا اسے غیر اسلامی چیز قرار دے، مگر یہ حقیقت ہے کہ اس راہ کو اپنائے بغیر اخلاص اور احسان کے نام اور اس کی علمی تشریحات کی معرفت تو ہو سکتی ہے، لیکن آدمی کا دل ودماغ اور اس کا ریشہ ریشہ اس کی حلاوت سے سرشار ہو جائے، اس کا حصول مشائخ کی صحبت اور تصوف کی عملی مشق کے بغیر بہت دشوار ہے۔ یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے آدمی خواہ اس سے صرفِ نظر کرے، مگر اس کے بغیر اسے اپنی زندگی میں خلاء ضرور محسوس ہوتا ہے، بشرطیکہ حس ماؤف نہ ہو چکی ہو۔ آج دنیا میں انسان اپنے کو بہت سی لایعنی مشغولیات میں مبتلا کر کے حقائق سے فرار اختیار کرتا ہے مگر مرض اور بڑھاپا تمام لایعنی مشغلوں کو چھڑا دیتا ہے۔ اس وقت بہت سے لوگوں کو اپنی کمی کا احساس ہونے لگتا ہے، اور اصحاب توفیق اس پر پہلے ہی متنبہ ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں مشہور ومعروف صاحب علم وتدریس حضرت امام غزالی علیہ الرحمہ کا اعتراف اور ان کی آپ بیتی ملاحظہ کر لینی چاہئے۔ یہ صرف انھیں کے دل کی آواز نہیں ہے، بلکہ غور کریں گے تو بکثرت اصحاب علم وفضل کے دل کی گہرائیوں سے یہ صدا نکلتی ہوئی محسوس ہوگی، یہ اور بات ہے کہ امام غزالی نے اس صدا پر لبیک کہی اور بہت سے حضرات اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ امام غزالی کی تحریر کا یہ اقتباس ہم حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ کی مایہ ناز کتاب ''تاریخ دعوت وعزیمت'' حصہ اول سے نقل کرتے ہیں۔ امام صاحب علوم وفنون کی کئی بے برگ وگیاہ وادیوں کا جائزہ لینے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

> ''اب صرف تصوف باقی رہ گیا ہے، میں ہمہ تن تصوف کی طرف متوجہ ہوا، تصوف علمی بھی ہے اور عملی بھی۔ میرے لئے علم کا معاملہ آسان تھا، میں نے ابوطالب مکی کی ''قوت القلوب'' اور حارث محاسبی کی تصنیفات، اور حضرت جنید وشبلی وبایزید بسطامی وغیرہ کے ملفوظات پڑھے اور علم کے راستے سے جو کچھ حاصل کیا جاتا تھا، وہ میں نے حاصل کر لیا، لیکن مجھے معلوم ہوا کہ اصلی حقائق تک تعلیم کے ذریعہ سے نہیں، بلکہ ذوق وحال اور حالات کی تبدیلی سے پہونچا جا سکتا ہے، جو علوم میرا سرمایہ تھے خواہ شرعی

> ہوں یا عقلی، ان سے مجھے وجودِ باری، نبوت اور معاد پر ایمان راسخ حاصل ہو چکا تھا، لیکن یہ بھی کسی دلیل محض سے نہیں بلکہ ان اسباب وقرائن اور تجربوں کی بنا پر جن کی تفصیل مشکل ہے، مجھ پر یہ اچھی طرح واضح ہو چکا تھا کہ سعادتِ اُخروی کی صورت صرف یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کیا جائے اور نفس کو اس کی خواہشات سے روکا جائے، اور اس کی تدبیر یہ ہے کہ دارِ فانی سے بے رغبتی، آخرت کی طرف میلان وکشش اور پوری یکسوئی کے ساتھ توجہ الی اللہ کے ذریعہ قلب کا علاقہ دنیا سے ٹوٹ جائے، لیکن یہ جاہ ومال سے اعراض اور موانع وعلائق سے فرار کے بغیر ممکن نہیں۔ میں نے اپنے حالات پر غور کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ میں سرتاپا دُنیوی علائق میں غرق ہوں۔ میرا سب سے افضل عمل تدریس وتعلیم کا معلوم ہوتا تھا، لیکن ٹٹولنے سے معلوم ہوا کہ میری تمام تر توجہ ان علوم کی طرف ہے جو نہ اہم ہیں اور نہ آخرت کے سلسلے میں کچھ فائدہ پہونچانے والے ہیں۔ میں نے اپنی تدریس کی نیت کو دیکھا تو وہ بھی خالص لوجہ اللہ نہ تھی، بلکہ اس کا باعث ومحرک بھی محض طلب جاہ وحصول شہرت تھا، تب مجھے یقین ہو گیا کہ میں ہلاکت کے غار کے کنارے کھڑا ہوں، اگر میں نے اصلاح حال کے لئے کوشش نہ کی تو میرے لئے سخت خطرہ ہے۔“

اس کے بعد امام غزالیؒ اپنی اندرونی کش مکش، ایمان ونفس کی آویزش، پھر اس کی وجہ سے اپنے مبتلائے امراض ہونے کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے بعد بغداد سے نکلنے، تدریس کو چھوڑنے، لوگوں کے افسوس کنے کا تفصیلی تذکرہ کرتے ہوئے اپنے دس سالہ مجاہدات کا اجمالاً ذکر کرنے کے بعد انھوں نے بطور خلاصہ کے تحریر فرمایا ہے کہ:

> ”ان تنہائیوں میں مجھے جو کچھ انکشافات ہوئے، اور جو کچھ مجھے حاصل ہوا، اس کی تفصیل اور استقصاء تو ممکن نہیں، لیکن ناظرین کے نفع کے لئے اتنا ضرور کہوں گا کہ مجھے یقینی طور پر معلوم ہو گیا کہ صوفیہ ہی اللہ کے راستے کے سالک ہیں، ان کی سیرت بہترین سیرت، ان کا طریق سب سے مستقیم اور ان کے اخلاق سب سے زیادہ

> تربیت یافتہ اور صحیح ہیں۔ اگر عقلاء کی عقل، حکماء کی حکمت اور شریعت کے رمز شناسوں کا علم مل کر بھی ان کی سیرت واخلاق سے بہتر لانا چاہے تو ممکن نہیں۔ ان کے ظاہری وباطنی حرکات وسکنات مشکوٰۃِ نبوت سے ماخوذ ہیں، اور نورِ نبوت سے بڑھ کر روئے زمین پر کوئی نور نہیں جس سے روشنی حاصل کی جائے۔" (المنقذ من الضلال)

یہ عاقل ترین عالم کی شہادت ہے اور بلاشبہہ صحیح اور قابل اعتماد ہے، جو لوگ تصوف کے منکر ہیں ان سے تو کچھ نہیں کہنا ہے، لیکن جو حضرات اس کے قائل ومعترف ہیں انھیں عملاً اس کی طرف متوجہ ہونا چاہئے، وہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے جو صرف دنیا اور دنیاوی متاع واسباب کے لئے بسر ہو، زندگی تو وہی ہے جو صرف اللہ کی رضا جوئی کے لئے ہو اور اس کی رضا جوئی کی عملی مشق کا نام تصوف ہے۔

یہ صحیح ہے کہ بہت سے لوگوں نے غیر مخلصانہ طریق پر تصوف میں قدم رکھا، اور انھوں نے اپنے اعمال وکردار سے اس پاک طریقہ کو بدنام کیا، لیکن کیا کچھ غلط افراد کی ناکردنی کے باعث اس ضروری عمل کو چھوڑ دیا جائے، ہرگز نہیں۔ تصوف انسان کو کہاں سے کہاں تک پہونچاتا ہے، اس کا بیان ایک بڑے صاحب علم وعقل اور زبردست دنیوی وجاہت کے مالک نواب صدر یار جنگ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی علیہ الرحمہ کی زبانی سنئے! وہ اپنے زمانے کے مشہور شیخ طریقت حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی قدس سرہٗ کی خدمت میں پہونچے تو ان کا کیا تاثر تھا، اسے ملاحظہ فرمایئے اور اندازہ کیجئے کہ تصوف آدمی کو کن بلندیوں تک پہونچا دیا کرتا ہے، بشرطیکہ اس کو اخلاص وصدق کے ساتھ اختیار کیا جائے۔ فرماتے ہیں:

> حضرت کی خدمت میں پہونچ کر دو زبردست خیالات میرے دل میں طاری ہوئے، جن کے سبب یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ میں نے حضرت کا مرتبہ پہچان لیا، لیکن یہ جانا کہ ہم میں اور ان میں سوائے ظاہری مشابہت کے اور کوئی مشابہت نہیں، ہمارے خیالات سے ان کے خیالات الگ، ہمارے ارادوں سے ان کے ارادے جدا،

ہمارے مشاغل سے ان کے مشاغل علیٰحدہ، ان کی امیدیں اور، خوشیاں اور، خوف اور مقصود اور۔ آگ لکڑی کو جلاتی ہے ہم بھی دیکھتے ہیں اور ان کے بھی پیش نظر ہے، لیکن ہم کیا سمجھتے ہیں، ان کے ذہن میں کیا آتا ہے۔

اول خیال تو یہ تھا کہ مرادآباد دُنیا میں ہے، اور گاؤں نہیں قصبہ ہے، لیکن حضرت کی مسجد میں ایک دوسرا عالم نظر آتا تھا، دنیاوی معاملات کا کوسوں پتہ نہ تھا، خود حضرت کی گفتار و کردار اور وہاں کے اہل قیام کے احوال سے (عام اس سے کہ وہ چند گھنٹوں کے لئے آئے ہوئے ہیں یا دو چار برس سے رہتے ہیں) یہ معلوم ہوتا تھا کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو تعلقاتِ دنیوی سے کنارہ کر آئے ہیں، حیدرآباد کے امیر و کبیر نواب خورشید جاہ بہادر جو ۵۲/لاکھ کے معافی دار ہیں، میرے پہونچنے سے صرف ایک روز پہلے وہاں آئے تھے، مگر ان کا ذکر نہ تھا اور نہ کوئی وقعت ان کی کسی کے ذہن میں معلوم ہوتی تھی، حالانکہ کانپور اور بلہور ان کے تذکروں کی صداؤں سے گونج رہے تھے، اور ہر ایک سوسائٹی (خواہ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ) ان کے تذکروں کو اپنے جلسوں کا دلچسپ مبحث بنائے ہوئے تھی، پھر یہ کس کا اثر تھا؟ آیا مرادآباد کے پانی کا؟ ہرگز نہیں، وہاں کی خاک کا؟ ہرگز نہیں۔ وہاں کے در و دیوار کا؟ ہرگز نہیں۔ حضرت کے ہاتھ پاؤں کا؟ ہرگز نہیں۔ حضرت کے بالوں کا؟ ہرگز نہیں۔ البتہ اس کیفیت کا اثر تھا جو حضرت کے قلب میں تھی۔ وہ کیفیت کیا تھی؟ اس سے کون واقف ہے اور کوئی کیا جانے؟ مریض کا بدن بخار سے جلتا ہے، مگر وہ سوائے اثر کے مؤثر کو نہیں جانتا۔ سبب کو تشخیص کرنا طبیب کا کام ہے، ہم بدن پر ہاتھ رکھ کر گرمی محسوس کر سکتے ہیں، مریض کو اپنا جسم گرم اور منہ کا مزہ تلخ معلوم ہوتا ہے لیکن یہ جاننا کہ یہ غلبۂ صفراء کا نتیجہ ہے، طبیب کا کام ہے۔

دوسرا خیال یہ تھا کہ خود میرا ذہن مجھ کو ذلیل سمجھتا تھا، اور ہر چند حیرت سے غور کرتا تھا لیکن کوئی وقعت اپنی میرے ذہن میں نہیں آتی تھی، دنیاوی جلسوں میں لفٹنٹ کے دربار دیکھے، رؤوسا کے مجمع دیکھے، اہل علم کی مجلسیں دیکھیں، مگر کہیں اپنے نفس کو اتنا بے حقیقت نہیں پایا، اپنے اعمالِ ذمیمہ پر خود نفس ملامت کرتا تھا اور اپنی بے مائیگی پر خود

☆☆☆☆☆☆☆

> نفریں کن تھا، ہر شخص سے خواہ وہ کوئی ہو، اپنے تئیں کم وقعت تصور کرتا تھا، غرض کہ ایک عجیب حال تھا کہ پورا بیان میں آنا مشکل ہے۔ وہاں سے آنے پر یہ خیالات ایسے رہے جیسے کہ کسی دلچسپ خواب کا صبح کو خیال اور لطف ہوتا ہے، رفتہ رفتہ یہ کیفیت زائل ہوگئی اور چند لمحے کے بعد پھر نفس امارہ أنا و لا غیری اور ''ہمچو ما دیگرے نیست'' کے پھندے میں جا پھنسا، یہ خیال میرے نزدیک محض نئے اور نرالے تھے جو مدت العمر میں کسی اور جگہ کبھی نہیں پیدا ہوئے، اس سے قیاس چاہتا ہے کہ وہ جگہ بھی کچھ اور جگہوں سے نرالی تھی،،، اللہ بس باقی ہوس۔'' (تذکرۂ فضل رحمٰن گنج مراد آبادی)

غور کیجئے! یہ نرالی جگہ، یہ نرالی کیفیت اور خیال! کس چیز کا اثر ہے، حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی کے قلب پر وہ کیفیت کہاں سے طاری ہوئی، اس کا سرچشمہ بجز تصوف کے اور کیا ہے؟ ان کو تصوف ہی نے مرصع کیا تھا، اور اس چیز کو ان کی زندگی سے نکال دیجئے تو دیکھئے کیا بچتا ہے۔

تصوف ہمارا بہت قیمتی سرمایہ ہے، ایک لازوال دولت ہے، اس راہ سے بندہ اپنے رب سے واصل ہوتا ہے، تصوف شریعت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے، وہ شریعت کے آدمی میں رچ بس جانے کا ایک بے بدل ذریعہ ہے۔ اس کے بنیادی ارکان پانچ ہیں، (۱) صحبت شیخ، (۲) علم شریعت، (۳) ذکر کی کثرت، (۴) فکر کا التزام، (۵) اور امراضِ نفسانی کا علاج۔ ان میں کون سی چیز قابل اعتراض ہے، اور کون سی بات شریعت کے باہر ہے؟

اس سرمایہ کی حفاظت حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی **قدس اللہ اسرارھما** کے اخلاف کی ذمہ داری ہے۔

(رجب تا رمضان ۱۴۱۸ھ/نومبر، دسمبر ۱۹۹۷ء، جنوری ۱۹۹۸ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تنقید کا دوہرا معیار

کسی شہر میں کوئی رئیس تھے، ان کا تکیۂ کلام تھا ’’جو ہے سو ہے‘‘ ہر گفتگو میں یہی مہمل جملہ ان کی زبان سے ادا ہوتا رہتا تھا، ایک مرتبہ انھوں نے کسی سے فرمائش کی، کہ تم بازار جاؤ ’’جو ہے سو ہے‘‘ وہاں سے ’’جو ہے سو ہے‘‘ فلاں سامان ’’جو ہے سو ہے‘‘ لیتے آؤ، ’’جو ہے سو ہے‘‘۔ وہ شخص چلا گیا، کچھ دیر کے بعد وہ خالی ہاتھ واپس آیا، رئیس نے خالی ہاتھ دیکھا تو ان کی پیشانی شکن آلود ہوگئی، انھوں نے وجہ پوچھی تو یہ کہتا ہے، میں بازار ا گیا ’’جو ہے سو ہے‘‘، مگر آج ’’جو ہے سو ہے‘‘ بازار ’’جو ہے سو ہے‘‘ بند ہے، ’’جو ہے سو ہے‘‘۔ یہ سن کر وہ رئیس آگ بگولہ ہوگئے، اسے مارنے کو دوڑے، کہتے جا رہے تھے کہ میں کہوں ’’جو ہے سو ہے‘‘ تم مت کہو ’’جو ہے سو ہے‘‘۔

یہی حال ہمارے درمیان پائی جانی والی بعض جماعتوں کا ہے، کہ جس کام کو وہ خود نہایت بلند آہنگی اور جرأت کے ساتھ کر رہی ہیں، اگر جواب کے طور پر انھیں کے حق میں وہی کام کوئی دوسرا کر دے، تو ان کا مزاج بگڑ جاتا ہے، حالانکہ ہونا یہ چاہئے کہ جس طرزِ عمل کو انھوں نے اپنے لئے اختیار کیا ہے، دوسروں کو بھی اس کے استعمال کی اجازت دیں۔ مثلاً ایک جماعت ہے جو ’’عمل بالحدیث‘‘ کا دعویٰ کرتی ہے، دعویٰ تو بہت اچھا ہے، اور ہر مسلمان اس کو اپنی سعادت سمجھتا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی حدیثوں پر عمل کرے۔ کوئی شخص جو رسول اللہ ﷺ پر ایمان رکھتا ہو، اس کے بارے میں یہ سوچا نہیں جا سکتا کہ اس کے پاس رسول اللہ ﷺ کا ارشاد آئے اور وہ اسے رد کر دے، لیکن اس جماعت کے تیور ایسے ہیں، جیسے دوسرے لوگ عمل بالحدیث سے تہی مایہ ہیں۔ چنانچہ ان کا یہ تیور ان کی تحریروں اور تقریروں سے ظاہر

ہوتا ہے، وہ صراحۃً اپنے علاوہ دوسروں کو عمل بالحدیث سے منحرف قرار دیتے ہیں، عمل بالحدیث کے دعویٰ کا سہارا لے کر وہ جس پر چاہتے ہیں تنقید کا تیشہ چلا دیتے ہیں، حتیٰ کہ اگر وہ اپنے زعم میں محسوس کرتے ہیں کہ بعض صحابہ نے ان کی معمول بہ حدیث پر عمل نہیں ہے، تو ان کے حق میں بھی بے تکلف زبان اور قلم کو حرکت دینے لگتے ہیں۔ جرح وتنقید اور تجہیل وتضلیل کا عمل ان کے ہاں خوب رائج ہے، دوسروں کے حق میں یہ سب رَوا ہی نہیں، معمول ودستور ہے، لیکن یہی حق وہ دوسروں کو دینے کے لئے تیار نہیں ہیں، اور اگر کسی نے ان کے حق میں ذرا بھی زبانِ تنقید کھولی تو اس جماعت کے چھوٹے بڑے سب بوکھلا جاتے ہیں، پھر جواب بنے یا نہ بنے، بات معقول ہو یا نامعقول، جوابی کاروائی ضروری ہو جاتی ہے، گویا وہ زبانِ حال سے اعلان کرتے ہیں کہ ہم جس کی گردن پر چاہیں چھری رکھ دیں، لیکن ہمیں چاقو کی نوک بھی برداشت نہیں، اس سلسلے میں یہ جماعت بڑی حساس ہے، یہ جماعت کسی کی تقلید نہیں کرتی، لیکن بعض علماء کو ذہنی طور پر اپنا پیشوا تسلیم کرتی ہے۔ یہ اگر امام ابوحنیفہؒ کو کچھ کہے تو کسی کو مجالِ جواب نہیں، لیکن اگر کسی نے علامہ ابن تیمیہ یا شیخ ناصر الدین البانی کو کچھ کہہ دیا تو پوری مشنری حرکت میں آجاتی ہے، حالانکہ یہ لوگ ان کے مقلد نہیں ہیں، مگر نہ جانے ان کے بارے میں اتنے حساس کیوں ہیں؟ اگر امام ابوحنیفہ کی تغلیط یہ لوگ کر سکتے ہیں، تو دوسروں کو بھی حق دیں کہ وہ ان کے اور ان کے ذہنی مقتداؤں کی تغلیط کر سکیں۔ الماٰثر کے پچھلے دو ایک شماروں میں ان کے تنقیدی حملوں کا قدرے جواب چکایا گیا تو انھیں سخت ناگوار گزرا ہے، بہت برہم ہوئے ہیں، اب اُدھر سے حملوں کی شدت بڑھ رہی ہے، لیکن ہم مطمئن ہیں ہمیں اور بھی کام ہیں، ان کے پاس وہی پُرانے حربے ہیں جن کی جھنکار سننے کے ہم عادی ہیں۔ البتہ یہ بات زیب نہیں دیتی کہ جو طرزِ عمل وہ دوسروں کے حق میں رَوا رکھتے ہیں، اس کی اجازت وہ دوسروں کو نہیں دیتے، یہ بات کیا حدیث کے خلاف نہیں ہے؟

جی تو یہی چاہتا ہے کہ ان لوگوں کے حملوں کا کوئی جواب نہ دیا جائے، کیونکہ یہ حملے ان کا تکیۂ کلام ہیں، کہاں تک ان کا تعاقب کیا جائے گا، اسی لئے باوجودیکہ ہمارے حلقوں

میں بھی زبان وقلم کی کمی نہیں ہے، لیکن عموماً لوگ خاموش رہتے ہیں، اور جواب میں الجھنے کو کارِ لایعنی خیال کرتے ہیں، اور واقعی بات یہی ہے۔ تاہم چند باتیں پیش نظر ہوتی ہیں، اس لئے کسی قدر جوابی کارروائی پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔

اوّل: یہ کہ ان کی بے محابا تنقیدات سے فقہی احکام میں غلو اور تشدد پیدا ہوتا ہے، مثلاً ناواقفوں کو یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ بہت سے فقہی احکام میں احناف بالکل خلافِ سنت ہیں، حالانکہ وہ مسائل کتاب وسنت کی قوی بنیادوں پر قائم ہیں، اب انھیں قطعی خلافِ سنت قرار دے کر دوسرے کسی طرزِ عمل میں سنت وشریعت کو منحصر کر دینا، یہی تشدد اور غلو ہے، جس کی شریعت میں اجازت نہیں ہے، اس کی اصلاح ضروری ہے۔

دوسرے: یہ کہ اگر حملہ آور کو روکا نہ جائے تو بے جا طور پر اس کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے اور اس کی وجہ سے بہت سے لوگ تشکیک میں مبتلا ہونے لگتے ہیں، چنانچہ ان کے شور وغل کی وجہ سے بسا اوقات دیکھا گیا ہے، جو احناف ان سے ناواقف ہوتے ہیں وہ اپنے مسلک کی طرف سے شک وشبہ کے شکار ہونے لگتے ہیں، تو اس لئے کہ وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ ہمارا جواب دوسروں کے پاس ہے ہی نہیں، اور اس لئے کہ اپنے لوگ شک وشبہ میں نہ مبتلا ہوں، جواب دینے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

تیسرے: یہ کہ ان کی تنقیدوں کے ضربات سے بہت سے ائمہ متقدمین، مشائخ اور بزرگان دین کی آبرو مجروح ہوتی ہے، اور اس کے نتیجے میں پچھلوں کا رشتہ اگلوں سے ٹوٹنے لگتا ہے، جو ان کے لئے خسارہ کا باعث ہے، یہ ضرورت بھی مجبور کرتی ہے کہ انھیں سمجھایا جائے، اور ان کی خدمت میں عرض کیا جائے، ؎

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت　　دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

اور اگر اس کا لحاظ نہیں کیا گیا تو یہ بات ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہئے کہ تُرکی بہ تُرکی جواب دینے والے موجود ہیں۔ سعدی علیہ الرحمہ کی یہ نصیحت بہت برمحل ہے ؎

ہر بیشہ گماں مبر کی خالی ست　　شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

ہر جھاڑی کو یہ نہ سمجھو کہ خالی ہے، ممکن ہے وہاں کوئی چیتا سویا ہوا ہو۔

اور یہ جو عرض کیا گیا کہ ان تنقید کی ضربوں سے مشائخ اور بزرگان دین کی آبرو مجروح ہوتی ہے، تو یہ واقعہ ہے، کچھ عرصہ پہلے تک تو فقہاء کرام ان کی نوازشوں اور عنایات کے مورد تھے، مگر اب دائرہ وسیع ہوگیا ہے، جو لوگ ہندوستان میں ملت اسلامیہ کی آبرو تھے، جنھوں نے اپنی پوری زندگی دین کی خدمت کے لئے وقف کردی تھی، اور جو اس ملک میں دین کے تحفظ و بقاء کے جلی عنوان تھے۔

اب ان کی عزت وآبرو بھی تار تار ہو رہی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ہندوستان میں ایک زمانہ میں حکومت کی سطح پر دین اسلام کے خاتمہ کا اعلان ایک ایسے بادشاہ کی طرف سے کرایا جارہا تھا، جس کے آباء واجداد مسلمان تھے، لیکن اسے باور کرادیا گیا تھا کہ دین محمدی پر ہزار سال بیت چکے ہیں، اس لئے اس کی عمر پوری ہو چکی ہے، اب بادشاہ سلامت ایک دوسرے دین کی داغ بیل ڈالیں، چنانچہ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ نے ’’دین الٰہی‘‘ کے نام سے ایک نئے دین کا ’’معجون مرکب‘‘ تیار کیا۔ اس وقت ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہندوستان سے دین اسلام کا خاتمہ ہوجائے گا، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی حفاظت کے لئے اپنے ایک بندے حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کو کھڑا کیا، انھوں نے کمالِ عزیمت کے ساتھ اکبری فتنہ کا خاتمہ کیا، اللہ تعالیٰ نے انھیں جو قوتِ ایمانی، عزیمتِ روحانی اور رسوخِ علم نیز عالی ہمتی عطا فرمائی تھی، اور اس کے ساتھ حق تعالیٰ کی جو خاص توفیق شامل تھی، اس کی برکت سے انھوں نے وقت کے سب سے بڑے بادشاہ کے جگائے ہوئے فتنہ کو موت کی نیند سلادیا، ان کی دینی خدمات کو قبول عام حاصل ہو چکا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ پر جس کی ذرا بھی نگاہ ہوگی، وہ مجدد صاحب کی عظمت کے اعتراف پر مجبور ہوگا، یہ انھیں کی مساعیٔ مشکورہ اور دعاہائے سحرگاہی کی برکت ہے کہ جس تخت سے دین اسلام کے خاتمہ کا اعلان کیا جارہا تھا، ایک ہی پشت کے بعد اس پر شاہجہاں جیسا بادشاہ آتا ہے، جس نے ملک کو اسلامی آثار سے جگمگادیا، اور اس کے معاًبعد اورنگ زیب عالمگیر جیسا دیندار اور خدا ترس بادشاہ اسی

تخت پر آتا ہے جس کے علم اور بزرگی کا شہرہ عام ہے۔

مگر یہ کتنے دکھ کی بات ہے کہ مذکورہ بالا حلقے میں اس جیسے عظیم بزرگ کی کھال بھی محفوظ نہیں رہی، کیا ان کے حصے میں یہی بات رہ گئی ہے کہ جن بزرگوں نے سب کچھ قربان کر کے رسول اللہ ﷺ کی شریعت کی حفاظت کی ہے، ان کے گوشت اور کھال کو زاغ وزغن کے قبضے میں دے دیا جائے، اور کسی کے کان پر جوں بھی نہ رینگے۔ ان کا قصور کیا تھا کہ ان کی خدمات پر پانی پھیرنے کی سعی کی جارہی ہے؟ قصور یہ ہے کہ یہ بزرگ اور ان کے سلسلے کے دوسرے بزرگ تصوف کے علمبردار تھے، ان کی زندگی کا سب سے جلی عنوان تصوف تھا، اور تصوف اس حلقہ میں قطعاً گردن زدنی ہے۔ تصوف کے ہوتے ہوئے کوئی نیکی قابل قبول نہیں اور تصوف نہ ہو تو شاید ہر گناہ قابل عفو ہے۔

تصوف! جس کے بغیر کل تک کسی دینی شخصیت یا دینی خدمت کی تکمیل نہیں ہوتی تھی۔ تصوف! جس کی خانقاہ میں مجاہدین اسلام کی پرورش ہوئی ہے۔ تصوف! جس کو ہندوستان کے خدامِ دین کی زندگی سے نکال لیجئے تو کچھ نہیں بچتا۔ تصوف! جس نے اللہ کے بے شمار بندوں کو دین وایمان کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کا حوصلہ بخشا تھا۔ چودہویں صدی ہجری کے وسط تک کسی بزرگ، کسی عالم دین کا نام لیجئے، تصوف اس کی زندگی میں جگمگا رہا ہوگا، حتیٰ کہ جماعت مذکور کے ابتدائی پیشوا میاں نذیر حسین صاحب اور نواب صدیق حسن صاحب بھوپالی وغیرہ بھی اس میکدہ کے مے گساروں میں تھے۔ ہندوستان کا مشہور خانوادہ جس کو یہ لوگ قبولیت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، بلکہ اس خانوادہ کو اپنا پیشوا تسلیم کرتے ہیں، یعنی شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کی اولاد واحفاد، حضرت شاہ عبد العزیز صاحب اور حضرت شاہ محمد اسماعیل شہید، ان سب حضرات کی تربیت تصوف ہی کے زیر اثر ہوئی تھی، اب وہی تصوف ایک ناقابل معافی جرم بن چکا ہے، نہ جانے اس کے باوجود شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی اور شاہ محمد اسماعیل شہید کو یہ لوگ ابھی تک کیوں اپنا پیشوا تسلیم کئے جارہے ہیں، حالانکہ ان کے پورے وجود پر تصوف چھایا ہوا ہے۔

غلط کار لوگ ہر جگہ داخل ہو جاتے ہیں اور غلطیاں ہر جگہ رہ جاتی ہیں، ان غلطیوں پر روک ٹوک کرنا عین تقاضائے ایمان ہے، اور غلط کاروں کو متنبہ کر دینا، ان کی نشاندہی کرنا بالکل ضروری ہے، لیکن سرے سے تصوف وسلوک کا انکار کر دینا، یہ کیا ہے؟ یہ تو مسلمانوں کو ان تابناک ماضی سے کاٹ کر رکھ دینا ہے، معتمد علماء ومشائخ سے بدگمان کر دینا ہے، آزادروی کی نئی راہ کھول دینی ہے جس پر چل کر آدمی اباحیت اور الحاد ودہریت کے گڈھے میں گر جائے، چنانچہ اس کا تجربہ ہے۔

کاش یہ لوگ بزرگوں کی کھال نہ نوچتے، بلکہ اپنی کھال پر نظر رکھتے کہ کہاں کہاں داغ دھبہ لگا ہوا ہے، اسے صاف کرتے، اپنا احتساب کرتے تو بہتر ہوتا۔

ہندوستان ہی میں نہیں، دنیا کے ہر ملک اور ہر خطے میں صوفیہ اور مشائخ کی روشن خدمات ہیں، انھوں نے جان پر کھیل کر دین کی خدمت کا فریضہ انجام دیا ہے، ان کے ذریعے سے جس قدر اسلام کی اشاعت ہوئی ہے، کوئی دوسرا ان کی ہمسری نہیں کرسکتا۔ بھی چند سال پہلے جب روس کی حکومت پارہ پارہ ہوئی تھی، تو اچانک کئی اسلامی ریاستیں نکل کھڑی ہوئیں، دنیا کو حیرت ہوئی کہ ستّر سال کمیونزم کے آہنی پنجے میں دبے رہنے کے باوجود مسلمان اب بھی اتنی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ اس وقت دار المصنفین اعظم گڈھ میں ڈربن یونیورسٹی (افریقہ) کے پروفیسر حبیب الحق صاحب تشریف لائے تھے، انھوں نے خود ان ممالک اور ریاستوں میں جا کر ان کا مشاہدہ کیا تھا، انھوں نے جدید وقدیم تعلیم یافتہ حضرات کے مجمع میں..... اور ان میں وہ بھی تھے جو کسی طرح تصوف کو معاف کرنے کے لئے تیار نہیں..... بڑی قوت سے کہا کہ ان ممالک میں اسلام کی حفاظت کی خدمت ان لوگوں نے انجام دی، جنھیں آج کچھ لوگ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے، انھوں نے کہا وہاں خطرناک سے خطرناک حالات میں جن لوگوں نے اسلام کو سینوں سے لگائے رکھا، وہ تاریک جنگلوں اور دشوار گزار بیابانوں اور گھاٹیوں میں چھپ چھپ کر ماؤں کی گود سے شب کے سنّاٹے میں ننھے منے بچوں کو لے جاتے اور دنیا کی نگاہوں سے بچ کر انھیں قرآن کی تعلیم دیتے، یہ صوفیہ

تھے! صرف صوفیہ تھے!!

اب لوگوں کے منہ میں زبان ہے، ہاتھ میں قلم ہے، دولت کی فراوانی ہے، پریس کی بہتات ہے، طباعت کی سہولت ہے، کوئی کسی کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں، زبان روکنے والا نہیں، جس کا جو جی چاہے بولے، لکھے، شائع کرائے، لیکن کیا اس کا کوئی حساب کتاب نہیں، ڈرنا چاہئے کہ کل کہیں ایسا نہ ہو کہ ان خادمانِ دین کا ہاتھ ہو اور خردہ گیروں کا دامن ہو، اور دربارِ خداوندی میں پیشی ہو۔ اس وقت بڑی دشواری ہوگی، اللہ تعالیٰ اسلاف کے حق میں بد گوئی اور الزام تراشی سے ہر مسلمان کی حفاظت فرمائے۔ **وباللہ التوفیق**

(محرم، صفر، ربیع الاوّل ۱۴۱۷ء/ جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۹۶ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بے لگام سلفیت

ایک زمانے میں ہندوستان کے اندر اسلام اور مسلمانوں کے حق میں سب سے بڑا اور کھلا ہوا فتنہ ''رافضیت'' کا تھا۔ علماء اہل سنت بالخصوص حضرت مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، شاہ عبد العزیز محدث دہلوی، حضرت سیّد احمد شہید، مولانا محمد اسماعیل شہید اور مولانا عبد الشکور صاحب لکھنوی نے اس فرقہ پر ضرب لگائی تو مسلمان اس سے چوکنے ہو گئے اور بہت کچھ اپنے آپ کو اس سے بچالیا، ورنہ اس فرقہ نے حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہی پر کفر و نفاق کی تہمت رکھ کر مسلمانوں کو دین اسلام سے منحرف کرنے کی اپنی والی کوشش کر ڈالی تھی، اور اس کے ساتھ بہت سے کفریہ اور شرکیہ کلمات اور عقائد مسلمانوں کے معاشرہ میں رائج کر دیئے تھے۔

اس فرقہ کا زور گھٹ رہا تھا کہ بریلویت اور رضاخانیت کا طوفان اٹھا، اس فرقہ نے کفر کے فتوؤں کی تلوار ہاتھ میں لے لی، اور اپنے خیال و نظریہ سے جس کو بھی علیٰحدہ پایا، اس پر یہ تلوار چلادی۔ مسلمانوں کی کوئی جماعت اور کوئی شخصیت بجز رضاخانیت اور رضاخانیوں کے ایسی نہیں بچی جو ان کے کفریہ فتووں سے گھائل نہ ہوئی ہو، اب بھی یہ فرقہ اپنے اس ''عمل خاص'' میں مصروف ہے، مگر اب تلوار کی کاٹ وہ نہیں رہی، جو پہلے تھی۔

ہندوستان کے مسلمانوں کو اس فتنہ سے ذرا مہلت مل رہی تھی کہ تکفیر و تضلیل کا ایک دوسرا طوفان اٹھنے لگا، اس طوفان کو اٹھانے والے ہیں تو ہندوستانی اور پاکستانی غیر مقلدین! مگر سہارا لینے کی کوشش کی ہے وادئ نجد سے! اس کی اُٹھان بھی ٹھیک اسی شان سے ہوئی ہے جس شان سے رضاخانیت کا فتنہ اٹھا تھا، یعنی جیسے احمد رضا خان بریلوی نے ہندوستان کے

علماءِ حق کی اردو عبارتوں میں قطع و برید کی اور جو جی چاہا ترجمہ کیا، اور اسی ترجمہ کو پیش کر کے علماءِ حرمین سے کفر کا فتویٰ حاصل کیا، ٹھیک اسی کی تقلید اس فتنہ کے بانیوں نے کی۔ انھوں نے بھی علماءِ حق (علماءِ دیوبند) کے احوال واقوال اور عبارتوں کو جیسے تیسے پیش کیا، اور سعودی علماء سے فتوے لکھوائے، احمد رضا خان بریلوی نے جو مجموعہ مرتب کیا تھا اس کا نام ''حسام الحرمین'' ہے، اور ان بانیانِ فتنہ نے جو مجموعہ اکٹھا کیا، وہ ''**الديوبندية - تعريفها وعقائدها**'' یہ فتاویٰ کیا ہیں؟ تکفیر کی بے حجابانہ چلتی ہوئی تلواریں ہیں، ان کی زد میں موجودہ فرقۂ غیر مقلدین کے علاوہ بیشتر اگلے پچھلے مسلمانوں کی گردنیں ہیں، یہ اندھی اور بے شعور تلواریں ہیں جن کا عقل وفہم اور ''تاویل الاحادیث'' سے کوئی تعلق نہیں ہے، ان تلواروں سے اور تو اور خود غیر مقلدین کے صفِ اول کے ائمہ کی گردنیں کٹی پڑی دکھائی دیتی ہیں، لیکن یہ فرقہ اب بھی ان کی مدح سرائی کرنے سے نہیں شرماتا، مثلاً شیخ الکل فی الکل مولانا سیّد نذیر حسین دہلوی، نواب صدیق حسن خاں بھوپالی، نواب وحید الزماں حیدرآبادی وغیرہ، کیوں کہ جن بنیادوں پر علماءِ دیوبند کی تکفیر کی گئی ہے، وہ بنیادیں ان حضرات کے یہاں بھی پائی جاتی ہیں، دیکھئے: **وقفة مع اللامذهبية**'' مصنفہ مولانا ابوبکر غازی پوری۔

(اس کے ضروری حصوں کی تلخیص ''الماٰثر'' ج:۴، ش:۴ میں شائع ہو چکی ہے، اسے بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے)

اس کتاب میں فرقۂ غیر مقلدین کے علاوہ تمام مسلمانوں بالخصوص علماءِ دیوبند اور ان سے تعلق رکھنے والوں کو ملتِ اسلام سے خارج قرار دیا گیا ہے، اس لئے نہیں کہ وہ کفریہ عقائد میں مبتلا ہیں، بلکہ اس لئے کہ وہ اہل اللہ اور مشائخ کے حق میں کرامات اور خوارق کے قائل ہیں، اور اس سلسلے میں جو واقعات ان کی طرف منسوب ہیں، انھیں سچ مانتے ہیں، مثلاً یہ کہ ان کے وقت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکت ہوتی ہے، تھوڑے وقت میں ان سے زیادہ کام ہو جاتا ہے، قلیل مدت میں طویل مسافت طے کر لیتے ہیں، بغیر اسبابِ ظاہری کے ان سے بعض امور صادر ہو جایا کرتے ہیں، اور بہت علوم جو عام انسانوں پر نہیں کھلتے منجانب اللہ ان پر کھل جاتے ہیں، اور یہ سب ان کے اختیار سے نہیں ہوتا محض اللہ کے کرم و بخشش

سے ہوتا ہے! لیکن اسی قصور پر وہ ملت اسلام سے خارج ہیں، اور اس لئے ان پر کفر کا فتویٰ ہے کہ وہ انبیاء کرام علیہم السلام کو قبروں میں زندہ سمجھتے ہیں، اور روضۂ اطہر نبوی ﷺ کی زیارت کے لئے سفر کرنے کو جائز بلکہ باعث اجر وثواب سمجھتے ہیں، اور ان کا جرم یہ بھی ہے وہ دلائل الخیرات (درود شریف کی ایک کتاب) اور قصیدہ بردہ (عربی میں ایک مشہور نعت نبوی) پڑھنے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ ان کا ایک گناہ یہ بھی ہے کہ ان کی دعاؤں اور توجہات سے مریضوں کو شفا مل جاتی ہے، نیز ان کا سب سے بڑا گناہ بلکہ کفر یہ ہے کہ وہ تصوف کے قائل، بلکہ اس پر عمل پیرا ہیں، یہ بالکل ناقابل معافی گناہ ہے، اور تصوف خواہ کہیں نظر آئے، اس پر تکفیر کی تلوار چمک کر رہتی ہے، غرض یہی بنیادیں ہیں جن کو بھیانک بنا بنا کر پیش کیا گیا ہے، اور مسلمانوں کی تکفیر کی گئی ہے۔

صوفیہ اور مشائخ کے اعلیٰ حلقوں میں ایک علمی مسئلہ ''وحدت الوجود'' کا زیر بحث رہتا ہے، یہ ایک دقیق اور عمیق علمی مسئلہ ہے، اور جتنا دقیق ہے اتنا ہی مختلف فیہ بھی ہے اور نازک بھی، جو لوگ اس کی حقیقت نہیں سمجھتے، وہ اس کے موافق ہوں یا مخالف، بہر حال اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ جو لوگ اس کے قائل ہوئے اور انھوں نے اس کی حقیقت کو نہیں سمجھا، ان سے بہت سی گمراہیاں پھیلیں، لیکن بے سوچے سمجھے جن لوگوں نے اس کی مخالفت کی وہ بھی کچھ کم بے راہ نہیں ہوئے، اور آج پوچھئے کہ کتنے لوگوں نے اس کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، اور کتنے اس سے واقف ہیں، اور کتنے لوگ اس کے عوارض ولوازم کو جانتے ہیں، عام طور پر اہل علم بھی اور دوسرے تمام مسلمان بھی ''وحدت الوجود'' کے مسئلہ سے یکسو ہو کر اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، یہ مسئلہ نہ مدارِ ایمان واسلام اور نہ اس کا علم عام ہے، مگر ''الدیوبندیۃ'' کے غیر مقلد مصنف نے ضروری سمجھا کہ اخص الخواص کے دائرہ کے اس غامض علمی مسئلہ کو عامۃ الناس اور اہل علم کے سر تھوپ کر ان کی تکفیر کرلے، وحدت الوجود کے بارے میں بقول مصنف ''الدیوبندیۃ'' کبار علماء سنت کا فتویٰ یہ ہے کہ ھٰولاء اکفر من النصاریٰ (الدیوبندیۃ، ص:۴۷) یہ لوگ عیسائیوں سے

بدتر کافر ہیں، اور چونکہ ان کے نزدیک یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ تمام علماء دیوبند اور ان سے تعلق رکھنے والے، بلکہ ان سے پہلے کے بیشتر صوفیہ ومشائخ وحدت الوجود کے قائل ہیں، اس لئے بیک حملہ یہ سب نصاریٰ سے بڑھ کر کافر ہیں۔

اگر کوئی شخص اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ پر نظر رکھتا ہو، تو ہمیں شمار کر کے بتائے کہ دنیا میں کتنے مسلمان اس تکفیری فتویٰ سے بچتے ہیں، واللہ! ان کی تکفیر کا دھواں تو رضاخانیت سے غلیظ اور وسیع ہوگیا ہے، اور لطف یہ ہے کہ عقل وفہم کے یہ مساکین سرے سے وحدت الوجود کے مسئلے کو سمجھتے ہی نہیں، اور نہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ تو وہ لوگ ہیں جنھیں ظواہر الفاظ کے علاوہ کچھ نہیں سوجھتا، قرآن میں **الرحمن علی العرش استویٰ**، کا لفظ آ گیا، تو فرماتے ہیں کہ **هل يكون الاستواء إلا الجلوس** (الدیوبندیۃ، ص:۲۴۶) لیجئے، استواء جلوس وقعود میں منحصر ہوگیا، یعنی اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھے، گویا وہ آدمیوں کی طرح بیٹھتے ہیں۔ تاویل خواہ کتنی ہی ضروری ہو، لیکن ان کے نزدیک جائز نہیں، خواہ تاویل نہ کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے لئے جسم ماننا پڑے، اسے محدود تسلیم کرنا پڑے، جیسا کہ استواء کو جلوس کے معنی میں لینے سے یہ خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، لیکن یہ گوارا ہے مگر تاویل گوارا نہیں، چنانچہ ان کے عقائد میں اس طرح کے خرافات بہت ہیں، خیر یہ ایک الگ موضوع ہے، کہنا یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان تو رضاخانیت ہی کے تکفیری حملوں سے نالاں تھے، اب یہ اس سے بڑا فتنہ پیدا ہوا ہے۔

مصنف الدیوبندیہ نے ہر مسئلہ کے تحت ''**رای كبار علماء السنة فی هٰذه المسألة** '' کے تحت کچھ علماء کی رائیں نقل کی ہیں اور انھیں کو کبار علماء السنۃ قرار دے کر ان کے فتووں کو وحی الٰہی کے طور پر علماء دیوبند کے خلاف پیش کیا گیا ہے، یہ کس قد وقامت کے لوگ ہیں؟ اور ان کا مبلغ علم وفہم کیا ہے؟ اسے ایک مثال سے سمجھ لیجئے:

الدیوبندیہ میں کسی مسعود الدین عثمانی کی کتاب ''توحید خالص'' کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ بعض دیوبندی کہتے ہیں کہ مدرسۂ دیوبند کی بنیاد نبی کریم ﷺ نے رکھی ہے،

اور آپ کبھی کبھی اپنے خلفاء اور اصحاب کے ساتھ مدرسہ کا حساب دیکھنے تشریف لاتے تھے۔ (الدیوبندیۃ، ص: ٩٦)

مسعود الدین عثمانی خواہ کوئی ہوں، لیکن جو صورت واقعہ انھوں نے بیان کی ہے وہ سفید جھوٹ ہے، بنیاد رکھنے کی بات تو یہ ہے کہ نودرہ کی عمارت کی بنیاد جب رکھی جانی تھی تو ایک بزرگ مولانا رفیع الدین صاحب علیہ الرحمہ نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ آپ تشریف لائے اور چھڑی سے نشان بنایا کہ یہاں سے بنیاد کھودیئے۔ (تاریخ دار العلوم دیوبند، ج: ١، ص: ١٨٥) اور دوسرا واقعہ خود صاحب الدیوبندیہ نے لکھا ہے کہ حالت ذکر میں ایک بزرگ کو ایک خاص استغراقی حالت طاری ہوئی، اور اس حالت میں مکشوف ہوا کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، اور حضرت نانوتویؒ نے دار العلوم کے حسابات پیش کئے، یہ دونوں واقعے خواب اور کشف کے ہیں، اور یہ دونوں چیزیں از قبیل مبشرات ہیں، جن کے حق ہونے میں کسی طرح اہل حق کو کلام نہیں ہو سکتا، مگر ملاحظہ فرمایئے، اس پر ایک صاحب کس طرح برافروختہ ہوئے ہیں:

> ''اس خرافاتی حکایت میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے خلفاء اور اصحاب پر زبردست افتراء ہے، اور حدیث متواتر ہے کہ: من كذب عليّ متعمداً فليتبوأ مقعده من النار (جو بالقصد مجھ پر جھوٹ بولے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے) تو جو لوگ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے خلفاء واصحاب پر افتراء کرتے ہیں وہ اس سے بچ نہیں سکتے، کہ اس وعید شدید کا بڑا حصہ ان پر صادق آکر رہے، اور ان لوگوں پر بھی، جو اس خرافی واقعہ کو سچ جانیں، وہ بھی اس زبردست جھوٹ کی سزا سے بچ نہیں سکتے۔'' (حمود تویجری، ص: ٩٨)

نہ حقیقت واقعہ کی تحقیق اور نہ خواب ومکاشفہ کی شرعی حیثیت پر نظر! بس بے دلیل افتراء علی الرسول کی تہمت بے جا! اس بہتان طرازی کی بھی کچھ سزا ہوگی یا نہیں؟

ایک صاحب دو قدم اور آگے نظر آتے ہیں، فرماتے ہیں:

پڑھو اے لوگو اور حیرت کرو! رسول اللہ ﷺ اس مدرسہ کی بنیاد کیسے رکھ سکتے ہیں، جو

> آپ کی سنت سے جنگ کرتا ہو اور آپ کی سیرت وطریقے کو پھینک رہا ہو، یہ مدرسہ عقائد میں ماتریدی اور مذہب کے اعتبار سے حنفی ہے، اور اس کی بنیاد رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی اور دین میں انتشار پر رکھی گئی ہے۔(۱) اس سے یہ رسول اللہ ﷺ راضی ہیں، نہ خلفائے راشدین خوش ہیں، نہ خود امام ابوحنیفہ! (تقی الدین ہلالی) ص:۹۸

اللہ اکبر! دین ومذہب کا فیصلہ ہلالی صاحب کے ہاتھ میں ہے، ماتریدی ہونا کفر ہے، حنفی ہونا شرک ہے، یا اللہ جانے کیا ہے؟ اور ہلالی صاحب یہ تو بتائیں کہ اس مدرسہ سے نہ رسول اللہ ﷺ راضی ہیں، نہ خلفائے راشدین، نہ صحابہ، نہ امام ابوحنیفہ! یہ غیب کا علم اور قطعی علم انھیں کہاں سے حاصل ہوا؟ کیا رسول اللہ ﷺ نے انھیں بتایا ہے؟ یا ان پر وحی نازل ہوئی ہے؟ یا رسول اللہ ﷺ پر افتراء ہے؟ بتائیں کہ کیا ہے؟ بلاشبہ یہ افتراء ہے، جھوٹ ہے، بہتان ہے، جو رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین اور صحابہ اور امام ابوحنیفہ پر باندھا گیا ہے، **ولکن لایشعرون۔**

نہ جانے علم سنت کی یہ کون سی قسم ہے، کہ بے دلیل بلکہ خلاف دلیل یہ صاحب جو ہانک دیں وہ وحی قطعی! اور کوئی غریب خواب دیکھے یا اسے کشف ہو تو وہ افتراء! یہ تو جنون ہے، پھر بھی یہ صاحب علماء کبار سنت میں شامل ہیں۔

مات کھا گئی رضاخانیت کی گستاخی، غیر مقلدیت کی بے باکی سے! گھٹنے ٹیک دیئے بریلویوں نے غیر مقلدوں کے سامنے! لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ ہر چڑھاؤ کے لئے اتار ہے، علماء ومشائخ کی کھال سے الجھنے والے بہت دنوں تک اپنے گریبانوں کو بچائے نہیں رکھ سکتے، کسی زمانہ میں معتزلہ نے حکومت کا سہارا پا کر اہل سنت کو بہت تنگ کیا تھا، لیکن آخر ان کی دھجیاں بکھر گئیں۔ ایک دور میں فیضی اور ابوالفضل وغیرہ نے دربار اکبری کی بیساکھی لے کر مسلمانوں کو رگیدنا شروع کیا تھا، مگر ان کے تمام پُرزے اڑ گئے، اب ان زر پرست مولویوں نے سعودی حکومت اور علماء کو فریب دے کر تمام مسلمانوں پر کفر وشرک کی تلوار برسانی شروع کی ہے، لیکن یہ فریب کی کرسی عارضی چیز ہے، اس کا سہارا ناپائیدار ہے، نہ

جانے کب یہ کرسی نیچے سے کھسک جائے۔

خیر خواہی کی بات یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے خیالات کو معصوم نہ سمجھیں، اپنی عقل کو عقلِ کل نہ قرار دیں، اور حق کو اپنے ہی محدود حلقے میں منحصر نہ کریں، اپنے حق میں بھی غلطی کا امکان باقی رکھیں، دوسروں کے اقوال واحوال ومقاصد کو سمجھیں، آیاتِ الٰہی اور احادیث نبوی کو کھلونا نہ بنائیں اور بے محابا کفر کے فتوے نہ صادر کریں، اور خدا کی گرفت سے ڈریں۔ **واللہ الموفق**

(رجب تا رمضان ۱۴۱۷ء/جنوری تا مارچ ۱۹۹۷ء)

☆☆☆☆☆

(۱) کاش ہلالی صاحب جانتے کہ دارالعلوم دیوبند کی بنیاد کن حالات میں اور کن جذبات سے رکھی گئی ہے، تو وہ اتنے بڑے جھوٹ کے گناہ سے بچ جاتے، یا ممکن ہے کہ اس شخص سے سچ بولنے کی قدرت سلب ہوگئی ہو، ان تحریریں جو ''الدیوبندیہ'' میں نقل کی گئی ہیں ان کے پڑھنے سے ایسا ہی احساس ہوتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

أمر بالمعروف ونهى عن المنكر

امام غزالی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ:

> امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا درجہ دین اسلام میں ''مدار اعظم'' کا ہے، یہ اتنی اہم چیز ہے کہ اسی کے واسطے اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کو بھیجا ہے، اگر اس کی بساط لپیٹ کر رکھ دی جائے، اور اس کے علم وعمل کا رواج بند ہوجائے تو کارِ نبوت معطل ہوکر رہ جائے، دین ودیانت میں اضمحلال پیدا ہوجائے، خرابیاں عام ہوجائیں، گمرہی پھیل جائے، جہل کا غلبہ ہوجائے، فساد کا دائرہ وسیع ہوجائے، بربادی بے انتہا ہوجائے، آبادیوں کا حال ابتر ہوجائے، بندگانِ خدا ہلاکت کے غار میں گر جائیں، اور انھیں بجز روزِ قیامت کے احساس بھی نہ ہو۔
>
> وہ چیز جس کا ہمیں اندیشہ تھا، وہ ہوگئی إنا لله وإنا إليه راجعون، اس ''مدار اعظم'' کا علم مٹ گیا، اس کی حقیقت فنا ہوگئی، اس کے نشانات تک باقی نہ رہے، قلوب پر مداہنت کا غلبہ ہوگیا ہے، اور خالق کا فکر وخیال دلوں سے محو ہوگیا ہے، لوگ بہائم کی طرح خواہشات وشہوات کے پیچھے چھوٹ پڑے ہیں، اور اب بساط زمین پر ایسے مومن صادق کا وجود نادر ہوگیا ہے، جسے اللہ کی راہ میں کسی لومۃ لائم کی پرواہ نہ ہو۔
>
> (احیاء العلوم، ج:۲، ص:۳۰٦)

یہ ماتم امام غزالیؒ نے اپنے دور کا کیا ہے، اگر وہ ہمارے اس دور کو دیکھتے تو نہ جانے کیا فرماتے؟ اب تو رنگ ہی اور ہے، منکرات کا وہ عموم ہے کہ وہی معروف بن گئے ہیں۔ ان منکرات پر نکیر کون کرے؟ کسے یارا ہے کہ انھیں ٹوک سکے؟ حال یہ ہے کہ منکر پر نکیر کرنے والا خود مورد لعن وطعن بن جاتا ہے، امام غزالی نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا ایک ارشاد

نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: **یاتی علی الناس زمانٌ لأن تکون جیفة حمار أحب إلیهم من مومن یامرهم وینهاهم** (احیاء العلوم، ج:۲، ص:۳۱۱) ایک ایسا وقت بھی آئے گا، لوگ اس مومن کے مقابلے میں جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہو، مردار کو پسند کریں گے۔

کون یہ کہہ سکتا ہے کہ آج یہ بات صادق نہیں آرہی ہے، اب منکرات پر نکیر تو درکنار، ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، اگر کوئی اتفاق سے ٹوک دے، تو ان لوگوں کی بھی پیشانیوں پر بل آجاتا ہے جو معروف اور منکر کو سمجھتے ہیں، گویا جس کے جو جی میں آئے کرتا جائے، تنظیم بنا کر، یا انفرادی طور پر بس اتنی شرط ہے کہ بظاہر وہ کام مثبت رنگ کا ہو، خواہ قرآن وسنت سے میل نہ کھاتا ہو، خواہ وہ غیروں کی نقالی میں ہو، خواہ اس سے دینی احکام پر زد پڑتی ہو، لیکن اسے کوئی نہ ٹوکے، کیونکہ فرض کرلیا گیا ہے کہ ٹوکنا تخریب ہے، احتساب کی اجازت کوئی نہیں دیتا، ہر شخص اور ہر جماعت اپنی رائے پر نازاں ہے۔

لیکن یہ کیا کوئی اچھا حال ہے؟ اس کا جواب قرآن کریم میں تلاش کیجئے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: **وَتَریٰ کَثِیْراً مِنْھُمْ یُسَارِعُوْنَ فِی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَأَکْلِھِمُ الْسُّحْتَ لَبِئْسَ مَاکَانُوْا یَعْمَلُوْنَ، لَوْلَا یَنْھٰھُمُ الرَّبَّانِیُّوْنَ وَالْاَحْبَارُعَنْ قَوْلِھِمُ الْاِثْمَ وَأَکُلِھِمُ الْسُّحْتَ لَبِئْسَ مَاکَانُوْا یَصْنَعُوْن** (سورہ مائدہ: ٦٢/٦٣) اور تم ان میں سے بہتوں کو دیکھو گے کہ گناہ اور ظلم اور حرام کھانے پر دوڑتے ہیں، بہت برے کام ہیں جو کر رہے ہیں، کیوں نہیں منع کرتے، ان کے درویش اور علماء گناہ کی بات کے کہنے سے اور حرام کھانے سے، بہت ہی برے عمل ہیں جو کر رہے ہیں۔

مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نور اللہ مرقدہٗ لکھتے ہیں کہ:

> ''جب خدا کسی قوم کو تباہ کرتا ہے، تو اس کے عوام گناہوں اور نافرمانیوں میں غرق ہوجاتے ہیں، اور اس کے خواص یعنی درویش اور علماء گونگے شیطان بن جاتے ہیں، بنی اسرائیل کا حال یہی ہوا کہ لوگ عموماً دنیوی لذات وشہوات میں منہمک ہو کر خدا تعالیٰ کی

> عظمت وجلال اور اس کے قوانین واحکام کو بھلا بیٹھے، اور جو مشائخ اور علماء کہلاتے تھے انھوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ترک کردیا، کیونکہ حرص اور اتباع شہوات میں وہ اپنے عوام سے بھی آگے تھے، مخلوق کا خوف یا دنیا کا لالچ حق کی آواز بلند کرنے سے مانع ہوتا تھا، اسی سکوت اور مداہنت سے پہلی قومیں تباہ ہوئیں۔

سورہ مائدہ ہی میں کچھ دور آگے چل کر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: **لُعِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِیْسَی بْنِ مَرْیَمَ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوْا وَکَانُوْا یَعْتَدُوْنَ، کَانُوْا لَایَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْکَرٍ فَعَلُوْہُ لَبِئْسَ مَاکَانُوْا یَفْعَلُوْنَ** (سورہ مائدہ: ۷۸/۷۹) ملعون ہوئے کافر بنی اسرائیل کے داؤد کی زبان پر اور عیسیٰ بن مریم کی، یہ اس لئے کہ وہ نافرمان تھے، اور حد سے گزر گئے تھے، آپس میں منع نہ کرتے تھے برے کام سے جو وہ کررہے تھے، کیا ہی برا کام ہے جو کرتے تھے۔

مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں کہ:

> ’’یوں تو تمام کتب سماویہ میں کافروں پر لعنت کی گئی ہے، لیکن بنی اسرائیل کے کافروں پر جب وہ عصیان وتمرد میں حد سے گزر گئے کہ نہ مجرم کسی طرح ارتکاب جرائم سے باز آتا تھا، اور نہ غیر مجرم، مجرم کو روکتا تھا، بلکہ سب شیر وشکر ہوکر بے تکلف ایک دوسرے کے ہم پیالہ وہم نوالہ بنے ہوئے تھے، منکرات وفواحش کا ارتکاب کرنے والوں پر کسی طرح کے انقباض، تکدر اور ترشروئی کا اظہار بھی نہ ہوتا تھا، تب خدا نے حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت مسیح علیہ السلام کی زبان سے ان پر لعنت کی۔‘‘

امام احمد بن حنبل، امام ترمذی، امام ابوداؤد علیہم الرحمہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

’’بنی اسرائیل جب معاصی میں پڑے، تو اوّلاً ان کے علماء نے منع کیا، مگر وہ نہیں مانے، لیکن اس کے باوجود وہ علماء ان کے ساتھ ان کی مجالس میں بیٹھتے رہے، ان کے ساتھ کھاتے اور پیتے رہے، پس اللہ نے ایک دوسرے کے قلوب کو باہم ٹکرادیا، اس کے بعد ان

پر حضرت داؤد اور عیسی بن مریم کے واسطے سے لعنت کی، کیونکہ وہ نافرمانی کرتے تھے، اور حد سے تجاوز کرتے تھے۔‘‘

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول علیہ السلام جب یہ فرمارہے تھے تو ٹیک لگائے ہوئے تھے، اتنا فرما کر سیدھے بیٹھ گئے، اور فرمایا نہیں! قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، یہاں تک کہ تم ان کو روکو۔‘‘ (مشکوۃ شریف، تفسیر ابن کثیر)

یہ ایک آئینہ ہے جس میں ہم اپنی تصویر دیکھ سکتے ہیں، کیا بنی اسرائیل کا حال جو قرآن کریم اور حدیث میں بیان کیا گیا ہے، ہماری آنکھوں کے سامنے نہیں ہے، اور کیا قلوب پر مداہنت خلق کا غلبہ نہیں ہے، کہیں اپنی آن اور جاہ کا خیال ہے، کہیں اپنی جماعت اور پارٹی کی حمایت کا مسئلہ ہے، کہیں اپنی قوم اور برادری کا خوف ہے، حد تو یہ ہے کہ اب نہی عن المنکر کو تخریب اور جارحیت سمجھا جانے لگا ہے اور طرح طرح کے بے بنیاد شبہات والزامات کا اسے مورد قرار دیا جاتا ہے۔

امام غزالیؒ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق نقل کیا ہے کہ وہ پہلے حکام کے پاس تشریف لے جایا کرتے تھے، پھر انھوں نے جانا بند کر دیا، ان سے لوگوں نے عرض کیا کہ اگر آپ ان کے پاس تشریف لے جاتے رہتے، تو ان کے دلوں پر اثر ہوتا، تو انھوں نے فرمایا کہ میں ڈرتا ہوں کہ اگر ان سے بات کروں، تو کہیں میرے سلسلے میں وہ نہ سمجھ جائیں، جس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں (یعنی میری نیت کچھ اور ہو، وہ اسے کسی اور نیت وغرض پر محمول کر لیں) اور اگر خاموش رہوں تو اندیشہ ہے کہ گنہگار ہو جاؤں گا۔ (احیاء العلوم، ج:٢، ص:٣١١)

اور یہ بالکل امر واقعہ ہے کہ کوئی شخص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ کسی نیت سے انجام دیتا ہے، اور لوگ اسے دوسرے مقاصد پر محمول کرنے لگتے ہیں، اور انھیں اس کا خیال شاید نہیں ہوتا کہ یہ بدگمانی گناہ کے دائرے میں آجاتی ہے۔

پہلے جو بات ’’سلطانئ افراد‘‘ کے دور میں تھی، اب وہی بات ’’سلطانئ جمہور‘‘ کے دور میں بھی ہے، تاہم اس دور میں عزلت نشینی اختیار کر کے آدمی اپنی ذمہ داریوں کو کم کر سکتا

تھا، مگر آج نشر واشاعت اور پریس کے بے انتہا پھیلاؤ کی وجہ سے کسی کی عزلت نشینی اس کی ذمہ داریوں کو ہلکا نہیں کرسکتی، وہ برائی کی جگہوں پر حاضر نہیں ہوگا، وہ منکرات کی مجلسوں سے دور رہے گا، مگر یہ جگہیں اور یہ مجلسیں خود اس کے گھر پہونچ جائیں گی، پھر اگر وہ بولے تو ”سطانئ جمہور“ اسے نہ جانے کن مقاصد پر محمول کرلے، اور اگر نہ بولے تو عنداللہ گنہگار رہوگا۔

بہر کیف! ایک بڑی ذمہ داری کی چیز ہے، اس سے صرف نظر کرنا خطرناک ہے، اور اسے اختیار کرنا لوگوں کے طعن کا نشانہ بننا ہے، لیکن یہاں پر سیّدنا علی کرم اللہ وجہہ کا ایک ارشاد ضرور یاد رکھنا چاہئے، انھوں نے ایک روز خطبہ دیتے ہوئے منبر پر ارشاد فرمایا کہ: **واعلموا أن الامر بالمعروف والنهى عن المنكر لايقطع رزقاً ولايقرب أجلاً**۔ خوب سمجھ لو کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے نہ رزق بند ہوگا، اور نہ موت قریب آجائے گی۔

نیز حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے، جس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ عصر کے بعد تقریر فرمائی، اور قیامت تک آنے والی بہت سی باتوں کا تذکرہ فرمایا، اس میں یہ بھی فرمایا کہ: **ولا يمنعن أحداً منكم هيبة الناس أن يقول بحق إذا علمه وفى رواية إن رأى منكراً أن يغيره فبكىٰ ابوسعيد وقال قد رأيناه فمنعتناه هيبة الناس أن نتكلم فيه** (مشکوٰۃ شریف، ج:۲، ص:۴۳۷)

مطلب یہ ہے کہ ایسا نہ ہو کہ لوگوں کی ہیبت اور لوگوں کا دباؤ تمہیں حق بات کے کہنے سے رکاوٹ بن جائے، جبکہ وہ اس حق بات کو جانتا ہو، پھر حضرت ابوسعید خدریؓ رو پڑے، اور فرمایا کہ ہم نے تو اسے دیکھ لیا، چنانچہ لوگوں کی ہیبت نے ہمیں حق بات کہنے سے روک دیا۔ **أللّٰهم وفقنا لما تحب وترضىٰ من القول والعمل والفعل والنية والهدىٰ إنک علىٰ كل شئ قدير**۔

(جلد نمبر:۷، شمارہ نمبر: محرم تا ربیع الاول ۱۴۱۹ھ/ مئی تا جولائی ۱۹۹۸ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۲؍ربیع الاوّل کے ہنگامے

ان حروف کا لکھنے والا ایک ضرورت سے ہندوستان کے معروف شہر بمبئی گیا ہوا تھا، ۱۲؍ربیع الاول کو بمبئی کے مشہور محلّہ مدن پورہ، مولانا آزاد روڈ کے ایک مکان پر ٹھہرا ہوا تھا، اس نے دیکھا کہ یہاں مسلمانوں کا ایک طبقہ اپنے پیغمبر ﷺ کی ولادت پر عید منا رہا ہے۔ مشہور یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ولادت مبارکہ آج سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے ۱۲؍ربیع الاول کو ہوئی تھی، اس تاریخ میں آپ کی ولادت کا ہونا کوئی تحقیقی اور قطعی بات نہیں ہے، بہت سے محققین نے اس سے اختلاف کیا ہے، لیکن یہاں ہندوستان میں اسی مشکوک اور غیر یقینی تاریخ کو یقینی اور قطعی بنا کر ایک عجیب وغریب عید منائی جاتی ہے، اور اسے نام ”عید میلاد النبی“ کا دیا جاتا ہے۔ یہ عید ہندوستان وپاکستان کے کے بیشتر شہروں میں منائی جاتی ہے، اور اسے ایک خاص انتہا پسند اور جارحیت زدہ فرقہ کی سرپرستی حاصل ہے۔ بہت سی جگہوں پر اس عید میلاد النبی کے تماشے سڑک پر نظر آئے، لیکن بمبئی میں جو نقشہ دیکھا، وہ اور کہیں نظر نہ آیا، اس عید میں جو چیز قدر مشترک ہے وہ تو ہر جگہ ایک ہی ہے، یعنی جھنڈوں کے ساتھ سڑکوں پر جلوس نکالنا، لاؤڈ اسپیکر لگا کر نعت خوانی کرنا، شور وغل کرنا، بلند وبانگ نعرے لگانا، سڑکوں کو جام کرنا، راہ چلتے لوگوں کو پریشانی میں ڈالنا، امن وسکون کے ماحول کو پُر خطر اور مخدوش بنانا وغیرہ، لیکن بمبئی میں رنگ ہی کچھ اور تھا۔

بمبئی میں عید میلاد النبی کا جلوس سڑکوں پر نکالا گیا تھا، اور ٹرک ایک دو نہیں سینکڑوں بلکہ شاید ہزاروں کی تعداد میں رہے ہوں گے۔ ۳؍بجے دن سے مولانا آزاد روڈ پر یہ جلوس شروع ہوا، تو دس بجے رات تک مسلسل یہ جلوس چلتا رہا، یکے بعد دیگرے ٹرک نکلتے

رہے، ہر ٹرک الگ الگ انداز سے سجایا گیا تھا، کوئی پھولوں سے آراستہ تھا، کسی کو پھلوں سے سجایا گیا تھا، کسی پر بڑے بڑے بینر لگے ہوئے تھے، الگ الگ جماعتوں، انجمنوں، برادریوں، پیشہ وروں اور محلوں کے الگ الگ ٹرک تھے، ہر ٹرک پر اوباش اور لاخیرے قسم کے نوجوان اور لڑکے ہڑبونگ مچا رہے تھے، سڑک پر اترا اِترا کر ناچ رہے تھے، تھرک رہے تھے، ڈھول تاشے بجا رہے تھے، نماز کا وقت ہے، مسجدوں میں نمازیں ہو رہی ہیں، اور یہ عاشقان رسول نعرے لگا رہے ہیں، ‘‘علی کا دامن نہیں چھوڑیں گے’’ ‘‘غوث کا دامن نہیں چھوڑیں گے’’ ‘‘خواجہ کا دامن نہیں چھوڑیں گے’’ ‘‘آدھی روٹی کھائیں گے، اسلام کو بچائیں گے’’ ‘‘چوبیس نمبر ہائے ہائے’’ انھیں نعروں کے شور وغل میں اسلام کو بچانے والے نمازوں کو برباد کر رہے تھے، نمازیوں کو پریشان کر رہے تھے، مسجدوں کی بے حرمتی کر رہے تھے، ٹریفک جام، راہ رَو پریشان، پولیس کا عملہ دم بخود، عام لوگ سراسیمہ، اور اسلام کے یہ نام لیوا بہادر اچھل اچھل کر ‘‘نہیں چھوڑیں گے، نہیں چھوڑیں گے’’ کے نعرے گونجا رہے تھے۔

ایک شخص بیٹھا سوچ رہا تھا کہ قرآن سے، احادیث رسول سے، تاریخ کے مطالعہ سے، اور اپنے اساتذہ کے ذریعے واسطہ در واسطہ رسول اللہ ﷺ سے، مذہب اسلام کی جو حقیقت اور صورت سمجھ میں آتی ہے وہ اس موجودہ تصویر سے کتنی مختلف ہے۔

دین اسلام ایک سنجیدہ اور دانشمندانہ مذہب ہے، جس میں اللہ کی عبادت کا وہ عمدہ ترین طریقہ ہے جس سے بہتر تو کیا، اس کے برابر بھی سوچا نہیں جاسکتا، اس میں معاملات کی دیانت اور صفائی ہے، اس میں اخلاق کی بلندی ہے، اس کی تعلیم یہ ہے کہ مسلمان کی ذات سے بجز اذن الٰہی کے کسی کو ذرا بھی ایذاء نہ پہونچے، اس مذہب میں لہو ولعب، خرافات، گانے بجانے، ناچنے تھرکنے، اچھلنے کودنے، اور لغویات کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اگر کسی کھیل کی اسلام نے اجازت دی ہے، تو اس میں بھی سنجیدگی اور مقصدیت کے پہلو کو برقرار رکھا ہے، اسلام ہر محل اور ہر زمان میں ایک نافع، بابرکت اور دل آویز دستورِ حیات ہے۔

سوچنے والا سوچے جا رہا تھا کہ یہ اسلام جو بمبئی کی سڑکوں پر نظر آ رہا ہے، یہ اسلام تو

نہ قرآن کے تیس پاروں میں نظر آتا ہے، نہ حدیث کے ذخیروں میں ملتا ہے، نہ ائمہ کرام کی مدون کردہ فقہ میں ملتا ہے، نہ تاریخ اسلام کے صفحات میں ملتا ہے، یہ کون سا اسلام ہے جس کو یہ جیالے بچانے چلے ہیں، نہ جانے علی کا، غوث کا، اور خواجہ کا کون سا دامن ہے جسے یہ بہادر نہیں چھوڑیں گے۔ علی کا دامن ان کے ہاتھ میں ہوتا، تو یہ دن کو میدان جہاد میں صف آرا ہوتے، اور رات کو مصلوں پر مصروفِ مناجات ہوتے، غوث اور خواجہ کا دامن ہاتھ میں ہوتا، تو یہ مسجدوں اور خانقاہوں میں نظر آتے، لیکن یہ تو سڑک پر اچھل کود رہے ہیں، راستہ بند کئے ہوئے ہیں، عوام الناس کو تنگی میں ڈال رہے ہیں، وہ اسلام جسے رسول اللہ ﷺ نے پیش کیا ہے، جس کی تکمیل آپ کی حیات مبارکہ میں ہی کر دی گئی تھی، جس میں اب کسی اضافہ وترمیم کی گنجائش ہے، اس کے دائرے میں یہ جلوس، جلوس کے یہ نعرے، یہ ہڑ بونگ، اور ہڑ بونگ کے یہ وحشت ناک تماشے تو قطعاً نہیں ہیں۔

پھر اسے کیا کہا جائے، یہ اسلام تو ہے نہیں، اور اگر کسی کو اصرار ہو کہ یہ اسلام ہے، تو یقیناً نیا اسلام ہے، وہ اسلام نہیں ہے جس کی تعلیم حضور اکرم ﷺ نے دی ہے، جس کو مان کر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم علم وعمل اور تقویٰ وتدین کی بلندیوں سے سرفراز ہوئے تھے، جس کے پیرو تابعین، ائمہ اور تمام علمائے دین تھے، جس پر عمل پیرا ہونے والے حضرت سیّدنا شیخ عبد القادر جیلانی اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی تھے۔ (علیہم الرحمہ)

☆☆☆☆☆

ہر مسلمان جانتا ہے کہ کبریائی اور بڑائی اللہ ہی کے لئے ہے، وہی سب کا حاجت روا اور مشکل کشا ہے، ساری کائنات کا بلا شرکت غیرے اکیلا مالک ومدبر ہے، وہی خالق ہے، وہی صاحب تصرف ہے، اسی کا حکم پورے نظام عالم میں نافذ ہے، اس کے ساتھ کسی تصرف میں کوئی شریک نہیں ہے، معبود وہی ہے، باقی سب محتاج اور غلام ہیں، وہ موت وحیات کا مالک ہے۔ تمام امور اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں، اس کے اذن کے بغیر ایک پتہ بھی ہل نہیں سکتا، اور ہر مسلمان یہ بھی جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور رضا حاصل کرنے کا

واحد ذریعہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی قدم بہ قدم پیروی کی جائے، اگر کسی نے ان کا راستہ ذرا بھی چھوڑا، تو وہ جہاں بھی پہونچے، مگر اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کو نہیں پہونچ سکتا، معیار وہی ہیں، انھیں کی پیروی کرنے سے مرتبہ ملا، جس کو ملا۔ یہ بزرگانِ دین اور مشائخ کبار جن کی ولایت کی دنیا معترف ہے، انھیں یہ ولایت حضور اکرم ﷺ کے نقش قدم پر چل کر ہی ملی ہے، ان کا اصل کمال اتباع واطاعت ہی میں مضمر ہے۔

لیکن اب دیکھئے کہ رسول اللہ اور اولیاء کرام ہی کا نام لے لے کر امت کن خرافات میں مبتلا ہوگئی ہے، دین کی اصل حقیقت رسوم ومظاہر میں گم ہوگئی ہے، فرائض سے کوئی واسطہ نہیں۔

سنتوں کا نور زندگیوں سے غائب ہے، حرام وحلال کی تمیز باقی نہیں رہی، مگر بزرگوں کا نام بیچ میں لاکر لوگوں نے توحید کی جگہ شرک کو، سنت کی جگہ بدعت کو جاری کر رکھا ہے، عید میلاد النبی ہو، یا گیارہویں شریف، شب معراج ہو یا یوم عاشورا، خواجہ اجمیری کی زیارت ہو یا کچھوچھہ کا مزار، اوراس کے علاوہ ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے مزارات، ہر موقع اور ہر جگہ پر دیکھ لیجئے کہ انھیں بزرگوں کا نام لے لے کر اور انھیں کی عقیدت ومحبت کا نعرہ لگا لگا کر کن کن خرافات کے مرتکب اسی اسلام کے نام لیوا ہوتے ہیں، جس کو جناب نبی کریم ﷺ لائے تھے، جس اسلام نے شرک کو اور شرک کے آثار کو یکسر ختم کر دیا تھا، اب اسی اسلام کا دم بھرنے والے گلے گلے تک شرک میں ڈوبے ہوئے ہیں، لیکن پھر بھی مسلمان ہیں۔

پھر اتنے ہی پر بس نہیں، اسلام جو ایک نہایت سنجیدہ دین تھا، اس کے ماننے والے اسی کے نام پر خرافات کو ایجاد کر کے سڑک پر لے آئے، بازار میں لے آئے، ڈھول اور طبل کے ساتھ لے آئے، دنیا سمجھتی ہے کہ یہی اسلام ہے، حالانکہ اسے اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ ایسے ہی مسلمان ہوتے ہیں، اور مسلمان یہی سب کرتے ہیں، حالانکہ یہ اعمال مسلمانوں کے نہیں ہیں۔

یہ شور یہ ہنگامے شرعی اعتبار سے تو غلط در غلط ہیں ہی، خاص ہندوستان کے ماحول

ومزاج کے اعتبار سے ان کی صورت حال مزید سنگین ہے، ان مجمعوں میں کیسے لوگ اکٹھے ہوتے ہیں، سب جانتے ہیں، کبھی کبھی یہ لاخیرے اوراوباش نوجوان وہ حرکتیں کرجاتے ہیں جن کا خمیازہ پوری قوم کو بھگتنا پڑتا ہے، کوئی شرارت کردی، اور فساد پھوٹ پڑا، پھر جان ومال اور جائداد واملاک کا ناقابل تلافی نقصان ہوتا ہے۔

یہ تجربہ بار بار ہوا ہے، اور ہوتا ہے، مگر آنکھیں نہیں کھلتیں، کاش اس پر وہ لوگ بھی غور کرتے، جوخود کو علماء کی صف میں رکھتے ہیں، اور وہ ان خرافات کی سرپرستی کرتے ہیں، انھیں عظمتِ رسول اور عقیدتِ اولیاء کی سند عطا فرماتے ہیں، حالانکہ وہ جانتے ہیں، یہ نہ رسول کی تعظیم ہے اور اولیاء کی عقیدت ہے، بلکہ یہ صرف نفس کی خواہشات کے کرشمے ہیں۔

شرکت وبدعات کی ان خرافات نے امت کو بے حد وحساب مصائب میں مبتلا کررکھا ہے، ان کا احتساب اخلاص کے ساتھ کیا جانا چاہئے۔ یہ تمام علماء کی ذمہ داری ہے، جس کا جتنا دائرہ ہو، اس میں جد وجہد کرنا اس کا فریضہ ہے۔ **أللٰهم وفقنا لماتحب وترضیٰ من القول والعمل والفعل والنية والهدیٰ إنک علیٰ كل شئ قدير۔**

(جلدنمبر: ۷، شمارہ نمبر: ۲۔ ربیع الثانی تا جمادی الثانی ۱۴۱۹ھ / اگست تا اکتوبر ۱۹۹۸ء)

ماہنامہ ضیاء الاسلام فروری ۲۰۱۰ء

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

من عادیٰ لی ولیاً فقد آذنته بالحرب

امیر المومنین فی الحدیث امام محمد بن اسماعیل البخاری علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب ''الجامع الصحیح'' میں سیّدنا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے واسطے سے ایک حدیث قدسی نقل کی ہے:

قال رسول الله ﷺ إن الله تعالیٰ قال : من عادیٰ لی ولیاً فقد آذنته بالحرب ۔ رسول اللہ ﷺ کا رشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس نے میرے کسی ولی سے عداوت کی تو میری جانب سے اس کو اعلان جنگ ہے۔

یہ حدیث اور اس کی تعلیم تمام انسانوں کے لئے بالعموم اور اہل اسلام کے لئے بالخصوص بہت ہی اہمیت کی حامل ہے، کیونکہ بسا اوقات انسان کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے، اور رہائی کی سینکڑوں تدبیریں کرتا ہے، دعائیں کرتا ہے، دوسروں سے بھی دعائیں کراتا ہے، مگر مصیبت برقرار رہتی ہے، اسے خبر نہیں ہوتی ہے، کہ یہ بلا اس کے سر پر کیوں مسلط ہوئی ہے، مصائب بتا کر نہیں آتے کہ ان کا تسلط فلاں معصیت اور فلاں جرم کی بنا پر ہے، اور حقیقت یہ ہوتی ہے کہ اس کے دل میں اللہ کے کسی ولی کی عداوت ہوتی ہے، اس کی غیبت اور آبروریزی کرتا ہے، اسے ستاتا ہے، اور اس کے نتیجے میں وہ خدا کے اعلانِ جنگ کے خطرہ میں گرفتار ہوتا ہے، اور جس کی لڑائی خدا سے ہو، اس کو کون سی تدبیر بچا سکتی ہے۔ أعاذنا اللّٰه منه

اگر کوئی فرد کسی ایک ولی سے عداوت میں مبتلا ہوتا ہے، تو خدا کا قہر اس ایک فرد کی جانب متوجہ ہوتا ہے، اور اگر کوئی جماعت، کوئی معاشرہ، کوئی گروہ کسی ایک یا چند اولیاء اللہ

سے بغض رکھتا ہے، تو وہ پوری جماعت، پورا معاشرہ اور پورا گروہ اس قہر وحرب کی زَد میں آ جاتا ہے۔ مولانا روم نے اسی حدیث کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا ہے۔ ؎

ہیچ قومے را خدا رُسوانہ کرد ‏ ‏ ‏ ‏ تا دلِ صاحبدلے نالد بدرد

اللہ تعالیٰ کسی قوم کو رُسوا نہیں کرتے، جب تک کسی صاحب دل کا دل اس سے نہیں دکھتا۔

تاریخ کے اَوراق اور انسانی تجربات اس حدیث کی صداقت کی گواہی سے لبریز ہیں، جب اور جہاں کسی اللہ کے ولی کا دل دکھایا گیا ہے، قہر خداوندی کے شرارے وہاں برسے ہیں، جب تک یہ نہیں ہوتا قومیں کفر وشرک کے باوجود ایک مدت تک باقی رہتی ہیں، جو قومیں انبیاء کرام سے ٹکرائیں ان کا حشر کیا ہوا؟ قرآن کریم میں ان کے احوال پڑھ لیجئے، انبیاء کرام یقینی طور اللہ کے ولی ہیں، انبیاء کے علاوہ دوسرے اولیاء کی ولایت گو اس درجہ کی یقینی نہ ہو، لیکن انبیاء کرام کے بتائے ہوئے علامات سے انھیں پہچانا جا سکتا ہے۔

انسان ہلاکتوں سے بچنے کی حتی الامکان احتیاطی تدابیر اختیار کرتا ہے، اپنے جانی اور مالی نقصان سے ہر شخص ڈرتا ہے، کون چاہتا ہے کہ اسے کسی طرح کا ضرر لاحق ہو، پھر جہاں اور تدبیریں کی جاتی ہیں، امراض اور وباؤں کے لئے پیشگی ٹیکے لگواتے ہیں، وہیں اس کا اہتمام کیوں نہیں کیا جاتا کہ اللہ کے ولیوں کی عداوت اور ان کی ایذا رسانی سے خود کو لوگ بچائیں، عجیب بدقسمتی ہے کہ ایک شخص اپنی ہستی کو مٹا کر، اپنی شخصیت کو مٹا کر، اللہ ورسول کی تعلیمات پر خود کو قربان کر کے ’’حیاۃ طیبہ‘‘ حاصل کرتا ہے، اللہ کا قرب حاصل کرتا ہے اور دوسرے افراد اس کا مذاق اُڑا کر، اس کی تذلیل کر کے، اس سے عداوت کر کے اللہ کے قہر وغضب میں مبتلا ہوتے ہیں، حالانکہ کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ ایسے لوگ تباہ ہو جاتے ہیں، عجیب عجیب لاینحل مصیبتوں، ذلتوں اور بلاؤں میں ڈوبے جاتے ہیں، ایک کو دیکھ کر دوسرے کو عبرت حاصل کرنی چاہئے، مگر جیسے بھیڑوں کا ریوڑ ہو کہ ایک کنوئیں میں گرتی ہے، تو دوسرے کا قدم رکتا نہیں، وہ اسی میں جا پڑتی ہیں۔

ہاں سوال ہے کہ اللہ کا ولی کون ہے؟ تو شریعت اسلامیہ نے کسی بھی مسئلہ کو

ناصاف نہیں چھوڑا ہے، ہر ایک کے حدود و علامات مقرر فرما دیئے ہیں، آدمی ذرا تامل کرے تو بات بالکل واضح نظر آتی ہے۔

صاحب فتح الباری علامہ حافظ ابن حجر علیہ الرحمہ نے اس حدیث کی شرح کے ذیل میں ولی کی تعریف یہ ہے کی ہے: **المراد بولی اللہ العالم باللہ المواظب علی طاعته المخلص فی عبادته**۔ اللہ کا ولی وہ ہے، جو اللہ کی معرفت رکھتا ہو ہمیشہ اللہ کی اطاعت کرتا ہو، اور اس کی عبادت میں مخلص ہو۔ یہ اللہ کے ولی کی تعریف بھی ہے، اور اس کے علامات کا بیان بھی ہے، جسے اللہ کی معرفت حاصل ہوگی، وہ ہر حال میں اللہ سے راضی ہوگا، اور ہر حال میں اللہ کو یاد رکھے گا، اسے دیکھ کر، اس کی صحبت میں بیٹھ کر اللہ یاد آئے گا، اللہ کی اطاعت کا ظاہراً بھی پابند ہوگا اور باطناً بھی، اور یہی اس کا حال اور مزاج ہوگا، اس کا دلی جذبہ اور رُجحان اللہ کی اطاعت ہی کا ہوگا اور پھر اس کی عبادت کا منشاء کوئی غرضِ دنیاوی یا لذتِ نفسانی نہ ہوگا، بلکہ محض اللہ کے لئے وہ عبادت کرتا ہوگا، جس کے یہ احوال ہوں، ظن غالب یہ ہے کہ وہ اللہ کا ولی ہوگا، اس کی عداوت ضرور مہلک ہوگی۔ یہ تعریف تو حافظ ابن حجر علیہ الرحمہ نے قرآن و حدیث ہی کی روشنی میں ذکر کی ہے، لیکن آیئے، حدیث کے باقی الفاظ کا بھی مطالعہ کرلیں، کہ زبان رسالتمآب ﷺ کے واسطے سے خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ولی کی کیا شان بتائی ہے۔ فرماتے ہیں: **وما تقرب إلی عبدی بشئ أحب إلی مما افترضته علیه وما زال عبدی یتقرب إلی بالنوافل حتیٰ أحببته فکنت سمعه الذی یسمع به وبصره الذی یبصر به ویده التی یبطش بها ورجله التی یمشی بها وإن سألنی لأعطینه ولئن استعاذنی لأعیذنه**۔ اور بندہ جن چیزوں سے میرا قرب حاصل کرتا ہے، ان میں میرے نزدیک محبوب ترین اعمال وہ فرائض ہیں جنھیں میں نے اس پر فرض کیا ہے۔ اور بندہ نوافل کے واسطے سے برابر درجاتِ قرب میں ترقی کرتا جاتا ہے، یہاں تک کہ (ایک وقت وہ آتا ہے کہ) میں اس کا کان بن جاتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے، میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں، جس سے وہ دیکھتا ہے، میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں، جس

سے وہ پکڑتا ہے، میں اس کا پاؤں بن جاتا ہوں، جس سے وہ چلتا ہے، اگر وہ مجھ سے کوئی سوال کرے تو میں اسے ضرور بالضرور دوں گا، اور اگر کسی چیز سے میری پناہ مانگے تو میں اسے ضرور پناہ دوں گا۔

خیال کیجئے! فرائض ونوافل کی پابندی کرنے والا کہاں تک پہونچتا ہے، وہ اللہ کی محبوبیت کے کس مقام پر فائز ہوتا ہے، کہ سننا، دیکھنا، پکڑنا، چلنا بظاہر اس کے کان، آنکھ، ہاتھ اور پاؤں سے ہور ہا ہے مگر اللہ تعالیٰ اُن سب کی نسبت اپنی طرف فرمار ہے ہیں، ظاہر ہے کہ جہاں شرف ومحبوبیت کی یہ کیفیت ہو، وہاں اگر اس سے کوئی دشمنی کرے گا، تو وہ دشمنی اس بندے سے کا ہے کو ہوگی، اللہ ہی سے ہوگی، اور اللہ کا دشمن جسے اللہ تعالیٰ جنگ کی دھمکی دے رہے ہوں، بچ کر کہاں جا سکتا ہے۔

لیکن ابھی معاملہ اسی پر ختم نہیں ہے، اس محبوبیت ومقبولیت کی مزید معراج دیکھئے، فرماتے ہیں: **وماترددت عن شئ أنا فاعله ترددی عن نفس المومن یکره الموت وأنا أکره مساء ته**، اور جن کاموں کو مجھے کرنا ہوتا ہے، ان میں سے کسی میں مجھے وہ تردد نہیں ہوتا، جو مومن کی موت کے سلسلے میں ہوتا ہے، مومن موت کو ناگوار سمجھتا ہو اور مجھے اس کی ناگواری، گوارا نہیں ہوتی۔

خیال فرمایئے! ایک بندۂ مومن جو ولایت کے مذکورہ احوال سے متصف ہو، اس کی پسند وناپسند کا اللہ کو کس درجہ لحاظ ہے۔

یہاں حافظ ابن حجر علیہ الرحمہ شیخ ابوالفضل بن عطاء کے حوالے سے ایک ضروری تنبیہ تحریر فرماتے ہیں، اللہ نے جو فرائض مقرر فرمائے ہیں، ان میں وہ فرائض ظاہرہ بھی ہیں، جن کا کرنا فرض ہے جیسے نماز اور زکوٰۃ وغیرہ، اور وہ بھی داخل ہیں جن کا ترک فرض ہے، جیسے زنا اور قتل وغیرہ، اسی طرح وہ فرائض بھی اس میں داخل ہیں جن کا تعلق باطن اور قلب سے ہے، فعلاً بھی اور ترکاً بھی، مثلاً اللہ کی معرفت، اس کی محبت، اس پر توکل، اس کا خوف وغیرہ بہر حال جن کے یہ احوال واوصاف ہوں، ان سے دشمنی کرنا خطرناک ہے،

احتیاط تو اس میں ہے کہ کسی بندۂ مومن کی عداوت اپنے دل میں نہ رکھے، لیکن جن مومنین کے کچھ خصوصی احوال ہوں، ان کی دشمنی اور ایذا رسانی سے بہت بچنا چاہئے ورنہ قدرت کا انتقام ایسی راہوں سے آئے گا جس کا وہم وگمان بھی آدمی کو نہ ہوگا۔

فالحذر الحذر من معاودة اوليائه تعالىٰ. أللّٰهم إنا نسالک حبک وحب من يحبک وحب عمل يقربنا إلىٰ حبک يا أرحم الراحمين۔

(جلد نمبر: ۷، شمارہ نمبر: ۳۔ رجب تا رمضان ۱۴۱۹ھ/ نومبر، دسمبر ۱۹۹۸ء، جنوری ۱۹۹۹ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کے شعائر کا احترام

محدثِ جلیل حضرت اقدس مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی نور اللہ مرقدہٗ اپنی حیاۃ طیبہ کے آخری دور میں ایک مسجد کے سنگ بنیاد کی تنصیب کے سلسلے میں اتراری، خیر آباد میں تشریف لائے۔ سنگ بنیاد کے بعد کسی نے نصیحت کی درخواست کی تو حضرت نے ایک مختصر سی بات ارشاد فرمائی، جس وقت ارشاد فرما رہے تھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ آپ کے اندرون میں غیر معمولی طاقت بھری ہوئی ہے۔ آواز خاصی زوردار تھی، نہایت قوت سے ارشاد فرمایا کہ:

> ”پہلے لوگوں میں دین اور دینی شعائر و امور کا بڑا احترام تھا، مسجد میں اذان ہوتی تھی، تو جو لوگ نماز نہیں پڑھتے تھے وہ مسجد کے قریب سے گزرتے بھی نہ تھے۔ باتیں کرنا اور شور کرنا تو درکنار! نماز کا احترام اتنا تھا ان کے دلوں میں۔ لیکن اب یہ حال ہو گیا ہے کہ مسجد میں اذان ہو رہی ہے اور، کوئی اور نہیں مسلمان ہی مسجد کے قریب بیٹھا شور وشغب کرتا ہے۔ نہ احترام ہے، نہ خوف ہے، جرأت بہت بڑھ گئی ہے لوگ ڈھیٹ ہو گئے ہیں۔ یہ چیز مسلمانوں کی دنیا اور آخرت دونوں کیلئے مضر ہے، دنیا میں تو ایک سے بڑھ کر ایک پریشانیوں میں مبتلا ہوتے ہیں انفراداً بھی اور اجتماعاً بھی، اور آخرت کا حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ میں علماء سے کہتا ہوں کہ مسلمانوں سے اس جرأت اور ڈھیٹ پنے کو دور کرنے کی کوشش کریں اور دلوں میں جذبۂ احترام پیدا کرنے کا اہتمام کریں“

الفاظ تو پورے یاد نہیں رہے مگر مفہوم یہی تھا جو اوپر لکھا گیا۔ یہ باتیں حضرت نے بڑی دلسوزی سے فرمائی تھیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ بات بالکل صحیح ہے، اور اس کی روک تھام

بہت ضروری ہے۔ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے ملفوظات میں ایک واقعہ مذکور ہے، انھوں نے فرمایا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے زمانے میں ایک عورت کا جو کچھ پڑھی لکھی نہیں تھی انتقال ہورہا تھا۔ وہ نزع کی حالت میں کچھ بول رہی تھی، جو گھر والوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا، ایک آدمی حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ کی خدمت میں آیا کہ اور واقعہ بیان کرکے تشریف لے چلنے کی درخواست کی۔ شاہ صاحب فوراً وہاں گئے، تو عورت کہہ رہی تھی ''ھٰذان رجلان یقولان لی ادخلی الجنة'' یہ دو آدمی مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ جنت میں چلو، داخل ہوجاؤ۔ حضرت شاہ صاحب نے حیرت سے یہ بشارتی کلمات سنے اور پوچھا کہ یہ کوئی بزرگ خاتون ہیں؟ انھیں تو دنیا ہی میں جنت کی بشارت مل رہی ہے، لوگوں نے کہا کہ نہیں یہ کوئی نیک خاتون کیا ہوتی، یہ تو بہت تیز مزاج اور تندخو عورت تھی، بات بات پر لوگوں سے لڑ جاتی، بالخصوص جب اذان ہوتی تو یہ کسی کو کچھ نہ بولنے دیتی اور نہ کچھ کرنے دیتی اور اگر درمیان اذان کوئی عورت بول پڑتی تو یہ اذان کے ختم ہونے پر اس سے بہت لڑتی کہ تم اذان کے وقت کیوں بولی! حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا شاید یہی اس کا جذبۂ احترام تھا، جس کی وجہ سے خود اس کی زبان پر بشارت کے کلمات جاری ہوئے اور وہ بھی عربی زبان میں جو اہل جنت کی زبان ہے۔

سچ ہے، ''وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ (سورہ حج) اور جو کوئی اللہ کے شعائر کی عظمت کرتا ہے، تو یہ اس کے دل کے تقویٰ کا ثمرہ ہے۔

لیکن اب یہ سارا حال قصۂ پارینہ بن چکا ہے۔ اب عام مسلمانوں کو نہ نماز کا احترام رہا، نہ اذان کا، نہ مسجد کا، نہ علماء ومشائخ کا، بلکہ اللہ ورسول کا احترام بھی دلوں سے رُخصت ہوتا جارہا ہے۔

چند ہفتے پہلے ایک ضرورت سے مسلمانوں کے ایک بڑے گاؤں میں جانے کا اتفاق ہوا، جہاں خدا کے فضل سے عربی اور حفظ کے دو دو مدرسے چلتے ہیں۔ علماء وحفاظ کی بھی ایک معقول تعداد وہاں ہے، دن بھر وہاں رہنے کاا اتفاق ہوا۔ ایک مسجد کے قریب ایک

صاحب کے یہاں قیام تھا، عصر کی نماز سے پہلے مسجد کے قریب لاؤڈ اسپیکر سے شور وغل سنائی دیا، معلوم ہوا کہ کرکٹ کا میچ ہو رہا ہے، باہر نکلا تو ایک ٹھٹ کا ٹھٹ اِدھر اُدھر بیٹھا تماشا میں مصروف تھا، اذان ہونے لگی میں نے سمجھا کہ اسلام کے یہ نام لیوا کچھ دیر کے لئے کھیل روک دیں گے، لاؤڈ اسپیکر کا شور بند ہو جائے گا۔ مگر

غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

کھیل بدستور جاری رہا، تماشا دیکھنے والوں کی تعداد بڑھتی رہی، لاؤڈ اسپیکر کا ہنگامہ برقرار رہا۔ اسی شور وہنگامہ میں نماز ہوئی، ذہن ودماغ مختل ہو گیا، بہت صدمہ ہوا۔ سخت افسوس ہوا کہ اب ہم لوگ اتنے گر گئے ہیں اتنے جری ہو گئے ہیں، اور ستم بالائے ستم یہ کہ کھیل کے اس ہنگامے میں بعض دیندار شکل وصورت کے لوگ بھی نماز اور اذان سے بے نیاز محو تماشا تھے۔ **إنا لله وانا إليه راجعون**

کتنے افسوس کی بات ہے پہلے اگر مسجد کے پاس غیر مسلم باجا بجاتے ہوئے گزرتا، تو مسلمان آمادۂ فساد ہو جاتے کہ اس نے مسجد کا احترام نہیں کیا۔ اور اب حال یہ ہے کہ مسلمان ہی مسجد کی ہر بے حرمتی کا کام کر ڈالتا ہے اور اس کو احساس نہیں ہوتا اور اس پر یہ فریاد ہوتی ہے کہ مسلمان مصیبتوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ آخر ہم غور کریں کہ ہم کس چیز میں اپنے آپ کو گھیر رہے ہیں۔

(محرم تا ربیع الاول ۱۴۲۰ھ/مئی تا جولائی ۱۹۹۹ئ/ماہنامہ ضیاء الاسلام اپریل ۲۰۰۴ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

احتساب سے گرانی

مجلّہ ’’المآثر‘‘ کا جب آغاز ہوا تھا، تو اس میں کتابوں کے تعارف وتبصرہ کا کوئی باب نہ تھا، اور ارادہ یہی تھا کہ اس عنوان سے یہ مجلّہ خالی رہے گا، اس وقت مصلحت پیش نظر تھی کہ کتابوں کے تعارف وتبصرے کے لئے ضروری ہے کہ زیر تبصرہ کتاب یا رسالہ کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے، اس پر اپنی رائے قائم کی جائے، اور پھر اس کے کھرے اور کھوٹے کو واضح کیا جائے، اور یہاں مدیر کا یہ حال ہے کہ وہ ایک مدرسہ کا مدرس ہے، تدریس کی مشغولیت تحریر سے کس قدر مانع ہے، وہ اہل تجربہ پر مخفی نہیں ہے، ایسی حالت میں ہر کتاب پڑھنا اور پھر اس پر تبصرہ کرنا ایک مشکل امر تھا، اس لئے خیال ہوا تھا کہ یہ باب سرے سے منعقد ہی نہ ہو تو بہتر ہے، ایک عرصہ تک اس پر عمل رہا، لیکن بعض حضرات، مجلّات وجرائد کے عام دستور کو پیش نظر رکھ کر کتابیں بھیج دیا کرتے تھے، ان سے معذرت کرنی پڑتی تھی، پھر ایسا بھی ہوا کہ بعض اہم کتابوں پر تبصرے شائع بھی ہوئے، اس نظیر کے سامنے آجانے کے بعد معذرت مشکل ہوگئی، لیکن ہمارے لئے یہ ایک دشوار کام ہوگیا، کیونکہ اس کے لئے ہر کتاب پڑھنی ضروری ہے، اور اس کا موقع ملتا نہیں۔ اس لئے تبصرے میں تاخیر ہونے لگی، اور اصحاب تصنیف کو شکایتیں ہونے لگیں، اسی خیال سے زیر نظر شمارہ میں اعلان تحریر کردیا گیا کہ اب یہ باب پھر بند کیا جاتا ہے، یہ اعلان اس وقت لکھا گیا تھا جبکہ ابھی پچھلا شمارہ چھپ کر نہیں آیا تھا، اس کے کچھ دنوں کے بعد پچھلا شمارہ چھپ کر آیا، اس میں ایک کتاب پر تبصرہ مدیر کے قلم سے آیا ہے۔ یہ تبصرہ مدیر نے اپنی دانست میں دیانت داری کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر لکھا ہے، لیکن مصنف کی منشاء اور ان کی غرض کے خلاف ہے، تبصرہ نگار

نے پوری کتاب محنت کر کے پڑھی ہے، متعدد بار پڑھی، اس نے کوشش کی کہ تبصرہ مصنف کی منشاء کے مطابق ہو، جس کتاب کا ترجمہ کیا گیا ہے، اور اس کی تلخیص کی گئی ہے، وہ دوسری جگہ سے حاصل کی، مگر اب اس کو کیا کہئے کہ تبصرہ نگار اس کوشش میں کامیاب نہ ہوا کہ اسے مصنف کی خواہش پر ڈھال سکے، پس جیسا اس نے پایا بغیر کسی مداہنت کے اسے پیش کر دیا، اور وہ اس خوش فہمی میں مبتلا رہا کہ مصنف اپنے اغلاط پر متنبہ ہو کر خوش ہوں گے، اور کھلے دل سے اس کا اعتراف کریں گے، یا اگر مجھ سے غلطی ہوئی ہے تو سمجھائیں گے، لیکن افسوس ایسا نہ ہوا، اس تبصرہ سے مصنف کو رنج ہوا، اس رنج نے غصہ کی شکل اختیار کی، پھر وہ غصہ کاغذ کے صفحات پر بکھر گیا، ان کا خط آیا، جس میں غصے کے شرارے بہت تیز ہیں، تبصرہ نگار کو اس خط سے کوئی تکلیف اور رنج نہیں ہے، مصنف مجھ سے ہر اعتبار سے بڑے ہیں، انھیں حق ہے کہ وہ اپنے چھوٹے پر خفا ہوں، اسے جھڑکیاں سنائیں اور پلائیں، تاہم جی چاہتا ہے کہ ان سے عرض کروں کہ:

> ''محترم! یہ آپ کی شانِ بلند کے منافی ہے کہ کسی نے آپ کو لقمہ دے دیا، تو آپ اسے برداشت نہ کریں، آخر حافظ سے غلطی ہوتی ہے، پیچھے سے اس کا شاگرد بھی اسے لقمہ دیتا ہے، تو وہ بشاشت سے قبول کرتا ہے، اسے اپنی توہین نہیں سمجھتا، یہاں بھی ایک چھوٹے نے تصحیح کرنی چاہی ہے، تو آپ ناراض کیوں ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھیں، یہ تو اس لئے ہوا کہ آپ نے ترجمہ وتلخیص کی ناہمواریوں پر توجہ نہین فرمائی تھی، اب انشاء اللہ آپ خود بھی اس راہ پر ہوشیار ہو کر چلیں گے، اور دوسرے بھی، جو اس میدان میں بے سوچے سمجھے کود پڑتے ہیں، انھیں سوچنے اور سمجھنے کا موقع ملے گا۔''

بہر حال تبصرہ نگار تو یہی کرے گا، جو اس نے کیا ہے، لیکن اب جو غصہ کے طوفان کی زد میں وہ آیا ہے تو اس سے یہ رائے مزید پختہ ہوگئی ہے کہ یہ باب ہی بند رہے تو مناسب ہے۔

قومیں اور افراد جب اقبال مند ہوتے ہیں، تو وہ اپنا احتساب خود کرتے ہیں، وہ اپنے خیالات اور اعمال کو مستند سمجھ کر مطمئن نہیں ہوجاتے، بلکہ ہر وقت جائزہ لیتے رہتے ہیں، اور جو کچھ اس میں شریعت اور عقل کی میزان پر پورا اترتا ہے، اسے باقی رکھتے ہیں، اور باقی کو حذف کر کے توبہ واستغفار کرتے ہیں، اور اگر از خود اپنی کوئی خرابی سمجھ میں نہیں آتی، اور دوسرا کوئی اس پر متنبہ کر دیتا ہے، تو اسے شکرگزاری کے ساتھ قبول کرتے ہیں اور احسان مند ہوتے ہیں۔

دار العلوم دیوبند کے پہلے شیخ الحدیث اور صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہٗ جنھیں ان کے علوم کی وسعت وگہرائی کی وجہ سے شاہ عبد العزیز ثانی کہا جاتا تھا، ان کے تلمیذ ارشد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ نے بار بار بیان کیا ہے، جب کوئی انھیں ان کی کسی غلطی پر تنبیہ کر دیتا تھا، تو نہایت شکرگزاری سے بار بار اس کا اعتراف کرتے تھے، اور غالبًا اسی کا اثر تھا کہ حضرت تھانوی علیہ الرحمہ نے ...... جو کہ نہایت کثیر التصانیف بزرگ ہیں ...... اپنے یہاں ایک مستقل سلسلہ ''ترجیح الراجح'' کا قائم کر رکھا تھا، اور کہیں سے کوئی بھی کسی چیز پر گرفت کرتا تھا، تو اسے بغور ملاحظہ فرماتے اور اس کی رائے کو درست پاتے تو بے تکلف اس کا اعتراف کر کے اپنے سابق قول سے رجوع فرمالیتے۔ حضرت مولانا سیّد سلیمان ندوی علیہ الرحمہ نے بھی رجوع واعتراف کے نام سے ایک مضمون تحریر فرمایا تھا جس میں اپنی متعدد رایوں سے برملا رجوع کیا، اہل حق کا ہمیشہ یہی شعار رہا ہے، غلطی کے اعتراف سے آدمی کو بلندی ملتی ہے۔

اور قومیں جب زوال سے دوچار ہوتی ہیں، تو انھیں اپنی غلطی ہی ہنر معلوم ہونے لگتی ہے، انھیں بسا اوقات خیال ہی نہیں رہتا کہ ہم سے بھی کوئی غلطی ہوسکتی ہے، جب یہ کیفیت ہوتی ہے تو قومیں ٹھٹھرتی چلی جاتی ہیں، ترقی کی راہیں یکسر مسدود ہوجاتی ہیں، اور اس کا نقطۂ عروج یہ ہوتا ہے کہ دوسروں کی روک ٹوک اور تنبیہ کو توہین وتذلیل سمجھا جانے لگتا ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهٗ

جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ (سورۃ البقرۃ:۲۰۶) اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو، تو اس کا غرور گناہ پر آمادہ کر دیتا ہے، اس کو جہنم کافی ہے، اور بلاشبہ وہ برا ٹھکانہ ہے۔

یہ حال تو ایک فسادی کا ہے، چرب زبان منافق کا ہے، لیکن ہر شخص کو غور کرنا چاہئے کہ یہ مذموم صفت، جسے اللہ تعالیٰ نے اتنے اہتمام سے ذکر فرمایا ہے، کہیں وہ میری شخصیت کو داغ دار تو نہیں بنا رہی ہے، اگر آدمی اپنا احتساب خود کرے تو برابر آگے بڑھتا رہے گا، اور دوسروں کو انگلی اٹھانے کا موقع نہیں ملے گا۔ ہمارے ملک میں مسلمانوں کی یہ نفسیاتی کمزوری عام ہے کہ جب کوئی حادثہ ہم پر گزرتا ہے، جس میں ہم جانی مالی نقصان میں مبتلا ہوتے ہیں تو اس کے اسباب ہم اپنے سے باہر دوسری قوموں اور دوسرے افراد میں تلاش کرتے ہیں، اور اپنے کو ایک طرف الگ رکھ دیتے ہیں، حالانکہ غلطی ہمارے اندر بھی ہوتی ہے، اسی پر نگاہ رکھیں، ہر لحاظ سے ہمارے لئے بہتر ہوگا۔

اس موقع پر مسلمان اخبارات اور جرائد کا رول بھی وہی ہوتا ہے، جو عام لوگوں کا رُجحان ہوتا ہے، یعنی یہ بھی چیخ وپکار کو دوسروں کی ہی غلطیاں دکھاتے رہتے ہیں اور قوم کو معصوم قرار دیتے ہیں، اس طرح کی غلطی کی اصلاح کا خیال ہی نہیں ہوتا، حوصلہ مندی کی بات یہ ہے کہ اپنی غلطی پر نظر رکھی جائے، اور اس سے بلند تر بات یہ ہے کہ دوسروں کے ٹوکنے پر اعترافِ قصور کر لیا جائے۔

(رجب تا رمضان ۱۴۲۰ھ/نومبر، دسمبر ۱۹۹۹ء، جنوری ۲۰۰۰ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ فقہی سیمینار؟

زمانے کے فیشن کے لحاظ سے اور یورپین قوم کی تقلید میں اس دور میں اہل اسلام نے بلکہ اہل علم نے بہت سی وہ چیزیں قبول کرلی ہیں، اور انھیں رواج دے دیا ہے، جنھیں اسلام کی فطرت اور اسلامی تعلیمات سے مناسبت نہیں ہے، لیکن مصلحت، جدید دور کے تقاضے، وقت کی مجبوری اور نہ جانے کیا کیا نام لے کر انھیں اسلام سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، انشورنس، بینک کا نظام، لڑکیوں کی اقامتی درسگاہیں وغیرہ، یہ چیزیں اسلام کے مزاج سے میل نہیں کھاتیں، مگر ان کے لئے مصلحتوں کا انبار لگایا جاتا ہے، تاکہ کوئی ٹوک نہ سکے، کچھ یہی حال آج کل کے سیمیناروں اور کانفرنسوں کا معلوم ہوتا ہے، چاہے وہ فقہ پر سیمینار ہو یا حدیث وقرآن پر، یہ ہے تو انگریزوں کی تقلید! مگر اسے جوڑ دیا جاتا ہے امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کی مجلس علم کے ساتھ! حالانکہ کہاں ان کی مجلس درس، اور ان کے شاگردوں کی مسلسل ان کی خدمت میں حاضری اور بحث وتحقیق؟ اور کہاں یہ دوتین روز کے لئے چند متفرق لوگوں کا اجتماع؟ جن کے ذوق الگ، اور جن کے مبلغ علم کا کچھ پتہ نہیں، اجتماع سے پہلے اپنی اپنی رائیں لکھ کر لے آئے، مختلف مجلسوں میں باتیں کی، اور بس پھر ختم!

حقیقت یہی ہے کہ یہ سب نئے زمانے کی پیداوار ہیں، ان کے فوائد کم اور نقصان زیادہ ہیں، ہر طرح کے لوگ ان سیمیناروں میں اکٹھا کرلئے جاتے ہیں، ایسے لوگ جن پر مصالح زمانہ کا غلبہ ہوتا ہے، وہ دلائل سے تعرض کرنے کے بجائے جذبات ومصالح کی رعایت ضروری سمجھتے ہیں، کچھ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں، جو دلائل کی خبر رکھتے ہیں، مگر یہ

کھچڑی جیسا مجمع کس حد تک صحیح نتیجے تک پہونچتا ہے، یہ قطعاً مشکوک ہے، اور اس پر طرہ یہ کہ سوالنامہ اس طرح مرتب کیا جاتا ہے کہ اس میں مفروضہ مصائب ومشکلات کو اہتمام سے ذکر کرکے جواب دینے والوں کے لئے ایک راہ متعین کردی جاتی ہے، اس کے بعد اگر دلائل اس کے خلاف بھی ہوں، بہت سی مصلحتیں اس کے منافی بھی ہوں تب بھی جواب دینے والا ادھر متوجہ نہیں ہوتا، یا اس کی الٹی سیدھی تاویلیں کرتا ہے۔

۱۱؍تا۱۴؍فروری ۲۰۰۰ء بارہواں فقہی سیمینار منعقد ہوا، اس میں ایک سوال حالت نشہ میں طلاق کے متعلق تھا، عام طور پر صحابہ کرام اور ائمہ عظام علیہم الرضوان والرحمۃ اس بات کے قائل ہیں کہ شراب یا کسی بھی حرام نشہ آور چیز کو اگر کسی نے اپنی خواہش ومرضی سے استعمال کیا، اور اس سے نشہ پیدا ہوا تو اس حالت کی دی ہوئی طلاق واقع ہوجاتی ہے، صحابہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نشہ کی حالت میں دی ہوئی طلاق نہیں پڑتی۔ چاروں ائمہ میں سے ہر ایک اس کا قائل ہے کہ پڑجاتی ہے، امام شافعیؒ اور امام احمد سے ایک ایک قول اس کے خلاف کا بھی ہے، لیکن امام شافعی کا قول راجح طلاق پڑجانے کا ہے۔ چند دوسرے ائمہ جن کی فقہ مدوّن نہیں ہے، مثلاً امام لیث بن سعد اور اسحاق بن راہویہ سے منقول ہے کہ نشہ والی طلاق نہیں پڑتی، مگر ان کے علاوہ تمام صحابہ وائمہ طلاق پڑجانے ہی کے قائل ہیں، عموماً اسی پر فتویٰ دیا جاتا ہے، اور قرآن کریم کی آیت جو تحریم شراب سے متعلق ہے، اس کے ساتھ بھی مناسبت اسی کو ہے کہ طلاق پڑجاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شراب کی حرمت شدیدہ کو بیان کرنے کے بعد اس کی حکمت بھی قرآن کریم میں ارشاد فرمائی ہے: إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطٰنُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ ۔ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان شراب اور جوئے کی وجہ سے عداوت اور کینہ ڈال دے، اور اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے، تو کیا اس سے تم باز آتے ہو۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ شراب پی کر بھی آدمی مکلّف ہوتا ہے، اس کے تصرفات واعمال کو عداوت وبغض کا سبب قرار

دیا گیا ہے، اور یہ کہ اس سے ذکر الٰہی اور نماز سے رکاوٹ ہوتی ہے، اس سے باز رہنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ پورے طور پر مکلّف ہے، پھر اس میں طلاق کیوں واقع نہ ہوگی۔ دوسرے یہ کہ عداوت وبغضاء کی بہت سی صورتوں میں نمایاں ترین صورت میاں بیوی کے درمیان تفریق ہے، اگر اس حالت میں طلاق واقع نہ ہو تو شراب عداوت وبغضاء کا سبب کہاں ہوئی؟ اس خاص مسئلہ میں تو بے اثر ثابت ہوئی۔

خیر یہ تو ایک علمی بحث ہے، مجھے عرض کرنا ہے کہ ایک ایسا مسئلہ جس میں عموماً تمام صحابہ کرام کا اتفاق ہے، اکثر ائمہ متفق ہیں اور اسی فتویٰ دیا جاتا رہا ہے۔ سوالنامہ جب مرتب کیا گیا تو مفتی کا ذہن پوری قوت کے ساتھ بنایا گیا کہ وہ خواہی نخواہی عدم وقوع کا فیصلہ کرے، نشہ کی حالت میں طلاق کا ایسا بھیانک منظر بنایا گیا، جیسے اگر اس حالت کی طلاق کو نافذ مان لیا جائے تو مرد تو کم عورتیں اور اس کے معصوم بچے سخت مصیبتوں کا شکار ہوں گے، پس مسلم معاشرے کو مصائب سے بچانے کے لئے مان لینا چاہئے کہ نشہ کی حالت میں دی ہوئی طلاق نہیں پڑتی۔

سمجھ میں نہین آتا کہ اگر یہ فتویٰ دے بھی دیا جائے، تو عورت اور اس کے معصوم بچے مصائب سے کیوں کر بچ جائیں گے؟ کیا اس فیصلے سے شراب نوشی کی حوصلہ افزائی نہیں ہوگی؟ کہ صاحب پیتے رہو، بکتے رہو، نشہ کی حالت میں عورت کے ہاتھ سے نکل جانے کا ندیشہ تھا، اب وہ بھی نہیں رہا۔ شوہر طلاق طلاق کہتا رہے، اور نشہ کا عذر کر کے بیوی کو نشۂ شراب کا نشانہ بناتا رہے، کیا شراب نوشی کے عادی شخص کے ساتھ بندھے رہنا عورت کے لئے بڑی مصیبت نہیں ہے، ہم تو دیکھتے ہیں کہ شراب کا عادی نشہ کی حالت میں اپنی بیوی اور اپنے بچوں کے لئے مستقل مصیبت ہوتا ہے، اس کی شکایت تو اتنی عام ہے، نشہ کی حالت کی طلاق اس کے مقابلہ میں کالعدم ہے، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ شراب کی عادت چھڑانے کی تدبیر کی جاتی، لیکن ہوا یہ کہ اس کی جڑ اور راسخ ہوگئی، پھر غور کرنے کی بات ہے کہ نشہ کی حالت میں دی ہوئی طلاق کو تو آپ نے نہیں مانا، تو اگر وہ اس حالت میں کسی کو گالی دے، کسی کو

تہمت لگائے، کسی سے مار پیٹ کرے، کسی کو قتل کردے اور شراب کے نشہ میں یہ سب کچھ ہوتا ہے، طلاق دینے سے زیادہ ہوتا ہے، تو اس فساد کا انسداد کیسے ہوگا؟ کیا یہاں بھی یہی کہا جائے گا کہ نشہ کی حالت میں وہ ہوش وخرد سے محروم تھا، لہٰذا اس کے ان تصرفات کو نافذ قرار نہ دیا جائے، حقیقت یہ ہے کہ معاشرہ کا فساد طلاق سے نہیں، شراب نوشی سے ہے، طلاق کی نفی مت کیجئے، شراب نوشی سے نہی کیجئے۔

ایک بڑی مصیبت یہ ہے کہ اس طرح کی مجلسوں سے اخبار والوں کو بڑی دلچسپی ہوتی ہے، وہ آدھی بات سنتے ہیں اور لے بھاگتے ہیں، چنانچہ اچانک اخبار میں یہ بات آئی کہ ”نشہ کی حالت میں دی ہوئی طلاق واقع نہیں ہوتی، علماء کا فیصلہ“ فوراً ہر طرف اس کی گونج پھیل گئی، حالانکہ صورتحال یہ نہیں تھی، بہت سے علماء کو اس سے اختلاف تھا، چنانچہ دوسرے دن اس اختلاف کی بھی خبر آئی، مگر اس کا چرچا مغلوب رہا، اور پہلی خبر خوب گرم رہی، کیونکہ وہ لوگوں کے نفس اور تقاضے کے مطابق تھی، اور حقیقت بھی کچھ اسی طرح ہے کہ سیمینار کے ذمہ داروں کا رجحان عدم وقوع طلاق ہی کا ہے، اس لئے اس رجحان کو خوب آب وتاب حاصل رہی اور جس مسئلہ پر اب تک فتویٰ رہا ہے، اور جس کے قائل چند حضرات کو چھوڑ کر باقی تمام حضرات صحابہ وائمہ وعلماء کرام رہے، اسے کچھ دھندلا کر دیا گیا۔

پھر ایک بات یہ بھی قابل غور ہے کہ علماء کے درمیان مسائل میں علمی طور پر اختلاف تو ہوتا ہی رہتا ہے، بحثیں چلتی ہیں، لیکن عوام کے سامنے ایک صاف ستھرا، منقح فتویٰ لایا جاتا ہے، عوام کو ان اختلافات سے دور رکھنا چاہئے، ورنہ وہ دلائل تو سمجھیں گے نہیں، جو مسئلہ نفس کے مطابق ہوگا، اسے اختیار کر کے دوسرے کو غلط کہنا شروع کہہ دیں، اس طرح کے علمی اختلافات کو عوامی بنانے کا انجام اباحیت اور خواہش پرستی کے سوا کچھ نہیں، یہ معاشرہ کا بگاڑ کیا کچھ کم ہے؟ ابھی چند سال پہلے انشورنس کے مسئلے میں اسی طرح کی بے اعتدالی ہو چکی ہے۔

ان سیمیناروں کا حاصل اس کے علاوہ کیا ہے کہ کچھ علماء کو ایک خاص رجحان کے

تحت کچھ مطالعہ کی توفیق ہو جاتی ہے، عمومی کوئی فائدہ تو سمجھ میں نہیں آتا۔ ان سیمیناروں نے جو فیصلے صادر کئے ہیں، وہ وہی ہیں جن پر پہلے سے علماء فتویٰ دیتے چلے آئے ہیں، اور جو مسائل مختلف فیہ رہے ہیں، ان میں بس عوام کے سامنے اختلاف آجاتا ہے کہ فلاں فلاں لوگ اس جانب کے قائل ہیں، اور فلاں فلاں لوگ دوسری جانب کے؟ سوال یہ ہے کہ اس اختلاف کو سامنے لانے کا کیا حاصل؟ کوئی فیصلہ تو سیمینار کر نہیں پاتا، ہاں اختلاف کو سامنے لاکر عوام کو اباحیت کا راستہ دکھا دیتا ہے، کہ جو پہلو آسان اور نفس کے مطابق ہو، اسے اختیار کر لیں، خواہ وہ دلائل کے لحاظ سے مرجوح ہو، خواہ اس کے قائلین اس درجہ کے نہ ہوں جس درجے کے دوسرے لوگ ہیں۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ عام مسلمانوں پر سے دین کی گرفت ڈھیلی ہو رہی ہے، بلکہ یہ بھی خیال پیدا ہو رہا ہے کہ لوگ دین کو خوامخواہ مشکل بنا رہے ہیں، ورنہ اس میں نفس کی خواہشات کی بھی بہت گنجائش ہے، اور یہ کہ علماء نے دین کو مشکل کر دیا ہے، ورنہ وہ تو ہمارے نفس کے تقاضوں کو پورا کرنے کا اہتمام کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

اس کا انجام یہ ہے کہ علماء متقدمین پر سے اعتماد اٹھتا جا رہا ہے، دین کی عظمت گرتی جا رہی ہے، کاش اس پر بھی غور کیا جاتا مسلمانوں کو مصائب و مشکلات کے نرغے سے بچانے اور معاشرے میں آسانیاں پیدا کرنے کے نتیجہ میں اگر دین اسلام ہی خواہشات نفس اور مسخ و ترمیم کے نرغے میں گھر جائے تو فرضِ اولین ہے کہ دین کی حفاظت کی جائے، اور معاشرہ کی اصلاح اس کے مطابق کی جائے، نہ کہ دین کی اصلاح معاشرے کے مطابق، کتنی افسوسناک بات ہے کہ ے

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

اور جو شخص بھی دلائل سے بے اعتنائی کر کے رفتارِ زمانہ کے تقاضوں کی رعایت کا اہتمام کرے گا، وہ ضرور قرآن کے بدلنے کے جرم میں ملوث ہوگا۔ **أعاذنا اللّٰہ منہا**

(شوال تا ذی الحجہ ١٤٢٠ھ ؍ فروری تا مارچ ٢٠٠٠ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقاضائے بندگی

دنیا کے مختلف مذاہب اور نظریات انسانی زندگی پر کس نقطۂ نظر سے غور کرتے ہیں ، اور اس کا کیا محور و مقصد متعین کرتے ہیں، اور پھر اس کی بنیاد پر انسانی زندگی کو کن کن راہوں پر گزارتے ہیں، یا گزارنا چاہتے ہیں؟ یہ تلاش و تحقیق کا ایک وسیع میدان ہے۔ ہم مسلمانوں کو جو دین و مذہب خالق کائنات جل مجدہ کی جانب سے آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے مقدس واسطہ سے ملا ہے، ہمارا مرکز نگاہ وہی ہے، ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ اسلام نے انسانی زندگی کا کیا مقصد و موضوع متعین کیا ہے؟ اور اس نے زندگی کے کن کن مرحلوں میں کیا کیا ہدایات جاری کی ہیں؟

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا: قُلْ إِنَّ صَلَاتِيُ وَنُسُكِيُ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ (سورۃ الانعام:) تم کہہ دو کہ بلاشبہ میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت سب اللہ کے لئے ہے، جو تمام عالم کا رب ہے۔

اس آیت پر سرسری طور سے بھی گذرنے والا بداہۃً سمجھ لے گا کہ انسان کی زندگی اور اس کی موت، سب کا محور و مقصد اللہ کی ذات ہونی چاہئے۔ وہ جو کچھ کرے اللہ ہی کے لئے کرے، کوئی اور غرض اس کے پیش نظر نہ ہو۔ یہ مقصد اگر نگاہوں کے سامنے رہے تو گناہوں اور نافرمانیوں کی نجاستیں خود بخود دور ہو جائیں گی، کیونکہ کوئی گناہ اللہ کے لئے کیا جائے، ممکن ہے ہی نہیں! جس نے اپنی زندگی اللہ کی ذات سے وابستہ کر دی، وہ نافرمانیوں کی آلودگی سے صاف بچ نکلا۔ اس سے اگر کبھی کوئی قصور ہوگا تو معافی تلافی کے بغیر اسے چین نہ ہوگا۔

یہ وہ مقصد زندگی ہے جو ہر لحہ انسانیت کو ترقی دیتا رہتا ہے۔ اس کی صرف عبادتیں ہی وجہ خوشنودیٔ پروردگار نہیں رہتیں، بلکہ اس کی زندگی کا ہر لحہ سراپا عبادت بن جاتا ہے، اور جب یہی مقصد نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے تو اس کا ہر عمل بے روح ہو جاتا ہے۔ بڑی عجیب بات ہے کہ ایک وہ شخص جس نے اپنی عقیدت ومحبت کو اللہ کی بارگاہ میں اُستوار کیا ہو، وہ اس سے غافل ہو کر دوسری چیزوں میں الجھ جائے۔ انسان اپنی ذات وصفات کے لحاظ سے فانی ہے، لیکن جب اس کی نسبت ذات، حی وقیوم کے ساتھ درست ہو جاتی ہے تو بقاء ودَوام کی شان اس کے اندر بھی آجاتی ہے، اسی نسبت کو قائم کرنے اور اُستوار رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب نازل فرمائی، اپنے پیغمبر کو بھیجا، کہ وہ کتاب کی تشریح وتبیین کر کے ایک صاف ستھری شریعت پر لوگوں کو چلنا سکھائیں، یہی شریعت صراطِ مستقیم ہے اور اسی پر چل کر انسان نجاتِ ابدی کا مستحق ہوتا ہے۔ اس کے لئے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ انسان محض اپنی عبادت کو سنوارے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی عادات وحاجات اور ضروریات وتقاضوں کو بھی اسی دائرے میں رکھے جو شریعت نے متعین کیا ہے۔ انسان اپنی زندگی کے ہر رُخ سے معلوم ہو کہ خود مختار نہیں ہے بلکہ کسی کا غلام ہے، کسی کی بندگی ہی اس کی زندگی اور اس کی روح ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْناً وَّإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلاماً (الفرقان) رحمٰن کے بندے وہ ہیں کہ زمین پر تواضع سے چلتے ہیں، اور جب جاہل ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو سلامتی کی بات کہتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے! رحمٰن کے خاص بندوں کی جو پہلی قابل تعریف صفت حق تعالیٰ نے ذکر کی ہے وہ از قبیل عادات ہی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جہاں عبادات میں آدمی اللہ تعالیٰ کے احکام کا پابند ہے، وہیں عادات وضروریات میں بھی اسے اسی طریقہ کی پابندی کرنی ہے، جو حق تعالیٰ نے اپنے نبی کے ذریعہ ہم پر ظاہر کیا ہے۔

مسلمان تو اسے سوچ بھی نہیں سکتا کہ وہ کہیں بھی، کسی مرحلہ میں بھی آزادانہ چال چل سکتا ہے، اسے تو ہر قدم پر اپنے مالک ومولیٰ کی مرضی دیکھنی ہے، اور حقیقت میں یہی

غلامی و پابندی، اصل آزادی ہے، آدمی اپنے نفس کی خواہشات کا پابند ہو، اپنے معاشرے کے رسوم وقیود میں گرفتار ہو، کسی اپنے ہی جیسے انسان کی غلامی میں مبتلا ہو، شیطان کی گرفت میں جکڑا ہوا ہو، یہ واقعی غلامی ہے، ذلت ہے، انسانیت کی توہین ہے۔ اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ کی غلامی ہو، شریعت کے احکام کی پابندی ہو، ہر لحظہ اسے اپنے مالک ومولیٰ کے چشم وابرو کا انتظار ہو، یہ حقیقی آزادی ہے۔ آدمی اپنے گمانِ باطل کی بنیاد پر اس حقیقی آزادی سے گھبراتا ہے اور جو سرتاسر قید وبند ہے، اسے پسند کرتا ہے، لیکن اسے جلد ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ غلامی کیا ہے؟ اور آزادی کیا ہے؟

انسانی زندگی کے طبعی حاجات وضروریات کا دائرہ اچھا خاصا وسیع ہے، لیکن کوئی ضرورت وحاجت ایسی نہیں ہے جس کی تکمیل یا اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت ورہنمائی موجود نہ ہو، اور اس سے فائدہ اٹھا کر آدمی اسے خوشنودئ پروردگار کا سامان نہ بنا لے، لیکن اس حاجت وضرورت کو برتنے والا جب اللہ کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر اپنی خواہش کے مطابق برتتا ہے تو بسا اوقات اس کے اوپر وبالِ جان ثابت ہوتی ہے۔

انسانی ضروریات میں ایک اہم ضرورت جس کی شاخیں ذیل در ذیل ہیں، جس ایک حاجت کی تکمیل سے بہت سی حاجتیں سر اٹھاتی ہیں اور آدمی کو اپنی زندگی ان حاجات کی تکمیل میں جھونک دینی پڑتی ہے، بلکہ ہمارے دور میں تو انسان نے انھیں حاجات وضروریات کی تکمیل کو اپنی زندگی کا موضوع اور مقصد قرار دے لیا ہے۔ یہ وہ حاجت ہے جس کا عنوان ''نکاح'' ہے، نکاح انسانی زندگی کی ایک بنیادی اور طبعی ضرورت ہے، جس کی تکمیل بہر حال ضروری ہے، بقائے نسل انسانی کا انحصار اسی پر ہے۔ شریعت نے اس ضرورت کی تکمیل کا نہ صرف یہ کہ انتظام کیا ہے بلکہ ایسا انتظام کیا ہے اس کو عبادت بنا دیا ہے، اگر آدمی نکاح کے امور میں اس طریقہ کے مطابق مشغول ہو، جسے شریعت نے متعین کیا ہے تو امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کا یہ عمل نفل عبادات نماز اور روزے وغیرہ میں مشغول ہونے سے زیادہ افضل ہے، اور ایسا شخص شاید اس عابد وزاہد سے زیادہ اللہ کی خوشنودی سے

سرفراز ہوگا جو ہمہ دم نوافل میں اپنے آپ کو لگائے رہتا ہے۔

لیکن افراد ہوں یا قومیں، جب زوال کا شکار ہوتی ہیں تو وہی راہیں جو انھیں منزل کی کامیابی تک پہونچاتی ہیں، ان کے لئے منزل سے دوری کا سبب بن جاتی ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ ان راہوں کا رُخ بدل گیا ہے، نہیں! ان کا استعمال غلط ہو جاتا ہے۔ شریعتِ مطہرہ نے شادی اور نکاح کو ایک ہمہ گیر اور بنیادی ضرورت تسلیم کر کے اس کی تکمیل کا نہایت سادگی کے ساتھ انتظام کیا ہے، جس سے نہ کسی پر کوئی ناروا دباؤ پڑے اور نہ یہ کہ سرے سے اظہار خوشی ومسرت سے ممانعت ہو۔ نکاح کے معاملات بہر حال انسان کی زندگی میں ایک خوش گوار مرحلہ ہے، جس پر خوشی کا اظہار بجا ہے، وہ خود بھی خوش ہو اور دوسروں کو بھی اپنی اس خوشی میں شریک کرے۔ شریعت نے ان دونوں پہلوؤں کی رعایت کی ہے، سادگی تو یہ ہے کہ سیّدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ مدینہ طیبہ میں حضور اکرم ﷺ کی موجودگی میں نکاح کرتے ہیں اور اس طرح نکاح کرتے ہیں کہ ان کے اور سب کے مرکزِ عقیدت ﷺ کو بھی خبر نہیں ہوتی۔ نہ کوئی دھوم دھام، نہ بارات کا ہنگامہ، نہ کسی طرح کا سوانگ، بس ایک ضرورت تھی اسے پورا کرلیا، اور لطف یہ کہ جب رسول اللہ ﷺ نے نکاح کے متعلق کچھ آثار دیکھ کر خود ہی سوال کیا تب بتایا، مگر اللہ کے رسول ﷺ نے معلوم ہونے پر یہ تک نہیں فرمایا کہ کم از کم مجھے تو بتادیتے، میں نکاح کا خطبہ پڑھتا، ایجاب وقبول کراتا وغیرہ، کچھ نہیں فرمایا۔ آپ کی اس خاموشی نے اس بات کو متعین کردیا کہ سادگی ہو تو ایسی ہو، مگر ساتھ ہی ساتھ اس پہلو کی رعایت بھی فرمائی، کہ یہ ایک خوشی کا موقعہ تھا، اس میں دوسروں کو بھی شریک کرنا چاہئے تھا، تو فرمایا ولیمہ کرلینا چاہئے تھا، خواہ ایک بکری ذبح کر کے اس پر دعوت کردیتے۔

اس واقعہ سے نکاح کا سادگی کے ساتھ انجام پانا اور اس کے باوجود قدرے اہتمام کرنا دونوں کا پتہ چلتا ہے۔ اور یہی معیار ہے سادگی کا بھی اور اہتمام کا بھی! یعنی ابتداءً سادگی کے ساتھ رشتہ کرلینا، پھر جب بیوی شوہر کے گھر آجائے تو ولیمہ کرلینا۔ اس میں دعوت کا اہتمام کرلیا جائے تو مضائقہ نہیں ہے، بہتر ہے۔

لیکن اب تقریبِ نکاح کے جو احوال سامنے آتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شریعتِ اسلام کے علاوہ کوئی نئی شریعت وجود میں آ گئی ہے، جس کی پابندی اسی طرح کی جاتی ہے جیسی شریعتِ اسلامی کی پابندی کرنی چاہئے۔ اور یہ سب کچھ اس خدائی ہدایت نامے کے تحت نہیں جسے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے، جس پر سب مسلمانوں کا ایمان ہے، اس کے تحت نہیں بلکہ رسم و رواج کے اور جذبۂ نمود و نمائش کے تحت انجام دیا جاتا ہے۔ اب تو زبانوں پر نکاح کا سادہ اور مقدس لفظ بھی نہیں آتا، اسے شادی سے، بارات سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور شادی کا تصور آتے ہی دماغ میں وہ تمام خرافات اور فضولیات گردش کرنے لگتے ہیں جن کو لوگوں نے اس کے ساتھ جوڑ رکھا ہے۔ نسبت کے طے کرنے سے شروع ہو کر دولہن کے شوہر کے گھر آنے تک خرافات و لغویات کا ایک طوفان ہوتا ہے، جس میں دونوں خاندان اور ان کے متعلقین زیر و زبر ہوتے رہتے ہیں۔ نکاح کے باب میں شریعت نے ایک دعوتِ ولیمہ کی ہدایت کی ہے، مگر اب تو نہ جانے کتنی دعوتیں بطور ایجادِ بندہ کے رائج کر لی گئی ہیں۔ نسبت طے کرنے کا ہنگامہ لڑکی والوں کے یہاں بھی بپا ہوتا ہے اور لڑکے والوں کے وہاں بھی، اِدھر سے ایک فوج چڑھائی کر کے لڑکی والوں کے یہاں آ جاتی ہے اور دعوت کا جشن ہوتا ہے، اور لڑکی والوں کے یہاں سے ایک لشکر لڑکے والوں کے گھر پہونچتا ہے، بسا اوقات دیکھنے میں آتا ہے کہ اس میں دعوتِ ولیمہ سے بڑھ کر اخراجات ہوتے ہیں، اس سے ایک دوسرے پر اپنی دھاک جمائی جاتی ہے۔ نسبت طے ہو گئی، پھر بارات کی دھوم دھام ہے، جہیز کی فرمائشیں ہیں، لین دین کا ہنگامہ ہے، دعوت کا طوفان ہے، اور نہ جانے کیا کیا ہے؟ ہم گوشہ نشینوں کو سب کی خبر کہاں؟ مگر یہ سننے میں آتا ہے کہ اتنے لاکھ خرچ ہوئے، اتنے سامان لائے گئے، اتنے لوگوں نے دعوت کھائی، وغیرہ۔ یہ وہ دعوت ہے جس کا شریعت اسلامی کی کتابوں میں کوئی ذکر نہیں، علماء اسلام اسے جانتے ہی نہیں، اسے صرف وہ جانتے ہیں جو علم دین سے مَس نہیں رکھتے۔ لڑکی والوں کے یہاں فوج کی فوج چڑھا کر لے جانا، یا لڑکی والوں کا اپنے جذبۂ نمائش کے لئے بے جا اہتمام کرنا احکامِ شریعت کے کس خانے میں

ڈالا جائے؟ علماء حیران ہیں۔ نمود و نمائش کی تو ہر دعوت ممنوع ہے، اور یہ تو وہ دعوت ہے جس کا ذکر ہی سرے سے نہیں ملتا۔ اتنی بات کافی تھی کہ دولہا کے ساتھ چند لوگ لڑکی والوں کے گھر آجاتے، ان کی ضیافت وہاں ہوجاتی، نکاح ہوجاتا، اس کے بعد دولہن کو رخصت کرا کے لوگ لے آتے، پھر یہاں ولیمہ ہوجاتا، جس کو چاہتے بلاکر شریک کر لیتے، لیکن کس کس بات پر رویا جائے۔ دیکھا یہ جاتا ہے کہ بارات رنگ رلیوں کے ساتھ ہنگامہ مچاتی چل رہی ہے، لاؤڈ اسپیکر پر نظم خوانی ہورہی ہے، پٹاخے چھوٹ رہے ہیں، چند قدم کے فاصلے پر بارات جانی ہے، لیکن اس کے لئے گاڑیاں سج رہی ہیں، خاصا چکر کاٹ کر بارات جارہی ہے، کسی مسجد سے اذان کی آواز آرہی ہے، مگر بارات چل رہی ہے، آیا کرے اذان کی آواز، بارات کی صدا کچھ اور ہوتی ہے، بڑا دردناک منظر ہوتا ہے، مؤذن کی آواز دب جاتی ہے، جس کی آواز تو آواز قد بھی قیامت کے دن بلند ہوگا، اس کی آواز دب جاتی ہے اور نظم خوانیوں کی، آتش بازیوں کی آواز غالب رہتی ہے۔

اور جذبۂ اسلامی کا حال یہ ہے کہ ایک صاحب جو ماشاء اللہ صورت سے دیندار تھے، نماز بھی پڑھتے تھے۔ ان کے یہاں شادی طے پائی اور تمام رسوم وخرافات کے ساتھ ہونی طے پائی۔ ان کے ایک رشتہ دار نے اس لئے کہ شاید کچھ اصلاح ہوجائے، حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ کی کتاب ''اصلاح الرسوم'' انھیں دی کہ اس کا مطالعہ کرلیں، اس کتاب میں شادی بیاہ کی رسموں کا شریعت کی روشنی میں جائزہ لے کر اصلاح کی صورت بتائی گئی ہے، انھوں نے اُلٹ پلٹ کر ایک نظر کتب پر ڈالی اور یہ کہتے ہوئے واپس کردی کہ ابھی شادی بیاہ کی مشغولیت ہے، بعد میں پڑھوں گا۔ اس طرح لوگوں نے اپنے خودساختہ رسوم کو پکڑ رکھا ہے، کہ اس کی اصلاح کے سلسلے میں کچھ پڑھنا بھی گوارا نہیں ہے۔

مسلمانو! ہمارا دین ایک مکمل دین ہے، اس میں نہ اضافہ کی گنجائش ہے اور نہ کمی کرنے کی اجازت ہے، اس کے دائرے میں جو کچھ ہے وہ اللہ کے لئے ہے، اور اس

دائرے سے باہر نکلئے تو محض دنیا ہے، جو ہمارے مقصود وموضوع کے خلاف ہے، اللہ کی خوشنودی اسی دائرے میں ہے جسے شریعت نے متعین کردیا ہے، اس کے باہر کوئی چیز قابل قبول نہیں ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللهِ الْإِسْلَامَ، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ کے نزدیک دین محض اسلام ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بھی دین لائق اعتنا نہیں ہے۔ فرمایا: وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْناً فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ (آل عمران: ۸۵) جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرے گا، وہ ہرگز قبول نہ ہوگا، اور ایسا شخص آخرت میں خائب وخاسر ہوگا۔ پس اے اللہ پر اور دین اسلام پر ایمان رکھنے والو! اس ایک دین کے علاوہ کسی اور طریقے کی طرف نظر نہ اٹھاؤ، اسی میں عزت ہے، اسی میں بلندی ہے۔ نکاح کی تقریب میں بھی اسی دین کی ہدایات کو سامنے رکھو اور دل کی خوشی اور انشراح کے ساتھ انھیں ہدایات پر کاربند رہو۔ نکاح میں برکت بھی ہوگی اور دنیا وآخرت میں سرخروئی بھی ہوگی۔ **انشاء اللہ**

(ج: ۹، ش: ۲، ربیع الثانی، جمادی الاولیٰ، جمادی الاخریٰ ۱۴۲۱ھ / اگست، ستمبر، اکتوبر ۲۰۰۰ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ظلم وطغیان کا جواب

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے کہ: **وَلَا تُجَادِلُوْا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ إِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ** (یعنی اہل کتاب سے اسی طریقے پر جھگڑو جو بہتر ہو، مگر ان میں جو بے انصاف ہیں) **إِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا** پر علامہ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں: **أي حادوا عن الطريق وعموا عن واضح المحجة وعاندوا وكابروا فحينئذٍ ينتقل من الجدال إلى الجلاد**، (ج:۴، ص:۶۶۲) یعنی وہ لوگ جو جادۂ حق سے انحراف کریں، اور واضح دلائل کے ہوتے ہوئے اندھے بن جائیں، اور عناد ومکابرہ میں گرفتار ہوجائیں، ان کے حق میں جدال احسن سے جلاد (ضرب وقتل) کی طرف منتقل ہوا جاسکتا ہے۔ علامہ شبیر احمد عثمانی اس آیت کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

> ”مشرکوں کا دین جڑ سے غلط ہے، اور اہل کتاب کا دین اصل سے سچا تھا، تو ان سے اس طرح مت جھگڑو کہ جڑ سے ان کی بات کاٹنے لگو، بلکہ نرمی، متانت، خیر خواہی اور صبر وتحمل سے واجبی بات سمجھاؤ، البتہ جو ان میں صریح بے انصافی عناد اور ہٹ دھرمی پر تل جائے، اس کے ساتھ مناسب سختی کا برتاؤ کرسکتے ہو، آگے چل کر ایسوں کو سزا دینی ہے۔ (ص:۵۲۱، العنکبوت)

یہ آیت تمام اہل ایمان کو ہدایت کرتی ہے کہ کسی مسئلہ میں اختلاف کرنے والوں کے ساتھ، خواہ ان کا اختلاف قطعی طور پر حق وصداقت کے خلاف ہو، بحث ومناظرہ اور گفتگو اور جدال کا وہی طریقہ اختیار کرنا چاہئے جو بہتر ہو، جس میں مخاطب کی دل آزاری نہ ہو، لب ولہجہ سخت نہ ہو، بات ایسی ہو جو دل میں اتر جائے، لیکن یہ ہدایت اسی وقت تک ہے جب تک مخاطب کی جانب سے ضد وعناد، ہٹ دھرمی اور بے جا بحث وجدال کا ظہور نہ ہو، وہ خود بھی شرافت کا دامن کسی درجہ میں تھامے ہوئے ہو، لیکن اگر وہ بے انصافی کی راہ اختیار کرتا

ہے، ضد اور تشدد کا معاملہ کرتا ہے، تو پھر اس کے ساتھ نرم رویہ کی ہدایت نہیں ہے، کیونکہ بعض طبیعتیں اس حد تک حق سے منحرف ہو جاتی ہیں کہ ان پر نرم کلام اور نرم معاملہ کا کوئی اثر پڑتا ہی نہیں، تو ایسے لوگوں کے ساتھ سختی کا معاملہ کرنا، بسا اوقات ضروری ہو جاتا ہے۔ ان سے ترک تعلق، ان کی زجر و توبیخ اور علانیہ ان کی باصرار تردید، یہ سب سختی کے مظاہر ہیں۔ ایسا دو وجہ سے کرنا ضروری ہوتا ہے، اول اس لئے کہ شاید اس سختی کے خوف کی وجہ سے وہ راہِ حق کی طرف پلٹ جائیں۔ دوسرے یہ کہ جو لوگ صحیح راہ پر ہیں، لیکن انھیں علم میں رسوخ نہیں ہے، ان کے بارے میں اندیشہ ہوتا ہے کہ ان بے انصافوں سے کہیں متاثر نہ ہو جائیں، تو جب ان کے ساتھ سخت لب ولہجہ اختیار کیا جاتا ہے اور ان کی تادیب کی جاتی ہے، تو عوام الناس کو ان کی قباحت و شناعت خوب واضح ہو جاتی ہے، اور وہ ان سے پرہیز کرتے ہیں، ورنہ اگر ان باطل پسندوں سے خوشامدانہ برتاؤ رکھا گیا تو اسی راہ سے وہ حق پرستوں کے طبقات پر حملہ آور ہوں گے، جو لوگ انسانوں کی نفسیات اور حق و باطل کی معرکہ آرائی پر نگاہ رکھتے ہیں انھیں یہ بات بخوبی معلوم ہے۔

قرآن پاک میں رسول اللہ ﷺ کو ہدایت کی گئی کہ: **يَـاأَيُّهَا النَّبِيّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْـمُنَافِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ** (اے نبی کفار اور منافقین سے جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے) یہاں اللہ تعالیٰ نے جہاد اور سختی کا حکم جیسے کفار کے حق میں دیا ہے، ویسے ہی منافقین کے حق میں بھی دیا ہے، حالانکہ منافقین وہ ہیں جو اپنے متعلق ایمان کا دعویٰ رکھتے ہیں، اور مسلمانوں کے معاشرہ میں گھلے ملے رہتے ہیں، لیکن ان کے بارے میں جہاد اور سختی کا حکم دیا گیا ہے، تو اگر آج بھی کوئی فرد یا فرقہ جادۂ حق سے انحراف کرتا ہے اور بے انصافی کی راہ چلتا ہے، اور اس کے اندر نفاق کے خصائل و آثار موجود ہیں، تو ان سے بحث و گفتگو میں نرم لہجہ کی پابندی ضروری نہیں، **وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ** کے حکم سے تو ان پر سختی متعین ہو جاتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ: **أربـع مـن كن فيه كان منافقاً خالصاً ومـن كـانـت فيـه خصلة منهن كانت فيه خصلة من النفاق حتى يدعها، إذا**

أوتمن خان، وإذا حدث كذب، وإذا عاهد غدر، وإذا خاصم فجر، (متفق عليه، مشكوٰة شريف، باب الكبائر وعلامات النفاق)

چار باتیں جس میں ہوں گی وہ خالص منافق ہے، اور جس میں ان میں کوئی ایک بات ہوگی، اس میں نفاق کی ایک خصلت ہوگی، جب تک وہ اسے چھوڑ نہ دے۔ ١۔ امانت میں خیانت کرتا ہو، ۔٢۔ بات کرتا ہوتو جھوٹ بولتا ہو۔٣۔ معاہدہ کرکے دھوکا دیتا ہو۔٤۔ جھگڑے میں راہ حق سے انحراف کرجاتا ہو۔ ظاہر ہے کہ جس فرد میں یا جس فرقہ میں بہ حیثیت مجموعی ان چار باتوں یا ان میں سے چند یا ایک بات کا غلبہ ہو، بلاشبہ وہ سخت برتاؤ کا مستحق ہوگا۔

کافروں کا ذکر نہیں، اہل اسلام میں جتنے فرقے ایسے پیدا ہوئے، جو راہِ حق سے ذرا بھی منحرف ہوئے، ان میں مجموعی حیثیت سے ان چاروں خصلتوں یا ان میں سے کسی ایک کا غلبہ رہا ہے، خواہ وہ پاکدامنی کے کتنے ہی لمبے چوڑے دعوے کرتے ہوں۔

موجودہ دور میں اسلام کے اندر جتنے فرقے سر اٹھا رہے ہیں، اور ان کی سرگرمیوں کی وجہ سے اسلام کا سر نیچا ہو رہا ہے، ان میں نمایاں ترین نام اس فرقہ کا ہے، جو خود کو ’’اہل حدیث‘‘ اور ’’سلفی‘‘ کہتا اور کہلواتا ہے، لیکن اگر حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ نہ ’’سلفی‘‘ ہے، نہ ’’اہل حدیث‘‘! سلفی تو اس لئے نہیں کہ ان کی سیرت و کردار کو سلف صالح سے کوئی نسبت نہیں ہے، جیسے بریلوی اپنے آپ کو ’’اہل سنت والجماعت‘‘ کے عنوان سے سجاتے ہیں، حالانکہ وہ درحقیقت ’’بدعت‘‘ کے علمبردار ہیں، ایسے ہی یہ لوگ سلف کے طرز و انداز سے باغی ہیں، مگر خود کو ’’سلفی‘‘ کہتے ہیں، اور ’’اہل حدیث‘‘ قدیم اصطلاح میں صرف ان حضرات کو کہا جاتا تھا جو علم حدیث کے ماہر ہوا کرتے تھے، اگر ان کی اولاد علم حدیث سے تعلق نہیں رکھتی تو اس کا شمار اہل حدیث میں نہیں ہوتا تھا، لیکن اس دور کے اہل حدیث کو علم حدیث سے خواہ بالکل مس نہ ہو، نہ ان کو نہ ان کی اولاد کو، مگر یہ نسل در نسل ’’اہل حدیث‘‘ کا سرنامہ لگائے رہتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ ان کی شناخت عدم تقلید ہے، اس لئے یہ غیر مقلد ہیں، اور عدم تقلید

کے لوازم میں ائمہ وعلماء کی بے احترامی اور ان کی شان میں گستاخی ہے، چنانچہ اس فرقہ کا یہی امتیاز ہے، اپنے اس امتیاز کو باقی رکھنے کے لئے انھیں جھوٹ بھی بولنا پڑتا ہے، خیانت بھی کرنی پڑتی ہے، دھوکا بھی دینا پڑتا ہے، اور اپنی زبان وقلم سے نکلی ہوئی بات کو ثابت کرنے کے لئے فجور کا بھی مرتکب ہونا پڑتا ہے۔ (ان کی چیزوں کی تفصیل دیکھنی ہو تو رسالہ زمزم (دوماہی) مرتبہ: مولانا محمد ابوبکر غازی پوری، محلّہ سیّدواڑہ، غازی پور کے شمارے اور مولانا کی دوسری کتابیں جو غیر مقلدین کے رد میں لکھی گئی ہیں، ملاحظہ فرمائیں)

مجلّہ المآثر نے غیر مقلدوں کے سلسلے میں کبھی مداہنت کا معاملہ روا نہیں رکھا ہے، جب جیسی ضرورت ہوئی، ان کا تعاقب کیا گیا ہے، تاہم غیر مقلدوں کی جارحیت اور ان کے لب ولہجہ سے اگر ہماری تحریروں کا موازنہ کیا جائے تو ہماری تحریریں پاسنگ کی حیثیت نہیں رکھتیں، ان کا سا دلخراش لہجہ، ان کی سی دل آزار باتیں اور ان کی سی پینترا بازیاں اگر ہم کوشش بھی کریں تو کبھی ہم اس میں کامیاب نہ ہوسکیں گے۔ تاہم ہمارے بعض اکابر کو ہمارا اتنا لب ولہجہ بھی پسند نہیں آتا، بعض بزرگوں نے فرمائش بھی کی کہ غیر مقلدوں کے مقابلے میں یہ لب ولہجہ نہ اختیار کیا جائے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس فرقہ کی جارحیت اتنی بڑھی ہوئی ہے، اور اس کی آفات چارسو اتنی پھیل گئی ہیں کہ ہر طرف فریاد مچی ہوئی ہے۔ ہندوستان کے جس گوشے میں جانے کا اتفاق ہوا ہے ہر جگہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلفی فرقہ مسلمانوں کے درمیان تفرقہ ڈالنے کا مقدس فریضہ انجام دے رہا ہے۔ ۱۴۱۷ھ میں اللہ تعالیٰ نے حج کی سعادت بخشی، تو وہاں فیجی کے لوگوں سے ملاقات ہوئی، وہ بھی فریاد کناں تھے کہ غیر مقلدوں نے بڑا فساد برپا کر رکھا ہے، بس وہ شعر یاد آیا ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑے ہیں زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

جو جہاں ہے وہیں مصیبت میں ہے، کیا عرب کیا عجم، کیا سعودی عرب کیا خلیجی ممالک، کیا ہندوستان کیا پاکستان، کیا نیپال کیا برطانیہ، کیا امریکہ کیا افریقہ، ہر جگہ یہ فتنہ

سرگرم عمل ہے، اب ایسی صورت میں بھی ان کے ساتھ نرم لب ولہجہ اختیار کریں تو ان کے طغیان میں اور اضافہ ہوگا۔

ہمارے ایک بزرگ حضرت مولانا عتیق الرحمٰن صاحب سنبھلی دامت برکاتہم جو حضرت مولانا محمد منظور نعمانی علیہ الرحمہ کے عالی مرتبہ فرزند ہیں، اپنے والد گرامی کی حیات میں ایک عرصہ تک ماہنامہ الفرقان کے مدیر رہے ہیں، پھر علاج کے سلسلے میں لندن تشریف لے گئے، اور اب وہاں کے شہری ہیں۔ مولانا کا قلم ابتداء ہی سے نہایت سنجیدہ اور باوقار رہا ہے، الفرقان کی ادارت کے دور میں بھی ان کا شائستہ لب ولہجہ اور باوقار اُسلوب بہت ہی دل آویز اور مؤثر ہوتا تھا۔ میری طالب علمی کا دور تھا، اور میں بہت پابندی سے ان کی تحریریں پڑھتا تھا، ادھر جب سے وہ لندن میں مقیم ہیں، اسلام دشمن تمام طاقتیں اور ان کی ہر قسم کی سازشیں، جو اسلام کے حق میں مسلسل ہوتی رہتی ہیں، ان کے سامنے بے نقاب ہیں، باہر کے ان دشمنوں کے مخالفانہ عزائم اور اقدامات کی وجہ سے اندرونی فتنوں اور فتنہ پردازوں کے حق میں ان کے اسلوب اور لب ولہجہ میں مزید نرمی پیدا ہوگئی ہے، ایسی نرمی جیسی خاندانی جھگڑوں میں بیرونی شماتت کی وجہ سے خاندان کا بزرگ کسی فتنہ پرور، سنگدل آدمی کے سامنے عاجزانہ گفتگو کرلیتا ہے، اس کے پاؤں پر ٹوپی رکھ دیتا ہے، بلکہ اس کے پاؤں پکڑ لیتا ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ اپنا مخالفانہ رویہ ترک کردے، تاکہ خود بھی عافیت سے رہے، اور خاندان کی عزت بھی برباد نہ ہو، مگر وہ کبھی اتنا سنگدل ہوتا ہے کہ اس سے بھی نہیں پسیجتا، اپنی ترنگ میں رہتا ہے، اور اس بزرگ خاندان کے اس طرز عمل کو اور نرم کلامی کو اپنی خوشامد قرار دے کر اور سرکش ہوجاتا ہے۔

ایسا ہی کچھ حال یہاں بھی محسوس ہوتا ہے، مولانا موصوف کی غیر مقلدین کے متعلق متعدد تحریریں آچکی ہیں، اور سب کا انداز واسلوب وہی دلسوزی سے سمجھانے کا ہے۔ اگر آدمی کا دل پتھر نہ ہو تو ضرور اپنی حرکتوں پر شرمائے گا، مگر کیا ان کی تحریروں سے غیر مقلدوں کو کچھ احساس ہوا، ان میں کچھ نرمی آئی؟ ابھی کچھ دنوں پہلے ایک غیر مقلد سلفی کا ایک خط بعض

رسالوں میں شائع ہوا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ کسی غیر مسلم کو مسلمان بنانا اتنا اہم نہیں ہے، جتنا ایک سلفی کو اہل حدیث بنانا اہم ہے، اور فقہ کی کتابیں اتنی نجس ہیں کہ اگر ان پر پیشاب کر دیا جائے تو وہ پیشاب مزید نجس ہو جائے گا۔ آپ بتائیے، اس ذہنیت کے لوگ کسی نرم کلامی کے مستحق ہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہی لوگ مخالفین اسلام کے آلۂ کار ہیں، انھیں کی گندی ذہنیت مخالفین کو وہ ہتھیار فراہم کرتی ہے، جن سے وہ مذہب اسلام پر حملہ آور ہوتے ہیں۔

حضرت مولانا عتیق الرحمٰن صاحب سنبھلی بھی ان کی شوریدہ سری کے ہاتھوں بے بسی محسوس کر رہے ہیں، ان کا ایک طویل مضمون ''أَللّٰهُمَّ إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ'' کے عنوان سے ترجمان دار العلوم، شمارہ جون، جولائی ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا ہے۔ لب و لہجہ اس میں بھی ان کا وہی ہے جو پہلے سے چلا آ رہا ہے، لیکن ان کا اندرونی درد و کرب اتنا بڑھا ہوا، اور اس کا اظہار اس میں اتنی شدت سے ہے کہ لہجہ کی یہ نرمی، اسلوب کا یہ وقار سراسر تکلف معلوم ہوتا ہے۔ اب وہ بھی فریاد کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پا رہے ہیں، پورا مضمون پڑھنے کے لائق ہے، اس مضمون میں انھوں نے غیر مقلدوں کی طرف سے شائع ہونے والی زہریلی کتاب ''الديوبندية'' کا احتساب کیا ہے، گو مولانا اپنے مضمون کو احتساب کہنے پر شاید راضی نہ ہوں، اور اسے افہام و تفہیم ہی کہنا پسند کریں، تاہم وہ نقد و احتساب ہی ہے، بلکہ ظلم کے خلاف ایک دل جلی فریاد ہے، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے، اس سے میری بات کی تصدیق ہو جائے گی، کتاب کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''کتاب کیا ہے؟ ایک عبرت گاہ ہے، ایک مرقع ہمارے اخلاق و کردار کے فساد و انحطاط کا، ایک تماشہ گروہی بغض و عناد اور جذبات رقابت کا۔'' (ص: ۱۸)

مولانا نے اس عبارت میں ہمارے کا لفظ لکھ کر اپنی بات کی شدت کو کم کر دیا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس موقع پر یہ لفظ محض تکلف ہے، آپ ابتداء سے اب تک کی تاریخ ملاحظہ فرما لیجئے۔ غیر مقلدین مسلسل نشتر زنی کرتے ہیں، تب علماء دیوبند میں سے کوئی ایک جواب ترکی بہ ترکی کے لئے اٹھتا ہے، اور اپنے ہی لوگوں کی مسلسل روک تھام سے گھبرا اٹھتا

ہے۔ اللہ جزائے خیر دے مولانا ابوبکر غازیپوری کو، ادھر کچھ دنوں سے اس میدان میں اترے ہوئے ہیں، وہ تو غیر مقلدوں نے آج کل اتنا تنگ کر رکھا ہے کہ علماء دیوبند کے حلقے میں ان کی مخالفت زیادہ نہیں ہو رہی ہے، ورنہ یہی حضرات ان کے قلم کو روک دیتے، اس نرمی اور مداہنت کا اثر یہ ہے کہ اہل تقلید کے عوام پریشانی میں مبتلا ہیں۔

المآثر محرم، صفر، ربیع الاول ۱۴۲۱ھ کے شمارے میں اداریہ کے اندر غیر مقلدین کے ایک تازہ ستم کا بیان کیا گیا ہے، اس پر مولانا سنبھلی مدظلہ نے مدیر کو ایک خط لکھا ہے، اس کا بھی اقتباس ملاحظہ ہو!

> ’’المآثر کا ٹائٹل اب بہت دیدہ زیب ہوگیا ہے، لفافے سے نکال کر نظر پڑتے ہی دل خوش ہوگیا، مگر اداریہ بہت رنج دہ اور المناک تھا، سمجھ میں نہیں آتا خود کو اہل حدیث کہلانے پر یہ اصرار کرکے (۱) یہ ایسی ناکردنیوں کو کیسے روا رکھ رہے ہیں۔ الفرقان میں آپ نے میرا وہ مضمون پڑھا ہوگا، جو ارون شوری کی کتاب ’’فتووں کی دنیا‘‘ پر لکھا تھا، اس کے مقدمے میں شوری نے ان سب مسلک والوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے، جن کے فتاویٰ سے اس نے بحث کی ہے، ان سب میں اہل حدیث حضرات کی خصوصیت انگریزی کے الفاظ SELF RIGHTEOUS میں کی ہے، جس کو ہماری زبان میں ’’برخود غلط‘‘ کہا جاتا ہے، پس افسوس کہ روز بروز اس کی تصدیق ہر سابق دن سے زیادہ ہوتی جارہی ہے۔ فالی اللہ المشتکیٰ

حقیقت یہ ہے کہ غیر مقلدین کا ایک بڑا طبقہ جو تقریباً اس پورے فرقہ کو محیط ہے، قرآن کی آیت إلا الذین ظلموا (ظالموں) کے زمرے میں اور علامات نفاق والی حدیث کے دائرے میں آتا ہے، دینی غیرت کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے جواب میں مداہنت اور نرمی نہ کی جائے، بلکہ صاف صاف ان کی کجرویوں کو بیان کردیا جائے، تاکہ عامۃ المسلمین کو دھوکا نہ ہو۔ (شوال تا ذی الحجہ ۱۴۲۰ھ/فروری تا اپریل ۲۰۰۱ء)

---

(۱) یہ اہل حدیث کہلانے پر اصرار کرنے والے ٹھیک ان رضاخانیوں کے نقش قدم پر ہیں، جو خود کو اہل سنت کہلانے پر اصرار کرتے ہیں۔ (مدیر)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پریشانی اور اس کا علاج

ہمارا یہ دور، جس کے لیل ونہار کی گردش میں انسانی زندگی الٹ پلٹ رہی ہے، کہا جاتا ہے کہ مادی ترقیات کا دور ہے۔ انسان نے اپنی عقل وفکر کو، محنت وکاوش کو اور طلب وجستجو کو جب مادہ میں کھپایا، تو حیرت ناک چیزیں وجود میں آئیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں یہ ترقیات آسمان تک پہونچی چلی جارہی ہیں۔ ہر روز صبح جب آنکھ کھلتی ہے، تو کوئی نئی چیز دنیا کے بازار میں دکھائی دیتی ہے۔ ان سارے اسباب ووسائل کو دنیا اس لیے ایجاد کرتی جارہی ہے کہ انسانی زندگی آسان ہوجائے۔ گھوڑے اور بیل گاڑی پر جب سفر ہوتا تھا، تو منزل تک پہونچنے میں مدت لگ جاتی تھی۔ اب موٹریں، ریل گاڑیاں، ہوائی جہاز ہیں۔ سارا عالم گھر آنگن بن گیا ہے۔ پہلے تھوڑے فاصلے پر خبر پہونچانی ہوتی، تو بڑا وقت لگتا تھا۔ اب دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک ایک منٹ میں کوئی بھی خبر پہونچا دیجئے۔ علاج معالجہ کی وہ سہولتیں ہیں کہ پچھلے زمانہ والوں نے خواب میں بھی نہ دیکھی ہوں، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ انسان کی زندگی آسان سے آسان تر ہوتی، راحتیں اس کے قدموں پر لوٹتیں، سکون کی چادر انسانیت کے سر پر تنی رہتی، جب سہولت وراحت کے یہ اسباب فراواں ہیں، تو اسی حساب سے آرام وآسائش کا پھیلاؤ بھی ہوتا۔ ہر شخص خوش ہوتا، رات کو میٹھی نیند سوتا، دن میں بے محنت ومشقت کے روزی حاصل کرتا، کسی کو کوئی دکھ نہ ہوتا۔ لیکن کیا ایسا ہوا؟ کوئی اللہ کا بندہ جواب دے کہ ہاں ایسا ہوا۔ آپ یہ سوال لکھ کر لاکھوں انسانوں کے پاس بھیجئے، سب جگہ سے ایک ہی جواب آئے گا کہ نہیں ان اسباب نے تو زندگی اور مشکل کردی ہے۔ تیز رفتار سواریاں بہت دوڑ رہی ہیں، مگر ہر روز نہ جانے کتنی انسانی جانیں اس تیز رفتاری کی زد میں

آ کر دم توڑ دیتی ہیں، سڑک پر ہمہ دم خطرہ ہے۔ پھر کثیف اور امراض کو پیدا کرنے والے دھوئیں اور گیس نے وہ قیامت ڈھا رکھی ہے، کہ آدمی اپنا گھر بند کر لے تب بھی چھٹی نہیں ہے، ہر نئی ایجاد نیا خطرہ لاتی ہے، ہر علاج نئی بیماری کو جنم دیتا ہے، اور موت کا ہنگامہ ہمہ وقت گرم ہی رہتا ہے، سڑکوں پر سے لاشیں اٹھائی جارہی ہیں، ریل کی پٹریوں پر سے کٹے پھٹے مردہ جسم اٹھائے جارہے ہیں، شفاخانوں سے ماتم کرتے ہوئے لوگ نکلتے ہیں، اور جنگوں میں، خانہ جنگیوں میں اور فسادات میں تو موت کا وہ رقص ہے کہ ہر تماشائی بسمل بنا ہوا ہے، گھر سے باہر نکلئے تو اطمئنان نہیں، گھر کے اندر رہئے تو راحت نہیں، اضطراب صد اضطراب ہے، بے چینی ہی بے چینی۔

آخر اسباب کے یہ الٹے نتائج کیوں نکل رہے ہیں۔ ہر انسان دوسرے انسان سے پوچھتا ہے، میں آسائش کا یہ سامان لایا، تو میرا بچہ اندھا کیوں ہوگیا؟ میرا بیٹا دولت کما کر لایا تو اس کے دوست نے اس کو گولی کیوں ماردی؟ میں نے اپنی بیوی کے علاج میں پیسہ پانی کی طرح بہایا تو اسے کینسر کیوں ہوگیا؟ میں نے اپنا مکان بنایا تو میرے پڑوسی نے مجھ پر مقدمہ کیوں قائم کردیا؟ ہر طرف سوالات ہیں۔ لوگ جواب بھی دے رہے ہیں، مگر کوئی جواب تسلی نہیں بخشتا، کسی سے گتھی نہیں سلجھتی، ایک سوال کے بعد دوسرا سوال سر ابھارتا ہے، آخر کیوں؟ آخر کیوں؟

انسان جواب دیتا ہے، اپنی اسی عقل سے جواب دیتا ہے، جو مادیت کی سنگین خول میں پھنسی ہوئی ہے۔ اس سوال کا جواب انسان نہیں دے سکتا ہے، وہ دے سکتا ہے جو انسان کا بھی خالق ہے، اور ساری کائنات کا بھی خالق ہے۔ اس سے پوچھئے، وہ بیماری بھی بتائے گا، دوا بھی بتائے گا، اور دوا میں اثر بھی پیدا کرے گا۔

قرآن کریم کا تیرہواں پارہ کھولئے، اس میں ایک سورہ ہے سورۂ رعد، اس کے چوتھے رکوع کی تلاوت کیجئے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَ یَقُولُ الَّذِینَ کَفَرُوا لَوۡ لَاۤ اُنۡزِلَ عَلَیهِ آیَةٌ مِنۡ رَّبِّهٖ قُلۡ اِنَّ اللّٰهَ یُضِلُّ مَنۡ یَّشَاءُ وَیَهۡدِیۡ اِلَیهِ مَنۡ اَنَابَ اَلَّذِیۡنَ

آمَنُوْا وَ تَطْمَئِنُّ قُلُوْبُھُم بِذِکْرِ اللہِ اَلاَ بِذِکْرِ اللہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ اَلّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصّالِحَاتِ طُوْبیٰ لَھُمْ وَ حُسْنُ مَآب ﴾ یہ انکار کرنے والے کہتے ہیں کہ اس (پیغمبر) پر اس کے پروردگار کی جانب سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی، تم کہہ دو کہ اللہ جس کو چاہتا ہے راہ سے ہٹاتا ہے، اور جو اس کی طرف دل سے متوجہ ہوتا ہے اسے اپنی راہ دکھاتا ہے۔ وہ لوگ جو ایمان لائے، اور ان کے قلوب اللہ کی یاد سے اطمینان پاتے ہیں، خوب سن لو کہ اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے، جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے عمل صالح کیا ان کے لیے بشارت ہے اور بہترین ٹھکانا ہے۔

ان آیات میں اس سوال کا جواب موجود ہے۔ مادہ نے دنیا والوں کو باور کرایا ہے کہ انسان کی زندگی لے دے کر بس اتنی ہی ہے، جتنے دن اس دنیا میں وہ جی لیتا ہے، ماں کے پیٹ سے نکلنے کے بعد سے اس کی زندگی کے دن شروع ہوتے ہیں، اور آخری سانس پر اس کی زندگی کا اختتام ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ بات بالکل غلط ہے، انسان کا قلب اس کا انکار کرتا ہے۔ انسان اسی غلط نظریہ کی بنیاد پر اس زندگی کو بنانے اور سنوارنے کی کوشش کرتا ہے، مگر ناکام رہتا ہے۔ پیغمبروں نے اس غلط نظریہ کی تردید کی۔ انسانیت کو انھوں نے خاک کی پستی سے اٹھا کر رب کائنات کے حضور میں پہونچانا چاہا، اور بتایا کہ اس زندگی کے کاموں کی مکافات اور اس کی جزا کے لیے ایک دوسری دنیا ہے، وہ آخرت ہے۔ لیکن چونکہ وہ آنکھوں کے سامنے نہیں ہے، اس لیے انسان تردد میں مبتلا رہتا ہے، وہ پیغمبروں سے مطالبہ کرتا ہے کہ اگر واقعی آپ اللہ کے رسول ہیں، اور آخرت برحق ہے، اور آپ کی بتائی ہوئی راہ حق ہے تو کوئی نشانی ایسی دکھایئے کہ ہم یقین کرنے پر مجبور ہو جائیں، ارشاد ہوا کہ نشانیاں تو بہت ہیں، مگر اللہ کی توفیق اسی کو ملتی ہے جو دل سے اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور جو کوئی انحراف کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ جسے چاہتے ہیں گمراہی میں چھوڑ دیتے ہیں، یعنی ہدایت وضلالت کا سرا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ البتہ اگر کوئی اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے، تو اسے اللہ تعالیٰ محروم نہیں کرتے، پھر ارشاد فرمایا کہ یہ متوجہ ہونے والے وہ ہیں، جو ایمان لائے، اور ان کے قلوب کو

اللہ کے ذکر سے اطمینان حاصل ہوتا ہے، اس کے بعد ایک اصولی بات جو کہ لازوال ہے، بتائی کہ دلوں کا اطمینان تو اللہ کی یاد ہی میں ہے۔

یہی وہ بنیادی نکتہ ہے، جسے مادیت نے کھو دیا ہے۔ پس اسے راستہ نہیں مل رہا ہے، آدمی اسباب پر اسباب ایجاد کیے چلا جا رہا ہے، مگر اپنے پیدا کرنے والے کو بھول کر، اس کی نافرمانی کر کے، اس کے احکام سے روگردانی کر کے، نتیجہ یہ ہے کہ اسباب راحت سب موجود ہیں۔ مگر راحت نام کی، اطمینان نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ یاد وہ ہے، جو انسان کے پورے وجود پر چھا جائے۔ زمان و مکان کے کسی مرحلے میں اس پر فراموشی نہ طاری ہو، زندگی کا ہر عمل اسی یاد کے زیر اثر ہو، زبان اس کے ذکر سے تر و تازہ ہو، قلب اس کے دھیان سے معمور ہو، ہر کام جذبۂ اطاعت کے نور سے منور ہو۔ غرض یہ کہ آدمی کا مرنا جینا سب اسی سے وابستہ ہو۔ تب وہ حال ہوتا ہے کہ اسباب موجود ہوں یا معدوم، ذرائع و وسائل پاس ہوں یا دور، جب وہ خالق اسباب کے قریب اپنے کو دیکھتا ہے تو اطمینان و سکون کی پھوار اس پر مسلسل پڑتی رہتی ہے، پھر تو وہ کیفیت ہوتی ہے، جس کو جگر مرادآبادی نے اپنے شاعرانہ انداز میں کہا ہے، مگر وہ ایک حقیقت ہے محض شاعری نہیں ہے، کہتے ہیں

میرا کمال عشق بس اتنا ہے اے جگر — وہ مجھ پہ چھا گئے میں زمانے پہ چھا گیا

آج انسانیت دکھی ہے، کیونکہ اس کا دل اپنے مرکز سے منحرف ہے، جہاں اطمینان ہے وہاں وہ جانے سے گھبراتی ہے۔ اور جہاں اضطراب ہے، دکھ ہے پریشانی ہے، وہاں کے لیے وہ بھاگتی پھرتی ہے۔ اسباب کی دنیا ایک اندھیری دنیا ہے، اس کا ماضی بھی اندھیرا ہے، اور مستقبل تو بالکل ہی معدوم ہے۔ بارہا ایسا ہوا ہے، اور ہر شخص کو اس کا تجربہ ہے کہ آدمی ایک مقصد کے لیے اسباب فراہم کرتا ہے، اسباب مہیا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر آدمی یقین کر لیتا ہے، کہ اب مقصد ہاتھ میں آیا ہی ہے کہ اچانک نتیجہ اس کے برخلاف نکلتا ہے اور انسان مایوس ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی لیے آج کا انسان ہر دم ایک اضطراب میں رہتا ہے، ذہنی ٹینشن اتنا بڑھا ہوا ہے کہ کسی آن اطمینان نہیں۔ اس ٹینشن کا حملہ دل پر ہوتا ہے، دماغ پر ہوتا

ہے۔ اور اس زمانے میں یہ دونوں کمزوری کا شکار ہیں، کب ہارٹ فیل ہو جائے، کب دماغ پر فالج گر جائے، کچھ ٹھکانا نہیں۔ جو کچھ نہیں حاصل ہوا یا جو کچھ کھو دیا، اس پر صدمہ و رنج، اور آئندہ کیا ہوگا اس کی تشویش اور اندیشہ، بس انھیں دونوں تکلیفوں میں انسان الٹا پلٹتا رہتا ہے، یہی ''ٹینشن'' ہے، جو انسان کو اور اس کی زندگی کو کھائے جا رہا ہے۔

اور جو آدمی اللہ سے، اللہ کے ذکر سے، اللہ کی اطاعت سے وابستہ ہے۔ اسے کوئی ''ٹینشن'' نہیں ہے۔ نہ اسے ماضی پر حسرت ہے، نہ مستقبل کا اندیشہ ہے، نہ اسے حال کی پریشانی ہے۔ اس کی نگاہ ماضی و حال و مستقبل سے بلند ہوتی ہے۔ اسے اللہ سے وابستگی ہوتی ہے۔ جو زمان و مکان پر حکمراں ہے، اس کی قدرت لامحدود ہے، پس جو کچھ ہوتا ہے اسی کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس کی شہادت قرآن کریم میں خود اللہ ہی نے دی ہے۔ فرماتے ہیں ﴿اَلا اِنّ اَولیاءَ اللّٰہِ لاَ خَوفٌ عَلَیھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنونَ. الّذِینَ آمَنُوْا وَکانُوْا یَتّقُوْنَ. لَھُمُ الْبُشْریٰ فِیْ الْحیاۃِ الدُّنیا وَفِی الآخِرَۃِ لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمَاتِ اللّٰہِ ذٰلِکَ ھُوَ الفَوْزُ الْعَظِیْم﴾ (سورہ یونس ۶۲ تا ۶۴) سنو! بلاشبہ جو اللہ کے ولی ہیں ان پر نہ کوئی اندیشہ ہے، اور نہ انھیں رنج ہوتا ہے، جو ایمان لائے اور جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا ان کے لئے دنیا و آخرت دونوں زندگیوں میں بشارت ہی بشارت ہے، اللہ کی باتیں بدل نہیں سکتیں، یہی بڑی کامیابی ہے۔

بیشک خدا کی بات بدل نہیں سکتی ہے۔ اس نے جہاں سکون و اطمینان رکھا ہے، وہیں ملے گا، دوسری جگہ اس کی تلاش فضول ہے۔ انسان مادی اسباب و وسائل میں مرنا کھپنا چھوڑ دے، وسائل کو بس انھیں کے درجے میں حاصل کرے اور برتے، اور زندگی کا محور و مرکز اور نصب العین رب اسباب کو بنائے، تو انسانی زندگی کی تمام چولیں ٹھیک اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ جائیں گی۔ ورنہ انسان ایک پہلو کو ابھارے گا تو دوسرا دبے گا۔

لیکن یہ بات جو بڑی کامیابی ہے، بغیر قصد و ارادہ کے حاصل ہونے کی نہیں ہے، اور نہ یہ ہوگا کہ آدمی اس کی مخالف سمت دوڑتا رہے، اور یہ کامیابی اسے لپٹ جائے۔ اس

کے لئے تو دل سے متوجہ ہونا پڑے گا۔ اس کے تقاضوں کو بروئے کار لانا ہوگا۔ ہر چیز کو اس کے خزانے سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اللہ کا ذکر بھی وہیں سے حاصل ہوگا، جہاں یہ خزانہ موجود ہوگا۔ ذکر کا خزانہ ذاکرین کے قلوب ہیں جو اللہ کے ذکر سے لبریز ہیں۔ جن میں ہر خیال اور ہر ارادہ اللہ کی یاد کے تابع ہو کر آتا ہے، ان کی صحبت میں غفلت کے بیماروں کا علاج ہوتا ہے۔ مادیت کے اس انہماک کے دور میں ایسے لوگ کمیاب ہوگئے ہیں، تاہم نایاب نہیں ہیں۔ آپ تلاش کرتے رہیئے، دل میں سچائی ہوگی تو اللہ تعالی کسی خزانے تک رسائی آسان فرمادیں گے، ملاحظہ ہو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فارس میں ایک آگ کے پجاری کے گھر پیدا ہوتے ہیں۔ اسی عقیدے اور عبادت پر جوان ہوتے ہیں۔ مگر دل میں تڑپ تھی، ہدایت کی، خدا طلبی کی، کیسے پھرتے پھراتے عین اس وقت مدینہ طیبہ پہونچائے گئے، جب کہ وہاں نبی کریم ﷺ کی آمد آمد کا غلغلہ تھا۔ اور بالآخر وہ آستانۂ نبوت پر حاضر ہو کر شرف صحابیت سے اور بے کراں بشارتوں سے نوازے گئے۔ آج بھی اگر کوئی صدق دل کے ساتھ تلاش کرے، تو اسے ذکر کا بھی خزانہ ملے گا، اور سکون قلب اور اطمینان روح کا بھی مرکز ملے گا، مگر مشکل یہ ہے کہ آدمی کو مادی اسباب سے اتنی محبت ہے، اور مستقبل کے اتنے اندیشے ہیں، اور انھیں مادی اسباب سے مستقبل کے بننے اور بگڑنے کا ایسا عقیدہ رچا اور بسا ہوا ہے کہ گھبراتا تو ضرور ہے، مگر نکلنے کی ہمت نہیں پڑتی، ہمتوں کی پستی کا یہ عالم ہے کہ مال وزر کا نقصان تو درکنار، اس کی کمی کے اندیشے سے انسان کا دل لرزتا رہتا ہے۔ اگر اسے دنیا اور اسباب دنیا کا تحفظ دیدیا جائے، تو ذاکرین کی جماعت میں شامل ہو سکتا ہے۔ اور اگر اس کے تحفظ کے سلسلے میں ذرا بھی شک ہوگا، تو قدم نہیں اٹھائے گا۔ حالانکہ اس دربار کا رنگ یہ ہے کہ:

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد
آنچہ در وہمت نیاید آں دہد

آدھی جان اگر وہ لیتے ہیں، تو سیکڑوں جان عطا فرماتے ہیں۔ جو کچھ تمھارے وہم وخیال میں نہیں ہوتا وہ بھی بخشتے ہیں۔

یہاں گھاٹے کا سودا نہیں ہے، نفع ہی نفع ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ ﴾ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان سے ان کی جان کو اور ان کے مالوں کو خرید لیا ہے۔ اور اس کا عوض جنت ہے۔

جنت اور اللہ کی رضا و خوشنودی کے مقابلے میں جان و مال کی کیا حقیقت ہے؟ اتنی قربانی دے کر اگر جنت کی دائمی راحت حاصل ہو جائے تو سودا نہایت سستا ہے۔ اور بہت ہی نفع بخش ہے۔

اطمینان و راحت کا خزانہ تو ذکر اللہ ہی میں ہے جس خوش نصیب کی اس تک رسائی ہو جائے۔

(ربیع الثانی تا جمادی الثانی ۱۴۲۲ھ/ اگست تا اکتوبر ۲۰۰۱ء/ ماہنامہ ضیاء الاسلام مئی ۲۰۰۴ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فتنوں کی ہمہ گیری اور اس سے بچنے کی تدبیر

مشہور محدث امام ابوالحسین مسلم بن الحجاج قشیری نے اپنی کتاب الجامع الصحیح میں جو مسلم شریف کے نام سے معروف ہے، اور صحاح ستہ (حدیث کی چھ صحیح کتابوں) میں ایک ہے، اور بخاری شریف کے بعد اسی کا درجہ کا ہے، ایک مفصل حدیث نقل کی ہے، جو ہمارے موجودہ حالات میں بہت ہی قابل غور ہے، اور اس کے تقاضوں کو پیش نظر رکھنا، اور انھیں عمل میں لانے کا اہتمام کرنا بہت ہی ضروری ہے، اس حدیث کے راوی حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ ہیں، جن کو رسول اللہ ﷺ بہت ہی خاص خاص باتیں بتایا کرتے تھے، اور اسی لیے وہ آپ کے ’’صاحب سر‘‘ (رازوں سے باخبر) کہے جاتے تھے، سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ ان کے قول وعمل کا بہت لحاظ رکھتے تھے، یہی حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر تھے، آپ نے حاضرین سے دریافت فرمایا کہ تم میں سے کسی نے رسول اللہ ﷺ سے فتنوں کا تذکرہ سنا ہے، کچھ لوگوں نے جواب دیا کہ ہم نے سنا ہے، آپ نے فرمایا کہ شاید تم وہ فتنہ سمجھ رہے ہو، جو آدمی کو اس کے اہل وعیال اور پڑوس کے سلسلے میں پیش آتا ہے، انھوں نے کہا جی! ہم یہی سمجھ رہے ہیں، آپ نے فرمایا کہ اس سلسلے کی لغزشوں اور خطاؤں کا کفارہ تو نماز، روزہ اور صدقہ سے ہو جاتا ہے، لیکن کسی نے آپ سے اس فتنہ کا تذکرہ سنا ہے؟ جو سمندر کی طرح موجیں مارتا ہوا چلے گا۔ اس پر سب لوگ خاموش رہے، میں نے عرض کیا کہ میں نے سنا ہے، فرمایا: ہاں تم نے سنا ہوگا، اللہ تمھارے باپ کو مبارک کرے! حضرت حذیفہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ فتنے قلوب پر لگاتار اس طرح آئیں گے جیسے چٹائی ایک ایک تنکے سے بنی جاتی ہے، تو جس قلب میں یہ فتنے جذب ہو گئے، اس

میں سیاہ نقطے پڑ جاتے ہیں، اور جس قلب نے انھیں اجنبی سمجھ کر جھٹک دیا، اس میں ایک روشن نقطہ بن جاتا ہے، اس طرح ایک قلب تو بالکل سنگ مرمر کی طرح سفید اور روشن ہو جاتا ہے، جس میں رہتی دنیا تک کوئی فتنہ اثر نہیں کر سکتا، اور دوسرا قلب کالا، راکھ میں اٹا ہوا الٹے پیالے کی طرح ہو جاتا ہے، جو نہ معروف سے مانوس ہوتا، اور نہ منکر سے اسے وحشت ہوتی، وہ صرف اسی چیز کو جانتا ہے، جسے اس کی نفسانیت نے جذب کیا ہے“۔

حدیث میں بعض اجزاء اور بھی ہیں، لیکن ہم نے اپنے موضوع سے متعلق جو حصہ تھا، اسے نقل کیا ہے، یہاں حدیث کے چند الفاظ کی وضاحت ضروری ہے، تاکہ قارئین کے سامنے وہ بات واضح رہے، جو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمائی ہے۔

اس میں ایک لفظ ”فتنہ“ ہے، اس کی جمع ”فتن“ ہے، اردو محاورہ میں فتنہ کا معنی لڑائی جھگڑا اور اختلاف و انتشار ہے، لیکن عربی میں ”فتنہ“ کا معنیٰ امتحان اور آزمائش کے ہیں، خواہ وہ امتحان اپنے نتیجہ کے اعتبار سے خیر ہو، یا شر، لیکن زیادہ تر اس کا استعمال اس آزمائش اور امتحان کے لیے ہوتا ہے، جس سے شر کا ظہور ہوتا ہو، چنانچہ فتنہ کا اطلاق کفر پر، دوراز کار تاویلات پر، ذلت و رسوائی پر، مصیبت اور عذاب پر، لڑائی جھگڑے پر، اچھائی سے برائی کی طرف پلٹنے پر اور کسی چیز کی محبت میں غلو پر ہوتا ہے۔

اہل و مال کا فتنہ یہ ہے کہ ان کی محبت میں پڑ کر آدمی دینی احکام میں کوتاہی کرنے لگتا ہے، یہی حال پڑوس کا بھی ہوتا ہے، کبھی پڑوس کی محبت میں اور کبھی اس کی عداوت میں آدمی حد سے تجاوز کر جاتا ہے، اور غلطیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، ان غلطیوں کا کفارہ روزمرہ کی عبادات ہو جاتی ہیں، یہ فتنے تو ہمہ دم آدمی کے ساتھ ہیں، ان کی اصلاح و مغفرت کا سامان بھی منجانب اللہ مہیا ہیں، اگر آدمی نماز روزے اور عبادات کا پابند ہے، تو یہ روزمرہ کی خطائیں، خود بخود بجھتی رہتی ہیں۔

لیکن ایک فتنہ وہ ہے، جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ **تَموجُ موجَ البحرِ**، سمندر کی طرح موجیں مارتا ہوا آئے گا، یعنی جس طرح سمندر کی موجیں باہم ٹکراتی ہیں، ایک

دوسرے کے پیچھے اس طرح سر اٹھاتی ہیں، جیسے ہر ایک دوسرے کے تعاقب میں ہے، اسی طرح یہ فتنے یکے بعد دیگرے آئیں گے، باہم گتھم گتھا ہوں گے، لڑائی جھگڑے کی کثرت ہوگی، کوئی کسی کی رعایت کو تیار نہ ہوگا، پاس ولحاظ اٹھ جائے گا، لوگ جانوروں سے بدتر ہو جائیں گے، ان فتنوں کی کیفیت کیا ہوگی، فرماتے ہیں کہ **تُعرَضُ الفِتَنُ عَلَی القُلُوبِ کالحَصِیرِ عُوداً عُوداً** جس طرح چٹائی بنی جاتی ہے، تو ایک تنکے کو دوسرے تنکے سے جوڑتے چلے جاتے ہیں، اسی طرح قلوب فتنوں کی آماجگاہ بن جائیں گے، ایک فتنہ آئے گا اور معاً اس کے بعد دوسرا فتنہ آئے گا، اگر قلب ہر فتنہ سے متاثر ہوتا گیا، اور اس میں ملوث ہوتا رہا تو وہ سیاہ ہوتا رہے گا، اور نوبت یہاں تک پہنچے گی کہ بالکل کالا ہوکر رہ جائے گا، جیسے راکھ میں اٹا ہوا ہو اور اوندھے پیالے کی طرح ہوجائے گا کہ اس میں نہ علم ٹھہرے گا، نہ معرفت۔ خیر کی ہر بات اس سے باہر ٹپک جائے گی، پھر نہ اسے نیکی اور خیر کی کوئی پہچان ہوگی، نہ اس سے مانوس ہوگا، اور نہ برائی سے اسے کوئی وحشت اور تنفر باقی رہے گا، یعنی بھلائی سے دور اور برائی میں ڈوبا ہوا ہوگا، وہ بس اسی بات کو قبول کرے گا، جو اس کی خواہش نفس کے مطابق ہو۔

اور اگر قلب ایسا ہے کہ اس نے ان فتنوں کو رد کردیا، ان سے نہ متاثر ہوا، اور نہ ان میں ملوث ہوا، بلکہ علم ومعرفت کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اطاعت الٰہی میں سرگرم رہا، تو وہ قلب ایسا ہوگا، جیسے سنگ مرمر جو چکنا بھی ہوتا ہے، اور سفید بھی کہ اس پر کوئی گندگی اثر نہیں کرتی، اسی طرح یہ دل صاف اور روشن ہوتا ہے، اور پتھر کی طرح مضبوط ہوتا ہے، اس پر کوئی فتنہ اثر نہیں کرسکے گا۔

اس حدیث پر غور کریں، اور جن حالات سے مسلمان گزر رہے ہیں، ان پر غور کریں، تو یہ حدیث رسول اللہ ﷺ کے معجزات میں معلوم ہوتی ہے۔ آج ہمارے سامنے واقعی وہی منظر ہے کہ فتنہ موجیں مار رہا ہے، اس پوری کائنات انسانی میں ہر طرف جو چیز بکھری ہوئی پڑی ہے، بلکہ سب پر گھیرا ڈالے ہوئے ہے، وہ فتنہ ہی ہے، گھر گھر بلکہ ہر ہر فرد کو یہ فتنہ عام ہے، ایک فتنہ تھمتا نہیں کہ دوسرا فتنہ سامنے آجاتا ہے، یہ فتنے باہر سے اٹھتے ہیں اور دلوں کے

اندر جذب ہوتے ہیں، اور دل کے اندر سے اٹھتے ہیں اور باہر پھیلتے جاتے ہیں۔

فتنوں کے عموم وشیوع کا یہ حال ہے کہ ایک بات کہیں سے اٹھتی ہے، اور ذرائع ابلاغ کی قوت ووسعت اس کو چند لمحوں میں ساری دنیا میں پہنچا دیتی ہے، اور جگہ جگہ فتنے کی آگ بھڑک اٹھتی ہے، مثلاً:

ڈیڑھ دو سال پہلے امریکہ کی ایک بلند وبالا عمارت پر حملہ ہوا، کس نے حملہ کیا، اس بات کی آج تک تحقیق نہ ہوسکی، ادھر یہ حملہ ہو رہا ہے، عمارت تباہ ہو رہی ہے، اور ساری دنیا کو یہ بات معلوم ہوگئی، سب تھرا گئے کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے؟ سب کی ٹکٹکی ادھر ہی لگ گئی، اور نزلہ گرا ایک غریب، اور بے کس ملک پر، کیونکہ وہ مسلمان تھا، اور مسلمان رہنا چاہتا تھا، مہینوں ساری دنیا کی نگاہیں اسی پر لگی رہیں، قلوب الٹتے پلٹتے رہے، لوگ شور مچاتے رہے کہ غلط ہو رہا ہے، مگر سمندر بن کر جو فتنہ موج مار رہا ہو، وہاں کوئی آواز کب سنائی دے سکتی ہے؟ اس فتنہ کا اثر ساری دنیا پر پڑا، کتنے لوگوں کے ایمان ڈگمگائے، خدا اور رسول پر جنکو یقین تھا، وہ شک میں مبتلا ہونے لگے، مایوسی وشکستگی کی بدلیاں فضائے قلوب پر چھا گئیں، لوگ ایسا محسوس کرنے لگے کہ افغانستان اور طالبان نہیں، خود اسلام ختم ہو جائے گا، یہ فتنہ تھمتا تو کیا؟ فتنہ پرور ہی ذرا تھک گیا، تو دوسرے چند ممالک کو دھمکیاں دے کر ہراساں کرنے لگا، اور اپنے سدھائے ہوئے کتے اسرائیل کی پیٹھ ٹھونک دی، اس نے فلسطینیوں پر ہلہ بول دیا، اور ظلم و درندگی کی وہ خونچکاں داستان مرتب کی کہ اگلے پچھلے سب ظالم شرما جائیں۔

اُدھر یہ سب ہو ہی رہا تھا کہ ہندوستان میں بابری مسجد کو عنوان بنا کر گودھرا میں فتنہ کی ایک چنگاری پھینکی گئی، اور وہ آن واحد میں شعلہ بن کر احمد آباد اور اس کے مضافات میں مسلم آبادیوں کو تہس نہس کر گئی۔ اللہ جانے اس کی چنگاریاں کہاں کہاں اڑ کر پہنچی ہیں، ان مسلسل فتنوں کی وجہ سے قلوب کی حالت بگڑ گئی ہے، ظلم وستم کی ہر چیرہ دستی کے بعد یہ گمان ہوتا ہے کہ اب قلوب اللہ کی طرف پلٹیں گے، اب لوگ اللہ کو راضی کرنے کی تگ ودو کریں گے، مگر دیکھا یہ جاتا ہے کہ معاملہ برعکس ہو رہا ہے، قلوب میں اللہ سے بغاوت کا جذبہ کچھ اور بڑھ جاتا ہے،

برائیوں کی طرف جھکاؤ زیادہ ہوجاتا ہے، اصلاحِ حال کے بجائے خرابی کی صورت پھیل جاتی ہے، ایک فتنہ باہر موج مار رہا ہے اور ایک فتنہ قلوب میں گھسا ہوا ہے، قلوب کا فتنہ یہ ہے کہ اس میں خیر کی صلاحیت نہ رہے، اگر اس کے سامنے کوئی خیر کی بات لائی بھی جاتی ہے، تو شر وفساد کی شکل اختیار کر لیتی ہے، اس قلب کی مثال الٹے پیالہ جیسی ہوجاتی ہے، جس میں کوئی خیر کی بات نہ ٹھہرتی ہے اور نہ جمتی، بس اس کی خواہش نفس کی وجہ سے جو چیز چمٹ جاتی ہے، وہی رہتی ہے اور اس کے مناسب کوئی چیز مل جاتی ہے، تو وہ بھی چمٹ جاتی ہے۔

یہ دونوں طرح کے فتنے اس دور میں موجیں مار رہے ہیں، معاشرہ بھی فاسد ہے، اور قلوب بھی فاسد ہیں، قلب کا صلاح یہ ہے کہ وہ ان فتنوں کو رد کر دے، ان کا کوئی اثر قبول نہ کرے، وہ سنگ مرمر کی طرح سخت مضبوط اور چکنا ہوجائے کہ برائیاں اس سے ٹکرائیں تو، مگرا چٹ کرنا کام واپس ہو جائیں، قلب میں اگر اتنی صلاحیت پیدا ہو جائے، تو اسے کوئی فتنہ ضرر نہیں پہنچا سکتا۔

ایسے قلوب ہر زمانے میں کم رہے ہیں، اور ہمارے دور میں تو بہت کم ہیں، لیکن اللہ کی زمین خالی نہیں ہے، اچھے لوگ اور اچھے قلوب مل جاتے ہیں، گو مشکل سے ملتے ہیں اور کم ملتے ہیں، یہ قلوب فتنوں سے محفوظ رہتے ہیں، اور فتنوں سے پناہ انھیں حضرات کے زیر سایہ مل سکتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: **بَدَأَ الإسلامُ غریباً و سَیعودُ کما بَدَأَ غَریباً فَطُوبیٰ لِلْغُرَباءِ** (مسلم شریف) اسلام کا جب آغاز ہوا تھا تو یہ لوگوں کے درمیان اجنبی تھا، یعنی لوگوں کا ماحول و معاشرہ، ان کے احوال وکوائف بالکل جداگانہ تھے، اسی ماحول میں چند لوگوں نے اسلام قبول کیا، اس کے احکام وتعلیمات کو اپنی زندگی کا شعار بنایا، تو یہ لوگ سارے ماحول سے کٹے ہوئے اجنبی سے محسوس ہوئے، وہ خود اپنے کو اس ماحول میں اجنبی سمجھ رہے تھے، اور دنیا والے بھی انھیں اجنبیت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، پھر آہستہ آہستہ اسلام کا حلقہ وسیع ہوتا گیا، لوگوں میں اس کا تعارف بڑھتا گیا، یہاں تک کہ لوگ مانوس ہوگئے، اجنبیت دور ہوگئی، اب یہ ایک معروف ومسلم حقیقت بن کر لوگوں کی نگاہوں

اور دلوں میں جاگزیں ہوگیا، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ پھر ایک وقت ایسا آئے گا کہ یہ مذہب دوبارہ اجنبی بن جائے گا۔ اسلام کے خلاف ایک ایسا ماحول برپا اور ایک ایسی تہذیب مسلط ہوجائے گی کہ اس ماحول میں اسلام پر عمل کرنے والا محض اجنبی بن کر رہ جائے گا۔ اب یہاں اہل اسلام کے سامنے دوراہیں ہیں، ایک یہ کہ اپنی اجنبیت سے گھبرا کر، اس سے وحشت زدہ ہوکر اپنی مخصوص شناخت اور اپنی خاص وضع کو خیر باد کہہ کر عام ماحول و معاشرہ میں گھل مل جائیں، اسلام کے آثار و اعمال کو اپنے اوپر سے کھرچ کر پھینک دیں، تاکہ دیکھنے والا، برتنے والا جان ہی نہ سکے کہ یہ بھی مسلمان ہیں۔

دوسری راہ یہ ہے کہ اسلام کے تقاضوں پر، اس کی تعلیمات پر، اس کی شناخت اور وضع پر باصرار ڈٹ جائیں، اور اس سلسلے میں کسی دباؤ کی پرواہ نہ کریں، دنیا مخالف سمت دوڑ رہی ہے، مگر یہ اپنی سمت جا رہے ہیں، دیکھنے والے دیوانہ اور سنکی کہہ رہے ہیں، ساری خلقت تو اُدھر جا رہی ہے، تم ادھر کہاں جا رہے ہو؟ یہ طعنے سنتے رہیں، تحمل کرتے رہیں، الجھنے سے گریز کرتے رہیں، مگر اپنی راہ پر لگے رہیں۔

اس آخری دور میں، اور اجنبیت کے اس ماحول میں یہ دوراہیں ہیں۔ پہلی راہ دنیاوی اعتبار سے آسان ہے، اس راہ میں آدمی خود کو چلتی بھیڑ میں گم کردیتا ہے، اور دنیا کے اعتبار سے اس بھیڑ کو جو فوائد حاصل ہوتے ہیں، اس میں یہ بھی حصہ دار بنتا ہے، اس میں بظاہر دنیا کا فائدہ ہے، زندگی کی سہولت ہے، جہاں جائے گا، کہیں اجنبیت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جائے گا، لیکن اس سہولت کے لیے، اس کو ایک بہت بڑی قربانی دینی پڑتی ہے، اور وہ بھی ناروا، وہ قربانی آخرت کی قربانی ہوتی ہے، جس طریق پر اسلام نے چلنے کی تلقین کی ہے، جب اسے چھوڑا تو آخرت کی راہ چھوڑی، جنت کی راہ چھوڑی،، ایمان میں اضمحلال پیدا ہوا، عبادات میں زوال آیا، طاعات سے برکنار ہوا، کفر والحاد کی موجودہ طوفانی ہوا میں بھی خطرناک راہ اختیار کرنے والے زیادہ ہیں، دنیا مقصود و معہود بنی ہوئی ہے، اس راہ میں آخرت کی تباہی تو ہے ہی، مسلمانوں کی دنیا بھی کچھ زیادہ بامراد نظر نہیں آتی، کیونکہ جب

کہیں سود و زیاں کا معاملہ پڑتا ہے، تو کفر کی طاقتیں، انھیں مسلمان کہہ کر، ان کے ساتھ وہی معاملہ کرتی ہیں، جو مسلمانوں کے حق میں ان کے منصوبے میں داخل ہوتا ہے، متعدد فسادات میں کمزور ایمان والوں نے اپنی شناخت چھوڑی، کفر کی شناخت اختیار کی، مگر نتیجہ وہی رہا کہ سب کے ساتھ وہ بھی ہلاک کر دیے گئے، دنیا بھی گئی، آخرت بھی گئی!! ﴿خَسِرَ الدُّنیا و الآخِــرَةَ و ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرانُ الْمُبِیْنُ﴾

دوسری راہ دنیاوی اعتبار سے بہت مشکل ہے، لوگوں کے طنز و طعن ہیں، کوئی ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا، اپنے گھر میں بھی آدمی اجنبی بن جاتا ہے، وہ حال ہو جاتا ہے کہ بات کرے تو کوئی سننے کو تیار نہ ہو، رشتہ چاہے تو کوئی رشتہ کرنے پر آمادہ نہ ہو، دین پر عمل کرنے کا جذبہ، اسے اس کے ماحول سے کاٹ کر رکھ دیتا ہے، اس سے سب خفا ہوتے ہیں، اور وہ سب سے علیحدہ ہو جاتا ہے، یہ حالت انسان کے لیے بہت سنگین ہوتی ہے، بڑے مضبوط ارادے اور بلند حوصلہ کا مالک ہوتا ہے وہ آدمی، جو ان سب مشکلات کو برداشت کر کے خالص ایمان و اسلام پر باقی رہے، یہ شخص ایسا ہے، جیسے ہاتھ پر انگارہ رکھے ہوئے ہو: ؎

ہم حوادث میں رہے کوہ و بیاباں کی طرح
اور ہوں گے ترے سانچے میں جو ڈھل جاتے ہیں

مگر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ انھیں افراد کی وجہ سے دین کا تحفظ ہوتا ہے، فتنے رفع ہوتے ہیں، اور آخرت میں تو ان کا وہ عالم ہوگا کہ سو سو شہیدوں کا ثواب حاصل کریں گے، اللہ تعالیٰ کی خوشی اور رضا انھیں حاصل ہوگی، مولانا محمد علی جوہرؒ نے بہت خوب کہا ہے کہ: ؎

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

فتنوں کے اس دور میں ایسے ہی قلوب کامیاب ہیں، انھیں تلاش کر کے ان کی پناہ میں رہنا چاہئے۔

(محرم تا ربیع الاول ۱۴۲۳ھ/ مئی تا جولائی ۲۰۰۲ء/ ماہنامہ ضیاء الاسلام جولائی ۲۰۰۴ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

احتساب میں مجلّہ المآثر کا رویہ

قلب و دماغ اور قلم و زبان سب اپنے پروردگار، اپنے خالق و مالک، اپنے محسن و داتا کے سامنے سراپا شکر و سپاس بن کر سجدہ ریز ہیں، اور ان کی حمد و ثنا کا نغمہ گنگناتے ہیں کہ آج سے دس سال قبل چند ناتوانوں اور ناتجربہ کار افراد نے محدث الھند علامہ جلیل، فقیہ وقت، ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہ کی رحلت کے بعد سوچا، باہم مشورے کئے کہ ایک علمی مجلّہ حضرت اقدس کی یادگاری میں جاری کیا جائے، اس میں حضرت کے علوم و معارف کا تعارف کرایا جائے، علم و تحقیق کے وہ خزانے، جو ابھی اہلِ علم کے ہاتھوں میں نہیں پہنچے ہیں، انھیں پہنچانے کا انتظام کیا جائے، حضرت کے سوانحِ زندگی، نہ جاننے والوں کے لیے علم کی روشنی میں لائے جائیں، وقفہ وقفہ سے تلاش و تحقیق کی یہ وادی طے کی جائے گی، تو ایک طویل اور دشوار گزر راہ منزل بمنزل لپٹتی رہے گی، علم و معرفت کا نور پھیلتا رہے گا، مآثر و معارف کے خزانے بھرتے رہیں گے، اور گوہر نقاب مستوری کو الٹ الٹ کر نکلتے رہیں گے۔

امید و بیم کی کشمکش کے درمیان یہ مشورہ فیصلہ بنا، اور پہلا سہ ماہی مجلّہ ’’المآثر‘‘ کے عنوان سے محرم، صفر، ربیع الاول ۱۴۱۳ھ میں طباعت کے مرحلوں سے گزار کر اہل علم کے ہاتھوں میں پہنچا دیا گیا، ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ اہلِ علم اور ارباب تحقیق اسے کس نگاہ سے دیکھیں گے، کس طرح اسے جانچیں اور پرکھیں گے؛ مگر یہ سوچ کر قدرے اطمینان ہوتا تھا کہ اس کی نسبت ایک ایسے صاحبِ علم کے ساتھ ہے، جو علم و تحقیق کا ایک سمندر نہیں بلکہ مجمع البحار تھا، جس کے سامنے معاصر اساطین علم کی گردنیں خم رہی ہیں، اس نسبت کی وجہ سے قبولیت و

پسندیدگی کا ظن غالب تھا، چنانچہ یہ ظن غالب سچا ثابت ہوا، لوگ نوآموز اور گمنام افراد کی اس جرأت پر چونکے تو ضرور! بہت سے حضرات حیرت میں پڑے کہ علمی صحافت کے پردے پر یہ نئی تصویریں دکھائی دے رہی ہیں، لیکن محدث جلیل علیہ الرحمۃ کی برکت تھی کہ یہ نئی تصویریں بھی قبولیت پا گئیں، مجلّہ پسند کیا گیا، چوٹی کے اہلِ علم نے اس سے دلچسپی لی، اور دیکھتے ہی دیکھتے اقلیم علم میں اس نے اپنی شناخت بنالی۔

ادارہ المآثر نے ابتدا میں اس مجلّہ علمیہ کے سلسلے میں جو منصوبہ طے کیا تھا، اور سفر کی جو راہیں اور منزلیں طے کی تھیں، کوشش یہی رہی کہ انھیں راستوں پر یہ علمی سفر طے ہوتا رہے، اور متعین منزلوں کو پالینے کی جدوجہد جاری رہے۔

اس سلسلے میں پہلا منصوبہ تو یہ تھا کہ حضرت اقدس علیہ الرحمہ کے گرانقدر علمی کارناموں کا ذرا تفصیلی تعارف پیش کردیا جائے، لوگ بلکہ بہت سے اہل علم حضرات بھی بس اتنا جانتے تھے کہ حضرت اس دور کے عظیم محدث، فن اسماء الرجال کے ماہر اور حدیث کے درجات ومراتب کے معتبر نقاد ہیں، لیکن ان کے وہ کارنامے کیا ہیں؟ ان کی تفصیل کیا ہے؟ جس کی بنیاد پر قلوب میں منجانب اللہ یہ بات جمی ہے، اس سے بہت کم لوگ واقف تھے۔ خود یہ راقم سطور، جس کے کاندھوں پر مجلّہ کی ادارت تحریر کا بار ڈالا گیا، اس کا قدم بھی اجمال سے نکل کر تفصیل کے میدان میں نہیں آیا تھا، مجلّہ کے آغاز کے وقت سے حضرت کی کتابوں کا از سرنو تفصیلی مطالعہ شروع کیا، تو علم وتحقیق اور نقد ونظر کی ایک وسیع جولانگاہ نگاہوں کے سامنے آئی، تلاش علم کا ایک نیا میدان ملا، قلم کو حضرت اقدس کی تحریروں کے سہارے چلنے کا راستہ ملا، چنانچہ یکے بعد دیگرے حضرت کے علمی وتحقیقی معارف کی ایک روشن اور دلآویز جلوہ گاہ یہ مجلّہ بنا، جو کتابیں حضرت کی تحقیق وتعلیق سے پہلی مرتبہ مخطوطات کی الماریوں سے نکل کر مزین ہوئیں، ان کے نوادرات بطور نمونے کے قارئین کے سامنے پیش کیے گئے؛ مسند حمیدی، کتاب الزہد والرقائق، المطالب العالیہ، کشف الاستار، مصنف عبدالرزاق وغیرہ۔ ان کے علاوہ حضرت کے وہ انتقادات جو اکابر اہلِ علم کی کتابوں پر جستہ جستہ تحریر ہوئے ہیں،

جن سے حضرت کی نگاہ کی وسعت اور گہرائی اور گیرائی کا اندازہ ہوتا ہے، ان کے کچھ نمونے مرتب کیے، یہ انتقادات ''استدراکات علمیہ'' اور ''استدراکات محدث کبیرؒ'' کے عنوان سے تقریبا چودہ قسطوں میں شائع کیے گئے، عالم عرب کے مشہور عالم شیخ ناصرالدین کی غلطیوں کو حضرت محدث اعظمیؒ نے چار اجزاء میں تحریر فرمایا، اس کی تلخیص چار قسطوں میں پیش کی گئی۔

خود حضرت کی خدمات وکمالات کا تعارف بھی متعدد حضرات کے قلم سے شائع کیا گیا، حضرت اقدس کی نایاب ونادر اور وقیع علمی تحریریں جو کبھی مجلات وجرائد میں شائع ہوئی تھیں، انھیں از سر نو شائع کیا گیا، ان کی تعداد ۲۰؍ سے کم نہیں ہے، حضرت اقدس کے گراں قدر فتاویٰ پہلے مرتبہ شائع ہوئے، اسی طرح حضرت اقدس کے مواعظ جو گاہے گاہے آپ ارشاد فرمایا کرتے تھے، انھیں ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے نقل کرکے ناظرین کے استفادے کے لیے پیش کیا گیا۔

وہ حضرات جو اخلاص ودیانت کے پیکر رہے، جن کی زندگیوں کو سامنے رکھ کر تعمیر سیرت کی جاسکتی ہے، جن کے سوانحِ زندگی بعد والوں کے لیے چراغِ راہ ثابت ہوسکتے ہیں، ان کے تذکرے لکھے گئے، دس سال میں ایسے تقریباً پندرہ سولہ حضرات پر مضامین مرتب کیے گئے۔

حضرت محدث کبیر علیہ الرحمۃ کی زندگی کا ایک نمایاں مجاہدانہ کارنامہ یہ رہا ہے کہ غلط افکار ونظریات نے جہاں سر اٹھایا ہے، اور مذہب اسلام پر ان کی وجہ سے دھبہ لگنے کا اندیشہ ہوا ہے، یا دھبہ لگا ہے، تو حضرت نے ان غلط نظریات کا متین علمی احتساب کیا ہے، اور حقائق کی روشنی میں غلط کاروں کی ہر غلطی کو واضح کردیا ہے، اور علم وتحقیق کے نام سے جو گمراہیاں اسلام میں داخل کرنے کی کوشش کی گئی، سب کا قلع قمع کردیا۔ مجلّہ ''المآثر'' نے ابتداء ہی سے اپنے مشن میں یہ بات شامل رکھی ہے کہ کہیں سے کوئی غلطی، غلط نظریہ، غلط تحقیق اسلام کے قلعے میں دراندازی کرنا چاہے گی، تو اس پر بند لگانے کی جدوجہد کی جائے گی، چنانچہ دس سال کے اس عرصہ میں گاہے گاہے، حسب ضرورت یہ خدمت بھی انجام دی

گئی ہے، اس عرصہ میں غیر مقلدیت نے مختلف عنوانوں کو بالخصوص تین طلاق کے مسئلہ کو علم و تحقیق کی درسگاہ سے نکال کر عوامی اسٹیج پر اور اخباروں اچھال دیا تھا، جس سے نہ صرف مذاہب اربعہ (حنفیت، شافعیت، مالکیت اور حنبلیت) پر حرف آتا تھا، بلکہ خود اسلام کی شبیہ بگڑ رہی تھی، مجلّہ المآثر نے اس موضوع پر خود حضرت محدث کبیر علیہ الرحمۃ کی گرانقدر تحریر شائع کر کے اس کا دفاع کیا۔

کچھ عرصہ سے مولانا قاضی مجاہد الاسلام کی سربراہی میں ایک تنظیم فقہ اکیڈمی نے فقہی سیمناروں کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے، بعض اعتبارات سے یہ سلسلہ مفید اور نتیجہ خیز محسوس ہو رہا تھا، لیکن بھانپنے والوں نے شروع ہی میں بھانپ لیا تھا کہ علمی میدانوں میں یورپ سے درآمد کردہ یہ نیا طریقۂ عمل شاید آگے چل کر فتنوں کا باعث بن جائے، چنانچہ پانچویں فقہی سیمنار میں، جو اعظم گڈھ میں ہوا تھا، یہ اندیشہ کھل کر سامنے آگیا، اس میں لائف انشورنس کے متعلق ایک ایسا فیصلہ کیا گیا، جو اسلام کی تعلیمات اور اس کی روح کے منافی تھا، اور اس کے لیے ایسا طریقۂ کار اختیار کیا گیا، جو خود سمینار کے دستور کے خلاف تھا۔ اس راہ سے اندیشہ تھا کہ مسلمانوں کے معاشرے میں جوا اور سود کی نجاست پھیل جائے گی۔ المآثر نے اس کا احتساب کیا، اور اس موضوع پر اکابر علماء کے مضامین مسلسل شائع کیے، اس کا اثر یہ ہوا کہ فقہی سیمنار کے مذکورہ فیصلہ کی بنیاد پر انشورنس کے ادارے جو تیزی کے ساتھ مسلمانوں کے معاشرے میں گھسنے لگے تھے، اور مسلمانوں میں یہ ناجائز وبا شدت سے پھیلنے لگی تھی، اس کے سامنے ایک مضبوط بند قائم ہوگیا، فللہِ الحمد۔

اس احتساب کے دائرے میں خود سمینار اور اس کے لیے مرتب کیے جانے سوالات بھی آئے، سمینار کی کاروائی میں جو نامناسب طرز عمل اختیار کیا جا رہا تھا، اس پر بھی ٹوکا گیا، بعض حضرات جو صلح کل کی طرف رجحان رکھتے ہیں، انھیں المآثر کے اس طرز عمل سے گرانی ہوئی، انھوں نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا، ان کے خیال میں مسلمانوں اور دین کی خدمت کے لیے جو بھی قدم اٹھایا جائے، اسے گوارا کرنا چاہیے، اس میں اگر کچھ غلطیاں

ہو رہی ہوں، تو بھی خاموش رہنا چاہئے؛ لیکن ظاہر ہے کہ اگر اسے قاعدہ بنا لیا جائے، تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک بڑا حصہ معطل ہو کر رہ جائے گا، اس لیے ادارہ نے ان ناگواریوں کو دیکھا، سنا اور سہہ لیا، مگر اپنے طرزِ عمل میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ جو چیز غلط ہے، اس کی غلطی کو واضح کر دینا، اختلاف نہیں ہے، نزاع نہیں ہے، اختلاف اور نزاع کی نسبت حق کی جانب نہیں ہو سکتی، ہاں اگر دلیل سے یہ بات واضح کر دی جائے کہ جو کچھ کہا گیا ہے، وہی غلط ہے، تو البتہ اس پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس کی جائے گی، لیکن صرف اتنا کہہ دینا کہ ادارہ جارحیت کے راستے پر جا رہا ہے، لوگوں سے نزاع کر رہا ہے، کافی نہیں ہے۔ المآثر نے جو آواز اٹھائی، اگر وہ درست ہے، تو اختلاف اور نزاع کی نسبت اس کی طرف نہیں ہو سکتی، جو لوگ غلطی کر رہے ہیں، ان کی طرف ہوگی، حق اختلاف نہیں کرتا، وہ ایک سچا راستہ بتاتا ہے، جو لوگ اس سے منحرف ہوتے ہیں، وہ اختلاف کے شکار ہوتے ہیں، اللہ کے پیغمروں نے قوم کی رسمِ عبادت اور رواجِ زندگی کے خلاف حق و صداقت کا راستہ دکھایا، تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ انھوں نے اپنی قوم سے اختلاف کیا، باہم پھوٹ ڈال دی، خاندانوں میں تفرقہ پیدا کر دیا، گو کہ ان کی قومیں یہی راگ الاپتی رہیں، مگر ان کا کہنا غلط تھا، قوموں نے اختلاف کیا، پیغمبروں سے نزاع کیا، کیونکہ انھوں نے حق سے انحراف کیا۔ آج بھی یہی قاعدہ ہے، غلطی خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، اگر وہ واقعۃً غلطی ہے، تو اس پر ٹوکنے والا نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے رہا ہے، اس پر اختلاف کا الزام نہیں رکھا جا سکتا، یہ اگر نہ تسلیم کیا جائے تو حق و باطل کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا، اور ''صلح کل'' کا جذبہ رکھنے والے حضرات غیر شعوری طور پر اس غلطی میں مبتلا ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿لِکُلِّ اُمّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَکاً هُمْ نَاسِکُوْهُ فَلاَ یُنٰزِعُنّکَ فِیْ الاَمْرِ وَ ادْعُ اِلیٰ رَبّکَ اِنّکَ لَعَلیٰ هُدیً مُسْتَقِیْمٍ﴾ [سورۃ الحج: ٦٧] (ہر امت کے لیے ہم نے ایک طریقۂ عبادت بنایا تھا، جس کے مطابق وہ عبادت کرتی تھی تو یہ لوگ تم سے اس معاملہ میں نزاع نہ کریں، اور تم اپنے رب کی طرف دعوت دیتے

رہو، بلاشبہ تم یقیناً سیدھی ہدایت پر ہو)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے تحریف شدہ رسوم جاہلیت کے خلاف جو شریعت حقہ کا نظام عبادت پیش کیا وہ اختلاف اور نزاع نہیں ہے، قرآن حکم دیتا ہے کہ تحریف شدہ طریقۂ عبادت کو اختیار کرنے والے رسول سے نزاع نہ کریں، کیونکہ رسول ٹھیک ٹھیک حق و ہدایت پر گامزن ہیں، اب جو ان سے منحرف ہوگا، وہی نزاع کا مرتکب ہوگا۔ اہل حق کے بارے میں یہ کہنا کسی طرح درست نہیں ہے کہ انھوں نے نزاع کیا، وہ اختلاف کے مرتکب ہوئے۔

کوئی کہہ سکتا ہے کہ پیغمبر کا حق پر ہونا بالیقین ہے، ان سے اختلاف کرنے والا یقیناً نزاع کا مرتکب ہے، لیکن جو لوگ پیغمبر نہیں ہیں، وہ معصوم نہیں ہیں، ان کی رائے کا صحیح ہونا یقینی نہیں ہے، اس لیے ان کی طرف نزاع کی نسبت درست ہوسکتی ہے، کیونکہ ان کے حق کا ہونا قطعی نہیں ہے، لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ حق کا معیار آج بھی موجود ہے، اگر اس معیار پر کوئی بات اترتی ہے، تو حق کہنا ہی پڑے گا، اجتہادی امور میں بے شک یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاید حق دوسری طرف ہو، لیکن جہاں قرآن کی نص قطعی ہو، اس کی دلالت واضح ہو، یا مسئلہ امت کے درمیان متفق علیہ ہو، یا حضرات صحابہؓ و تابعین یا حضرات ائمہ اربعہ کا کسی مسئلہ پر اجماع ہو، تو اس کا حق ہونا بالکل واضح ہے، تین طلاق کا مسئلہ، بیس رکعت تراویح کا مسئلہ ایسا ہے جس کے حق ہونے پر چاروں ائمہ مذاہب متفق ہیں؛ جوا اور سود کی حرمت پر قرآن کی نص قطعی واضح الدلالت ہے۔ المآثر نے جب کسی پر احتساب کیا، دلائل کی روشنی میں کیا ہے، کوشش کی گئی ہے کہ جذبات سے مغلوبیت نہ ہو، لیکن اپنی پاکئ داماں کی حکایت پر اصرار نہیں ہے، بسم اللہ اگر کوئی دلائل کی رہنمائی میں المآثر کی غلطی کو واضح کرے گا، تو اسے قبول کرنے میں تامل نہ ہوگا، مگر خیال یہ رہے کہ ادارہ المآثر کی اپنی الگ کوئی راہ نہیں ہے، اس نے اکابر علماء کی قدم بہ قدم پیروی کی ہے، حدیث میں حضرات محدثین کی اور فقہ میں علماء احناف کی، ان کی راہ سے انحراف نہیں ہے، اور جن کا احتساب کیا ہے، آپ دیکھیں گے کہ

احتساب اسی وقت ہوا ہے، جب انھوں نے اکابر علماء حق سے ہٹ کر اپنی نئی راہ نکالی ہے، اور اس پر اصرار کیا ہے، ہم تو متبع ہیں- بحمد اللہ- مبتدع نہیں ہیں۔ الماٰثر نے جو راہ اختیار کی ہے، وہ بصیرت کے ساتھ اختیار کی ہے اور اس دعاء التجاء کے ساتھ کی ہے کہ **اَللّٰھُمّ اَرِنا الحَقّ حقاً وّ ارْزُقْنا اتِّباعَهٗ وَ اَرِنا الْباطِلَ باطِلاً وّ ارْزُقْنا اجْتِنابَهٗ** (اے اللہ ہماری نگاہوں میں حق کو حق دکھایئے اور اس کی پیروی کی توفیق عطا فرمایئے، اور باطل کو باطل دکھایئے اور اس سے بچنے کی توفیق دیجئے)۔

ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں، اس کی حمد وثنا کرتے ہیں کہ دس سال تک اس ذات پاک نے ہمیں دین حق کی خدمت کی توفیق بخشی، اور اس کی مہربان ذات سے امید رکھتے ہیں کہ وہ پروردگار ہمیں مزید خدمت کی توفیق ارزانی فرمائے گا۔ اے اللہ آپ ہماری غلطیوں کو معاف فرمائیں، قدم کو غلط راہ پر چلنے سے اور قلم کو جادۂ حق سے بہکنے سے محفوظ رکھئے، آپ کی خوشنودی اور رضا مندی کے جویا اپنے غلاموں پر حق وہدایت کی راہ ہمیشہ کھلی رکھئے، اور اسی پر چلنے کی توفیق اور ہمت وقوت دیجئے آمین۔

رَبّنا لا تُواخِذْنا اِنْ نَسِيْنا اَوْ اَخْطَانا رَبّنا و لا تَحْمِلْ عَلَيْنا اِصْراً كَماَ حَمَلْتَهٗ عَلَى الّذِيْنَ مِنْ قَبْلِناَ رَبّنا و لا تُحَمِّلْناَ ما لا طاقَةَلناَ وَ اعْفُ عَنّا وَ اغْفِرْ لَناَ وَ ارْحَمْناَ اَنْتَ مَوْلاَنَا فَانْصُرْناَ عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ.

اے اللہ جو کچھ اب تک لکھا گیا، آپ جانتے ہیں کہ اس میں کتنا حصہ لائق اجر ہے، اور کتنا حصہ قابل مواخذہ، قابل مواخذہ حصہ سے درگزر فرمایئے اور جس پر کچھ اجر مرتب ہو سکتا ہو، اس اجر کو ہمارے پیش رو عالم ومقتدا جو ہمارے گمان میں آپ کے مخلص بندے تھے، جن کی یادگار میں یہ تحریریں لکھی جاتی رہی ہیں، ان کے اعمالنامہ میں درج فرمادیں۔

آمین یا رب العالمین

(ربیع الثانی تا جمادی الثانی ۱۴۲۳ھ/ اگست تا اکتوبر ۲۰۰۲ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فتنوں کی یورش اور مسلمانوں کے لائحۂ عمل

موجودہ دور میں دُنیا جن حالات سے گذر رہی ہے، ہمہ دم ایک آفت کا اسے سامنا ہے، دنیا کے کسی گوشہ میں کوئی آگ لگے، ساری کائنات اس میں سلگنے لگتی ہے۔ ایک عجیب وغریب بے یقینی اور بے چینی کی فضا مسلّط ہے، ہر طرف خوف ودہشت کا سایہ ہے، ایک انجانا خوف سب کو بے چین کئے ہوئے ہے۔

کوئی الجھن نہیں لیکن کسی الجھن میں رہتا ہے
عجب دھڑکا سا ہر دم دل کی ہر دھڑکن میں رہتا ہے

افراد ہوں یا حکومتیں، سب کا یہی حال ہے، ہر فرد اور ہر ادارہ خائف ولرزاں ہے، اور اسی خوف ودہشت کے ماحول میں وہ الٹی سیدھی حرکتیں کرتا ہے جس سے امن وامان مزید تہ وبالا ہوجاتا ہے۔ ایک فرد کسی دوسرے فرد سے کسی وہمی خوف میں مبتلا ہوتا ہے، تو وہ اس خوف کو دور کرنے کے لئے وہ تدبیریں اختیار کرتا ہے جس سے بجائے گھٹنے کے خوف اور بڑھ اور پھیل جائے، حکومتیں، حکومتوں سے ڈرتی ہیں، تو جنگ کا ماحول پیدا کرکے امن عالم کو تباہ کردیتی ہیں۔

چند سال پہلے کی بات ہے کہ دنیا کی ایک بڑی طاقت، جو قتل وخون اور گستاخی وبدتمیزی کا ''سرخ انقلاب'' لے کر دنیا کو بے گناہوں کے خون سے لالہ زار بناتی ہوئی اٹھی تھی، اس کی مضبوط حکومت چند جھٹکوں کے بعد منہدم ہوگئی، اور اس کے ملبے سے کئی ایسی حکومتیں اٹھ کھڑی ہوئیں جو اسلام کی نام لیوا، اور خدائے واحد کی پرستار ہیں۔ کفر وشرک کے پرستاروں کی نیندیں حرام ہوگئیں، حالانکہ ان سے کسی کو واقعی کوئی خطرہ نہیں تھا، مگر باطل نے

دنیا کے اِس سرے سے اُس سرے تک دہشت پھیلا دی کہ اسلام زندہ ہو رہا ہے، مسلمان بیدار ہو رہے ہیں، کہیں یہ بیداری کفر کے لئے پیغامِ موت نہ ثابت ہو، ہنگامے شروع ہوگئے، مگر ان کے عزائم کے برخلاف افغانستان میں ایک خالص اسلامی حکومت قائم ہوگئی، وہ حکومت کیا تھی؟ دنیا کے لئے امن وامان کا ایک پیغام تھی، حیوانیت ودرندگی سے انسانیت وملکوتیت کی طرف ایک سفر تھا، اچھے انسانوں کا ایک مجمع تیار ہوگیا تھا، مگر کفر کو کب گوارا تھا، ایک جھوٹا الزام لگا کر اس چھوٹے سے کمزور ملک پر جس کا جسم پہلے ہی سالہا سال کی لڑائیوں سے زخمی ولہولہان تھا، اتنے بم برسائے کہ وہ حکومت روپوش ہوگئی، لیکن ان بم برسانے والوں کو ابھی تسکین نہیں ہوئی، عراق کے خلاف الزام واتہام کے تیروں کا رخ پھیر دیا، مگر جب وہ سب الزام ناکام ہوگئے، اس کی بے گناہی ثابت ہوگئی تو ارشاد ہوا کہ کچھ ہو ہم تم پر بم برسائیں گے، دنیا ہانکتی پکارتی رہ گئی، اوراس نے بم برسانا شروع کر دیا۔ اس وقت سارا عراق دھواں دھواں ہو رہا ہے، فوجی نہیں عام شہری مر رہے ہیں، جل رہے ہیں، مگر ایک دیوانہ ہے کہ انھیں بے گناہی کی سزا دئے جا رہا ہے۔

قدرتِ الٰہی کا حلم ہے، اس کی طرف سے استدراج ہے، مہلت ہے، کہ ایک کمزور جسم پر ایک طاقت والا اچھل کود رہا ہے اور سارا عالم دم بخود ہے، ہر طرف بے چینی پھیلی ہوئی ہے، کیا ہوگا؟ ہر شخص کی زبان پر یہ سوال ہے، انسانی زندگی تلخ ہو رہی ہے، امن وامان کو آگ لگی ہوئی ہے، اور خونخوار دہشت گرد کہہ رہا ہے، کہ میں دنیا سے دہشت گردی کا خاتمہ کر رہا ہوں، امن کی بنیادیں مستحکم کر رہا ہوں۔ العیاذ باللہ

اسے شاید خود نہیں سمجھ میں آ رہا ہے کہ میں کیوں آگ برسا رہا ہوں اور جس پر آگ برس رہی ہے، وہ بھی شاید نہیں جانتا کہ کس گناہ کی سزا مجھے دی جا رہی ہے، حضرت ابوہریرہ ؓ حضور خاتم النبیین ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں، حضور کا یہ ارشاد امام مسلم نے اپنی کتاب **الصحیح** میں درج کیا ہے، فرماتے ہیں:

والذی نفسی بیدہ، لاتذھب الدنیا حتیٰ یاتی علی الناس یوم

لایدری القاتل فیم قَتَلَ؟ ولاالمقتول فیم قُتِلَ۔

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، دنیا اس وقت تک ختم نہ ہوگی، جب تک لوگوں پر وہ دن نہ آجائے کہ قاتل کو پتہ نہ ہو کہ اس نے کیوں قتل کیا، اور مقتول معلوم نہ ہو کہ وہ کیوں قتل کیا گیا؟

آثار ایسے نظر آرہے ہیں کہ فتنوں کی لہریں دم بدم بڑھتی ہی جائیں گی، وہ وقت قریب سے قریب تر آتا جارہا ہے، جب دنیا کی یہ بساط لپیٹ دی جائے گی، فرشتۂ قیامت منتظر ہے کہ کب حکم ہو اور کب صور پھونک دی جائے؟ یہ وقت جوں جوں قریب ہوتا جائے گا قتل وخونریزی کے عفریت کا ننگا ناچ بڑھتا جائے گا۔

امام مسلم علیہ الرحمہ ہی نے اپنی کتاب **الجامع الصحیح** میں حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کے حوالے سے حضوراکرام ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ: **لاتقوم الساعة إلا علیٰ شرار الخلق۔** قیامت جب قائم ہوگی تو بدترین مخلوق پر قائم ہوگی۔

ان ہی امام مسلم نے حضرت انس ؓ کے واسطے حضور اکرم ﷺ کا ایک اور ارشاد نقل کیا ہے کہ: **لاتقوم الساعة حتیٰ لایقال فی الارض الله الله۔** قیامت اسی وقت آئے گی، جب زمین پر اللہ اللہ کہا جانا بند ہوجائے گا۔ ایک اور روایت میں ہے: **لاتقوم الساعة علیٰ أحدٍ یقول الله الله۔** قیامت اس شخص پر آ ہی نہیں سکتی جو اللہ اللہ کہتا ہوگا۔

بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ **شرار الخلق** بڑھتے رہیں گے، اور ان پر قیامت کا قہر ٹوٹے گا، لیکن احادیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی امید کی کرن ایک بار اور چمکے گی۔

امام مسلم علیہ الرحمہ نے حضرت حذیفہ بن اُسید غفاری ؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

ہم لوگ ایک روز کچھ مذاکرے کررہے تھے، اتنے میں رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، اور فرمایا کہ کس تذکرے میں تم لوگ ہو؟ لوگوں نے کہا کہ ہم قیامت کا ذکر کررہے ہیں، فرمایا کہ جب تک دس نشانیاں نہ دیکھ لو قیامت نہیں آئے گی، پھر آپ نے (۱) دھویں کا

، (۲) دجال کا، (۳) دابة الارض کا، (۴) سورج کا پچھّم سے طلوع ہونے کا، (۵) عیسیٰ بن مریم کے نزول کا، (۶) اور یاجوج ماجوج کا ذکر کیا، نیز تین حسف (زمین دھنسنے) کا تذکرہ کیا، (۷) ایک مشرق میں، (۸) ایک مغرب میں، (۹) اور ایک جزیرۂ عرب میں، (۱۰) اور آخر میں ایک آگ کا ذکر کیا جو یمن سے نکلے گی اور لوگوں کو ہانکتی چلی جائے گی، اور ایک روایت میں ہوا کا ذکر ہے، جو لوگوں کو سمندر میں ڈال دے گی۔

یہ سب چیزیں اپنے اپنے وقت پر ہو کر رہیں گی، کیا عجب ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ جس دھوئیں کو بتا رہے ہیں، اس کا ایک حصہ یہ دھواں بھی ہو، جو بمباریوں کے نتیجے میں دنیا میں پھیل رہا ہے، جو کچھ بھی ہو قیامت کی نشانیاں یکے بعد دیگرے طاہر ہوتی جارہی ہیں، لیکن امید کی کرن یہ ہے کہ ابھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے نزول ہونا باقی ہے، ان کے نزول سے پہلے ایک امام عادل کی حکومت قائم ہو چکی ہوگی، جس کا لقب مہدی ہوگا، حضرت مہدی کا ظہور انتہائی ظلم وجور اور جبر وتشدد کے دور میں ہوگا۔

حدیث کی مشہور کتاب مشکوٰۃ شریف کے کتاب الفتن کے باب أشراط الساعة کی دوسری فصل میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے حوالے سے ایک حدیث نقل کی گئی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

ذکر رسول الله ﷺ بلاءً یصیب هذه الامة حتیٰ لا یجد الرجل ملجأ إلیه من الظلم فیبعث الله رجلاً من عترتی واهل بیتی فیملأ به الارض قسطاً وعدلا کما ملئت ظلماً وجوراً یرضی عنه ساکن السماء وساکن الارض۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک مصیبت کا تذکرہ فرمایا جو اس امت پر آئے گی، وہ مصیبت اتنی زبردست ہوگی کہ آدمی ظلم وستم سے بچنے کے لئے کوئی جائے پناہ نہیں پائے گا، تب اللہ تعالیٰ میری اولاد میں اور میرے اہل بیت میں ایک مرد (مجاہد) کو کھڑا کریں گے، جس کے واسطے سے روئے زمین کو عدل وانصاف سے بھر دیں گے، جس طرح کہ وہ ظلم وجور سے بھر چکی تھی، اس سے آسمان والے بھی خوش ہوں گے اور زمین والے بھی۔

یہی امید کی وہ کرن ہے، جو ابھی باقی ہے، اسی مردِ مجاہد کے دور میں پھر ایک آفت آئے گی، جو دنیا کی آفات میں ایک عظیم ترین بلکہ سب سے بڑی آفت ہوگی، اور وہ ہے دجال کا آنا۔

حضرت عمران بن حصین ؓ فرماتے ہیں کہ: **سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: مابین خلق آدم الیٰ قیام الساعة أمر اکبر من الدجال (رواہ مسلم)** ۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ فرماتے تھے کہ حضرت آدم کی پیدائش سے لے کر قیامت آنے تک کوئی واقعہ اور حادثہ دجّال کے فتنہ سے بڑا اور سخت نہ ہوگا۔

اس فتنۂ عظیمہ کے قلع قمع کے لئے آسمان سے حضرت عیسیٰ ؑ انھیں حضرت مہدی کے دور میں نازل ہوں گے، یہ دَور اگرچہ ایک زبردست فتنے اور مصیبت کا دور ہوگا، مگر اس کی بیخ کنی کے لئے ایک زبردست آسمانی طاقت بھی دنیا میں موجود ہوگی۔ دنیا کے حالات جس تیز روی کے ساتھ الٹ پلٹ رہے ہیں اور ظلم وجور کی حکمرانی جس طرح بڑھتی جارہی ہے، اور اربابِ حکومت کو حوصلہ نہیں ہوتا کہ اس ظلم وجور کے خلاف زبان کھول سکیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس روئے زمین پر ظلم وتشدد سے بچنے کے لئے کوئی پناہ گاہ باقی نہیں رہ گئی ہے، لحظہ بہ لحظہ انتظار بڑھ رہا ہے، کہ وہ ”مہدیٔ برحق“ نظامِ عدل کو قائم کرے۔

روشنی کی اس کرن کے انتظار میں دورِ حاضر کے مسلمانوں کے لئے ایک عظیم پیغام ہے، جسے ہر وقت، ہر صاحب ایمان کو مستحضر رکھنا چاہئے۔ وہ پیغام یہ ہے کہ ہر ایمان والا، اپنے ایمان کی اور اعمالِ صالحہ کی بغایت اہتمام حفاظت کرے، اور اسے اگلی نسل تک منتقل کرنے کی اپنے امکان بھر سعی کرے۔

شرح اس کی یہ ہے کہ جن دنوں حضرت مہدی کا ظہور ہوگا، معلوم ہے حالات کے لحاظ سے ہمارے موجودہ دور سے بہتر نہ ہوگا، بلکہ کچھ بدتر ہی ہوگا۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ جب کوئی حق کی آواز بلند کرتا ہے تو عموماً اس کی مخالفت ہی ہوتی ہے، بالخصوص اربابِ حکومت تو کسی آوازۂ حق کو برداشت کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے، ابھی چند دنوں پہلے

طالبان کی ایک حق نواز اور حق پرست طاقت ابھری تھی، لیکن کس نے ان کا ساتھ دیا؟ ایک طاغوت نے انھیں جب نشانہ بنایا تو تمام حکومتیں اسے شاباشی دیتی رہیں، یا خاموش تماشائی بنی رہیں، بالآخر وہ بکھر کر رہ گئی۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے کچھ ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ حضرت مہدی کا جب ظہور ہوگا تو ان کا ساتھ دینے والے بھی کم ہی ہوں گے، بجز ان کے جو خاص ایمانی طاقت اور اعمالِ صالحہ کے جذبے سے سرشار ہوں گے، جو دنیا بھر میں چھائی ہوئی مادی اور دنیاوی تہذیب وے متاثر نہ ہوں گے، جو مغربیت کی آندھیوں سے محفوظ ہوں گے۔ ایسے ہی لوگ اس مرد مجاہد کے ساتھ ہوں گے، ان کے پاس مادی ساز و سامان کی بہتات نہ ہوگی اور نہ بڑی فوج ہوگی۔ اسی لئے دنیا کی سب سے بڑی روحانی طاقت ان کی مدد کے لئے نزول کرے گی، کون نہیں جانتا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس دنیا کی ایک عجیب و غریب ہستی ہیں، جو بغیر باپ کے خاص قدرتِ الٰہی سے پیدا ہوئے اور جب تک زمین پر رہے، جبریل امینؑ ان کی حفاظت کرتے رہے، پھر آسمان پر اٹھا لئے گئے اور اب تک وہیں ہیں، اتنے عرصے میں ان کی قوت کہاں سے کہاں تک پہونچی ہوگی۔ یہ پیغمبرانہ اور ملکوتی قوت جب زمین پر اترے گی تو ظاہر ہے کہ برائیاں سمٹیں گی۔ تو آج کے مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ اپنا ایمان اتنا مضبوط کریں، اور اعمالِ صالحہ کا وہ آہنی حصار بنائیں کہ دنیا کا کوئی فتنہ انھیں اور ان کی نسل کو متاثر نہ کر سکے، تاکہ جب وہ مرد مجاہد اپنے کام کا آغاز کرے، تو یہ نسل بجائے ان کی موافقت کرنے اور بجائے ان کی مدد کرنے کے مخالف کیمپ میں نہ جا بیٹھے۔ اللہ جانے کب وہ دور آجائے، اور کب ہماری یہ ایمانی کاوش درجۂ اعتبار پا کر خدا تعالیٰ کے یہاں مقبول ہو جائے۔

اللھم انصر الاسلام والمسلمین واجعلھم دُعاةً الیٰ سبیل الحق والیقین،

آمین یارب العالمین

(محرم تا ربیع الاول ۱۴۲۴ھ / مئی تا جولائی ۲۰۰۳ء)

☆☆☆☆☆

﷽

مال رحمت بھی ہے اور فتنہ بھی!

امیر المومنین فی الحدیث امام محمد بن اسمٰعیل بخاری علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں حضرت عمرو بن عوف ﷜ کے حوالے سے ایک حدیث نقل کی ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے امین الامت حضرت ابوعبیدہ بن جراح ﷜ کو بحرین بھیجا تھا کہ وہاں سے جزیہ وصول کر کے لائیں، حضرت ابوعبیدہؓ بڑی مقدار میں مال وہاں سے لے کر مدینہ آئے۔ حضرات انصار نے ان کی آمد کو سنا، فجر کی نماز کے بعد رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کی، اللہ کے رسول ﷺ نے تبسم فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ تمہیں ابوعبیدہ کی آمد کی اطلاع ملی ہے، اور یہ کہ وہ کچھ لائے ہیں، اسی لئے تم لوگ آئے ہو، عرض کیا بے شک یہی بات ہے، آپ نے فرمایا: مبارک ہو اور تم کو خوشی حاصل ہو، اس کے لئے پُر امید رہو۔ واللہ میں تمہارے اوپر فقر و تنگدستی کا اندیشہ نہیں رکھتا، مگر مجھے اس کا اندیشہ ہے کہ تمہارے اوپر دنیا اس طرح پھیلا دی جائے گی جیسے تم سے پہلے لوگوں پر پھیلا دی گئی، تو تم لوگ آپس میں اس میں مسابقت کرو گے، اور وہ تمھیں اسی طرح غافل کر دے گی جس طرح اگلوں کو غافل کر دیا تھا۔ (کتاب الرقاق، باب: ۷)

اور امام ترمذی علیہ الرحمہ نے حضرت کعب بن عیاض ﷜ کے حوالے سے ایک حدیث نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے، آپ فرما رہے تھے کہ ہر امت کے لئے ایک فتنہ ہے، اور میری امت کا فتنہ مال ہے۔ (کتاب الزہد)

رسول اکرم ﷺ نے ان دونوں حدیثوں میں اور ان کے علاوہ متعدد مقامات پر مال کی آزمائش اور مال کے فتنے سے اپنی امت کو خبردار کیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ سے اور

آخرت سے غافل کرنے اور اللہ کے احکام کے مقابلے میں بغاوت کرنے کا سب سے مؤثر محرّک عموماً مال ہی ہوتا ہے۔ آدمی مال کی تحصیل میں بھی اور مال حاصل ہوجانے کے بعد اس کے استعمال میں بھی غفلت کا شکار ہوجاتا ہے۔ یہ نہیں کہ مال کی تحصیل سے، اور اس کے کمانے سے اللہ کے رسول ﷺ نے منع فرمایا ہو۔ نہیں یہ تو ایک امرِ مباح ہے، منع جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ مال کی محبت میں ایسا انہماک ہوجائے کہ آدمی اللہ سے، اللہ کے احکام سے، اللہ تعالیٰ کے دین سے، فکرِ آخرت سے غافل ہوجائے، لیکن مال کی محبت اور اس کی رغبت میں عموماً یہی ہوتا ہے، آپ خود اپنی ذات میں دیکھ لیں، اپنے گردوپیش پر نظر ڈالیں، آپ کو ہر جگہ..... **إلا ماشاء الله.** .....یہی دکھائی دے گا کہ مال گھر میں بڑھا اور طبیعتوں کا انداز بدلا، ملنے جلنے والوں کا حلقہ بدلا، زندگی کا معیار بدلا، سوچنے کا پیمانہ بدلا، سب سے اول اس کا حملہ آدمی کے دین ہی پر ہوتا ہے۔

رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: **ما ذئبان جائعان اُرسِلا فی غنمٍ بافسد لها من حرص المرء علی المال والشرف لدینهٖ** (ترمذی ودارمی) دو بھوکے بھیڑیئے، جو بکریوں کے گلّے میں بھیج دئے گئے ہوں، ان بکریوں کو اتنا نہیں برباد کرسکتے، جتنا کہ آدمی کی حرصِ مال اور حرصِ جاہ اس کے دین کو برباد کرتی ہے۔

تو مال اس وقت سخت برا اور آفت ہے جب وہ دین کو برباد کردے، اور یہی زیادہ تر ہوتا ہے، اس لئے اس سلسلے میں اتنے سخت ارشادات ہیں۔ حُبِّ مال کے لئے حُبِّ جاہ لازم ہے۔ آدمی کے پاس مال زیادہ ہوتا ہے تو اسے شدید خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اس سے مرعوب رہیں، اس کے سامنے خادمانہ طور پر حاضر رہیں، اس کے سامنے جبینِ نیاز ٹیکے رہیں، اور جب یہ بات پیدا ہوتی ہے تو بندہ بنے رہنے پر راضی نہیں ہوتا ہے، اس میں خدائی اور کبریائی کے ناز وانداز آجاتے ہیں، اب وہ خدا کے احکام کا پابند نہیں ہوتا، بلکہ لوگوں کو اپنے احکام کا پابند بنانے کی کوشش کرتا ہے، بندگی سے یہ بغاوت اور کبریائی حدود میں اس کی سرکشی بالآخر اس کے دین کو کھا جاتی ہے۔

فراوانیٔ مال و دولت کی یہ فتنہ سامانیاں ایسی نہیں ہیں کہ ان کی نشاندہی کی جائے، یہ معاشرہ کا ناسور ہے، جن کے پاس مال کی بہتات ہے، وہ اپنا احتساب خود کرلیں کہ یہ مال انھیں کن وادیوں میں پہونچاتا ہے۔ مال کا اگر صحیح استعمال ہو، صحیح طریقے سے حاصل کیا جائے اور صحیح مصرف میں خرچ کیا جائے، نیت بھی درست ہو، تو یہ مال جنت تک پہونچنے کا، اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کا ایک بہترین راستہ ہے۔ جائز ذرائع سے مال کمایا جائے، حرام کے دروازے اپنے اوپر بند کردئے جائیں، کسب مال میں خیانت نہ کی جائے، جھوٹ اور جھوٹی قسموں سے بچا جائے، جن چیزوں کی خرید و فروخت کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے، اور جن ذرائع کو غلط قرار دیا ہے، ان سے بچنے کا اہتمام کیا جائے، پھر کسب مال میں انہماک کی وجہ سے نماز و تلاوت اور ذکرِ الٰہی سے غفلت نہ برتی جائے، تو آدمی کے ہاتھ میں آنے والا مال بابرکت ہوگا، اس سے قلبی اطمینان حاصل ہوگا، اللہ کی طرف سے اس کی مدد ہوگی، دل میں اچھے ارادے اور اچھی نیتیں پیدا ہوں گی، ''عمل صالح'' کا جذبہ بیدار ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ: يَـٰٓأَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحاً إِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ () یعنی اے رسولو! حلال اور پاک روزی کھاؤ، اور نیک اعمال کرو، میں تمہارے اعمال سے واقف ہوں۔

اس آیت کریمہ میں ''عمل صالح'' کے حکم کو اللہ تعالیٰ نے حلال و پاکیزہ روزی کے ساتھ ذکر فرمایا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حلال روزی، اعمالِ صالحہ کا سبب بنتی ہے، بلکہ وہ مدارِ کار ہے، وہ نہ ہو تو ''اعمالِ صالحہ'' بھی گھٹ کر بلکہ مٹ کر رہ جائیں گے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ میرے لئے دعا فرما دیجئے کہ میں مستجاب الدعوات ہو جاؤں، یعنی جو دعا کروں قبول ہو جایا کرے۔ آپؐ نے فرمایا سعد! اپنا کھانا حلال اور پاک بنالو، مستجاب الدعوات ہو جاؤ گے، اور قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے، بندہ اپنے پیٹ میں حرام لقمہ ڈالتا ہے تو چالیس روز تک اس کا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا، اور جس شخص کا گوشت حرام مال سے بنا ہو، اس

کے لئے جہنم کی آگ ہی مناسب ہے۔

تو مسلمانوں کے معاشرہ کی اصلاح کا مدارِ کار حلال اور جائز آمدنی پر ہے، اس چیز کی بے احتیاطی نے اعمالِ خیر کی صلاحیت برباد کردی ہے، نیکیوں کا حوصلہ چھین لیا ہے، توفیقِ نیک سلب ہوکر رہ گئی ہے۔

پھر اس کے بعد مال کے خرچ کا ایک مسئلہ ہے، جس طرح ایک مسلمان مال کی کمائی میں احکام وہدایات کا پابند ہے، ٹھیک اسی طرح مال کے خرچ کرنے میں بھی اللہ تعالیٰ کے احکام وہدایات کا پابند ہے، اسے اختیار نہیں ہے کہ جس طرح چاہے اللہ کی دی ہوئی اس امانت میں تصرف کرے۔ اس کے خرچ کے کچھ مواقع تو خالص عبادت ہیں، مثلاً پورے حساب اور اہتمام سے زکوٰۃ نکالی جائے اور مستحقین کو دی جائے، صدقہ فطر ادا کیا جائے، نفلی صدقات وعطیات کا نظام رکھا جائے، فرض ہو تو حج میں مال خرچ کیا جائے، کسی مصیبت زدہ کی مدد کی جائے، صدقہ جاریہ کا انتظام کیا جائے، مال خرچ کرنے کے یہ وہ مواقع ہیں جو انسان کو بلندی کی معراج پر پہونچاتے ہیں، یہ بندہ خدا کا خاص بندہ بن کر رہتا ہے۔

کچھ مواقع مال خرچ کرنے کے وہ ہیں جن کا تعلق انسانی زندگی اور باہمی تعلق اور خاندانی اشتراک کی ضرورت سے ہے، جیسے خود آدمی کا اپنا کھانا پینا، کپڑا پہننا، مکان بنانا، دواعلاج، اپنے اہل وعیال کی خبر گیری وغیرہ۔ یہ سب چیزیں ضرورت کا درجہ رکھتی ہیں، عبادت نہیں، ان میں نیت درست ہو تو، شریعت کے احکام اور اعتدال ومیانہ روی کا اہتمام ہو تو مال یہاں بھی ثواب کا ذریعہ ہے۔

لیکن ضرورت کے ان مواقع پر خرچ کرنے میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت یہ ہے کہ: كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ O ۔ (کھاؤ اور پیو، مگر اسراف مت کرو، بے شک اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے)

اسراف کا مطلب یہ ہے کہ آدمی مقررہ حد سے آگے نکل جائے، مثلاً یہ بھی ہے کہ حلال سے تجاوز کرکے حرام تک پہونچ جائے، یہ بھی اسراف ہے کہ آدمی ضرورت سے زائد

کھاتا پیتا رہے۔

سلف صالحین نے اس بات کو بھی اسراف میں داخل کیا ہے کہ آدمی ہر وقت کھانے پینے کے دھندے میں مشغول رہے، یا اس کو دوسرے اہم کاموں سے مقدم جانے، جس سے یہ سمجھا جائے کہ اس کا مقصد زندگی یہی کھانا پینا ہے۔

ایک حدیث میں رسول کریم ﷺ نے اس کو بھی اسراف میں داخل فرمایا ہے کہ جب کسی چیز کو جی چاہے، اس کو ضرور ہی پورا کرے: إن من الاسراف أن تاکل مااشتهیت۔ (ابن ماجہ) یہ بھی اسراف ہے کہ جس چیز کا جی چاہے، اسے کھا ہی لو۔

امام بیہقی نے نقل کیا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ دن میں دو مرتبہ انھوں نے کھانا کھایا، تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ اے عائشہ! کیا تمھیں یہ پسند ہے کہ تمہارا شغل صرف کھانا ہی رہ جائے۔ (یہ دونوں حدیثیں معارف القرآن ج:۳، ص:۵۴۶ سے لی گئی ہیں)

اسراف حرام ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ، اسراف کرنے والوں سے اللہ کو محبت نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جو چیز باعثِ ناپسندیدگیٔ خداوندی ہو، وہ حرام ہی ہوگی۔

اسراف ہی کے قریب قریب ایک اور چیز ہے، جسے ’’تبذیر‘‘ کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْراً إِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْا إِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ وَکَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّهٖ کَفُوْراً، (بنی اسرائیل:۲۶/۲۷) اور بے جا مت اڑاؤ، بے شک مال کو بے جا اڑانے والے شیطان کے بھائی ہیں، اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔

’’تبذیر‘‘ یہ ہے کہ گناہوں میں اور لغویات میں مال خرچ کیا جائے، یا مباحات میں نے سوچے سمجھے اتنا خرچ کردے جو آگے چل کر حقوق واجبہ کو ضائع کردے، یا ارتکاب حرام کا سبب بن جائے۔

ہمارے معاشرے میں اسراف اور تبذیر کا طوفان کھڑا ہے، اللہ نے جن کو دولت

سے نوازا ہے، ان کے مال کا عمومی مصرف وہ خود غور کریں کہ کیا چیز ہے؟ گناہ کی چیزیں اس مال سے خریدی جارہی ہیں، جہاں کوئی موقع خرچ کرنے کا نہیں ہے، یا ہے تو ایک محدود اندازے سے خرچ کرنا کافی ہوتا ہے، وہاں کس طرح بے تحاشا مال خرچ ہورہا ہے، نکاح، ختنہ، عقیقہ، فضول دعوتیں، تفریحات، پکنک، گھروں کی زینت اور اللہ جانے کتنی کتنی بلائیں ہیں، جن میں مال بے تحاشا پھونکا اور بہایا جارہا ہے، اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی مواقعِ خیر پر خرچ کرنے سے محروم ہوجاتا ہے، شادی بیاہ میں لاکھوں لاکھ خرچ کرنے سے زکوٰۃ دینے کی سعادت سے ہٹادیا جاتا ہے، فضول تفریحات اور پکنکوں میں پیسے برباد کرنے والے، صدقاتِ نافلہ کا ثواب کیونکر حاصل کرسکتے ہیں؟ غلط مقدمات لڑنے والے، دوسروں کی ہلاکت کی سازشیں کرنے والے حج وزیارت کی سعادت کب پاسکتے ہیں؟

واقعہ یہ ہے کہ ایک برائی دوسری برائی کو جنم دیتی ہے، اور مال سے پھیلنے والی برائیاں تو جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی ہیں، جو پورے معاشرے کو خاکستر بنادیتی ہیں، یہ مال اس لئے نہیں ہے کہ اس سے برائیاں پھیلائی جائیں، بلکہ اس لئے ہے کہ اس کی زکوٰۃ نکال کر اپنے لئے بھی، اپنی آخرت کے لئے بھی اور اپنے معاشرے کے غریب وکمزور افراد کے لئے نفع وبہبودی کا سامان کیا جائے۔ اگر باقاعدہ ہر صاحب ثروت زکوٰۃ ہی نکالتا رہے اور صحیح مصرف میں پر پہونچانے کا اہتمام کرتا رہے، تو مسلمانوں کے درمیان سے کتنے مصائب کا خاتمہ ہوجائے۔ اللہ تعالیٰ توفیق دیں۔

(رجب تا رمضان ۱۴۲۳ھ/نومبر، دسمبر ۲۰۰۱ء، جنوری ۲۰۰۲ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سفرِ حج کے برکات اور اس کے تقاضے

زائرینِ حرم کے قافلے لوٹ لوٹ کر اپنے گھروں کو واپس آ چکے ہیں، بڑی خوش نصیب ہیں وہ آنکھیں جنھوں نے خداوند عالم کی تجلی گاہِ خاص کا جلوہ دیکھا، بہت خوش بخت ہیں وہ قدم جو کعبۃ اللہ شریف کے طواف میں دوڑے، اور صفا و مروہ کے درمیان سعی میں کوشاں رہے، زندگی کا بڑا قیمتی تھا وہ لمحہ جو میدانِ عرفات میں نصیب ہوا، اور ندامت کے چند قطرے وہاں کی خاک میں جذب ہو گئے، بڑی روشن تھی وہ رات جو مزدلفہ میں گزری، کتنی مبارک تھی وہ صبح جس میں وقوف مزدلفہ نصیب ہوا اور دعاؤں کو اذنِ قبول ملا، پھر منیٰ کی وہ سرگرمیاں مبارک صد مبارک! کبھی رمیِ جمرات ہے، کبھی قربانیوں کا اہتمام ہے، ابھی طوافِ زیارت کے لیے حرم کو روانگی ہے، پھر معاً واپسی ہے، کبھی سر منڈانے کی عبادت ہے؛ غرض اللہ کی راہ میں وہ دیوانگی ہے کہ رحمت الٰہی ٹوٹ ٹوٹ کر برسی، یہ ملتزم ہے جہاں لپٹ لپٹ کر حاجی دعا کر رہا ہے، یہ حجر اسود ہے جس تک پہنچنے کی بیتابی آدمی کو بے قرار رکھتی ہے مگر موقع نہیں مل پاتا، عاشقوں کا ہجوم ہی کچھ اتنا ہے کہ یہ بے تابی حسرت بن کر دل میں رہ جائے، یہ حطیم ہے، اس میں دو رکعت نماز حاصلِ زندگی ہے، یہ مقامِ ابراہیم ہے کاش یہاں دو رکعت پڑھنے کی فرصت میسر آ جائے، یہ آبِ زمزم ہے، خوب پیجئے، پیٹ بھر کر پیجئے، جس مقصد کے لیے پیجئے وہی حاصل ہو، بیمار ہوں تو شفا حاصل ہو، بھوکے ہوں تو آسودگی حاصل ہو، پیاس کی بے قراری ہو تو سیرابی ملے، نیت کر لیجئے کہ آخرت کی پیاس سے سیرابی ہو، انشاء اللہ وہ بھی یہیں حاصل ہو جائے گی۔ پھر یہ طیبہ پاک کی سرزمین ہے، آرامگاہِ رسول ہے (ﷺ)، مدینہ پاک کی سرزمین! اسلام کے عہدِ اولین کی یادگاروں کی امین! یہاں وہ خزانہ مدفون ہے،

جس کی قیمت سارا عالم نہیں ہوسکتا، یہاں کا ہر ذرہ آفتاب سے بڑھ کر روشن ہے، یہ مسجدِ نبوی ہے، یہ محراب نبی ہے، یہ منبرِ رسول ہے، یہ روضۂ اطہر ہے، یہ صفہ ہے، یہ بابِ جبرئیل ہے، یہ بابِ رحمت ہے، یہ جنت البقیع ہے، اس میں صدہا لعل وگہر چھپے ہوئے ہیں، یہ احد پہاڑی ہے، جس کو خون شہداء کے طفیل حیات جاوداں ملی، اس کا دل اہلِ ایمان کی محبت میں دھڑکتا ہے، یہ غزوۂ خندق کے آثار وعلائم ہیں، جہاں پہونچ کر سورۂ احزاب کی آیات بے ساختہ یاد آجاتی ہیں، یہ مسجدِ قبا ہے، جس نے پہلے پہل رسول اکرم ﷺ کے دستِ مبارک سے شرف تعمیر پایا تھا۔

اور کیا کیا ہے؟ عقیدتوں کی سوغات ہے، محبتوں کے تحفے ہیں، اشکہائے ندامت کی بارش ہے، دل کی بیتابیاں ہیں، ان کے جلوے ہر طرف بکھرے پڑے ہیں، تنگیِ داماں کی شکایت رہ جاتی ہے، ورنہ ادھر سے بخشش وعطا میں کوئی کمی نہیں ہے، حجاج کرام یہ ساری تجلیاں، یہ تمام سوغاتیں دامنِ دل میں سمیٹ کر لائے ہیں۔

اللہ تعالیٰ تمام مسافرانِ حرم کے حج وعمرہ کو قبول فرمائیں، اگر کسی نے حج اس کے شرائط وآداب کے ساتھ کیا، اس کی ظاہری و باطنی پابندیوں کو بجالایا، تو وہ اس طرح لوٹتا ہے، جیسے آج ہی وہ ماں کے شکم سے وجود میں آیا ہو، اس پر کسی گناہ کا اثر باقی نہیں رہتا، کتنے مبارک ہیں وہ بندے جو رحمت ومغفرت کے دریا میں غوطہ زن ہوکر اس طرح نکلے ہیں کہ ان کے اوپر میل کچیل کا کوئی دھبہ موجود نہیں، یہ دعا مانگیں تو ان کی دعا قبول، یہ کسی کی سفارش کریں تو ان کی سفارش منظور!

حجاج بیت اللہ زندگی کا ایک نیا دور لے کر لوٹے ہیں، اللہ نے بڑا احسان کیا کہ پچھلے گناہوں کو دھو کر صاف کر دیا، اب اس صفائی ستھرائی کی حفاظت اور اس کے بقاء کی ضرورت ہے، زندگی میں جو تبدیلی اللہ کی جانب سے آچکی ہے، اسی محور پر باقی زندگی گزارنے کا اہتمام چاہئے۔ ہم نے اپنے بچپن میں دیکھا تھا کہ جب کوئی حج کا ارادہ کرتا تو اسی وقت سے اس کے اوپر دینداری کی ظاہری علامات طلوع ہونے لگتی تھیں، چہرے پر ڈاڑھی نہیں ہے تو چھوڑ دی جاتی تھی، نمازوں کا اہتمام شروع ہوجاتا تھا، رشتہ داروں اور تعلق

والوں سے معافی تلافی کا سلسلہ چل پڑتا تھا، اور جب واپسی ہوتی تھی، تو وہ نہیں رہتے تھے جو پہلے تھے، مگر دیکھتے ہی دیکھتے رنگ بدل گیا، اب تو حج سے پہلے اور حج کے بعد کی زندگی میں بسا اوقات کوئی فرق نہیں ہوتا، اگر یہ ہوتا کہ حج سے پہلے بھی دیندار اور متقی تھے، اور حج کے بعد بھی یہ وصف قائم اور باقی رہا، تو کیا بات تھی! مگر ہوتا یہ ہے کہ نہ حج کے پہلے دینداری اور تقویٰ کا اثر ہے اور نہ حج کے بعد اس کی جھلک!

اے حضرات! یہ دنیا اور دنیا کی زندگی اس لیے نہیں ہے کہ آدمی اپنا دل دماغ اسی دنیا میں کھپا دے، اس کی سوچ کا محور بس یہ ہو کہ دنیاوی تقاضوں کو کیونکر عیش و راحت سے پورا کیا جائے، یہ تو انسان کا بڑا گھٹیا مقصد ہے، بلکہ تنگ نظری ہے گو کہ اس دور میں اسی قسم کے لوگ عقلمند کہے جاتے ہیں، لیکن خالقِ کائنات جلّ ذکرہ ارشاد فرماتے ہیں ﴿اِنّ الّذین لا یَرجُونَ لِقاءَ نا وَ رَضُوا بِالحَیوۃِ الدُّنیا و اطمَاَنُّوا بِها وَ الّذینَ هُم عَنُ آیاتِنا غٰفِلُون۔ اُولئِكَ ماوٰهُمُ النّارُ بِمَا كانوُا یَكسِبُونَ﴾ (سورۂ یونس: ٧/٨)
وہ لوگ جو ہمارے پاس آئے اور ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے، اور وہ دنیاوی زندگی ہی پر راضی اور مطمئن ہو بیٹھتے ہیں، اور نیز وہ لوگ جو ہماری نشانیوں سے غافل ہیں، بلاشبہ یہی لوگ ہیں جن کے لیے ان کے افعال کے عوض جہنم ہے۔

یعنی دنیا میں ایسا دل لگایا کہ آخرت کی اور خدا کے پاس جانے کی کچھ خبر ہی نہ رہی، اسی چند روزہ حیات کو مقصود و معبود بنا لیا، سارا کچھ کرنا دھرنا، خوشی و غم اور تگ و دو اسی زندگی کے لیے وقف ہو کر رہ گئی، اس کا آخری انجام یقیناً وہی ہے، جس سے اللہ نے ڈرایا ہے، یہ وصف ہے تو کفار و مشرکین کا، لیکن ہم مسلمانوں کو بھی اس پر غور کرنا چاہئے کہ یہ وصف اور یہ حال ہمارے اندر کتنا پایا جاتا ہے، عقیدے کی حد تک بلاشبہ ہر مسلمان کا دل صاف ہے کہ آخرت کی پیشی ہونی ہے، مگر یہ عقیدہ ہمارے روزمرہ کے حالات و معمولات میں کتنا مؤثر ہے؟ ہمارے طرزِ فکر اور کفار و مشرکین کے طرزِ فکر میں کتنا فرق ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ آخرت ہماری نگاہوں سے اوجھل سی معلوم ہوتی ہے، اور دنیاوی

مقصد پر ہی آدمی ٹوٹا پڑا ہوا ہے، غیروں کی نقالی میں ہم نے اپنی پونجی گنوادی ہے، ایک ایمان والا کسی کافر کی نقالی کرے، اُدھر رجحان رکھے، یہ بڑی بدنصیبی کی بات ہے، اللہ کو ماننے والا دنیوی خرافات کو مطمح نظر بنالے! ترقیٔ معکوس ہے، یہود ونصاری اور کفار ومشرکین، غضب الٰہی کے شکار ہیں، صحیح راہ سے کوسوں دور ہیں، ان کا طریقہ اختیار کرنے والا، ان کی معاشرت کو پسند کرنے والا، اللہ کو کیونکر راضی کرسکتا ہے؟

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿و لا تَرُكَنُوا اِلَى الّذينَ ظَلَمُوا فتَمَسّكُمُ النّارُ و ما لَكُمُ مِنُ دُونِ اللّٰهِ مِنُ اَوُلِياءَ ثُمّ لا تُنُصَرُونَ﴾ (سورۂ ھود: ۱۱۳) اور مت جھکو ان کی طرف جو ظالم ہیں، پھر تم کو لگے گی آگ اور کوئی نہیں تمھارا اس کے علاوہ مددگار، پھر کہیں مدد نہ پاؤ گے۔

یعنی جو لوگ ظالم ہیں، اور ظالم کون؟ اللہ کی باندھی ہوئی حدوں سے نکل جانے والا، فرماتے ہیں کہ ظالموں کی طرف تمھارا ذرا سا میلان اور جھکاؤ بھی نہ ہو، ان کی موالات، مصاحبت، تعظیم وتکریم، مدح وثنا، ظاہری تشبہ، اشتراک عمل، ہر بات سے حسب مقدور محترز رہو، مبادا آگ کی لپٹ تم کو لگ نہ جائے، پھر نہ خدا کے سوا تم کو کوئی مددگار ملے گا، اور نہ خدا کی طرف سے کچھ مدد پہونچے گی۔

کفار کی طرف دل کا میلان بغایت خطرناک ہے، اس سے اس طرح بچنا چاہئے، جیسے آدمی سانپ بچھو سے بچتا ہے، کسی کو معلوم ہو جائے کہ فلاں چیز کھانے سے یقینی طور پر کینسر ہو جاتا ہے، تو اس کے پاس کبھی نہ جائے گا، لیکن ہم ایمان رکھتے ہوئے، انھیں راستوں میں گھستے ہیں، جن کی انتہا جہنم پر ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر علیہ السلام سے ارشاد فرمایا ہے کہ ﴿وَ اِنُ كادوا لَيَفُتِنونَكَ مِنَ الّذى اَوُحَينا اِلَيكَ لِتَفُتَرِىَ عَلَينا غَيرَهٗ و اِذاً لاتّخَذُوكَ خليلاً۔ و لَوُ لا اَنُ ثَبّتُناكَ لَقَدُ كِدُتَ تَرُكَنُ اِلَيُهِمُ شَيُئاً قَليلاً۔ اِذاً لَاَذَقُناكَ ضِعُفَ الُحَيوٰةِ و ضِعُفَ الُمَماتِ ثُمّ لا تَجِدُ لَكَ عَلَيُنا نَصِيُراً﴾ (سورۂ بنی اسرائیل: ۷۳-۷۴-۷۵) ان کفار کا مقصد یہ ہے کہ ہم جو کچھ بذریعہ وحی تمھارے پاس علوم واحکام بھیج رہے ہیں، ان سے تمھیں ہٹادیں، اس کے لیے یہ سازشیں کرتے ہیں، ورغلاتے ہیں، دنیا کے سبز باغ دکھاتے ہیں، تاکہ تم اس کا کچھ حصہ ترک کردو، یابدل

دو، اگر تم ایسا کرلوگے، تو وہ تمھیں اپنا خالص دوست بنالیں گے، لیکن بات یہ ہے کہ ہم نے تمھیں سنبھال رکھا ہے، عصمت کی پختگی تمھیں عطا کر رکھی ہے، پہاڑ جیسا ثبات واستقلال بخش کر رکھا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو تم ذرا سا ہی سہی ان کی ترغیبات وتحریضات سے متاثر ہوجاؤ گے، اور اگر ایسا ہوتا تو ہم زندگی اور موت کا دوگنا عذاب تم پر مسلط کردیتے، اور ہمارے خلاف اپنا کوئی مددگار نہ پاتے۔

اندازہ کیجئے، کفار ومشرکین اور یہود ونصاریٰ کی طرف خفیف میلان پر کتنا شدید مؤاخذہ ہورہا ہے، اگر یہ وعید شدید اہلِ ایمان کے سامنے ہو، تو ان کا ہلکے سے ہلکا تشبہ بھی آدمی کو برداشت نہ ہو۔

نظریات وعقائد ہوں، یا ظاہری اعمال واوصاف کسی میں بھی اسلامی طریقہ چھوڑ کر غیروں کی نقالی، سب اس وعید کے دائرے میں آتی ہے، شعائرِ اسلامی کا استخفاف اور ان کی توہین ہو، فرائض وواجبات کا ترک ہو، اسلامی شکل وصورت سے ہٹ کر یہود ونصاریٰ یا کفار کی صورت اختیار کرنی ہو، ڈاڑھی منڈانی، مونچھیں بڑھانی، ننگے سر رہنا، انگریزی معاشرت کو ترجیح دینا، یہ سب اسی وعید کے تحت داخل ہیں، یہ تمام امور اس کی علامت ہیں کہ دل میں اسلامی طور طریقے کی عظمت واہمیت نہیں ہے، اس کے مقابلے میں غیر اسلامی طور طریقوں کی عظمت ومحبت ہے۔

محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہ نے اعیان الحجاج میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ایک ارشاد نقل کیا ہے، بہت ہی اہم اور قابلِ غور! فرماتے ہیں:

> ’’دو شخصوں کی وضع قطع اور لباس و پوشاک میں اس وقت تک مشابہت پیدا نہیں ہوتی، جب تک دونوں کے دل باہم مشابہ نہیں ہوتے‘‘ (ج:۱ص:۳۹)

ہمارا دین، دین حنیف ہے، دین حنیف کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک طریقہ ومذہب سے جدا، محض اللہ کے حکم پر مبنی، جس میں نفس کی خواہش، ماحول کے رجحان، اور خاندانی روایات کا کوئی دخل نہیں ہے، یہ دین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ میں منحصر ہے، اس اسوۂ

حسنہ سے خروج، دائرۂ ظلم میں انسان کو پہنچا دے گا۔ زندگی کے ہر مرحلہ میں مومن کو اس کی جستجو ہونی چاہئے کہ رسول اللہ ﷺ کا اسوۂ حسنہ کیا ہے، اپنے آپ کو اسی پر مضبوطی سے ڈال دے، خواہ اس کی وجہ سے دنیا میں اجنبی بن کر رہ جائے، دنیا والے اسے اجنبیت سے دیکھیں گے، لیکن فرشتے اسے پہچانیں گے، رسول اکرم ﷺ کی بشارت اس کے حق میں صادق آئے گی، فرمایا کہ **بَدَأ الإسلامُ غَرِیباً و سَیَعودُ غریباً کما بَدَأَ فَطُوبیٰ لِلْغُرَباءِ** اسلام کا جب آغاز ہوا تھا تو اس وقت کے ماحول میں اجنبی تھا، اسے پہچاننے والے کم تھے، اور پھر ایک وقت ایسا آئے گا کہ وہ اجنبی بن کر رہ جائے گا، نہ اسلام کو لوگ پہچانیں گے، نہ اس پر عمل کرنے والوں کو، تو ان اجنبیوں کے لیے خوش خبری ہے۔

گھبراہٹ اور مایوسی کی بات بالکل نہیں ہے کہ اسلام پر عمل کرنے کی وجہ سے آدمی اجنبی سا ہو کر رہ جائے، بلکہ یہ خوشی اور سعادت کی بات ہے، اس کے لیے بشارت ہے۔

تو جو چیز اللہ نے اور اللہ کے رسول نے ہمارے لیے پسند کی ہے، جو عقیدہ پسند کیا ہے، جو عمل منتخب کیا ہے، جو سیرت تجویز کی ہے، جو صورت ہمیں عطا کی ہے، اس پر ہم رہیں، نہ چہرہ مہرہ بدلیں، نہ لباس غیروں جیسا پہنیں، نہ غیروں کی طرح ترکِ نماز کریں، نہ دنیا اور متاعِ دنیا کو کفار و مشرکین کی طرح اہمیت دیں، نہ مخلوق کو کارساز سمجھیں، بس اللہ سے لو لگائے رکھیں، ہر کام کے بناؤ اور بگاڑ کی جگہ وہی ہے، اللہ پر پختہ ایمان رکھیں، بالیقین توکل کریں، اور اپنی زندگی کو اس آیت کے سانچے میں ڈھال لیں ﴿قُلْ اِنَّ صَلاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعالَمِینَ لا شَرِیکَ لَہٗ وَ بِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَ اَنا اَوَّلُ الْمُسْلِمینَ﴾ تم کہہ دو کہ بے شک میری نماز، میری عبادت، میری زندگی اور میری موت سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے، اور میں پہلا فرمانبردار ہوں۔

رضائے الٰہی تک پہونچانے والی راہ یہی ہے۔ فَتُوبُوا اِلَی اللّٰہِ جَمِیعاً اَیُّھا المومنونَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُونَ۔ (شوال تا ذی الحجہ ۱۴۲۳ھ / فروری تا مارچ ۲۰۰۳ء)

☆☆☆☆☆

(ضیاء الاسلام: جنوری ۲۰۰۸ء)

یہود کی گستاخیاں اور شعائر اللہ کا احترام

حق تعالیٰ شانہ نے قرآن کریم کی پہلی سورہ میں، جو کہ جامع ترین سورہ ہے، یعنی سورۂ فاتحہ میں ایک دعا اپنے بندوں کو تلقین فرمائی ہے اور نماز کی ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کی قرأت متعین کر کے حکم دے دیا ہے، کہ اس دعا کو بار بار، دن اور رات میں کئی بار دربارِ الٰہی میں پیش کیا کرو۔ اس سے سمجھا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بندوں کے لئے یہ دعا کتنی اہم اور بیش قیمت ہے۔ گویا زندگی اور موت کی عمدگی کا مدار اسی ایک بات پر ہے، یہ بات حاصل ہے تو زندگی، زندگی ہے، اور موت بھی زندگی ہے، اور اگر نہیں ہے تو زندگی موت سے بدتر ہے۔ وہ دعا یہ ہے: **إهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ○ صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْن** (ہم کو صراطِ مستقیم کی ہدایت دیجئے، ان لوگوں کے راستے کی، جن پر آپ نے انعام فرمایا، ان لوگوں کی راہ نہیں جن پر غضب کیا گیا، اور نہ ان لوگوں کی راہ جو بھٹک گئے)

''صراطِ مستقیم'' انبیاء وصدیقین، شہداء اور صالحین کا راستہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَأُوْلٰئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِيْنَ** (سورہ نساء: ۶۹) جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کرتے ہیں، وہ ان لوگوں کی معیت میں ہوں گے، جن پر اللہ نے انعام فرمایا، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء، صالحین، یہ لوگ بہترین رفیق ہیں۔

اور احادیث کریمہ میں صراحت ہے کہ **مغضوب علیھم** (جن پر غضب نازل ہوا) یہود ہیں، اور گمراہوں کا ٹولہ نصاریٰ کا ہے۔ قرآن کریم میں متعدد جگہوں پر یہود کے

اوپر غضب کا تذکرہ موجود ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَكْفُرُوْا بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْياً اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَن يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ فَبَآءُوْا بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ وَلِلْكَافِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (البقرة:۹۰) بری ہے وہ چیز، جس کے عوض انھوں نے اپنے آپ کو بیچا، کہ انھوں نے اللہ کی نازل کردہ کتاب کا محض اس ضد کی وجہ سے انکار کیا کہ اللہ تعالیٰ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے کیوں اتارے، پس وہ غضب بالائے غضب حاصل کرلائے، اور کافروں کے لئے ذلت کا عذاب ہے۔

اس آیت میں یہود ہی کا تذکرہ ہے، انھیں ہی غضب بالائے غضب کا مورد قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح سورہ مائدہ میں یہود کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے: قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ مَنْ لَعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ اُوْلٰئِكَ شَرٌّ مَّكَاناً وَّأَضَلُّ عَنْ سَوَاءِ السَّبِيْلِ (المائدة:۶۰) تم کہو، کیا میں تم کو وہ بات بتلاؤں، جس کی سزا اللہ کے نزدیک سخت ترین ہے، وہی جس پر اللہ نے لعنت کی، اور اس پر غضب نازل کیا، اور ان میں سے بعضوں کو بندر اور بعضوں کو سوّر بنا دیا، اور جس نے شیطان کی عبادت کی، یہی درجہ میں بدتر اور سیدھی راہ سے بہت بھٹکے ہوئے ہیں۔

یہودیوں کی خاص امتیازی بدبختی یہ تھی کہ وہ جانتے بوجھتے بدعملی اور گستاخی میں مبتلا تھے، اور اسی وجہ سے ان پر خصوصی غضب اترا، ان کی شرارتوں اور بے ادبیوں کا نقطۂ عروج یہ تھا کہ وہ رسولوں کی شان میں سخت گستاخیاں کرتے تھے، چنانچہ قرآن کریم میں ان کی شرارتوں کا ذکر ہے کہ ان کے ہاتھ انبیاء کے قتل میں ملوث ہیں، ان کے دامن پر صالحین کے خون کے دھبے ہیں، اور آخری حد یہ ہے کہ وہ خدا کی بارگاہِ عالی میں بھی زبان درازیاں کیا کرتے تھے۔ ایک وقت وہ تھا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو دعوت دی کہ فلاں قوم سے جنگ کرو اور ''ارضِ مقدسہ'' کو حاصل کرو، تو چند لوگوں کے علاوہ قوم نے جواب دیا: يَامُوْسٰى إِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا اَبَداً مَّادَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هٰهُنَا

قَاعِــدُوْنَ (سور مائدہ:۲۴) (اے موسیٰ جب تک وہ لوگ اس میں ہیں، ہم ساری عمر ہرگز اس میں نہیں داخل ہوں گے، پس تمہیں جاؤ اور تمہارا رب جائے، اور تم دونوں جنگ کرو، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔) یہ بے ادبی اس اولوالعزم نبی کے ساتھ وہ کررہے ہیں، جو ان کو مصر سے نجات دلا کر بغیر کسی جانی و مالی نقصان کے نکال لایا تھا۔

یہ گستاخانہ کلام نبی کی بھی توہین ہے اور خدا کی بھی۔ ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَقَـالَـتِ الْيَهُـوْدُ يَـدُ اللهِ مَغْلُـوْلَةٌ (المائدۃ:٦٤) یہود نے کہا کہ اللہ کا ہاتھ بندھ گیا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿لَقَـدْ سَمِـعَ اللّٰـهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَـاءُ سَنَـكْتُبُ مَـاقَـالُـوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْبِيَآءَ بِغَيْرِ حَق وَ نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ۔ (آل عمران:۱۸۱) بے شک اللہ نے ان لوگوں کی بات سنی جنھوں نے کہا کہ اللہ فقیر ہے اور ہم مالدار ہیں، اب ہم لکھ رکھیں گے ان کی بات، اور وہ خون بھی جو انھوں نے انبیاء کے ناحق کئے تھے، اور کہیں گے کہ جلتی آگ کا عذاب چکھو۔

ان آیات کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ کی شان میں، رسول کی شان میں، دین کے باب میں، دینی شعائر کے سلسلے میں گستاخی اور بے ادبی کتنی سنگین غلطی ہے، دین سارا کا سارا احترام وادب ہے، اور بے ادبی تمامتر بے دینی ہے۔ قرآن کریم اور احادیث شریفہ میں ان امور کو تفصیل کے ساتھ اس لئے بیان کیا گیا ہے کہ جو ملت قرآن کریم پر ایمان رکھتی ہے، رسول اللہ ﷺ کو جان سے زیادہ مانتی ہے، اللہ و رسول کی وفاداری کا دم بھرتی ہے، وہ اپنا دامن ان بے ادبیوں، گستاخیوں سے بچائے رکھے، کہیں ایسا نہ ہو کہ جو غضب یہود پر نازل ہوا تھا، اس کے چھینٹے ادھر بھی آجائیں، اس سے بچانے کا اللہ تعالیٰ نے اتنا اہتمام فرمایا ہے کہ ہر نماز میں اور نماز کی ہر رکعت میں اپنے بندوں کی زبان سے یہ دعا دہرائی ہے کہ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ

اسی کے ساتھ حق تعالیٰ نے خصوصی کرم یہ فرمایا کہ قرآن کریم میں ادب واحترام کا سلیقہ خود سکھایا، کہ اللہ و رسول کا احترام کیونکر کیا جائے؟ اس کے حدود کیا ہیں؟ آداب

کیا ہیں؟ اللہ ورسول کا ادب کرنا ہے، ان کے ساتھ اور کیا کیا چیزیں ہیں جن کی تعظیم اور جن کا احترام ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدِیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ O یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ کَجَهْرِ بَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ O اِنَّ الَّذِیْنَ یَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰی لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِیْمٌ O (الحجرات: ۳/۲/۱)

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اللہ سنتا اور جانتا ہے۔ اے ایمان والو! بلند نہ کرو اپنی آوازیں نبی کی آواز پر اور ان سے اس طرح تڑک کر نہ بولو جیسے آپس میں ایک دوسرے سے تڑک کر بولتے ہو، کہیں تمہارے اعمال ضائع نہ ہو جائیں، اور تم کو خبر بھی نہ ہو، جو لوگ اللہ کے رسول کے پاس دبی آواز سے بولتے ہیں، وہی ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے ادب کے واسطے جانچ لیا ہے، ان کے لئے معافی ہے اور بڑا ثواب ہے۔

یعنی جس معاملے میں اللہ ورسول کی طرف سے حکم ملنے کی توقع ہو، اس کا فیصلہ پہلے ہی آگے بڑھ کر اپنی رائے سے نہ کر بیٹھو، بلکہ حکم الٰہی کا انتظار کرو، جس وقت پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کچھ ارشاد فرمائیں، خاموشی سے کان لگا کر سنو، ان کے بولنے سے پہلے خود بولنے کی جرأت نہ کرو، اپنی اغراض وآراء اور خواہشات کو ان کے احکام پر مقدم نہ رکھو، اسی طرح حضور اکرم ﷺ کی مجلس میں شور نہ کرو، اور جیسے آپس میں ایک دوسرے سے بے تکلف چہک کر یا تڑخ کر بات کرتے ہو، حضورؐ کے ساتھ یہ طریقہ اختیار کرنا خلافِ ادب ہے، آپ سے خطاب کرنا ہو تو نرم آواز سے تعظیم واحترام کے لہجے میں ادب وشائستگی کے ساتھ کرو، آپ سے گفتگو کرتے وقت پوری احتیاط رکھنی چاہئے، مبادا بے ادبی ہو جائے اور آپ کو تکدر پیش آئے، تو حضورؐ کی ناخوشی کے بعد مسلمان کا ٹھکانہ کہاں ہے، ایسی صورت میں تمام اعمال

ضائع ہونے اور ساری محنت اکارت جانے کا اندیشہ ہے۔

جو لوگ نبی کی مجلس میں تواضع اور ادب و تعظیم کے ساتھ بولتے اور نبی کی آواز کے سامنے اپنی آوازوں کو پست کرتے ہیں، یہ وہ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے ادب کی تخم ریزی کے لئے پرکھ لیا ہے، اور مانجھ کر خالص تقویٰ وطہارت کے واسطے تیار کر دیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں کہ، چار چیزیں اعظم شعائر اللہ میں سے ہیں: قرآن، پیغمبر، کعبہ، نماز، ان کی تعظیم وہی کرے گا جس کا دل تقویٰ سے مالا مال ہو **وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ** (سورہ حج: ۳۲) جو کوئی اللہ کے نام لگی چیزوں کا ادب رکھے، سو وہ دل کی پرہیزگاری کی بات ہے۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جب حضور ﷺ کی آواز سے زیادہ آواز بلند کرنا خلافِ ادب ہے تو آپ کے ارشادات واحکام سننے کے بعد ان کے خلاف آواز اٹھانا کس درجہ کی بے ادبی ہوگی، اور کتنا بڑا گناہ ہوگا۔ (فوائد عثمانی)

ان آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ادب واحترام وہ بنیادی وصف ہے جس پر ایمان واسلام کی عمارت مستحکم ہوتی ہے، بے ادبی کرنے والا اپنے کئے ہوئے اعمال میں آگ لگا دیتا ہے، اس سے وہ غریب نفع کیا اٹھائے گا؟ اللہ تعالیٰ نے سورۂ حج میں ارشاد فرمایا: **وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ** (سورہ حج: ۳۲) جو کوئی اللہ کے نام لگی چیزوں کا ادب رکھے، سو وہ دل کی پرہیزگاری کی بات ہے۔

اس پر مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی علیہ الرحمہ تفسیری حاشیہ لکھتے ہیں کہ:

> ”شعائر اللہ کی تعظیم شرک میں داخل نہیں ہے، جس کے دل میں پرہیزگاری کا مضمون اور خدائے واحد کا ڈر ہوگا، وہ اس کے نام لگی چیزوں کا ادب ضرور کرے گا، یہ ادب کرنا شرک نہیں، بلکہ عین توحید کے آثار میں سے ہے کہ خدا کا عاشق ہر اس چیز کی قدر کرتا ہے جو بالخصوص اس کی طرف منسوب ہو جائے۔“

آج ایک ٹولہ ہے جو اللہ ورسول کے نام لگی چیزوں کی صرف اس لئے بے ادبی کرتا

ہے کہ، کہ اسے ادب کا معاملہ برتنے میں شرک کا وہم ہوتا ہے، حالانکہ وہ شرک نہیں ہے۔

الحذر! الحذر!! کبھی بھی ان چیزوں کے متعلق کوئی نازیبا بات نہیں کرنی چاہئے، اور نہ کوئی نازیبا رویہ اختیار کرنا چاہئے، جن کا خصوصی تعلق اللہ ورسول سے ہے، دین اسلام سے ہے، جو ہمارے دین ومذہب کی علامت ہیں۔ آج داڑھی کا مذاق اڑانا فیشن ہے، علماء وحفاظ کے ساتھ بے ادبی کا معاملہ کرنا روشن خیالی ہے، فقہی وشرعی مسائل کی توہین تو وہ لوگ بھی کرنے لگ جاتے ہیں جو بظاہر دیندار کہلاتے ہیں، کتنے غیبی حقائق ایسے ہیں کہ ان پر یقین رکھنا مدارِ ایمان ہے، لیکن مسلمانوں میں کتنے ایسے ملیں گے جو تذبذب کے شکار ہیں، اور اس تذبذب کا اظہار زبان سے بصورت بے ادبی کرتے رہتے ہیں۔

ایک جگہ دو آدمی آپس میں الجھے ہوئے تھے، باہم دست وگریبان تھے، گالیاں بک رہے تھے، ایک صاحب نے انھیں اس سے باز رکھنا چاہا، مگر غصہ کا بھوت اتنی جلدی کہاں اترتا ہے، پھر سمجھانے والے نے کہا کہ اللہ کا خوف کرو، لکھنے والا تمہاری گالیوں کو لکھ رہا ہے، تو دونوں اس کے سر ہوگئے کہ کہ کیا آپ نے دیکھا ہے کہ کوئی لکھ رہا ہے، پھر نوبت غیبی حقائق کے مذاق تک پہونچ گئی۔

اس طرح کے واقعات روزمرہ پیش آتے رہتے ہیں، آدمی نڈر ہوگیا ہے، جو چاہتا ہے بک دیتا ہے، حالانکہ گستاخیوں کا انجام کبھی کبھی فوری طور پر بھی ظاہر کردیا جاتا ہے، ویسے عام دستور الٰہی یہ ہے کہ حق تعالیٰ حلم اور ستاری سے کام لیتے ہیں، تا کہ آدمی کو توبہ کا موقع رہے، مگر کبھی کبھی موقع پر پکڑ آجاتی ہے۔

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَّشَاءُ وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللهِ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ** (الرعد: ۱۳) اور بھیجتا ہے کڑکتی بجلیاں، پھر ڈالتا ہے جس پر چاہے اور یہ لوگ جھگڑتے ہیں اللہ کی بات میں، حالانکہ وہ سخت قوت والا ہے۔

اس آیت کے سببِ نزول کے تحت علامہ ابن کثیرؒ نے مسند ابویعلیٰ سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے ایک روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عرب کے ایک متکبر

فرعون کے پاس بلانے کے لئے ایک صاحب کو بھیجا، انھوں نے اس سے کہا کہ آپ کو اللہ کے رسول بلا رہے ہیں، اس نے کہا کہ اللہ کا رسول کون؟ اور اللہ کیا چیز ہے؟ کیا وہ سونے کا ہے، آیا چاندی کا ہے؟ یا تانبے کا ہے؟ وہ صاحب لوٹ گئے، آپ نے پھر بھیجا، اس نے اب بھی یہی گستاخانہ جواب دیا، آپ نے تیسری مرتبہ انھیں بھیجا، وہ اب بھی یہی گستاخی کرنے لگا، اتنے میں اس کے سر کے اوپر بادل آیا، اور ایک بجلی کڑکی اور اس کی کھوپڑی اُڑا لے گئی، وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

بہت زیادہ ڈرنے کی بات ہے، اللہ و رسول کے مقابلے میں جرأت بڑا سنگین جرم ہے، کتنے لوگوں نے اللہ کی، رسول کی، قرآن کی، نماز کی، روزے کی، کعبہ کی، علماء کی، داڑھی کی توہین کی، اور ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئے، اللہ کے غضب کو دعوت دینا اپنے سے عداوت ہے۔

ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا، آپ کھانا کھا رہے تھے، آپؐ نے اسے بھی شریک کر لیا، اس نے بایاں ہاتھ کھانے کی طرف بڑھایا، آپؐ نے ٹوکا اور دائیں ہاتھ سے کھانے کی تلقین کی، اس نے تکبر کی راہ اختیار کی اور اپنی بات پر اڑ گیا، اور کہا میرا دایاں ہاتھ نہیں اٹھتا، اپنی بات کی پچ میں جھوٹ بولا، آپؐ نے فرمایا: **لا رفعها الله**، اللہ کرے نہ اٹھے۔ وہ ہاتھ اس کا وہیں سوکھ گیا۔

مساجد بھی اللہ کے شعائر میں ہیں، ان کا ادب واحترام بھی ضروری ہے۔ مسجد میں شور وشغب کرنا، اسے گھر کی طرح بنا لینا سخت توہین کی بات ہے۔ مسجدیں اس لئے نہیں ہیں کہ ان میں بیٹھ کر دنیا کی باتیں کی جائیں، انھیں پنچایت گھر بنا لیا جائے، مسجدیں اس لئے ہیں کہ ان میں نماز ادا کی جائے، ان میں اللہ کا ذکر کیا جائے، تلاوتِ قرآن کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جو آدمی مسجد میں داخل ہو وہ اس میں بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھ لے۔ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے نزدیک یہ دو رکعت تحیۃ المسجد مستحب ہے، اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک واجب ہے۔ مسجد کے اندر تو دور کی بات ہے، مسجد کے قریب بھی شور وشغب نہ کیا جائے، مگر اب جرأت کا یہ عالم ہے کہ مسجد کے قریب مسلمانوں کے گھر ہیں، انھیں نماز پڑھنے

کی توفیق تو ہوتی نہیں، البتہ اپنے گھروں میں پوری قوت سے ٹیپ ریکارڈ یا ٹی۔ وی چلا دیتے ہیں، جس کے شور سے مسجدیں گونجتی ہیں اور نمازیوں کو سخت دقت کا سامنا ہوتا ہے، ٹیپ ریکارڈ بجاتے ہوئے مسجد کے پاس سے بے تکلف اس طرح گزرتے ہیں جیسے انھیں اس کا احساس ہی نہ ہو کہ یہاں کوئی قابل احترام چیز بھی ہے۔ حد تو یہ کہ عین مسجد کے زیر سایہ ہمارے نوجوان کھیل کود کے مقابلے رکھ دیتے ہیں اور لاؤڈ اسپیکر سے اعلان کرتے رہتے ہیں، اور یہ سلسلہ کئی کئی روز تک چلتا رہتا ہے، مسجد میں اذان ہوتی ہے، مگر کھیل کے متوالوں کے کانوں سے اچٹ کر چلی جاتی ہے، کھیلنے والے کھیل میں محو ہیں، دیکھنے والے لذتِ نفس میں غرق ہیں، اور ع

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے

سب کھلاڑی ہو گئے یا تماش بیں ہو گئے، اور جو نمازی ہیں وہ پریشان ہیں، ابھی چند دنوں پہلے خبر ملی کہ ایک صاحب کے یہاں شادی کی دعوت بڑے دھوم دھام سے تھی۔ یہ دعوتیں کیا ہوتی ہیں، منکرات کا ہجوم ہوتا ہے، اتفاق یہ ہوا کہ عین کھانے کے وقت بارش شروع ہو گئی، لوگ پلیٹیں لے کر مسجد میں بھاگے، پھر مسجد میں دسترخوان لگ گیا اور مسجد، مسجد نہ رہی ڈائننگ ہال بن گئی، إنا لله وإنا إليه راجعون! جن لوگوں کو نماز کے لئے مسجد میں جانے کی توفیق نہیں ہوتی وہ کھانے کے لئے مسجد میں پہونچ گئے۔ ع

کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

(جلد نمبر: ۱۲، شمارہ نمبر: ۲، ربیع الثانی، جمادی الاولیٰ، جمادی الاخریٰ ۱۴۲۴ھ/اگست، ستمبر، اکتوبر ۲۰۰۳ء)

☆☆☆☆☆

﷽

جو غلط ہے اسے غلط ہی کہئے

الحمدللہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ وصحبہ اجمعین امابعد

صاحب مشکوٰۃ شریف نے امام ترمذی، امام ابو داؤد، مسند احمد اور ابن ماجہ کے حوالے سے ایک مشہور حدیث نقل کی ہے، اس کے راوی حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھائی، اور اس کے بعد ہماری طرف متوجہ ہوکر آپ نے ایک بلیغ اور مؤثر وعظ فرمایا جس سے آنکھیں ابل پڑیں اور قلوب لرز گئے، ایک شخص نے اس کے بعد عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ وعظ تو ایسا ہے، جیسے رخصت کرنے والا کسی کو رخصت کررہا ہو، آپ ہمیں کچھ ہدایت فرمادیجئے، آپ نے ارشاد فرمایا:

اوصیکم بتقوی اللہ والسمع والطاعۃ وان کان عبداً حبشیا فانہ من یعش منکم بعدی فسیری اختلافا کثیراً فعلیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین تمسکوابھاوعضوا علیھا بالنواجذ وایاکم ومحدثات الامور فان کل محدث بدعۃ وکل بدعۃ ضلالۃ۔ (باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

میں تمھیں اللہ کے تقوی اور سننے اور ماننے کی تاکید کرتا ہوں، اگر چہ تمہارا امیر حبشی غلام ہوا کیونکہ جو میرے بعد زندہ رہے گا، وہ بہت سارے اختلافات دیکھے گا، تو تم کو میری سنت اور ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت لازم ہے، اسے مضبوطی سے تھام لو، اور دانتوں سے پکڑ لو، اور نئے نئے ایجاد کردہ امور سے دور رہو کیونکہ یہ نئی چیزیں بدعت ہے اور یہ بدعت گمراہی ہے۔

ہمارا دور رسول اللہ ﷺ کے صدیوں بعد کا دور ہے، اس میں اختلافات کی وسعت اور پھیلاؤ کا کیا کہنا، ایک سے بڑھ کر ایک نئی چیزیں سامنے آرہی ہیں، کچھ دین کے نام پر دین کا لبادہ اوڑھ کر، بظاہر دین معلوم ہوتی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دین سے ان کا تعلق نہیں ہے، ایسے امور جو بظاہر دین کے رنگ میں ہیں، اور دین ہی کے نام پر انھیں نجام دیا جاتا ہے، مگر ان کی حیثیت دین میں اضافہ کی ہے، شریعت کی اصطلاح میں انھیں بدعت کہا جاتا ہے، نفس انسانی نے اپنے خواہشات ...... کی بنیاد پر ہر زمانے میں بدعات ایجاد کرنے کی جرأت کی ہے، لیکن اس وقت ہم جن نئے امور کا جائزہ لینا چاہتے ہیں وہ بدعات سے کچھ مختلف رنگ کے ہیں، ان کا تعلق دین میں، دینی احکام میں اور دینی افکار وعقائد میں سستی، اضمحلال، اور علم دین میں رسوخ نہ ہونے سے ہے، دینی احکام اور دینی عقائد نفس پر گراں گزرتے ہیں، اس لئے آدمی ان سے صرف نظر کرتا ہے، پھر یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اس پر طعن کیا جائے گا کہ یہ دین سے برگشتہ ہورہا ہے، جب کہ وہ چاہتا ہے کہ دین سے اس کا گہرا اور پختہ تعلق تسلیم کیا جائے، اس لئے وہ حیلوں اور بہانوں سے کام لیتا ہے، اور ان حیلوں کو دینی دلائل وشواہد سے دین کے رنگ میں پیش کرتا ہے۔

اس طرح کے نئے امور میں کچھ تو صریح اور قطعی گناہ ہیں، مثلاً مسلمانوں کا معاشرہ جو رسول اللہ ﷺ نے تیار کیا تھا وہ فرائض وواجبات اور سنن ومستحبات کے نور سے معمور تھا، نمازوں میں خشوع وخضوع کی فراوانی تھی، ہر عبادت میں اس کی اصل روح اخلاص وانابت موجود تھی، پھر نفوس انسانی کی ناپختگی نے کچھ کچھ چیزوں کو گراں سمجھ کر چھوڑنے اور ردوبدل کرنے کا سلسلہ شرع کیا، مسلمانوں کے پختہ دیندار طبقہ نے اس ترک اور ردوبدل کا مقابلہ کیا، لیکن آہستہ آہستہ نوبت یہاں تک پہونچ گئی کہ عبادت کے اہتمام کی جگہ گناہوں کے رواج نے لے لی، شریعت کے آداب کو چھوڑ کر لوگ مکروہات میں گرنے لگے، نماز، جس کے چھوڑنے کا کوئی مسلمان تصور بھی نہیں کرسکتا تھا، ہمارے زمانے تک آتے آتے اس کا ترک، اس کے عمل سے آگے نکل گیا، مالدار طبقے سے زکوٰۃ کا اہتمام نکلا اور نام ونمود اور لہو

لعب اور گناہوں کے مواقع پر خرچ کرنا کا بے محابا جذبہ پیدا ہوگیا، سفر حج پر دوسرے گناہوں کے سفر کو ترجیح دی جانے لگی، روزہ کا نما بھولا، اور کھانے میں لذائذ وتنعّمات کا اتنا اضافہ ہوا کہ اس کا شمار مشکل ہے، جیسے انسان کھانے ہی کے لئے پیدا ہوا ہے، اور جی رہا ہے، ایثار وہم دردی کی جگہ خودغرضی اور بے مروتی نے لے لی ہے، ان امور میں گناہوں کے کاموں کا بے تحاشا اضافہ ہوا ہے، اور یہ گناہ مسلمانوں کے معاشرہ اور دستور زندگی میں قطعاً نئے امور ہیں، جن میں اسلام کا نام لینے والے مبتلا ہیں۔

اس طرح کے گناہوں میں خیریت یہ ہے کہ انھیں گناہ ہی سمجھا جاتا ہے، انھیں ناجائز ہی قرار دیا جاتا ہے، ان کے جائز سمجھنے کا رجحان نہیں پایا جاتا، بلکہ ٹوکے جانے پر ایک طرح کی ندامت کا احساس ہوتا ہے، لیکن سائنس کی ہمہ گیر ترقی کے اس دور میں بعض ایسی چیزیں آگئی ہیں اور آتی جارہی ہیں، جن کا مثبت یا منفی تعلق شریعت اسلامی سے مشتبہ معلوم ہوتا ہے، یا ان کے عموم وشیوع اور کثرت استعمال کی وجہ سے مشتبہ بنا دیا گیا ہے، یہ چیزیں وقتاً فوقتاً زیر بحث آتی رہتی ہیں، اس قسم کی چیزیں ابتدا تو جب سامنے آتی ہیں، تو مخلص اور علم وتحقیق والے اصحاب رسوخ غور وفکر کرکے ان کا ایک حکم متعین کرتے ہیں، پھر ان کی اور نئی نئی شکلیں نکلتی ہیں، اور انکا عموم مزید بڑھتا ہے، تو مزید سوالات اٹھنے لگتے ہیں، مثلاً لاؤڈ اسپیکر ایجاد ہوا، تو سوال پیدا ہوا کہ اسے نماز اور خطبے میں استعمال کیا جاسلتا ہے یا نہیں؟ پھر جن چیزوں پر اقتدا صحیح ہونے کا مدار ہے، غور کیا گیا کہ لاؤڈ اسپیکر کے استعمال سے اس میں خلل تو نہیں ہوتا، پھر حضرات علماء اس نتیجہ پر پہونچے کہ نماز میں اس کا استعمال جائز ہے، مقتدی یا امام کی نماز اس سے فاسد نہ ہوگی، تاہم اس کے استعمال کے مقابلہ میں استعمال نہ کرنا ہی مناسب ہے، اسی طرح ریڈیو، ٹیپ ریکارڈر ایجاد ہوئے، تو ان کے احکام دریافت کئے گئے، ریل گاڑی اور ہوائی جہاز جاری ہوئے تو ان پر نماز پڑھنے کا مسئلہ پیدا ہوا، جسے بحمد اللہ حل کرلیا گیا، اس کے بعد ایجادات میں برق رفتاری آگئی، طرح طرح کی چیزیں ایجاد ہونے لگیں، جن سے بظاہر سمجھا گیا کہ انسان کی زندگی سہولیات سے مالا مال ہوگی، اور کچھ

سہولتیں ہوئیں بھی، مگر نقصانات اور مشکلات کا تناسب بھی اتنا زیادہ رہا کہ بے ساختہ یہی سمجھ میں آتا ہے کہ **و اثمها اكبر من نفعهما**، ان کا گناہ فائدہ سے بڑھا ہوا ہے۔

ان ایجادات میں کچھ چیزیں تو ایسی ہیں جن کے استعمال میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، جیسے نوع بنوع کی سواریاں، بعض گھریلو سامان جیسے بجلی سے چلنے والے پنکھے، کولر فریج، فون وغیرہ وعلی ہذا القیاس۔

کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کے ناجائز اور حرام ہونے میں کلام نہیں، جیسے فلمیں اور گانے بجانے کے آلات۔

کچھ ایجادات ایسی ہیں کہ بذات خود ان کی حرمت وحلت کا فیصلہ مشکل ہے، ان کی حلت وحرمت کا دارومدار ان کے استعمال پر ہے، اگر وہ صحیح مصرف میں استعمال ہوتے ہیں، تو وہ صحیح ہیں، ورنہ غلط، اس کی مثال میں ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈر کو پیش کیا جا سکتا ہے، کہ اگر ریڈیو کو صرف خبریں یا مفید پروگرام سننے کے لئے استعمال کیا جائے، تو مضائقہ نہیں، اور گانے بجانے اور لہو ولعب کے پروگراموں کے لئے استعمال کیا جائے تو ناجائز اور حرام۔

ٹیپ ریکارڈر میں اگر قرآن کریم کی تلاوت، دینی مواعظ ومجالس اور مفید چیزیں محفوظ کی جائیں تو درست، اور اگر اس میں گانے بجانے ضبط کئے جائیں، تو غلط۔

اسی طرح کی چیزوں میں بعض ایجادات نے خاصی پیچیدگی پیدا کر دی ہے، ان میں استعمال کو مدار حکم بنائیں، تو اس کی گنجائش نہیں معلوم ہوتی، اور اگر سرے سے انھیں ناجائز کہہ دیا جائے تو بہت سے فوائد سے محرومی ہوتی ہے، اس قسم کی مثال میں ٹیلی ویژن، وی سی. آر، انٹرنیٹ، اور سی ڈی کو پیش کیا جسکتا ہے، موجودہ احوال میں ان امور کی شرعی حیثیت اور دینی تعلیمات کے لئے ان کے استعمال پر خوب بحثیں ہو رہی ہیں، عام لوگ تو ان چیزوں کو دور حاضر کی زندگی کے لئے لازم قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک کسی خوشحال، تعلیم یافتہ اور باعزت گھرانے اور معاشرے کا تصور ہی ٹیلیویژن کے بغیر نہیں ہوسکتا، کوئی جلسہ، کمیٹی، فنکشن، کوئی اجتماعی پروگرام، بغیر ویڈیو کیسٹ اور سی. ڈی. کے مکمل ہوتا ہی نہیں، انٹر

نیٹ، تو ایک ایسی ایجاد ہے کہ موجودہ دور کی انسانی ضرورت کا ایک خاصا حصہ اسی کے متعلق ہوکر رہ گیا ہے، ان چیزوں کا استعمال صرف دنیا دار گھرانوں اور معاشروں میں محدود نہیں رہ گیا ہے، جو گھرانے دیندار کہلاتے ہیں اور جن پروگراموں کو دین و مذہب کے عنوان سے برپا کیا جاتا ہے، ان میں یہ چیزیں داخل ہو چکی ہیں، بھلا جو چیزیں انسان کی ضرورت بن گئی ہیں، انھیں ناجائز اور مکروہ کہنے کی ہمت کیسے کی جاسکتی ہے، اور اگر کوئی اپنی صلاحیت اور رسوخ فی العلم کی وجہ اس سلسلہ میں کچھ کہہ دے، تو اس کو درجنوں مثالیں دے کر خاموش کر دیا جائے گا۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ معاملہ اتنا ڈھیلا ڈھالا نہیں ہے، کہ جس چیز پر ضرورت کا لیبل چسپاں کر دیا جائے، اور آدمی کی ہوسناکیاں جنھیں ضروریات زندگی میں شامل کر دیں، انھیں دین خداوندی قبول کر ہی لے، مذہب اسلام کا ایک خاص عقیدہ اور نظریہ ہے، اس کا ایک پاکیزہ طریقۂ کار ہے، جو چیزیں اس کے موافق ہوں گی، انھیں تو قبول کیا جاسکتا ہے، اور جو امور اس کی ضد ہیں، انھیں کسی رنگ میں پیش کیا جائے، وہ رد ہی کی جائیں گی۔

لوگوں میں ایک دستور سا ہو گیا ہے، کہ ضروریات زندگی کا نعرہ لگا کر غلط چیزوں کے حق میں اسلام سے تائید حاصل کرنا چاہتے ہیں، کبھی یہ غیرت دلائی جاتی ہے کہ اسلام ایک آفاقی مذہب ہے، اسے زندگی کی ہر دور کا ساتھ دینا چاہئے، پس جو کچھ دنیا میں وجود میں آجائے، دین اسلام اسے جھٹ سند قبولیت دیدے، ورنہ زندگی کی دوڑ میں اسلام پیچھے رہ جائے گا، کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں فلاں ملک میں علماء دین نے عملاً اسے گوار کر لیا ہے، دین ملت کے ماہرین کے گھروں میں یہ چیزیں ضرورت بن کر داخل ہو چکی ہے، پس تم کب تک اسے ناجائز کہہ کر زمانہ سے بے خبری کا ثبوت دیتے رہوگے؟

ہاں یہ بھی ایک بڑا عجیب نعرہ ہے کہ دین و مذہب اور احکام شریعت کی خبر رکھنے والے عصر حاضر کے تقاضوں سے بے خبر ہیں، یہ نعرہ لگانے والے شاید بے خبر ہیں کہ علماء عصر حاضر کے کسی تقاضے سے بے خبر نہیں ہیں، مگر وہ اس دین کے اسرار و مزاج سے بھی باخبر ہیں،

جو آخری پیغام الٰہی بن کر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا ہے، وہ عصر حاضر کے تقاضوں اور شریعت اسلامی کا موازنہ کرتے ہیں، پھر وہ تقاضے، جو شریعت سے برگشتہ کرنے پر تلے ہوئے ہوتے ہیں، انھیں وہ رد کر کے شریعت کے احکام کی بقاء و تحفظ کو عزیز رکھتے ہیں اور یہ علماء کی بڑی ذمہ داری ہے کہ دین کا علم صحیح پیش کر دیں، اور عصر حاضر کے جو تقاضے اپنی تکمیل میں اس سے ٹکراتے ہوں، انھیں بے تکلف رد کر دیں، اور اس میں کسی لعن وطعن کی پروا نہ کریں، ورنہ یہ تقاضے دین اسلام کی جڑیں اکھاڑ دینے میں کسر نہ چھوڑیں گے۔

درحقیقت عصر حاضر کے جن تقاضوں کی دہائی دی جاتی ہے، وہ عصر حاضر کے تقاضے نہیں، بلکہ نفسانیت، حب مال وجاہ اور شہوت بطن وفرج کی لامحدود ہوسنا کیاں ہیں، اور آج پوری دنیا انھیں سفلی اور ردی جذبات ورذائل میں جوجھ رہی ہے، نام چاہے، جتنا خوبصورت دیا جائے، مگر عصر حاضر کے جن تقاضوں سے دین اسلام کو مرعوب کیا جاتا ہے، ان کی تہ میں اصل جذبہ اور محرک یہی گھٹیا جذبے اور داعیے ملیں گے، اس لئے علماء کو خوب غور کر لینا چاہئے کہ جن چیزوں میں گنجائش نکالنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے، ان میں بہتیرے ایسی چیزیں ہیں کہ اگر انھیں سند جواز دیکر یا ہلکی سی گنجائش دے کر مسلمانوں کے ہاتھوں میں دے دیا جائے، تو زیادہ وقت نہیں گزرے گا کہ ایک ایسا ماحول ومعاشرہ وجود میں آجائے گا، جس کو اسلام سے کوئی مناسبت نہ ہوگی۔ بس جو گناہ ہے، اسے گناہ ہی قرار دیا جائے، کرنے والا اسے گناہ سمجھ کر کرے، تو خود کو گنہگار سمجھے گا، اور شاید کبھی اسے احساس ہو، تو توبہ کی توفیق اسے ہو جائے گی۔ اور اگر اس گناہ کو سند جواز دے دی گئی، تو آدمی زندگی بھر گناہ گار ہوتا رہے گا۔ اور اسے کبھی توبہ نصیب نہ ہوگی۔

شریعت اسلامی میں جاندار کی تصویریں ناجائز ہیں، یہ اجماعی مسئلہ ہے اب ہر وہ چیز جس میں تصویر کے بغیر چارہ نہ ہو، خواہ وہ ٹیلی ویژن ہو، سی ڈی ہو، وی سی آر ہو، اس کے جواز کے گنجائش نہ نکالی جائے، ورنہ آج کا بنایا ہوا سوراخ کل کو دہانہ بن کر رہے گا۔ لوگ ان امور میں مبتلا ہیں، تو ناجائز سمجھ کر مبتلا ہوں، ناجائز کو جائز نہ سمجھیں، مبتلا تو لوگ ترک نماز میں

بھی ہیں، اور اگر حساب لگائیں گے تو میں مبالغہ نہیں کرتا کم از کم ہمارے ملک میں نوے فی صد سے زائد مسلمان نماز سے محروم ہیں، تو کیا ترک نماز کو جواز کی سند دے دی جائے گی؟

بے شک یہ صحیح ہے کہ ان ذرائع ابلاغ کی وجہ سے اسلام پر بے تحاشا اعتراض کئے جاتے ہیں، لیکن ان کا جواب دینے کے لئے ان فاسد اور ناجائز ذرائع پر آنا چاہئے، یہ خیال غلط ہے، ہم جواب دینے کے دنیاوی اور دنیا والوں کے اصولوں کے پابند نہیں ہے، ہم کو قرآن وحدیث میں جو طریقہ بتایا گیا ہے، اس کا پابند ہونا چاہئے، غلط طریقوں سے جو جواب دئے جائیں گے، ان سے اسلام کی شبیہ ہرگز درست نہ ہوگی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب سے ٹیلی ویژن پر قرآن کے نام سے ایک چینل آیا ہے، اس وقت سے مسلمانوں میں جہالت اور توہم پرستی اور بڑھتی جارہی ہے ظاہر ہے کہ اس سے اسلام کی شبیہ اور بگڑے گی، کیونکہ اس چینل پر جو کچھ دکھایا جاتا ہے، اسی کو دیکھنے والے دین سمجھتے ہیں۔ بس اللہ جانے کن کن خرافات کو دین کے نام سے تقدس کا لباس عطا کر دیا جائے گا۔ یہی حال انٹرنٹ اور مصوری ڈیوں کا ہے، ان کا نقصان فائدہ سے بہت زیادہ ہے، بلکہ ریڈیو ٹیپ ریکارڈر اور...... تصویر کی سی ڈیوں کا بھی یہی حال ہے کہ ان مشاغل میں میرا تجربہ یہی ہے دینی اعمال میں سستی عام ہو جاتی ہے، آدمی ذہن اور نظریہ کے اعتبار سے اسلام سے وابستہ ہوتا ہے مگر عملی زندگی خالی ہو جاتی ہے، خوب تجربہ ہے کہ جو لوگ ٹیپ ریکارڈ سے قرآن کی تلاوت سنتے ہیں، انھیں خود تلاوت کی توفیق نہیں ہوتی ہے، جو لوگ ٹیپ سے تقریریں اور مواعظ سنتے ہیں انھیں علماء اور بزرگوں کی خدمت اور صحبت میں جانے کا موقع نہیں ملتا، اور اگر کبھی گئے تو وہ کچھ فائدہ نہیں حاصل کرتا ہے۔

اسلام ایک عملی اور روحانی مذہب ہے، جس میں بقدر ضرورت دنیاوی اور جسمانی تقاضوں کے پورا کرنے کی اجازت ہے مگر ہوسنا کیوں کی اجازت نہیں ہے، یہاں تو دنیا کی مقصودیت کی نفی ہے، یہاں بڑا اہتمام جسم کا نہیں روح کا ہے، دنیا کا نہیں آخرت کا ہے، زندگی کا نہیں موت کا ہے، اور جن امور کا اوپر تذکرہ ہے، جس کا جی چاہے، ان لوگوں کا جائزہ

لے کے جوان مشاغل میں مبتلا ہیں، دیکھئے کہ ان کی عملی اور روحانی زندگی کیسی ہے؟

آپ کہہ سکتے ہیں کہ جسمانی، مادی اور دنیاوی تقاضوں کی تکمیل کا مزاج عام ہو چکا ہے؟ اسے تم کتنا روک سکتے ہو؟ میں عرض کروں گا کہ ہم اس کے ذمہ دار نہیں، رکاوٹ کھڑی کرنے کے ذمہ دار ہیں، غلط کو غلط کہہ دینا رکاوٹ کو کھڑا کر دینا ہے۔ اب اگر کوئی اسے گرا کر آگے بڑھ جائے تو وہ ظالم ہے۔ پس یہ نہیں ہوسکتا کہ غلط کو صحیح کہہ کہ ہم رکاوٹ کو منہدم کر دیں۔ علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ علم اور عمل پیش کر دیں، جس سے دنیا کی بے ثباتی، آخرت کی ترجیح، روحانی ترقی اور جسم و مادیت کی بے وقعتی سامنے آجائے۔ اس کے بعد جس کا جی چاہے آخرت کی طرف جائے، اور جس کا جی چاہے دنیا میں لت پت رہے **یهلک من هلک عن بينة ويحيى من حی عن بينة** (سورہ انفال) (جو ہلاک ہو، دلیل کے ظاہر ہونے کے بعد ہلاک ہو، اور جو زندہ رہے، دلیل سے زندہ رہے۔)

یہ طریقہ غلط ہے کہ گناہوں کے عموم وشیوع سے متاثر ہو کر، دنیا والوں کے لعن وطعن سے ڈر کر عصر حاضر کے تقاضوں کی دہائی سن کر ہم اسلامی مزاج وخصوصیات سے صرف نظر کر لیں، شریعت کے احکام میں کتر بیونت شروع کر دیں، دین کی محکم اور مستحکم دیواروں میں سوراخ پیدا کرنے لگ جائیں۔

(ماہنامہ ضیاء الاسلام: ستمبر ۲۰۰۵ء) (بشکریہ مجلّہ ''المآثر'')

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تصویر سازی کا ذوق

اللہ تعالیٰ نے انسان کو سادہ اور مفرد نہیں پیدا کیا ہے، بلکہ جذبات اور خواہشوں کا ایک مجمع اسے بنایا ہے، جسم کے تقاضے اور اس کی چاہتیں الگ ہیں، اور بہت ہیں، نفس کی لذتیں اور خواہشیں جداگانہ ہیں، روح اور قلب کی حاجات وضروریات کچھ اور ہیں، پھر انسان کے باہر خاندان، سماج، جگہ، موسم اور زمانے کے تقاضے علٰحدہ ہیں، اور انسان میں صلاحیت رکھی گئی ہے، اور اختیار بھی ملا ہوا ہے کہ اپنی سمجھ اور اپنے ارادے سے ان تقاضوں اور خواہشوں میں کسی کو اختیار کرے، کسی کو ترک کرے۔

تو کیا ان تقاضوں، لذتوں، خواہشوں کے ترک واخذ میں آدمی خود مختار ہے، جسے چاہے پکڑے اور جسے چاہے چھوڑے، یا کسی دستور اور قانون کا پابند ہے، اگر ہر انسان کو اس بات میں خود مختار بنا دیا جائے تو لازم ہے کہ ان تقاضوں اور لذتوں کی تکمیل میں آدمی کا آدمی سے تصادم ہو، اور اس ٹکراؤ میں دنیا کا امن چین غارت ہو، اس لیے بہر حال یہ لازم ہے کہ اس سلسلے میں کوئی قانون اور دستور ہو، ہم اہل اسلام کے لیے بات نہایت واضح ہے کہ اس کام کے لیے شریعت اسلامیہ ایک نہایت واضح اور معتدل دستور العمل ہے، اس کو کما حقہ بجا لایا جائے، تو تمام تقاضے، تمام ضروریات، تمام خواہشیں، اور تمام لذتیں اپنے اپنے جائز مقام پر جائز اور پر امن طریقے پر حاصل ہوں گی، اور انسانی زندگی کا اعتدال وتوازن برقرار رہے گا۔

انسان کے ذوق ووجدان پر جو بہت سی خواہشیں مسلط ہیں، جن میں اسے لذت کا احساس ہوتا ہے، ان میں ایک بڑی طاقتور خواہش اور لذت اپنی ذات، اپنے کام اور اپنے

ماضی کے احوال کی یادگار کو باقی رکھنا ہے پھر اس کے حصول کے لیے جہاں وہ بہت سے طریقوں کو کام میں لاتا ہے، ان طریقوں میں سے ایک طریقہ تصویر سازی کا بھی ہے، تصویروں کے ذریعے آدمی اپنی ذات اپنے کام، اپنے متعلقات اور اپنے ماضی کے حالات کی یادگار محفوظ کرنا چاہتا ہے، ہر آدمی کو اپنی ان چیزوں سے محبت ہوتی ہے، مگر زمانہ جوں جوں آگے بڑھتا جاتا ہے، اس سے تعلق رکھنے والی یہ چیزیں ماضی کے اندھیروں میں گم ہوتی چلی جاتی ہیں، حافظہ کسی قدر یاد رکھتا ہے، مگر اس کے نقوش بھی دھندلا جاتے ہیں، انسان چاہتا ہے کہ یہ چیزیں محفوظ رہیں، تاکہ جب چاہے وہ انھیں دیکھ سکے، دوسروں کو دکھا سکے، خود لذت یاب ہو اور دوسروں کو بھی اس میں شریک کرے، یہ سوچ کر اس نے ان چیزوں کو مجسمے کی صورت میں، تصویری نقوش کی صورت میں محفوظ کرنے کی کوشش کی، قدیم زمانے سے ہم دیکھتے ہیں کہ انسان اپنی یادگاروں کو محسوس صورتوں میں باقی رکھنے کا اہتمام کرتا ہے۔

تو کیا یہ جذبہ اور یہ ذوق جو انسان کے اندر رکھا گیا ہے، علی الاطلاق اس ذوق کی تسکین کا ہر سامان درست ہے، اس باب میں جب شریعت الٰہی سے فتوی لیا گیا، تو معلوم ہوا کہ اس ذوق کی تسکین کی اس حد تک اجازت ہے، جب تک انسان کو دنیا میں جس مقصد سے بھیجا اور پیدا کیا گیا ہے، اس مقصد کو کوئی نقصان نہ پہنچے، اور جہاں سے اس مقصد کو نقصان پہنچنا شروع ہو، وہاں سے ممانعت اور حرمت کی حد شروع ہو جاتی ہے۔

انسان کی پیدائش کا مقصد خود پیدا کرنے والے نے بہت وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے کہ **وماخلقت الجن والانس الا لیعبدون** (سورہ ذاریات) میں نے جن اور انسان کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں، جب تک اس ذوق تصویر سازی اور جذبۂ یادگاری کا ٹکراؤ عبادت الٰہی سے نہیں ہوتا، اس کی اجازت دی جاسکتی ہے اور جہاں اس نے اس مقصد عبادت میں خلل ڈالا، وہیں اس پر حرمت کا حکم لگے گا، اور اس سے روک دیا جائے گا۔

تاریخ انسانی پر غور کریں گے، تو یہ عجیب وغریب انکشاف ہوگا کہ تصویر سازی کا

ذوق توحید الٰہی اور عبادت الٰہی سے براہ راست متصادم ہے، واقعہ یہ ہے کہ تصویر سازی کا آغاز توحید الٰہی کے ٹھیک برعکس ہوا ہے، اس لیے بے تکلف یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ ذوق، اور اس ذوق کی تسکین کا سامان منشاء الٰہی کے عین خلاف ہے، اور آدمی پر فرض ہے کہ مجاہدہ کر کے اس ذوق کا رخ تصویر سازی اور یادگار بازی سے ہٹا کر حق تعالی کے ساتھ وابستگی میں لگائے، اس کی وجہ سے وہ گھاٹے میں نہ رہے گا، کیونکہ تصویریں کچھ دیر قائم رہتی ہیں، پھر وہ بھی فنا ہو جاتی ہیں، لیکن اللہ تعالی کے ساتھ وابستگی کی وجہ سے جو دوام حاصل ہوگا، اور جو بقاء نصیب ہوگا، اس کو کبھی زوال وفنا سے سابقہ نہ پڑے گا۔

اب تاریخ انسانی کا وہ انکشاف ملاحظہ فرمائیے، جسے میں نے عجیب وغریب کہا ہے، اور جو منشاء الٰہی کے ٹھیک برعکس ہے۔

یہ معلوم ہے کہ انسانی وجود کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے ہوا ہے، نسل انسانی کے پہلے مرکزی بزرگ حضرت آدم علیہ السلام ہیں، پھر دوسری مرکزی شخصیت حضرت نوح علیہ السلام کی ہے، حضرت آدم علیہ السلام سے انسانوں میں عبادت الٰہی کا طریقہ چلا اور وحدانیت کا عقیدہ قائم ہوا، اور عرصہ دراز تک برقرار رہا جب نوح علیہ السلام کا زمانہ آیا، تو اس طریقہ میں انحراف آچکا تھا، اور توحید کے مقابلے میں شرک پھیل چکا تھا، اللہ کے بجائے غیر اللہ کی عبادت ہونے لگی تھی، نوح علیہ السلام نے اس کے خلاف سخت جدوجہد کی اور ساڑھے نو سو سال تک کی، مگر مشرکین ٹس سے مس نہ ہوئے بالآخر طوفان عظیم میں غرق ہوئے، تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام میں دس قرن کا فاصلہ ہے، یعنی ایک ہزار سال!

توحید سے شرک کی طرف یہ انحراف کیونکر ہوا؟ اس کو سمجھنے کے لیے قرآن کریم میں سورۂ نوح کی تلاوت کیجئے حق تعالی ارشاد فرماتے ہیں **وقال نوح رب انهم عصونی واتبعوا من لم يزده ماله وولده الا خسارا. وقالوا لاتذرن ودا ولا سواعا ولا يغوث ويعوق ونسرا وقد اضلوا كثيرا.** (سورہ نوح) نوح نے عرض کیا اے میرے

پروردگار، انھوں نے میری بات نہ مانی، اور ایسی چیز کے پیچھے چل پڑے ہیں، جس میں انھیں مال اور اولاد کا گھاٹا ہی گھاٹا ہے، اور انھوں نے کہا کہ تم لوگ ہرگز ود کو نہ چھوڑنا، نہ سواع کو نہ یغوث ویعوق کو اور نہ نسر کو، اور انھوں نے بہتوں کو گمراہ کیا ہے۔

جلیل القدر مفسر قرآن، صحابی رسول، حبر الامت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ نام جو حضرت نوح علیہ السلام نے گنائے ہیں، یہ ان کی قوم کے نیک اور برگزیدہ لوگ تھے، جن سے لوگوں کو بہت محبت وعقیدت تھی، جب ان حضرات کا انتقال ہوگیا، اور قوم ان کی صحبت ومجلس سے محروم ہوگئی، قوم کو ان کی جدائی کا غم تھا، شیطان نے بعض لوگوں کے دل میں یہ بات ڈالی کہ جہاں یہ حضرات بیٹھتے تھے، وہاں ان کے مجسمے بنا کر رکھ دئے جائیں، تو ان کی صورت دیکھ کر تسکین رہا کرے گی، چنانچہ ایسا کر دیا گیا، اور ان مجسموں کو انہیں کے نام کے ساتھ موسوم کر دیا گیا، اس وقت وہ صرف سامان تسکین تھے، ان کی پوجا نہیں ہوتی تھی لیکن اس نسل کے بعد جب دوسری نسل آئی، تو اس نے تسکین وتسلی کے حصول سے ترقی کر کے عبادت شروع کر دی، اس طرح خدا پرستی سے انحراف شروع ہو کر بت پرستی کی نوبت آ گئی۔ (بخاری شریف تفسیر سورۂ نوح)

یہ تصویر سازی کی ابتدائی حالت ہے، اب یہ تصویریں خواہ جس مقصد کے لیے استعمال ہوں، اپنے ابتدائی تصور سے الگ نہیں ہوسکتیں، ان میں شرک کی نجاست اور آلودگی کی بدبو ضرور رہے گی، خواہ انھیں کتنا ہی خوبصورت اور پاک بنانے کی سعی کی جائے، اس لیے واقعہ یہ ہے کہ تصویر سازی ایمان کے خلاف ہے، غیرت ایمانی کے خلاف ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ ایمان والا اس سے دور ہی رہے، کیونکہ اس میں کفر وشرک کی بدبو موجود ہے۔

اس غیرت کا اظہار رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ میں دیکھئے بخاری شریف کی روایت ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک کپڑا پردے کا تھا، جسے انھوں نے حجرے کے ایک کنارے پر لٹکا رکھا تھا، نبی کریم ﷺ نے دیکھا تو فرمایا کہ اسے ہٹاؤ۔ اس کی تصویریں میرے سامنے نماز میں آتی رہتی

ہیں۔ (بخاری شریف باب التصاویر) اور مسلم شریف میں خود ام المؤمنین سے مروی ہے، وہ فرماتی ہیں کہ ہمارے پاس ایک پردہ تھا، جس میں ایک پرندے کی تصویر تھی، جو کوئی اندر آتا تو سامنے وہی تصویر پڑتی، مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اسے ہٹاؤ۔ میں جب گھر میں داخل ہوتا ہوں، تو یہ نظر کے سامنے پڑتی ہے، اور مجھے دنیا یاد آتی ہے (مسلم شریف کتاب اللباس)

رسول اللہ ﷺ کو دنیا کا یاد آنا بھی گوارا نہ تھا، غیرت ایمانی نے اس تصویر کو ہٹوادیا۔ اندازہ کیجئے پیغمبر علیہ السلام کے نزدیک تصویر کی کیا حیثیت ہے؟

لوگ کہتے ہیں- تصویروں کی کثرت وشیوع کے دور میں کہتے ہیں- کہ اب تصویریں پرستش کے لیے نہیں ہوتیں، جی! تسلیم لیکن ابتدائی آلودگی اب بھی اس سے لپٹی ہوئی ہے، اسے دیکھ کر کیا بت پرستی یاد نہیں آتی اور کیا اس کی تحریک نہیں ہوتی؟ کیا آج بھی بت پرستی اور تصویر پرستی بڑے پیمانے پر جاری نہیں ہے، کم از کم ہندوستان جیسے ملک میں بجز ہاں کے کوئی جواب ہی نہیں ہوسکتا، ہندوؤں کے ادنی ادنی تیوہاروں پر قسم قسم کی مورتیاں، مجسمے، تصویریں ہر کوچہ وبازار میں دکھائی دیتی ہیں، اور ان کی پوجا ہوتی رہتی ہے، تو غیرت ایمانی کا تقاضا ہے کہ تصویروں کا قصہ سرے سے ختم ہوجائے۔

پھر ہمیں تو حکم ہے **ما آتاكم الرسول فخذوه وما نهاكم عنه فانتهوا** (سورہ حشر) رسول جو کچھ تمہیں دیں اسے لے لو، اور جس سے منع کریں اس سے باز آجاؤ۔

قرآن کے اس حکم کی روشنی میں ہم یہ دیکھیں رسول اللہ ﷺ نے تصویر کے باب میں ہمیں کیا حکم دیا ہے اور کس سے منع کیا ہے، ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ جس کی اجازت دی ہے، وہ لے لیں، اور جس سے منع کیا ہے اس سے ہم باز آجائیں اپنی رائے سے کوئی علت اور مین میخ نہ نکالیں۔

تصویروں کے سلسلے میں محدثین نے رسول اللہ ﷺ کے ارشادات بکثرت نقل کیے، حدیث کے تمام مجموعوں میں تصویروں کے متعلق حدیثیں موجود ہیں، اور مختلف صحابہ سے منقول ہیں۔

صحاح ستہ میں ایک سرسری نگاہ میں متعدد صحابہ سے روایتیں منقول ہیں، ۱-حضرت ابوطلحہ انصاری، ۲-حضرت عبداللہ بن عباس، ۳-حضرت علی مرتضی، ۴-ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ، ۵-حضرت ابوہریرہ، ۶-حضرت عبداللہ بن عمر، ۷-حضرت عبداللہ بن مسعود، ۸-ام المؤمنین حضرت میمونہ، ۹-حضرت ابوجحیفہ رضی اللہ عنہم۔

ان سب حضرات کی روایتوں میں تصویر کی ممانعت، تصویر سازی کی حرمت اور اس پر لعنت، اور قیامت کے دن سخت عذاب کا تذکرہ موجود ہے، ہاں غیر ذی روح مثلاً درخت وغیرہ کی تصویر کی اجازت کا اشارہ ملتا ہے، اس لیے تصویر جو اس وقت زیر بحث ہے، وہ غیر ذی روح کی نہیں، جاندار اور روح والی چیزوں پر گفتگو ہو رہی ہے۔

تمام احادیث کے نقل کرنے کی گنجائش اداریے میں نہیں ہے، لیکن سمجھ لینا چاہیئے کہ ان سب روایتوں کا قدرِ مشترک جو کہ حرمت ہے، ''متواتر'' ہے، اس میں کسی طرح کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں، اس میں تاویل کا دروازہ بھی نہیں کھلتا، کیونکہ حدیثیں مجمل نہیں، متشابہ نہیں، محکم ہیں، اور محکمات میں تاویل وتخصیص کی گنجائش نہیں ہوتی، صرف مجبوری کے حالات میں بقدر ضرورت اختیار واستعمال کی اجازت ملتی ہے۔

۱- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا آپ فرما رہے تھے، کہ قیامت کے دن اللہ کے دربار میں سب سے سخت عذاب تصویر بنانے والوں کو ہوگا (بخاری شریف کتاب اللباس باب التفاسیر)

۲- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ یہ تصویریں بناتے ہیں قیامت کے دن انھیں عذاب ہوگا، اور ان سے کہا جائے گا کہ جس کو تم نے پیدا کیا ہے، اس کو زندہ کرو (حوالہ بالا)

۳- حضرت ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے تصویر بنانے والے پر لعنت کی ہے (حوالہ بالا)

۴- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو تصویر بناتے دیکھا تو فرمایا کہ میں

نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اس سے بڑا ظالم کون ہوگا، جو میری تخلیق جیسی تخلیق کرنا چاہتا ہے، اچھا تو وہ ایک دانہ پیدا کرے ایک ذرہ پیدا کرے (بخاری شریف کتاب اللباس باب نقض الصور)

۵- حضرت سعید بن ابی الحسن فرماتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس تھا، اتنے میں ان کے پاس ایک شخص آیا اور عرض کیا کہ حضرت! میری معیشت کا مدار میرے ہاتھ کی کاری گری پر ہے، میں تصویریں بناتا ہوں، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ میں تم کو بجز اس بات کے اور کچھ نہ بتاؤں گا، جو میں نے حضور اکرم ﷺ سے سنی ہے آپ فرماتے تھے کہ جس نے کوئی تصویر بنائی، تو اللہ تعالی اسے مبتلائے عذاب کریں گے، جب تک وہ اس میں روح نہ پھونک دے، اور اس کے بس میں نہیں ہے کہ روح پھونک سکے، یہ سن کر اس نے ایک گہری سانس کھینچی، اور اس کا چہرہ زرد پڑ گیا حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ ارے بھائی اگر تم بنانا ہی چاہتے ہوتو درخت وغیرہ کی تصویر بناؤ، جس میں روح نہیں ہوتی (بخاری شریف کتاب البیوع باب بیع التصویر)

۶- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، قیامت کے دن سب سے سخت عذاب ان لوگوں کو ہوگا، جو اللہ تعالی کے ساتھ عمل تخلیق میں مشابہت اختیار کرتے ہیں (بخاری شریف کتاب اللباس باب ماوطی في التصاویر)

۷- حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے، جس میں کتا ہو یا تصویر ہو۔ (بخاری شریف کتاب اللباس باب التصاویر)

تصویر کی تحریم اور ممانعت کے باب میں اور بھی بہت سی حدیثیں ہیں، سب کا قدر مشترک مضمون وہی ہے، جو مذکورہ بالا احادیث میں گزرا، ان احادیث میں تصویر سازی کی حرمت بھی بیان کی گئی ہے، قیامت میں اس کا کیا انجام ہوگا، وہ بھی بیان کیا گیا، کہ ایسا شخص سخت مبتلائے عذاب ہوگا، اور اسے مجبور کیا جائے گا کہ وہ اپنی بنائی ہوئی تصویر میں روح پھونکے، پھر دنیا میں بھی تصویر رکھنے کی نحوست بیان کی گئی کہ فرشتے تصویروں سے اتنی نفرت

کرتے ہیں کہ جس گھر میں تصویر ہو اس میں داخل نہیں ہوتے، پھر دنیا و آخرت کی اس وعید شدید کی علت بھی بیان کی گئی کہ مصور درحقیقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ عمل تخلیق میں مشابہت اختیار کرنا چاہتا ہے، یہ ایک بدترین گستاخی ہے، ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ وعیدیں ذی روح کی تصویر کے متعلق ہیں۔ بے روح اشیاء کی تصویر بنائی جا سکتی ہے۔

اتنی صاف وصریح اور واضح وعیدوں کے ساتھ کس کی ہمت ہے کہ وہ بال کی کھال نکالتا پھرے کہ تصویر ہاتھ سے بنائی گئی ہے، یا کیمرے سے کھینچی گئی ہے، یا اسے ویڈیو کی سائنس نے ذروں کی شکل میں تیار کیا ہے، اور وہ اسکرین پر چند لمحوں کے لیے آتی ہے، پھر غائب ہو جاتی ہے، وہ بہر صورت تصویر ہی تو ہے، اس کی کسی شکل کو جواز کا پروانہ تھمانا ساری شکلوں کے جواز کے لیے بہانہ بن جائے گا۔

تصویر جو آنکھوں سے نظر آئی، وہ تصویر ہے، اسے جس صورت میں بھی محفوظ کیا گیا ہو، تصویر سازی ہے خلق الٰہی کے ساتھ تشبہ کی گستاخی ہے، بت پرستی کی نجاست میں آلودہ ہے، فحاشی، بے حیائی، بے دینی، اور فضول لہو لعب کا دروازہ ہے، اس کو کسی تاویل سے جائز نہں کیا جا سکتا ہے۔

تعمق (بال کی کھال نکالنے) کی اجازت تو عبادات میں نہیں ہے، معاصی میں کیونکر ہو گی۔ ہمارے زمانے میں یہود و نصاریٰ کی تقلید و پیروی میں انجمن، کمیٹی، کانفرنس، سیمینار، کی بہت سی بلائیں مسلمانوں کے ماحول و معاشرے میں آئیں تو اپنے لوازم بد کے ساتھ آئیں، اور ان میں ایک بڑا لازمہ تصویر سازی ہے جہاں کوئی فنکشن ہوتا ہے، تصویر ساز لوگ بلا لیے جاتے ہیں اور اب تصویروں کے ایسے ایسے آلات آ گئے ہیں کہ ان سے بچنا مشکل ہے، کوئی کیمرے کی آنکھ چمکا رہا ہے، کوئی سانپ کے سر کی طرح ایک خاص قسم کا آلہ مجمع کی طرف جمائے ہوئے ہے کوئی بڑی سی مشین اٹھائے ہوئے دائیں بائیں گھما رہا ہے، اور یہ سب ایک ہی کام کر رہے ہیں، **یضاهئون خلق اللہ** اللہ کے عمل خلق میں شرکت و مشابہت کی گستاخی کر رہے ہیں، لوگ خوش ہیں کہ یادگار قائم ہو رہی ہے، ہم ٹی وی میں جلوہ

گر ہوں گے، اخبار کی زینت بنیں گے۔ اب یہ گناہ نہیں ہے، آرٹ ہے، فن ہے، پہلے ناچنے گانے والوں کی تصویریں آتی تھیں، اب اللہ والے بھی اس دوڑ میں شریک ہو رہے ہیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

گناہ تو گناہ ہی رہے گا، خواہ وہ کتنا ہی پھیل جائے، اللہ کا اور رسول کا کلام بدل نہیں سکتا، خواہ دنیا کی دنیا بدل جائے، گناہ میں ابتلائے عام ہو جائے، تو وہ کارِ ثواب نہیں بن جائے گا، مسلمانوں کی اکثریت نماز نہیں پڑھتی، تو نماز کا نہ پڑھنا معصیت سے خارج نہ ہوگا، یہ کہئے کہ گناہ بہت بڑھ گیا، یہ مت کہیے کہ ؎ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا، یہ شاعری ہے، حقیقت نہیں ہے، کفر کتنا ہی بڑھ جائے، ایمان نہیں ہوگا، قرآن کا یہ ارشاد ہر وقت دھیان میں رہنا چاہیے۔ **قل لایستوی الخبیث والطیب ولو اعجبک کثرۃ الخبیث فاتقوا اللہ یا اولی الالباب لعلکم تفلحون** (سورہ مائدہ) تم کہہ دو کہ ناپاک اور پاک برابر نہیں ہو سکتے اگرچہ ناپاک کی کثرت تمھیں خوش نما لگنے لگ جائے، پس اے عقل والو! اللہ سے ڈرو، تاکہ تم فلاح کو پہنچو۔

پھر اس پہلو سے بھی سوچیے کہ یہ تصویر سازی کوئی دینی ضرورت ہے؟ اس کا تو سوال ہی نہیں، جو چیز دین کے لیے تباہی کا باعث ہو، وہ دینی ضرورت کیونکر بن سکتی ہے؟ ہاں جبری واضطراری ضرورت ہو تو بکراہت گوارا کرنے کی گنجائش ہے، جیسے حکومتوں کے قوانین کی ستم رانیوں کی وجہ سے آدمی کو تصویر کے لیے مجبور ہونا پڑتا ہے۔

تو ان تصویروں کی دنیاوی کوئی ضرورت ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ دنیاوی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے، اگر یہ تصویریں نہ بنائی گئیں، تو دنیا کی کون سی ضرورت اٹکی رہ جاتی ہے؟ بس خیال ہی خیال ہے، یہ درحقیقت نفس پرستی ہے، دل و دماغ کی عیاشی ہے، بیمار طبیعتوں کی لذت جوئی ہے، اخلاق وانسانیت کے لیے ناسور ہے، اس کا تعلق نہ دین کی ضرورت سے ہے اور نہ دنیا کی معتد بہ ضرورت سے، ہائے! انسان کس لیے آیا تھا اور کیا کرنے لگ گیا۔

کس لیے آئے تھے ہم اور کیا کر چلے تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے

میں حضرات علماء کرام کی خدمت میں گزارش کرتا ہوں کہ وہ اس قسم کے اجتماعات اور مجالس میں شرکت سے احتیاط کریں، جن میں تصویر سازی ہوتی ہو، خواہ مجلس نکاح ہو، خواہ وہ سیمینار اور کانفرنس ہوں، دنیا کی شہرت عارضی ہے، اللہ کی ناراضگی اہم ہے، اللہ کو راضی کرنے کی فکر چاہئے اور رضائے الٰہی ہماری تاویلوں، مصلحتوں، استحسانوں میں نہیں ہے، اللہ و رسول کے ارشادات میں ہے، حلال بھی واضح ہے حرام بھی واضح ہے ان کے درمیان مشتبہات ہیں، دین کی حفاظت اس میں ہے کہ آدمی مشتبہات سے بھی اجتناب کرے، اور جو چیز حرام و ناجائز ہیں، ان کی طرف تو رخ بھی نہ کرے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے **الحلال بیّن والحرام بیّن وبینهما امور مشتبهة فمن ترک ماشبه علیه من الاثم کان لما استبان اترک، ومن اجترأ ما یشک فیه من الاثم اوشک ان یواقع ما استبان والمعاصی حمی الله، من یرتع حول الحمی یوشک ان یواقعه** (بخاری شریف کتاب البیوع)

حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے، ان کے درمیان کچھ مشتبہ چیزیں ہیں، (جن میں حرام وحلال دونوں کے پہلو ہیں) تو جو کوئی مشتبہ چیز جس میں گناہ ہونے کا شبہ ہے، چھوڑ دیتا ہے، وہ واضح حرام کو تو ضرور ہی ترک کرے گا، اور جو کوئی اس کام پر جرأت کرے گا جس میں گناہ ہونے کا شک ہے، وہ قریب ہے کہ کھلے ہوئے حرام میں پڑ جائے، معاصی اللہ تعالیٰ کی سرحدیں ہیں، جو سرحد کے آس پاس چکر لگائے گا اندیشہ ہے کہ اس میں پڑ جائے گا۔

تصویر سازی کا حرام ہونا بیّن ہے، اگر اس کا کوئی فرد مشتبہ بھی ہو، تب بھی اس سے بھاگنا چاہیے، ورنہ کھلے حرام میں پڑ کر رہے گا۔

مسئلہ صرف دنیا کا نہیں ہے، اصل مسئلہ آخرت کا ہے، اگر آخرت کی صلاح کے لیے دنیا کا کچھ نقصان بھی اٹھانا پڑے، تو گوارا ہے، چہ جائیکہ یہاں دنیا کا کوئی خاص قابل

ذکر نقصان بھی نہیں ہے، اور یہ رجحان تو بہت ہی پر خطر ہے کہ دنیاوی نا قابل اعتبار مصلحتوں کا سہارا لے کر ان باتوں کو جواز کی سند دی جائے، جنھیں اللہ کے رسول نے صراحت کے ساتھ حرام کہا ہے، اور اس کا حرام ہونا تواتر کے ساتھ ہمیں معلوم ہے۔

لیکن ہمارے دور میں یہ مصیبت بھی عام ہوتی جارہی ہے کہ نام بدل بدل کر حرام کو بے تکلف حلال کہا جارہا ہے، **فالی اللہ المشتکی وھو المستعان وھو حسبی ونعم الوکیل**

(بشکریہ مجلّہ المآثر مئو)

☆☆☆☆☆

نوٹ

کتاب کے فائنل پروف نکل چکے تھے، کہ المآثر کے ایک اہم اداریئے پر نظر پڑی، جو ایک ایسے شمارہ میں تھا جس میں اداریئے کے دو جز تھے، پہلا جز وفیات سے متعلق تھا جو ”کھوئے ہوؤں کی جستجو۔۔۔“ میں شائع ہوچکا ہے، جب اس دوسرے جز پر نظر پڑی تو اس کی شمولیت ضروری سمجھ میں آئی، اب اس کی جگہ پر دینے میں صفحات کی ترتیب گڑبڑ ہوتی، اس لئے اسے اخیر میں دیا جارہا ہے، اسے ملاحظہ فرمائیں صفحہ: ۵۸۳ پر۔ بعنوان (منیٰ کا حادثہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ انوار العلوم جہانا گنج کا
پہلا اداریہ

ماہنامہ انوار العلوم جہانا گنج تقریباً ڈیڑھ سال نکلا، اس کے اکثر اداریئے مدارس اور تعلیم کے موضوع پر تھے، جو مؤلف کی کتاب ''مدارس اسلامیہ، مشورے اور گزارشیں'' میں شائع ہو چکے ہیں۔ (مرتب)

الحمدللہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ سیدالانبیاء والمرسلین وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین. أمابعد!

تقریباً اٹھارہ سال پہلے کی بات ہے، میں الہ آباد میں تھا۔ میرے دوست مولانا عبدالرب صاحب اعظمی ناظم مدرسہ انوار العلوم جہانا گنج بھی وہیں تھے۔ ایک روز مصلح الامت عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی مسجد میں فجر کی نماز کے بعد ہم لوگوں نے دیکھا کہ لوگ ایک طرف بڑھ رہے ہیں اور کسی صاحب سے مصافحہ اور معانقہ کر رہے ہیں، لوگوں کے بڑھنے، مصافحہ کرنے اور معانقہ کرنے میں بے انتہا خلوص وعقیدت اور ادب و نیازمندی کی خوشبو محسوس ہو رہی تھی۔ جن سے مصافحہ ہو رہا تھا وہ ایک مسکین صورت بزرگ تھے، خشوع وخضوع کا نور چہرے سے پھوٹا پڑ رہا تھا، وہ خود جھکے جا رہے تھے، معمر تھے، داڑھی سفید ہو چکی تھی، دریافت کرنے پر بتایا گیا کہ یہ حضرت مولانا صدیق احمد صاحب باندوی (وفات: ۲۳؍ ربیع الآخر ۱۴۱۸ھ (۲۸؍ اگست ۱۹۹۷ء) ہیں۔ اس

وقت ان کی شہرت عام نہیں ہوئی تھی، ان کے بعض تلامذہ کے واسطے سے ان کا نام سن رکھا تھا، دل نے عقیدت کی حلاوت محسوس کی، ملاقات ہوئی، ہلکا سا تعارف ہوا، ایسا محسوس ہوا کہ وہ بھی پہلے سے کچھ واقف ہیں۔ مسجد سے باہر نکل کر کچھ دور آئے اور اور لوگوں کے ہجوم کے درمیان سے کچھ موقع ملا تو میرا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گئے، اور بہت آہستہ آہستہ فرمانے لگے کہ اس دور میں اللہ کے دین کی خدمت کرنے کی بہت ضرورت ہے، اللہ نے جس کو جو صلاحیت دی ہو، دین کی خدمت میں اسے جھونک دے، آپ کو اللہ تعالیٰ نے تقریر کی، تدریس کی، تحریر کی، اور دوسری بہت سی صلاحیتوں سے نوازا ہے، آپ اپنی سب صلاحیتوں کو دین کی خدمت میں لگا دیجئے، اتنا فرما کر فوراً لوگوں کے مجمع میں پہونچ گئے، اور مجھے اتنا بھی موقع نہیں ملا کہ اپنی عدم صلاحیت اور بے لیاقتی کا اظہار کرسکوں۔

حضرت مولانا کی یہ بات دل میں گڑ گئی، صلاحیت و لیاقت تو نہ اس وقت تھی اور نہ اب ہے، لیکن ان کی بات سے حوصلہ پیدا ہوا کہ اگر کوئی کام ہوسکتا ہو، تو اس کا رُخ پھیر کر دین ہی کی طرف لگا دیا جائے، اسی میں اپنی سعادت، خوش بختی ہے۔ تدریس کا ٹوٹا پھوٹا سلسلہ تو جاری ہی تھا، وعظ و تقریر پر طبیعت بمشکل آمادہ ہوتی تھی، اس کے لئے خود کو تیار کیا، لیکن تحریر و تالیف کا تو کوئی تصور نہ تھا، نہ مزاج و طبیعت کو اس سے مناسبت تھی، اور نہ کبھی اس کی طرف التفات ہوا تھا، کبھی کبھار کسی ضرورت یا مجبوری کے تحت قلم سے کام لے لیا ہو تو اس کی حیثیت ایک استثنائی شے کی ہے، تاہم بزرگوں کی بات خالی نہیں جاتی ۱۴۱۳ھ میں محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہٗ کی یادگار میں مجلّہ ''المآثر'' کا آغاز ہوا، تو قلم کے سفر کا باقاعدہ آغاز ہوا، اب جلد جلد کچھ کچھ لکھنے کی نوبت آنے لگی۔ مجلّہ ''المآثر'' کا علمی و تحقیقی معیار ایسا ہے کہ وہ صرف خواص اور اہل حضرات کی دسترس میں آسکتا ہے، بہت سے دوستوں، عزیزوں اور کرم فرماؤں کی خواہش ہوئی، اور یہ خواہش دلوں سے زبانوں پر آئی، کہ کوئی رسالہ ایسا بھی نکلنا چاہئے جو عام فہم ہو، جس سے خاص و عام سب مستفید ہوسکیں، اس میں متنوع موضوعات ہوں۔ غیر معیاری نہ ہو، لیکن معیار بہت بلند نہ ہو۔

آج کل قلم کی بہتات ہے، ذہن وفکر، علم وعمل، دین ودیانت خواہ کچھ ہو اور کیسی ہی ہو، قلم ہاتھ میں آجاتا ہے تو ہر شخص کو اپنے ذہنی وساوس اور خیالات پریشاں کو پیش کرنے کا شوق ہوتا ہے، اس کی وجہ سے صحیح علم معدوم ہوتا جارہا ہے، اب قلم کے راستے سے جہل پھیل رہا ہے، بہت سی کتابیں، بہت سے رسالے صحیح علوم کے حامل بھی شائع ہورہے ہیں، لیکن غلط باتوں کے طوفان میں بس وہ چند دیواریں ہیں جو ان طوفانوں کا راستہ روکنے کے لئے کافی نہیں۔ ضرورت ہے کہ اس طرح کی کتابیں اور اس طرح کے رسالے کثرت سے شائع کئے جائیں اور انھیں بہت سے ہاتھوں میں پہونچایا جائے، بہت سی نگاہوں سے گزارا جائے، شاید کسی دل میں بات اتر جائے۔ باطل پوری قوت سے اور ناز سے اتراتا ہوا چل رہا ہے، حق کی طاقت کے سامنے باطل کو ٹھہرنے کی تاب نہیں ہے، لیکن اہل حق کی کمزوری اور ان کی قلت سے باطل کو بڑھنے کا حوصلہ مل رہا ہے، اندھیرا گھٹاٹوپ ہے اور چراغ اس میں کم جل رہے ہیں۔ اس لئے وہ بھی کجلا جاتے ہیں۔

مولانا عبدالرب صاحب اعظمی نے اس ضرورت کو محسوس کیا، اللہ تعالیٰ نے انھیں بلند ہمت عطا فرمائی ہے، دورِ ظلمات میں آندھیوں کی زد میں چراغ جلانا بڑے حوصلہ کی بات ہے، اور یہ حوصلہ مولانا کو اللہ تعالیٰ نے بخشا ہے۔ مولانا نے ہمت کی اور اپنے مدرسہ سے اسی کے نام پر ماہنامہ ''انوار العلوم'' جاری کرنے کا فیصلہ کیا، اور مجھے مکلّف بنایا کہ میں ان کا تعاون کروں۔ مولانا عبدالرب صاحب کا حکم میں نے قبول کیا، یہ کام میرے حوصلہ سے بڑھا ہوا ہے، تاہم جب ارادہ کرلیا گیا ہے، تو اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ وہ مدد فرمائیں گے۔

اس رسالہ کو ملک کے مشہور وممتاز صاحب علم وصاحب قلم حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوری مدظلہ کی سرپرستی کا شرف حاصل ہے، ان کی نگرانی ورہنمائی کے تصور ہی سے حوصلوں میں توانائی آتی ہے، اللہ تعالیٰ ان کے سائے کو ہم پر باقی وقائم رکھے۔

رسالہ میں چند عنوانات مستقل ہوں گے، جن کے تحت مضامین شائع کئے جائیں

گے۔ ان شاء اللہ

۱----- **ملحوظات:** (اداریہ) جس میں مختلف اور متنوع موضوعات پر ادارہ کی طرف سے اظہار خیال ہوگا۔

۲----- **انوار القرآن یا انوار السنۃ:** ان دونوں عنوانوں میں سے کسی ایک یا دونوں کے لئے ہر ماہ چند صفحات مخصوص ہوں گے، اہل حضرات سے درخواست ہے کہ ان دونوں موضوعات پر اپنے رشحات قلم ارسال فرمائیں۔

۳----- علمی ودینی واصلاحی مقالات۔

۴----- گاہے گاہے باز خواں........: اس موضوع کے تحت اکابر سلف کے اقوال وتحریرات کی تلخیص، ان کے واقعات وحکایات اور ان کے مضامین کے ترجمے پیش کئے جائیں گے۔

۵----- استفسار وجواب: اس عنوان کے تحت فتاویٰ، قارئین کے علمی ودینی سوالات کے جواب، اشکالات کے حل پیش کئے جائیں گے، ان سارے موضوعات میں اہل علم کو حصہ لینے کی دعوت ہے۔

۶----- جدید مطبوعات پر تبصرے۔

ان کے علاوہ حسب ضرورت دوسرے دینی موضوعات پر بھی مفید مضامین شائع کئے جائیں گے۔ رمضان المبارک کے مقدس مہینے سے اس کا اجراء ہورہا ہے، اور اتفاق یہ ہے کہ ۱۹۹۶ء کا پہلا مہینہ جنوری ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں کہ اس رسالہ سے مفید دینی خدمت انجام پائے، ہمارے عزائم میں برکت ہو، رسالہ استقلال ودوام کے ساتھ نکلتا رہے، اور خالق کے حضور شرف قبول پائے۔ آمین یارب العالمین

☆☆☆☆☆

ماہنامہ

﴿الاسلام وضیاء الاسلام﴾

کے

اداریئے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حق تعالیٰ سے مایوس نہ ہوں!

شبلی کالج اعظم گڈھ میں ’’وندے ماترم‘‘ کے نام پر ہنگامہ ہوگیا۔ توڑ پھوڑ، مار پیٹ کا بازار گرم ہوگیا۔ حکام نے کرفیو نافذ کردیا، اعظم گڈھ اور مضافات میں ایسے واقعات رونما ہوتے رہے کہ کسی راہ چلتے مسافر کو مسلمان دیکھ کر لفنگوں نے حملہ کردیا، سامان چھین لیا۔ ہندوستان آزاد ہونے اور تقسیم کے بعد فرقہ وارانہ فسادات ہندوستانی مسلمانوں کی قسمت بن گئے ہیں، اور یہ کوئی اتفاقی اور ناگہانی واقعات نہیں ہیں، بلکہ یہاں اکثریتی طبقہ کی ذہنی تربیت اسی انداز پر کی جارہی ہے، شرک وکفر سے کسی خیر کی توقع نہیں ہوسکتی۔ اس لئے ادھر سے جو کچھ ہو، نہ باعث حیرت ہے اور نہ کوئی غیر متوقع بات!

اس ملک میں آہستہ آہستہ جن سنگھی اور بی۔ جے۔ پی کی ذہنیت عام ہوتی گئی، اور اب جبکہ مرکز میں بھی اور صوبوں میں بھی اس کی حکومت قائم ہوگئی ہے، تو ایک خاص رفتار کے ساتھ مرحلہ وار، اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہونچانے والی چیزیں لائی جارہی ہیں۔ ’’وندے ماترم‘‘ ایک شرکیہ ترانہ ہے، جس کا پڑھنا کسی مسلمان کو گوارا نہیں، ایک سیکولر حکومت میں کسی کے مذہب کو دوسروں پر لادنا صریح ظلم ہے، لیکن حکومت وسیاست شاید اب اسی کا نام ہے کہ مذہب واخلاق کی تمام قدریں پامال کردی جائیں۔ خیر یہ تو حکومت وسیاست کی بات ہے، یہ میری گفتگو کا موضوع نہیں، مجھے اس وقت جو کچھ عرض کرنا ہے، اپنے بھائیوں کے متعلق عرض کرنا ہے، جو اسلام کے نام لیوا ہیں، اللہ تعالیٰ کو رب مانتے ہیں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے، حضرت محمد ﷺ کو اپنا ہادی اور پیشوا مانتے ہیں، اسی کی پاداش میں دوسروں کی نگاہوں میں کانٹا بنے ہوئے ہیں، ان ہنگاموں اور فسادات اور

ناموافق حالات میں جب عام مسلمانوں کے احوال کا جائزہ لیا جاتا ہے، تو کئی چیزیں ایسی سامنے آتی ہیں جو ایک مسلمان کے لئے کسی طرح مناسب نہیں ہوتیں۔ اس سلسلے میں ایک بات عرض کرنی ہے۔

جب کہیں فساد ہوتا ہے یا کوئی مصیبت آتی ہے، تو عام طور پر مسلمانوں میں ایک طرح کی مایوسی اور بزدلی کا احساس پایا جانے لگتا ہے۔ اخبار اور ریڈیو افواہیں پھیلاتے ہیں، عوام کی زبانیں اس میں اضافہ کرتی ہیں، اور پھر ایسی بھیانک صورت حال لوگوں کے پیش نظر ہو جاتی ہے کہ خود بخود ہراس بڑھ جاتا ہے، مایوسی کا سایا گھنا ہو جاتا ہے اور مسلمان بے بس محسوس ہونے لگتا ہے، جیسے اس کا سہارا کوئی نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے عموماً بزدلی بڑھ جاتی ہے، کہیں آنے جانے میں اس طرح خوف محسوس ہونے لگتا ہے جیسے موت تعاقب میں ہے، اِکا دُکا ایسے واقعات بھی سننے میں آجاتے ہیں کہ غیر مسلموں کے ہجوم میں یا محض کسی وہم میں مبتلا ہو کر مسلمان اپنے کو غیر مسلم ظاہر کرنے لگتا ہے۔ شکل وصورت تو مسلمانوں کی بکثرت ہندوؤں جیسی دکھائی دیتی ہی ہے، بعض کمزور افراد ہاتھ میں دھاگا باندھ کر خود کو چھپاتے ہیں۔ کوئی نام بدل دیتا ہے، اس طرح کی مثالیں بکثرت تو نہیں، لیکن سننے میں آتی ہی رہتی ہیں۔

یہ سخت بزدلی اور نامردی ہے، مسلمانوں کو یہ کبھی نہیں بھولنا چاہئے کہ اس کے والی وولی اللہ تعالیٰ ہیں، مسلمان اگر اپنے دل میں اللہ کا ڈر رکھے، ان کے نبی کی پیروی دل سے کرے تو اس کا کوئی طاقت کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ ہر آن اسے اس کا دھیان رکھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ میرے ساتھ ہیں، تمام طاقت کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اس کی معیّت کے بعد کسی بھی مخلوق کا کچھ ڈر نہیں، مایوسی کی کوئی بات نہیں ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے سامنے غزوہ احد میں مسلمانوں کو ایک شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا، کیفیت مایوسی ہی کی تھی، کفار کا سالارِ لشکر نعرہ پر نعرہ لگا رہا تھا کہ **لنا العُزیٰ و لا عُزیٰ لکم** (ہمارے لئے عزیٰ ہے اور تمہارے لئے عزیٰ نہیں) عزیٰ کفار کا ایک بت تھا، شاید عزت وغلبہ کا بت رہا ہو، اس کے جواب میں

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم لوگ کہو: **اللہ مولانا و لامولیٰ لکم** (اللہ ہمارا والی و کارساز ہے اور تمہارا کوئی والی و کارساز نہیں)

اللہ تعالیٰ مشکل سے مشکل حالات میں مدد فرماتے ہیں، مسلمانوں سے اللہ تعالیٰ نے یہ کہیں وعدہ نہیں کیا ہے کہ تم پر کوئی مشکل نہیں پڑے گی، مگر صبر و تقویٰ کے بعد نصرت و فتح کا وعدہ ہے۔ اور یہ کتنی بڑی سعادت ہے کہ اللہ و رسول کے نام پر کسی کو دکھ پہونچایا جائے، اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے نہ جانے کتنے عروج سے سرفراز فرمائیں گے۔ اس لئے خوف و ہراس کو برطرف کر کے مردانہ وار صبر و استقلال سے، اللہ تعالیٰ پر کامل بھروسہ کر کے دل کو مضبوط رکھنا چاہئے، کسی بے گناہ پر ظلم نہ کرے، افواہیں نہ پھیلائے، بے صبری کا کوئی کام نہ کرے، آپس کے انتشار و افتراق کو ختم کرے۔ پھر دیکھے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد کس طرح بڑھ بڑھ کر آتی ہے، ایسا تو نہ بن جائے جیسے اس کا خدا کوئی ہے ہی نہیں۔ مرحوم آغا حشر کاشمیری نے کہا تھا؂

حق پرستوں کی اگر کی تو نے دل جوئی نہیں
طعنہ دیں گے بت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں

لیکن اب تو مصیبت کے حالات میں مسلمان اپنے آپ کو خود ایسا سمجھنے لگتا ہے، جیسے اس کا خدا کوئی نہیں، یہ صرف مایوسی نہیں ہے بلکہ حق تعالیٰ شانہٗ کے ساتھ بدگمانی بھی ہے، جو سخت بے ادبی ہے اور خدا کی جناب میں انجام کے لحاظ سے گستاخی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو معاف فرمائیں، ہمارے دلوں کو مضبوط بنائیں، اور اپنے اوپر سچا اعتماد و توکل نصیب فرمائیں۔ آمین یارب العالمین

(ذی قعدہ ۱۴۲۰ھ، فروری ۲۰۰۰ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مصائب کا اصل سرچشمہ؟

نادر شاہ نے دلی میں قتل عام کا حکم دیدیا تھا، ہر گلی کوچے میں انسانی لاشیں بکھری پڑی تھیں، کسی کو پناہ نہ ملتی تھی، ہر ایک گردن پر خونخوار تلوار کھنچی ہوئی تھی، سب سراسیمہ تھے، سب حیران تھے کہ یہ کیا ہوا؟ اس سوال کا جواب ملنے سے پہلے گردن پر تلوار چل چکی ہوتی۔ جب نادر شاہ کی خون آشام تلوار آسودہ ہو چکی تو اس نے یہ سلسلہ بند کرایا، اب بچے کھچے لوگوں کے حواس بجا ہونے شروع ہوئے، تو کسی نے کسی بزرگ سے دریافت کیا کہ حضرت! یہ سب کیا ہوا؟ انھوں نے ایک جملے میں جواب دیا، وہ جملہ تاریخی جملہ بن گیا، واقعیت اور صداقت پر مبنی! اپنے اندر درس وموعظت کی ایک دنیا لئے ہوئے، انھوں نے کہا:

شامتِ اعمالِ ما صورتِ نادر گرفت

نہ نادر کچھ ہے نہ نادر کا حکم کوئی چیز ہے، نادر کیا ہے؟ جیسے سب انسان ہیں قوانینِ قدرت میں جکڑا ہوا وہ بھی ایک انسان ہے، لیکن ہماری بداعمالیاں ہیں جنھوں نے پروردگار عالم کو ناراض کیا، وہی بداعمالیاں نادر کی صورت میں مجسم ہو کر ہم پر قہر وعذاب کا کوڑا بن کر برس گئی ہیں۔

انسان آفات ومصائب کا سرچشمہ اپنی ذات سے، اپنے احوال واعمال سے باہر تلاش کرتا ہے اور اسے اپنی ذات سے باہر مصائب کا چشمہ ابلتا ہوا دکھائی دے جاتا ہے، وہ اسی خارجی سرچشمہ پر، اس کے روکنے پر، اس کے پاٹنے پر اپنی کوشش صرف کرنے لگتا ہے، لیکن ایک سوراخ بند کرتا ہے تو دوسرے سوراخ سے دھواں نکلنے لگتا ہے، ایک طرف دباتا ہے تو دوسری طرف ابھار پیدا ہوتا ہے۔

یہ ایک طرفہ محنت کامیاب نہیں ہوتی تو وہ مایوس ہونے لگتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے

کہ اس نے جہاں اپنی ذات و معاشرہ سے باہر آفات ومشکلات کو ڈھونڈھا ہے اس سے زیادہ خود اپنے اندر تلاش کرنا چاہئے، باہر کی دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ بہت کچھ اندر کی دنیا کا ایک پرتو اور ظہور ہے۔ ایک شخص جسمانی طور پر تندرست ہو، توانا ہو، بدن میں پہلوانوں جیسی طاقت بھری ہو، چہرہ بارعب ہو، بازو بھرے بھرے ہوں، تو دیکھنے والا خود مرعوب ہوجاتا ہے، اگر اس کی نیت حملہ کرنے کی ہوگی تو وہ سو مرتبہ سوچے گا، کہیں یہ مجھے دبا نہ لے، میں اس کے مقابلہ میں ٹھہر سکوں گا؟ وغیرہ، لیکن اگر کوئی شخص دبلا پتلا مریل ہو، کھانا اس سے کھایا نہ جاتا ہو، چلنے میں پاؤں لڑکھڑاتے ہوں، ہڈیاں نمایاں ہوں، تو ہر کس و ناکس بے خطر اس پر حملہ کرسکتا ہے، کسی پر اس کا رعب قائم نہیں ہوگا۔

اسی طرح آج اس ملک میں عموماً اور مسلمانوں کے حق میں خصوصاً جو گورنمنٹ کا کردار اور طرزِ عمل ظاہر ہو رہا ہے، مسلمانوں پر دینی، اقتصادی اور تعلیمی ہر اعتبار سے حلقہ کیا جا رہا ہے، ہم یہ کہہ کر مطمئن ہوجاتے ہیں، دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں کہ یہ گورنمنٹ بہت بری ہے، اس کے عزائم خطرناک ہیں، اور کوئی شبہ نہیں کہ ملک کی اور صوبہ یوپی کی موجودہ حکومت نہایت منحوس اور بے برکت ہے، اس حکومت کے آنے کے بعد سے ملک کو مسلسل زمینی و آسمانی آفات ومصائب کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ کبھی قحط ہے، کبھی سیلاب ہے، کبھی زلزلہ ہے، کہیں آگ لگتی ہے، تو کہیں طوفان آتا ہے، پھر اخبارات میں، جلسوں میں، تقریروں میں، کانفرنسوں میں حکومت کے خلاف بہت لکھا جاتا ہے، بہت کچھ اسے برا بھلا کہا جاتا ہے، تجویزیں پاس ہوتی ہیں، نعرے لگتے ہیں، اہل حکومت کو عرضداشتیں پیش کی جاتی ہیں، یہ سب کچھ ہوتا ہے مگر اکثر تو ایسا ہی دیکھنے میں آیا کہ مسئلہ حل ہونے کے بجائے کچھ اور سنگین بن گیا۔

یہاں ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ جو لوگ مصائب وآفات کا شکار ہو رہے ہیں وہ اپنی اندرونی طاقت کا بھی جائزہ لیں، کہیں خود ان کی اپنی کمزوریاں تو نہیں ہیں جن کی وجہ سے شکاریوں کو حوصلہ ملا ہے کہ جیسے چاہیں مار لیں، کہیں ایسا تو نہیں، حکومت کے جس ظلم

و بے انصافی کے خلاف لوگ نعرے لگا رہے ہیں اسی طرح کے ظلم اور بے انصافیوں کا جنون خود ان کے اندر بھی پھیلا ہوا ہو، وہ ہمارے دین و مذہب پر باہر سے حملہ انداز ہوں، لیکن ہم خود اپنے اپنے طور پر دین و مذہب کے احکام سے منحرف ہوتے جا رہے ہوں، حکومت ہمارے مدارس اور مساجد کو نشانہ بنا رہی ہے، لیکن دیکھیں تو سہی خود اہل مساجد اور اہل مدارس کا، مساجد کے ساتھ، نمازوں کے ساتھ، مساجد کے انتظام کے ساتھ، مدارس کے ساتھ، تعلیم کے ساتھ، طلبہ کے ساتھ، اساتذہ کے ساتھ، باہم کیسا معاملہ ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں یہیں کمزوری ہو، یہیں بیماری ہو، یہیں پر کوئی مہلک مرض ہو، جس کا سہارا پا کر باہری دشمن حملہ کرنے کی جرأت کر رہا ہے۔

آیئے اس سوال کو ہم اپنے ہادی و رہبر، پیشوائے اعظم، سیّد الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی جناب میں پیش کریں اور جو جَواب وہاں سے ملے وہ ہمارے حرزِ جان ہونا چاہئے۔ دیکھئے رسول اللہ ﷺ فرما رہے ہیں:

> **إن الله تعالیٰ یقول: أنا الله لا إلٰه إلا أنا أنا مالک الملوک وملک الملوک، قلوب الملوک فی یدی وإن العباد إذا أطاعونی حوّلت قلوب ملوکهم علیهم بالرحمة والرافة، وإن العباد إذا عصونی حوّلت قلوبهم بالسخطة والنقمة، فأعذبهم سوء العذاب، فلاتشغلوا أنفسکم بالدعاء علی الملوک ولکن اشغلوا أنفسکم بالذکر والتضرع کی أکفیکم ملوککم** (رواہ ابونعیم فی الحلیة) [مشکوٰۃ شریف: کتاب الامارۃ والقضاء]
>
> اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ میں اللہ ہوں، میرے علاوہ اور کوئی معبود نہیں۔ میں بادشاہوں کا بادشاہ ہوں، بادشاہوں کے دل میرے ہاتھ میں ہیں، بندے جب میری اطاعت کرتے ہیں، تو ان کے بادشاہوں کے قلوب کو رحمت و مہربانی کے جذبے کے ساتھ ان پر متوجہ کرتا ہوں، اور جب بندے میری نافرمانی کرتے ہیں تو میں ان کے دلوں کو غصہ اور انتقام کے جذبے کے ساتھ ان کے اوپر بدل دیتا ہوں، تو وہ انھیں سخت عذاب کا مزا چکھاتے ہیں، تو اے لوگو! اپنے آپ کو بادشاہوں کے برا بھلا کہنے اور ان پر

> بددعا کرنے میں مشغول مت کرو، بلکہ ذکر اور دعا کے اندر اور گریہ وزاری میں خود کو مشغول کرو، تاکہ تمہارے بادشاہوں کے مقابلے میں مَیں تمہاری حمایت وکفایت کروں۔

رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ظلم وجبر کے مقابلے میں ظاہری تدابیر سے جو حد جواز میں ہوں، منع نہیں کرتا۔ دنیا میں اسباب کا سلسلہ مقاصد ونتائج کے ساتھ جڑا ہوا ہے، لیکن یہ اسباب دوہرے ہیں، انسان کو خارجی اسباب کے مقابلے میں داخلی اسباب پر توجہ زیادہ کرنی چاہئے، ہم حکومت کی غلط پالیسیوں کے خلاف دم خم دکھائیں، مظاہرہ کریں، تجویزیں پاس کریں، اپنی یکجہتی اور اتحاد کا منظر پیش کریں، سب بجا، لیکن اس سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ زیادہ اہتمام اس بات کا کریں کہ جس کمزوری کو پاکر حکومت ہمارے دین وملت پر حملہ آور ہے، اس کمزوری کو ہم دفع کریں، شریعت کو اور احکام اسلام کو پہلے ہم اپنی ذات پر، اپنے خاندان پر، اپنے معاشرہ پر نافذ کریں، چاہے وہ ہمارے نفس، ہمارے اغراض اور ہمارے ظاہری مفاد کے کتنا ہی خلاف ہو۔ اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہوں، اور اللہ کی رضا سب جانتے ہیں کہ نفس اور خواہش نفس کی پیروی کرنے میں نہیں ہے، وہ اس خدائی ہدایت کی پیروی کرنے میں ہے جس کو دے کر آخری ہادی (ﷺ) کو اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے۔

یہ دوطرفہ کوشش ومحنت ہی ہم کو کامیاب کرے گی، یک طرفہ محنت، جس میں اپنے نفس کو اور اپنے اغراض ومقاصد کو ہاتھ نہ لگانا پڑے، وہ کچھ زیادہ مفید نہیں ہے، اس صورت میں فساد کا ایک سوراخ بند ہوگا، تو دوسرے دس سوراخ کھلیں گے، کیونکہ سوراخ پیدا کرنے والا مادہ خود ہمارے اندر موجود ہے۔

یہ معاملہ ہر مسلمان کی ذمہ کا معاملہ ہے، اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑیں، اور انتشار نہ پیدا کریں، تب اللہ کی رحمت وعنایت متوجہ ہوگی۔

فعل اللہ ذٰلک وما ھو علیہ بعزیز

(ربیع الاول ۱۴۲۱ھ/جون ۲۰۰۰ء)

☆☆☆☆☆

بسم الله الرحمن الرحيم

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا سلیقہ

امر باالمعروف (اچھی بات کی تلقین) اور **نہی عن المنکر** (بری بات سے ممانعت) ایک شرعی فریضہ ہے، اور ایسا فریضہ ہے کہ اسی سے دین ودیانت کی زندگی ہے، اگر اسے ترک کردیا جائے تو شیطان پوری انسانیت پر ہلّہ بول دے گا، اور سب کو گمراہی کی دلدل میں پھنسا دے گا۔ اس کی ضرورت ہر زمانے میں رہی ہے، لیکن موجودہ دور میں جبکہ دنیا کو قبلۂ مقصود بنالیا گیا ہے، دنیا ہی کے نفع ونقصان کو سب کچھ سمجھا جاتا ہے اور اسی محور پر انسان کی زندگی گردش کررہی ہے، اس کے نتیجہ میں آخرت فراموش ہوگئی ہے، دینی احکام کی عظمت دل سے نکل گئی ہے، کافر تو کافر ہے، اپنے دل میں ایمان رکھنے والا بھی بڑی حد تک گناہوں پر بے باک اور جری ہوگیا ہے، اسی حالت میں اس کی جتنی ضرورت واہمیت ہے واضح ہے۔ قدم قدم پر متنبہ کرنے اور ٹوکنے کی ضرورت ہے، برائیوں کو اگر سلیقہ سے ٹوکا جائے تو وہ سمٹتی ہے اور اگر اسے ٹوکنا چھوڑ دیا جائے تو پھیلتی چلی جاتی ہے، ہر شخص اپنے دائرۂ اثر میں اس کا ذمہ دار ہے کہ بھلائیوں کو پھیلانے کی کوشش کرے اور برائیوں پر ٹوکے، مگر اس کے لئے خاص طریقہ ہے، خاص سلیقہ ہے، اور خاص شرطیں ہیں۔ شرطیں تو یہ ہیں کہ آدمی کو اچھے برے کا علم ہو، علم کے بغیر اس میدان میں قدم رکھنا خود ایک برائی ہے جس سے منع کرنا واجب ہے، اس لئے ضروری ہے کہ معروف اور منکر کا علم حاصل کرے، پھر جس درجہ کا معروف یا منکر ہو اسی درجہ کے مطابق اس کا حکم کرے یا اس سے منع کرے، نیز جس شخص کو وہ ٹوک رہا ہے اس کے درجے اور مرتبے کا علم بھی اور اس کا لحاظ بھی ضروری ہے، باپ کو فہمائش کرنے کا انداز اور ہوگا اور بیٹے کو ٹوکنے کا انداز اور ہوگا، اسی طرح ہر شخص اور ہر ماحول میں

فرق مراتب کا لحاظ شرط ہے۔ سلیقہ یہ ہے کہ تنبیہ اور فہمائش کا انداز ہمدردی اور خیر خواہی کا ہو، خوامخواہ ذلیل کرنے اور زچ کرنے کا انداز نہ ہو، نہ کسی کے پیچھے پڑا جائے۔ آدمی کا کام دلسوزی اور ہمدردی کے ساتھ نصیحت کرنا ہے، چاہے جتنی مرتبہ کرنی پڑے، اس نصیحت پر عمل کرا دینا، اس کا اثر دل میں ڈالنا اللہ کا کام ہے۔

طریقہ یہ ہے کہ جس بات کا حکم دیتا ہے یا جس بات سے منع کرتا ہے، اس کا عمل اور اس کا حال اس کے قول کی تردید نہ کرتا ہو، آدمی جس چیز پر خود عمل کرتا ہے اس کا حکم کسی کو دے گا تو اس سے نصیحت کے قبول ہونے کی توقع زیادہ ہے اور خود اس کی ذلت نہ ہوگی۔ اسی طرح جس بات سے منع کرتا ہے اس میں اس کا دامن آلودہ نہیں ہونا چاہئے ورنہ ملامت اور رسوائی کا نشانہ بن کر رہے گا۔ آپ جس کو کسی اچھی بات کی تلقین کریں گے یا کسی برائی پر ٹوکیں گے تو اس کی نگاہِ احتساب آپ پر اٹھے گی.....اور یہ فطری بات ہے.....اگر وہ دیکھے گا کہ آپ کی زندگی اسی سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے جس کی آپ تلقین کر رہے ہیں تو وہ مطمئن ہو جائے گا، پھر اپنے طرز عمل میں تبدیلی لانے کا قصد کرے گا، اور اگر اس نے دیکھا کہ آپ تلقین تو ضرور کر رہے ہیں مگر آپ کا معیارِ عمل اس کے مطابق نہیں ہے تو وہ لاپروائی سے ٹال دے گا کہ پہلے آپ اپنے کو دیکھئے، یہ طریقہ کہ قول و عمل میں تضاد ہو خود ایک منکر (برائی) ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ٹوکا ہے، فرماتے ہیں کہ: اَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْکِتَابَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ یہ خطاب علمائے یہود سے ہے۔ فرماتے ہیں کہ تم اوروں کو تو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو فراموش کر دیتے ہو، حالانکہ تم کتاب اللہ کو پڑھتے ہو، کیا اتنا نہیں سمجھتے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ایک باپ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتا ہے اور پوری خیر خواہی سے کرتا ہے، لیکن بیٹا دیکھتا ہے کہ باپ کا اس پر عمل نہیں ہے، تو وہ ذرا سا بھی متاثر نہیں ہوتا۔ علماء عوام کو فہمائش کرتے ہیں، وعظوں میں بھی، تحریروں میں بھی، عام گفتگوؤں میں بھی، مگر جب کرنے کا موقع آتا ہے تو بسا اوقات بہت سے علم دین رکھنے والے اور اصطلاحاً عالم کہلانے

والے عملی اعتبار سے اسی سطح پر ہوتے ہیں جس پر ایک عام آدمی ہوتا ہے، بلکہ ایسا بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ کچھ اس سے بھی نیچے اتر جاتے ہیں، تو ایسے لوگ عوام الناس کی زبانوں کے کھلونا بن جاتے ہیں اور اس کا اثر جب عام ہوتا ہے تو پھر کسی کی نصیحت پر کان نہیں دھرتے۔ خواص کو اور علماء و مشائخ کو اپنے طریقۂ زندگی کا اور اپنے کلام کا احتساب کرنا چاہئے اور عوام کے لئے نہیں بلکہ اللہ کے لئے اللہ کا حکم جان کر دونوں میں مطابقت پیدا کرنے کا اہتمام کرنا چاہئے۔ **واللہ الموفق وھو المعین**

(جمادی الاخریٰ ۱۴۲۱ھ / اگست ۲۰۰۰ء)

☆☆☆☆☆

﷽

رمضان کا پیغام

روز وشب کی گردش اپنی ہمیشہ کی رفتار کے مطابق چلتے ہوئے پھر رمضان المبارک کے مقدس مہینہ تک آپہونچی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مہینہ کو اور اس مہینہ کے دن اور اس کی راتوں کو دوسرے دنوں اور راتوں سے ایک خاص امتیاز بخشا ہے۔ یہ نیکیوں کی سوداگری کا مہینہ ہے، اس ماہ میں ہر نیکی اور طاعت کا بھاؤ بڑھا دیا جاتا ہے، اور بڑھانے والا وہ ہے جس کے یہاں لامحدود خزانہ ہے، جس کے یہاں لیت ولعل نہیں ہے، جس کے یہاں بخل وامساک نہیں ہے، جس سے عہد شکنی کا کوئی اندیشہ نہیں ہے، جس کے یہاں سود وزیاں کا کوئی مسئلہ نہیں۔ اس کے دربار سے جو وعدہ صادر ہوتا ہے وہ بڑھ چڑھ کر پورا ہوتا ہے، عالم قدس میں اس مہینہ کا خاص اہتمام ہے، اہل ایمان کی دائمی قیام گاہ ’’جنت‘‘ کو اس ماہ میں نیا رنگ وروغن بخشا جاتا ہے، یہ مہینہ ایمان وعمل کی بادِ بہاری کا مہینہ ہے، اس مہینہ میں صرف آنے والوں کا ہی اعزاز واکرام نہیں کیا جاتا، بلکہ منہ موڑنے والوں کو بھی پکار پکار کر بلایا جاتا ہے، کہ برائی کی طرف دوڑنے والے ٹھہرو، ذرا دیکھو تمہارے لئے کیا کیا انتظام ہے؟

اللہ اللہ! کیا شانِ کریمی ہے کہ جو آقا ہے، خالق ومالک ہے، قادر مطلق ہے، سب کچھ اختیار رکھتا ہے، سب سے بے نیاز ہے، وہ اپنے بندوں کو، غلاموں کو، بندیوں کو، باندیوں کو پکارتا ہے، بلاتا ہے، ان کو بلاتا ہے جو بے بس اور محتاج ہیں، لیکن مالک کی شانِ رحیمی نے ایک محدود اور مختصر سا اختیار بخش دیا ہے، تو اسی کے بل پر لگتے ہیں سرکشی کرنے، انھیں بھاگنے والے غلاموں کو اپنے لطف وکرم سے بلاتا ہے کہ آؤ میں تمہیں معاف کرنے کے لئے تیار ہوں۔

قربان ہونے اور مر مٹنے کا مقام ہے! کہاں ہیں بوجھ سے دبے ہوئے بندے؟ کہاں ہیں آفت کے مارے ہوئے غلام؟ کہاں ہیں روزی سے پریشان بھوکے؟ کہاں ہیں رحم وکرم کی آس لگائے ہوئے مساکین؟ کہاں ہیں زمانے کے ٹھکرائے ہوئے فقراء؟ آئیں، آگے بڑھیں، قریب ہو جائیں، ہاتھ بڑھائیں، دامن پھیلائیں، مانگتے جائیں اور پاتے جائیں، بخشش عام ہے، رحمت تمام ہے، محروم وہی ہے جو اس دریائے فیض کو بھی پا کر محروم رہے، بدقسمت وہی ہے جو رب عالی کی پکار پر بھی سوتا رہے اور اس کی آنکھ نہ کھلے۔

اے دنیاوی آفات میں مبتلا انسانو! تم اپنے مصائب کا علاج اور مشکلات کا حل کہاں ڈھونڈ ھ رہے ہو؟ تمہارے معاملات کا سرا یہاں اس عالم میں نہیں ہے، ان کا سرا عالم غیب میں ہے، عالم غیب ہی کے اشارے پر یہاں سب کچھ ظاہر ہوتا ہے، یہاں کی تدبیریں کچھ نہیں ہیں اگر وہاں کا اشارہ صادر نہ ہو! اپنی جد وجہد کا رخ ادھر ہی پھیر دینے کی ضرورت ہے، عالم غیب تک رسائی اعمال غیب ہی سے ہوتی ہے، خواہ وہ ذکر وعبادت ہو یا حسن سلوک اور اخلاق حسنہ ہوں، یا دعاء ومناجات ہو۔ **إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ** (اسی کی جناب میں کلمۂ طیبہ پہونچتا ہے اور عمل صالح اس کو اوپر اٹھاتا ہے)

کلمۂ خبیثہ (کفر) اور اعمالِ بد تو پستی میں پھینک دئے جاتے ہیں، ان کے لئے آسمان کے دروازے کھولے نہیں جاتے ہیں۔ **إِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَاتُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَايَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ**، بے شک جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان سے تکبر کیا، ان کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور نہ وہ جنت میں داخل ہوں گے، تاوقتیکہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل ہو جائے۔

تو ایمان والو! اصول یہی ہے، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ کلمہ طیبہ اور اعمال صالحہ عالم غیب کے حدود مملکت میں داخلہ پاتے ہیں، ہر الجھاؤ کے سلجھاؤ اور ہر مصیبت سے راحت اور ہر کلفت سے نجات کا واحد راستہ یہی ہے کہ آدمی کے قلب سے، زبان سے، ہاتھ پاؤں

سے، آنکھ کان سے اور جسم وجان سے اچھے اعمال کا صدور ہو۔ یہی اعمال آغوشِ رحمت میں پہونچ کر اس دنیا کے حالات کو درست کرائیں گے، اور اس کے لئے رمضان کا مبارک مہینہ بہت ہی سازگار ہے۔

روزہ کا اہتمام کریں، روزے کو مکروہات سے بچانے کا اہتمام کریں، یہ عبادت دن کی ہمہ وقت عبادت ہے، اس کو فضولیات اور گناہ کے کاموں میں مبتلا ہوکر برباد اور بے روح نہ بنائیں، دنیاوی کاموں کو گھٹا کر عبادت کے کاموں کو بڑھادیں، قرآن کریم کی تلاوت، ذکر اللہ کی کثرت، مساجد میں حاضری اور تراویح کی پابندی کا اہتمام کریں۔ ہوسکتا ہے کہ یہی محنت سال بھر کی برکتوں کو سمیٹ کر آپ کے دامن میں ڈال دے، اور پھر پورے سال اس سے آپ مستفید ہوتے رہیں، یہ تجربہ ہے کہ اعمال خیر کے اعتبار سے جس کا رمضان بخیر وعافیت گزر گیا وہ پورے سال اس خیر وعافیت کا فائدہ پاتا رہتا ہے۔

(شعبان، رمضان ۱۴۲۱ھ/نومبر، دسمبر ۲۰۰۰ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رمضان شریف اور قرآن شریف کی مناسبت

شب وروز سب اللہ کے ہیں، ماہ وسال سب اللہ کے ہیں، اوقات ولمحات سب اللہ کے ہیں، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ سب اوقات برابر نہیں ہیں۔ اللہ نے جس طرح فرشتوں میں، آدمیوں میں، زمینوں میں، آسمانوں میں انتخابات فرمائے ہیں، اسی طرح اللہ نے زمانوں میں بھی انتخاب فرمایا ہے۔ قدوسیوں کی سب سے عظیم القدر جماعت انبیاء علیہم السلام میں بھی حق تعالیٰ نے انتخاب کا عمل جاری فرمایا ہے، چنانچہ ارشاد ہے: تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ مِنْھُمْ مَنْ کَلَّمَ اللّٰہُ وَرَفَعَ بَعْضَھُمْ دَرَجٰتٍ وَآتَیْنَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ وَأَیَّدْنٰہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (سورۃ البقرۃ: ۲۵۳) یہ وہ رسول ہیں جن میں سے ہم نے بعض کو بعض کے اوپر فوقیت بخشی ہے، بعض ان میں وہ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ ہم کلام ہوئے، اور بعضوں کو ان میں سے بہت سے درجوں سے سرفراز فرمایا، اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو واضح دلائل عطا کئے، اور ہم نے ان کی مدد روح القدس سے کی۔

ٹھیک اسی طریقے سے اللہ تعالیٰ نے بہت سی کتابیں نازل فرمائیں، ان میں سے چار کو دین وشریعت کے اجراء وقیام کے لئے منتخب فرمایا، پھر ان چار میں سے تین کو منسوخ فرما کر ایک آخری جامع کلام اپنے آخری پیغمبر خاتم النبین ﷺ پر نازل فرما کر قیامت تک کے لئے اس کو زندہ جاوید، صحیح اور بلا ریب دستور العمل بنا دیا۔

قرآن مجید کلام اللہ ہے، کلام الٰہی کا تعلق ذاتِ الٰہی کے ساتھ صفت کا ہے، صفات ذات کا آئینہ ہوتی ہیں، وہ ذات سے علیٰحدہ کوئی چیز نہیں ہوتیں، صفات کے آئینے میں ذات کا جلوہ دکھائی دیتا ہے، وللہِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنیٰ، اللہ کے بہتر سے بہتر نام ہیں، یہ اسماء

صفاتِ الٰہی کے ترجمان ہیں، تو کلام الٰہی، اللہ تعالیٰ کے ذاتی اسماء وصفات میں ہے، جو حق تعالیٰ کے تمام ذاتی اور صفاتی کمالات کا جامع ہے، اور ظاہر ہے کہ کمالات خداوندی کی کوئی حد وانتہاء نہیں ہے، تو جو چیز ان کمالات کا آئینۂ جامع ہے، اس کے بھی کمال وجمال کی کوئی انتہاء نہ ہوگی، پس کلام الٰہی اس کائنات کی عظیم جلوہ گاہ ہے، جس کے واسطے سے حق تعالیٰ کی ذات عالی اور صفات جلالی وجمالی کا مشاہدہ ہوسکتا ہے۔

پھر جب اس آئینۂ جمال وجلال کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر نازل کرنے اور بندوں کو اس سے مشرف فرمانے کا ارادہ کیا، تو حق تعالیٰ نے تین انتخابات فرمائے، کس پر اتارا جائے ؟ کون اسے لیکر جائے ؟ اور اس کے لئے مناسب وقت کیا ہوگا ؟ کس پر اتارا جائے ؟ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس ذات کا انتخاب کیا، جس کو انھوں نے خود سارے عالم کے لئے رحمت بنایا۔ بہترین قلب وطبیعت سے نوازا، خصوصی تہذیب وتربیت سے آراستہ کیا، ہر آلائش طبعی وبشری سے پاک رکھنے کا اہتمام فرمایا۔ پھر وہ شخصیت ایسی نکھر کر سامنے آئی کہ دنیا بول پڑی: **ھٰذا ھو الصادق الامین**، صدق وامانت انسانیت کا وہ عظیم ترین شرف ہے، جس سے بڑھ کر کوئی شرف عام انسانوں کو نہیں حاصل ہوسکتا۔ مکہ کی گلیوں میں چلتا پھرتا انسان، خانۂ کعبہ کی دیواروں پر نگاہیں ڈالتا انسان، حراء پہاڑی کی کھوہ میں غور وفکر کرتا ہوا بے چین انسان، اس وقت بھی تمام عیوب اخلاقی وانسانی سے پاک تھا۔ جب ابھی اس کا منتخب ہونا خلائق پر ظاہر نہیں ہوا تھا۔ چالیس سال تک یہ انسان بہترین تعلیم وتربیت سے گزرتا ہوا پختہ ہوتا رہا۔ اب اس پر رب عظیم کا کلام عظیم اترنا تھا۔ اسے کون لائے ؟ تو اللہ تعالیٰ نے پاک اور مقدس برگزیدہ جماعت، جس کے بارے میں وہ خود گواہی دے رہے ہیں کہ: **لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ أَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ** ۔ اللہ کے حکم سے ذرا بھی نافرمانی نہیں کرتے، اور جو حکم پاتے ہیں ٹھیک وہی کرتے ہیں ۔ اس مقدس ترین جماعت میں وہ منتخب ہوا جو صاحب امانت بھی تھا، سب سے عظیم طاقت کا مالک بھی، خداوند تعالیٰ کے قریب تر تھا، **عَلَّمَهٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی ذُوْ مِرَّةٍ** (سورۃ النجم: ۶/۵) اس وحی الٰہی کی تعلیم

ایک فرشتہ کرتا ہے، جو بڑا طاقتور ہے، خلقۃً طاقتور ہے۔ إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ذِىْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِى الْعَرْشِ مَكِيْنٍ، مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ (سورة التكوير :۱۹تا۲۱) یہ قرآن کلام (الٰہی) ہے، ایک معزز فرستادہ کا لایا ہوا ہے، جو قوت والا ہے، مالک عرش کے نزدیک رتبہ والا ہے، وہاں اس کی اطاعت کی جاتی ہے، وہ صاحب امانت ہے۔ یہ معزز فرشتہ روح امین ہے، جبرئیل امین ہے۔

کس پر اترے؟ وہ منتخب ہوا، کون اتارے؟ وہ منتخب ہوا۔ اب ماہ وسال کے وہ کون سے اوقات ہیں جن کو اس کلام عظیم سے مناسبت ہے، تاکہ اس کا انتخاب ہو، اللہ ہی پیدا کرتے ہیں، وہی انتخاب فرماتے ہیں، يَخْلُقُ مَايَشَاءُ وَيَخْتَارُ، اللہ نے سال کے بارہ مہینوں پر نظر ڈالی، اور شعبان کے مہینے کو اپنے بندوں سے خاص مناسبت بخشی، بندوں کے سب سے بڑے رازداں ﷺ نے اس راز کو پایا، اور شعبان کو خصوصی عبادات ومعاملات کے لئے مختص فرمایا، چنانچہ بکثرت احادیث میں آیا ہے کہ آپ اس ماہ میں کثرت سے روزہ رکھتے، فرمایا: یہ رجب اور رمضان کے درمیان ایک ایسا مہینہ ہے، جس سے لوگ غافل ہیں، حالانکہ اس ماہ میں رب العالمین کے حضور بندوں کے اعمال پہونچائے جاتے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ میرا عمل جب وہاں لیجایا جائے، تو میں روزہ کی حالت میں ہوں (نسائی) حضرت انس بن مالک ؓ فرماتے ہیں کہ حضرت کو شعبان کا روزہ بہت محبوب تھا (احمد وطبرانی) حضرت انس ؓ ہی فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ رمضان کے بعد کون سا روزہ افضل ہے؟ فرمایا شعبان، رمضان کے اظہارِ عظمت کے لئے۔ اس مضمون کی روایتیں بکثرت ہیں، علامہ عبدالعظیم بن عبدالقوی المنذری نے اپنی جامع ترین کتاب ”الترغیب والترھیب“ کے کتاب الصوم میں ان میں سے اکثر کو جمع کر دیا ہے، ہم نے اس مضمون میں یہ حدیثیں انھیں سے اخذ کی ہیں۔

ماہِ شعبان کی فضیلت کو بندوں سے مناسبت تھی، اس لئے سیّد العباد ﷺ نے اس کا اہتمام کیا، اس کے بعد جو مہینہ آیا اسے خود رب العباد جل جلالہ نے اپنے لئے انتخاب فرمایا۔

رمضان شریف کے بارے میں امام فخر الدین رازیؒ نے تفسیر کبیر میں مشہور تابعی حضرت مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ رمضان اللہ تبارک وتعالیٰ کا ایک نام ہے، تو شہر رمضان کا معنیٰ ''اللہ کا مہینہ'' ہے، انھوں نے ایک روایت نقل کی ہے: **روی عن النبی ﷺ أنه قال: لاتقولوا جاء رمضان وذهب رمضان ولكن قولوا جاء شهر رمضان وذهب شهر رمضان فإن رمضان اسم من أسماء الله تعالىٰ** (ج:۳،ص:۹۰) آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ مت کہو کہ رمضان آیا، رمضان گیا، بلکہ یہ کہو رمضان کا مہینہ آیا، رمضان کا مہینہ گیا، کیونکہ رمضان اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ شعبان کے آغاز سے زمانہ کی برکتوں نے ترقی کی اور اس کا نقطۂ عروج ماہ رمضان ہوا، سیدنا مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی اپنے مکاتیب میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

> ''ماہ مبارک رمضان جامع جمیع خیرات وبرکاتست، وہر خیر وبرکت مفاض از حضرت ذات ست تعالیٰ وتقدس ونتیجۂ شیونات اوسبحانہ، وہر شر ونقص کہ بوجود می آید منشا آن ذات وصفات محدثہ است، **ما أصابك من حسنةٍ فمن الله وأصابك من سيئةٍ فمن نفسك**، خود نص قاطع است، پس جمیع خیرات وبرکات ایں ماہ مبارک نتیجۂ آں کمالات ذاتیہ است کہ شانِ کلام جامع آنہا ست، وقرآن مجید حاصل تمام حقیقت آں شان جامع ست، پس ایں ماہ مبارک را با قرآن مجید مناسبت تمام ست کہ قرآن جامع جمیع کمالات ست، وایں ماہ جامع خیرات کہ نتائج وثمرات آں کمالاتند، وہمیں مناسبت باعث نزول قرآن دریں ماہ شد، شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىْ أُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ وشب قدر دریں ماہ خلاصۂ وزبدۂ ایں ماہ است، آں لب است وایں ماہ در رنگ قشر آں، پس ہر کہ دریں ماہ بجمعیت گزراند واز خیرات وبرکات بہرہ مند شود، تمام سال بجمعیت گزراند وبخیر وبرکت مملو ومحتوی باشد (مکتوب:۱۶۲، دفتر اول)

ترجمہ: رمضان کا بابرکت مہینہ تمام بھلائیوں اور برکتوں کا جامع ہے، اور جو بھی خیر

> وبرکت اس میں ہے، سب کا فیضان حضرت ذات حق تعالیٰ وتقدس سے ہے، اور ذات ہی کے مختلف شیون کا ثمرہ ہے، کیونکہ شر ونقص کا جو کچھ وجود ہے، وہ مخلوق کی ذات سے وابستہ ہے، چنانچہ ارشاد ہے: **ما أصابک من حسنةٍ فمن الله وأصابک من سيئةٍ فمن نفسک**، جو کچھ تمہیں بھلائی پہونچے وہ اللہ کی طرف سے ہے، اور جو کچھ تمہیں برائی پہونچے وہ خود تمہاری ذات کی طرف سے ہے، یہ نص قطعی ہے، پس اس ماہ مبارک کی تمام بھلائیاں اور تمام برکتیں، اللہ تعالیٰ کے کمالات ذاتیہ کے ثمرات ہیں، اوران تمام کمالاتِ ذاتیہ کی جامع اس کے کلام کی شانِ عالی ہے، اورقرآن مجید اس شان جامع کی تمام حقیقتوں کا جامع ہے، پس اس ماہ مبارک کوقرآن مجید کے ساتھ پوری مناسبت ہے، کیونکہ قرآن کریم تمام کمالات کا جامع ہے، اور یہ ماہ مبارک ان تمام بھلائیوں اور سعادتوں کا جامع ہے، جوان کمالات کے ثمرات ونتائج ہیں، اور یہی مناسبت ہوئی کہ اس ماہ مقدس میں قرآن کریم کا نزول ہوا۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ أُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْآنُ۔ پھراس ماہ کا خلاصہ اور حاصل شب قدر ہے، وہ مغز ہے اور یہ مہینہ اس مغز کیلئے گویا چھلکا ہے، پس جو کوئی اس ماہ کو جمعیت اور یکسوئی کے ساتھ گزارے گا اور اس ماہ کی خیرات وبرکات سے بہرہ مند ہوگا، وہ پورا سال جمعیت اور اطمینان کے ساتھ گزارے گا، اور خیر وبرکت سے بھراپُرا رہے گا۔
> (مکتوب: ۱۶۲، دفتر اول)

حضرت مجدد صاحب قدس سرہٗ نے قرآن مجید اور رمضان شریف کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے، اسے بغور پڑھئے، جو کچھ قرآن وحدیث میں ان دونوں کے بارے میں ذکر آیا ہے، اس کا خلاصہ انھوں نے مختصر الفاظ میں ذکر کردیا ہے۔

(۱) پہلی بات یہ فرمائی کہ رمضان المبارک کا مہینہ انسانوں کے حق میں بلکہ کائنات کے حق میں تمام بھلائیوں اور برکتوں کا جامع ہے۔ امام بخاریؒ ومسلمؒ نے اپنی اپنی کتاب میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **إذا جاء**

رمضان فتحت ابواب الجنة وغلقت ابواب النار وصفدت الشياطين ، جب رمضان کا مہینہ آتا ہے، تو جنت کے دروازے کھول دئے جاتے ہیں، اور جہنم کے دروازے بند کردئے جاتے ہیں، اور سرکش شیاطین کو بیڑیوں میں جکڑ دیا جاتا ہے، اور یہ معلوم ہے کہ ہر خیر کا مرکز جنت ہے، اور ہر شر کا مجمع جہنم ہے، اور تمام برائیوں کی بنیاد شیطان ہے، پس ماہ مبارک رمضان بنص حدیث تمام بھلائیوں اور برکتوں کا جامع ہے۔

(۲) دوسری بات یہ فرمائی کہ دنیا وآخرت میں جو بھلائی ہے، اور جو بھی برکت ہے، سب کا فیضان ذات الٰہی جل شانہ سے ہے، کیونکہ حق تعالیٰ کی ذات شر ونقص سے پاک ہے، شر اور نقص کا منبع تو وہ ہے، جس میں عدم کی کیفیت پائی جاتی ہے، اور حق تعالیٰ ہر قسم کے عدم سے منزہ ہیں، پس جو کچھ خیر ہے انھیں کی طرف سے ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: **ما أصابک من حسنةٍ فمن الله وماأصابک من سيئةٍ فمن نفسک**، جو کچھ تمہیں بھلائی پہونچے وہ اللہ کی طرف سے ہے، اور جو کچھ تمہیں برائی پہونچے وہ خود تمہاری ذات کی طرف سے ہے۔

(۳) تیسری بات یہ فرمائی کہ رمضان شریف کی تمام برکتیں اور خوبیاں اللہ تعالیٰ کے ان تمام ذاتی کمالات کے ثمرات ہیں، جن کا جامع اللہ کا کلام ہے، کیونکہ متکلم کی تمام خوبیاں اس کے کلام میں جلوہ گر ہوتی ہیں، پس کلام اللہ ان تمام کمالات ذاتیہ کا جامع اور مظہر ہے۔

(۴) چوتھی بات یہ ہے کہ کلام الٰہی میں قرآن مجید کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ جمال وکمال کے تمام حقائق کا مرکز اور جامع ہے، کیونکہ یہ آخری کلام ہے، جو دنیا والوں کو دیا گیا ہے، پس ضروری ہے کہ حق تعالیٰ کے تمام شئونات کمالیہ وجمالیہ کا جامع ہو۔ **لَوْ أَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهٗ خَاشِعاً مُتَصَدِّعاً مِّنْ خَشْيَةِ اللهِ**، اگر ہم اس قرآن کو پہاڑوں پر اتارتے، تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کی خشیت سے دب جاتے، شق ہوجاتے۔ یہ اس کی شانِ عظمت ہے۔ اور **إِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ أَقْوَمُ**، اور بلاشبہ یہ قرآن اسی راہ کی رہنمائی کرتا ہے، جو بالکل درست ہے۔ یہ اس کی شانِ ہدایت ہے۔ اور **ذٰلِکَ**

الْكِتَابُ لَارَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ، یہ کتاب اس میں کوئی تردد اور شک نہیں، کہ اہل تقویٰ کے لئے دستور العمل ہے۔ یہ اس کی شانِ صداقت وحقانیت ہے۔

(۵) پھر یہ فرمایا کہ جب رمضان شریف برکات الٰہیہ کا مرکز ہے، اور قرآن کریم کی بھی یہی شان جامعیت ہے، تو دونوں میں بغایت مناسبت ہے، اس لئے اس کلام عظیم کو نازل کرنے کیلئے یہی مہینہ منتخب ہوا، اور یہ نزول لوح محفوظ سے آسمان دنیا کی طرف ہے، آسمانِ دنیا پر آ گیا تو گویا اس کے انوار سے دنیا جگمگا اٹھی، پھر وقتاً فوقتاً حسب ضرورت وہاں سے جبرئیل امین لاتے رہے۔

(۶) پھر پورے رمضان کا خلاصہ اور حاصل شب قدر ہے، لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ شب قدر ایک ہزار مہینوں سے بہتر ہے، اور نزول قرآن کے لئے یہی رات متعین ہوئی، إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ، ہم نے اسے شب قدر میں اتارا ہے۔

اتنی گونا گوں فضیلتوں اور عظمتوں کا تقاضا ہے کہ یہ پورا مہینہ روزے اور قرآن کے لئے وقف کر دیا جائے، روزے کی برکت سے انسان بشری کمزوریوں سے اوپر اٹھ کر ملکوتیت کی پاک صفات سے آراستہ ہونے کی استعداد حاصل کر لے گا، کیونکہ بشری کمزوریوں کی بنیاد کھانے پینے کی بھوک پیاس، اور شہوت کی طرف میلان ہے، روزہ کی حالت میں یہ سب چیزیں اعتدال پر آ جاتی ہیں، اور روزہ دار میں بارگاہِ خداوندی کی جانب پرواز کی صلاحیت ہو جاتی ہے، جب یہ صلاحیت پیدا ہوگئی، تو اب قرآن مجید کی تلاوت اسے بارگاہِ خداوندی میں پہونچا دیتی ہے، اس لئے دن میں روزہ اور رات میں تراویح، جس میں قرآن کی تلاوت اس کو بارگاہِ قدس تک بآسانی پہونچا دیتی ہے، اور بندہ اپنے مقصود میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

* * *

قرآن وحدیث کی تصریح اور سیّدنا مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ کی توضیح سے رمضان شریف اور قرآن شریف کی مناسبت خوب معلوم ہوگئی۔ یہ مناسبت تو نزولِ قرآن کے سلسلے

میں بیان کی گئی، اب سنئے کہ اس مناسبت کا تقاضا یہ ہے کہ رمضان شریف کے اوقات کو جس طرح روزہ سے معمور رکھنا اور روشن کرنا ضروری ہے، اسی طرح قرآن کریم کی تلاوت سے بھی ان ایام کو پیکرِ حسن و جمال بنانا ضروری ہے۔

قرآن کریم اور روزہ میں باہم جو تعلق اور مناسبت ہے اسے اس حدیث کی روشنی میں دیکھئے جسے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے حضور اکرم ﷺ سے نقل کیا ہے، آپ نے فرمایا: **الصیام والقرآن یشفعان للعبد یوم القیامة**، روزہ اور قرآن دونوں قیامت کے دن بندے کی شفاعت کریں گے۔ **یقول الصیام: ای رب! منعته الطعام والشهوة فشفعنی فیه**، روزہ کہے گا، اے میرے پروردگار! میں نے اسے کھانے اور شہوت سے روک دیا تھا، تو آپ اس کے حق میں میری شفاعت سن لیجئے۔ **ویقول القرآن منعته النوم باللیل فشفعنی فیه**، اور قرآن کہے گا کہ میں نے رات میں سونے سے روک دیا تھا، تو اس کے بارے میں میری شفاعت قبول فرمائیے۔ **قال: فیشفعان**، آپ ﷺ نے فرمایا کہ تب ان دونوں کی شفاعت مقبول ہوگی۔

گویا روزہ اور قرآن دونوں رفیق و ہمدم ہیں، جو کام ایک نے کیا وہی دوسرے نے بھی کیا، پس بندوں کو بھی چاہیئے کہ ان دونوں کو ایک ساتھ رکھیں اور اس کا بہترین موقع رمضان کا مہینہ ہے، رمضان المبارک ہر خیر و برکت کا مرکز ہے، اور روزہ فرشتوں کی صف میں پہونچانے والا، روزِ قیامت کا بہترین شفاعت گزار! اور قرآن کریم کا کیا کہنا، تمام شیوناتِ الٰہیہ اور صفاتِ کمالیہ کا آئینہ! بندہ ظاہر و باطن میں سراپا نور ہو جائے۔

رمضان شریف میں قرآن کریم کی تلاوت میں مشغولیت تین طرح سے ہوسکتی ہے۔ اول تراویح، دوسرے دور، تیسرے عام تلاوت۔ تراویح کی نماز کو تو اللہ تعالیٰ نے نفل قرار دیا ہے، حضرت سلمان فارسی ؓ نے حضرت رسول کریم ﷺ کا ایک بلیغ اور موثر خطبہ نقل کیا ہے، اس میں ایک جملہ یہ ہے: **شهر جعل الله صیامه فریضة وقیام لیله تطوعاً** (رواہ ابن خزیمہ فی صحیحہ) یہ وہ مہینہ ہے جس کے روزے کو اللہ نے فرض کیا ہے، اور

جس کی رات کے قیام (تراویح) کو نفل بنایا ہے۔

نیز رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: **من قام رمضان ایمانا و احتسابًا غفرله ماتقدم من ذنبه** (بخاری و مسلم، ابوداؤد، ترمذی و نسائی) جو کوئی رمضان میں ایمان کے تقاضے سے بہ نیت حصول ثواب عبادت کے لئے کھڑا ہو، اس کے پچھلے گناہ معاف۔

تراویح کی نماز کا موضوع تلاوت کلام الٰہی ہی ہے، چنانچہ قیام کا لفظ خود بتا رہا ہے کہ اس میں کھڑا ہونا ہی اصل ہے، اور معلوم ہے کہ قیام کی حالت میں قرآن پاک کی تلاوت ہی متعین ہے، پس مناسب ہے، بلکہ ضروری ہے کہ دن اگر روزہ میں بسر ہوا ہے کہ اس کی وجہ سے دن کا لمحہ لمحہ کامل عبادت بن گیا ہے، تو رات کے وقت میں جبکہ اس وقت میں روزہ نہیں ہے نماز اور تلاوت سے اسے معمور اور آباد رکھا جائے۔ حق تو یہ تھا کہ جس طرح رمضان شریف کے دن کی عبادت فرض ہے اسی طرح رات کی عبادت بھی فرض ہوتی، تاکہ چوبیس گھنٹے کے یہ دونوں حصے برابر ہوتے اور سال کا یہ ایک مہینہ تو ایسا ہوتا کہ نورانیت اور عبادت کی روحانیت میں روز و شب دونوں ایک جیسے ہوتے، مگر حق تعالیٰ نے بندوں کے ضعف پر نظر فرمائی اور رات کی عبادت کو بجائے فرض کے نفل قرار دیا، لیکن نفل کیسی؟

عام دنوں جیسی؟ نہیں، فرماتے ہیں: **من تقرب فيه بخصلة من الخير كان كمن ادى فريضة فيما سواه** (حوالہ سابق) اس ماہ میں جو کوئی نفل عمل کیا جاتا ہے، وہ ایسا ہے جیسے اس کے علاوہ کسی ماہ میں فرض ادا کیا ہو۔ اور تراویح تو جس شان کی عبادت ہے، قریب تھا کہ فرض ہی ہو جاتی، چنانچہ بخاری شریف کی متعدد روایات میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ رمضان شریف کی ایک رات مسجد میں تشریف لائے اور آپ نے نفل نماز پڑھی، آپ کے ساتھ صحابہ کی ایک جماعت بھی نماز میں شامل ہوگئی، جب صبح ہوئی تو اس نماز کا شہرہ ہوا، اب دوسری رات اس سے زیادہ مجمع ہوا، تیسرے دن مزید چرچا عام ہوا، اور رات میں نمازیوں کا زیادہ ہجوم ہوا، جب چوتھی رات ہوئی تو آپ تشریف نہیں لائے، صحابہ صبح تک انتظار کرتے رہے اور ساری مسجد بھری رہی، باہر تک آدمی تھے، آپ فجر کی نماز کے لئے باہر

نکلے، نماز فجر کے بعد آپ نے لوگوں کو خطاب کیا اور فرمایا:

أما بعد ! فانه لم یخف علی مکانکم ولکنی خشیت أن تفرض علیکم فتعجزوا عنها ،تمہارا رات میں یہاں ہونا مجھ پر مخفی نہ تھا، لیکن میں ڈرا کہ یہ نماز تم پر فرض نہ کردی جائے، اور اس کے بعد تم سے اس کی ادائیگی نہ ہو سکے، اس لئے میں باہر نہ آیا۔ (صلوٰۃ التراویح)

جس نماز کی یہ شان ہو، کون کہہ سکتا ہے کہ درجہ اور رتبہ کے اعتبار سے وہ عند اللہ فرض سے کم ہوگی، مزید اگر تراویح کی نماز پر نظر عمیق ڈالی جائے، تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ سال بھر کی فرض وواجب نماز کی مثنیٰ ہے، یا یہ کہہ لیجئے کہ رمضان شریف کی برکت سے سال بھر کی نماز اس ماہ میں دوگنی کردی گئی ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ رمضان میں روزہ کی فرضیت کے ساتھ تلاوت کی کثرت بھی مطلوب ہے، اور تلاوت کا اصل محل نماز ہے، تو ضروری ہوا کہ نماز میں بھی اضافہ کیا جائے، ہم نے غور کیا کہ عام دنوں میں روزانہ کتنی رکعتیں فرض اور واجب ہیں؟ تو معلوم ہوا کہ شب وروز میں بیس رکعتیں ہیں۔ دو رکعت فجر، چار رکعت ظہر، چار رکعت عصر، یہ دن کی نمازیں ہیں۔ اللہ کو وتر پسند ہیں، اس لئے مغرب میں تین رکعت فرض کر کے ان ساری نماز کو طاق بنادیا گیا، یہ کل تیرہ رکعتیں ہوئیں، رات میں عشاء کی چار رکعتیں فرض ہیں، اس کے ساتھ وتر ہونا فوت ہو رہا تھا تو اس میں بطور وجوب کے تین رکعت کا اضافہ کردیا گیا، اب رات کی نماز بھی وتر ہوگئی، اس طرح کل بیس رکعتیں ہوئیں، پھر مناسب ہوا کہ یہی بیس رکعتیں رمضان شریف کی برکتیں حاصل کرنے کے لئے دہرادی جائیں، چنانچہ تراویح کی نماز کا بیس رکعت ہونا غالبًا اسی کی طرف اشارہ ہے، عام دنوں میں مسلمان بطور فرض وواجب کے بیس رکعت چوبیس گھنٹے میں پڑھتے ہیں، تو رمضان شریف میں جبکہ عبادت کا ذوق بڑھ جاتا ہے، یہ بیس رکعتیں دوبارہ پڑھ لی جائیں۔

میں نے عرض کیا تھا کہ نماز تراویح کا اصل موضوع قرآن کی تلاوت ہے، پس

امت کے تعامل نے تراویح کی بیس رکعتوں میں ایک قرآن پاک کی تکمیل کا معمول بنایا، تا کہ ہر مسلمان کے حق میں ایک ختم کا اس ماہِ مبارک میں اہتمام وانتظام ہو جائے۔

سوال! قرآن پاک کی تلاوت تو صرف امام کرتا ہے تو اس کا تو ایک ختم ہوا۔ مقتدیوں کا کیونکر ہوگا؟ جواب! قربان جایئے حق تعالیٰ کی شانِ رحمت وحکمت کے، اور فدا ہویئے نبی کریم ﷺ کی شفقت ومہربانی پر! آپ نے امت کے لئے ہر خیر کا انتظام فرما دیا ہے، آپ جانتے تھے کہ آپ کی امت کا ہر فرد پڑھا لکھا نہ ہوگا اور نہ ہر ایک کا حوصلہ ہوگا کہ وہ کتاب اللہ حفظ کرے اور اسے تراویح کے اندر پورا پڑھے، پس عالم غیب کے راز داں نے حکم الٰہی کا اشارہ پا کر ایک ایسا قانون بنا دیا کہ ہر پڑھا لکھا اور اَن پڑھ اس سے یکساں مستفید ہو۔

متعدد صحابۂ کرام مثلاً حضرت انس بن مالک، عبد اللہ بن عمر، ابوسعید خدری، ابوہریرہ، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے یہ مضمون منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: **من کان له امام فقرأة الامام له قرأة** (نصب الرایہ مع الہدایہ، ج:۲، ص:۱۲) جس کا کوئی امام ہو تو امام کی قرأت اس مقتدی کی بھی قرأت ہے۔ حدیث کا یہ مضمون بالکل صحیح ہے، اس سے معلوم ہوا کہ امام جو کچھ پڑھتا ہے وہ مقتدی کا پڑھنا لکھا جاتا ہے، پس نماز تراویح میں جو لوگ امام کے پیچھے ہوتے ہیں ان کے نامۂ اعمال میں بھی قرآن کریم کی تلاوت درج کی جاتی ہے، نماز کے اندر قرآن کریم کی تلاوت بہت اہمیت رکھتی ہے، ثواب میں فرض کے برابر ہے، رمضان شریف خود پُرنور ہے، اس کے دن میں روزہ اور رات میں کلام الٰہی کی تلاوت نورٌ علیٰ نور کا سماں ہے۔

تلاوت کا دوسرا طریقہ دور کا ہے، اس طریقے کا آغاز سیّد الملائکۃ حضرت جبرئیل علیہ السلام سے ہوا ہے، صاحب تفسیر مظہری نے علامہ بغوی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ داؤد بن ابی ہند کہتے ہیں کہ میں نے امام شعبی سے عرض کیا کہ قرآن کا نزول ماہِ مبارک رمضان میں ہوا ہے، تو کیا سال کے دوسرے اوقات میں اس کا نزول نہیں ہوتا تھا، فرمایا کیوں نہیں،

پورے سال ہوتا رہتا تھا، لیکن رمضان میں نازل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ پورے سال میں جتنا اتر چکا ہوتا تھا، جبرئیل امین رمضان شریف میں اسے دوبارہ آپ کو سناتے تھے اور آپ انھیں سناتے تھے، پھر جو اللہ کو منظور ہوتا باقی رکھا جاتا، اور جو چاہتے اسے منسوخ کر دیا جاتا۔ (ج:۱، ص:۱۹۴)

رمضان شریف میں تلاوت کی ایک بہار یہ بھی ہے کہ دو حافظ اکٹھے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کو سناتا ہے، پھر اپنی اپنی تراویح میں دونوں پڑھتے ہیں، اس کے بعد صاحب توفیق ہوتے ہیں تو تہجد میں بھی تلاوت کرتے ہیں۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ حفاظ ہوں یا ناظرہ خواں، ترتیب سے قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہین، اور کئی کئی ختم پڑھتے ہیں، رمضان شریف میں اللہ کا فضل ہے، تلاوت کی خوب بہار ہوتی ہے، مردہ سے مردہ قلب اس ماہِ مبارک میں اچھا خاصا زندہ ہو جاتا ہے، حق تعالیٰ توفیقات سے نوازتے ہیں، دعائیں قبول کرتے ہیں، فرشتوں کو بھیجتے ہیں کہ وہ عبادت گزاروں کی خلوتیں میں پہونچیں، ان سے مصافحہ کریں، ان کے لئے دعائیں کریں۔ خوش نصیبی کا یہ مہینہ ہر مسلمان کے لئے مبارک ہو۔ **وفقنا اللہ سبحانہ للخیرات والبرکات فی ھٰذا الشھر المبارک ورزقنا اللہ سبحانہ النصیب الاعظم۔**

(ستمبر ۲۰۰۸ء)

◉◉◉◉◉

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بدنیتی کا خمیازہ

۲۶/جنوری (۲۰۰۱ء) کو حکومت ہند فرضی اور وہمی دہشت گردوں سے لرزاں وترساں تھی، ان سے نمٹنے کے انتظامات چوکس کردیئے گئے تھے، یہ سارا خوف فرضی تھا، لیکن جو واقعی خطرہ تھا اس سے سب کی آنکھیں بند تھیں، قدرتِ الٰہی نے زمین کو جھٹکا دیا اور بے شمار انسان، ہزاروں مکان اور اربوں کھربوں کا مال زمین کے اندر چلا گیا، اب ہمارا وزیر اعظم غل مچا رہا ہے کہ قدرتی آفات کا ہم مقابلہ کریں گے۔ اللہ جانے سب کچھ کھو کر کس کا مقابلہ وہ کرے گا۔ بی جے پی حکومت اور بی جے پی پارٹی سخت بدنیت ہے، اس کی بدنیتی اور بداعمالیوں کی سزا تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ملک کو اور ملک کے باشندوں کو مل رہی ہے، یہ پبلک کو تنبیہ ہے کہ ایسی بدنیت اور بدعمل پارٹی کو کیوں اپنے اوپر مسلط کیا۔ اب یہ حکومت باتیں بنارہی ہے، لیکن اس سے کیا ہوتا ہے، سب کچھ کھو کر کوئی پکارے کہ میں مقابلہ کروں گا، لڑوں گا تو اس کی دماغی حالت مشتبہ قرار پائے گی۔ یہ ایک قدرتی تنبیہ ہے کہ ملک کی عوام اب سے سنبھل جائے اور بی جے پی اور اس پارٹی کو حلقۂ حکومت سے نکال باہر کرے، ورنہ حکمرانوں کی بدنیتی سارے ملک کو تباہی کے دہانے پر کھڑا کردیتی ہے۔

خاص طور سے مسلمانوں کے لئے جو اللہ پر اور اس کی قدرت پر سچا ایمان رکھتے ہیں، ایک تازیانۂ عبرت ہے، وہ ریڈیو سن کر، ٹی وی دیکھ کر، اخبارات پڑھ کر چند جملے اظہار تاسف کے بول کر بے پرواہ نہ ہوجائیں بلکہ اپنے مالک ومولیٰ کی جانب رجوع کریں، اور ایک مزاج بنائیں اور ایک دھن پیدا کریں کہ وہ قادر مطلق جس کا ایک ادنیٰ سا اشارہ پاکر زمین جیسی مضبوط ترین مخلوق زیروزبر ہوکر رہ گئی اور کوئی اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا، اس سے

ڈریں، اس کی نافرمانی سے بچیں، اس کی شریعت کو اپنا دستور العمل بنائیں، اس کے سامنے گریہ وزاری کریں، اپنے گناہوں کی معافی چاہیں۔

اللہ تعالیٰ کا قہر وجلال گناہوں پر ہی برستا ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے متعدد قوموں کا اور ان کے انبیاء کا تذکرہ کیا ہے، ہر جگہ ایک ہی مضمون ہے کہ جب لوگوں نے حد سے زیادہ سرکشی اور نافرمانی کی، تو عذاب کا کوڑا دنیا میں لگنے لگا، حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ: **اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِعَادٍ اِرَمَ ذَاتِ الَّتِیْ لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُھَا فِی الْبِلَادِ وَثَمُوْدَ الَّذِیْنَ جَابُوْا الصَّخْرَ بِالْوَادِ وَفِرْعَوْنَ ذِیْ الْاَوْتَادِ الَّذِیْنَ طَغَوْا فِی الْبِلَادِ فَاَکْثَرُوْا فِیْھَا الْفَسَادَ فَصَبَّ عَلَیْھِمْ رَبُّکَ سَوْطَ عَذَابٍ اِنَّ رَبَّکَ لَبِالْمِرْصَادِ۔**

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے رب نے عاد کے ساتھ کیا کیا، جو ارم میں تھے، بڑے ستونوں والے کہ ان جیسے لوگ شہروں میں نہیں پیدا ہوئے، اور ثمود کے ساتھ کیا کیا، جنھوں نے پہاڑیوں وادیوں میں چٹانیں تراش کر مکانات بنائے تھے، اور فرعون کے ساتھ کیا کیا، جو بڑے لاؤ لشکر والا تھا، یہ لوگ وہ تھے جنھوں نے اپنے اپنے ملکوں میں سر اٹھایا تھا اور ان میں بڑی خرابی پیدا کر رکھی تھی، پھر تمہارے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسا دیا، بلاشبہ تمہارا رب گھات میں ہے۔

سرکشوں اور شر پسندوں کے سلسلہ میں یہ ایک دائمی صداقت ہے، جس کو کبھی تاریخ جھٹلا نہیں سکتی، کہ جب شرارت بڑھتی ہے، ظلم کا پانی سر سے اونچا ہو جاتا ہے، قدرت کا قہر وغضب یکایک اترتا ہے اور آدمی تو آدمی ہے زمین کو تہ وبالا کر دیتا ہے، اور اسی پر بس نہیں ہے ہمیشہ کے لئے لعنت ان کے پیچھے لگ جاتی ہے، یہاں ڈوبتے ہیں تو جہنم میں نکلتے ہیں، اور وہاں کے ابدی عذاب میں گرفتار ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے قوم نوح کے بارے میں فرمایا ہے: **مِمَّا خَطِیْئَاتِھِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْ نَاراً فَلَمْ یَجِدُوْا لَھُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَنْصَاراً۔** ان کے گناہوں کی وجہ سے انھیں پانی میں غرق کیا گیا، پھر وہ جہنم میں داخل کئے گئے، پھر

انھوں نے اللہ کے مقابلہ میں کسی کو اپنا مددگار نہ پایا۔

ایک ہی علاج ہے کہ ظلم سے باز آئیں، آپس کی نفرتوں اور عداوتوں کو مٹائیں، ایک دوسرے سے محبت کریں، قدرتی تازیانوں کو کوئی روک نہیں سکتا۔ ہمارا وزیر اعظم کہتا ہے کہ ’’ہم عہد کریں کہ آئندہ ایسا حادثہ نہ ہوگا‘‘ اگر اخبار نے وزیر اعظم کی طرف یہ بات صحیح منسوب کی ہے، تو انھیں عہد کرنا چاہئے کہ وہ ملک کے باشندوں میں کسی کو دبانے اور کسی کو ابھارنے کا عمل بند کریں گے، سب کے حقوقِ شہریت یکساں ہیں، انھیں برقرار رکھیں گے۔ عبادت گاہوں کو توڑنا ایک ظالمانہ عمل ہے، ظلم کے ساتھ حکومت کی کشتی نہیں چلا کرتی، لیکن ہم جانتے ہیں کہ نہ وزیر اعظم میں یہ حوصلہ ہے اور نہ ان کی پارٹی میں اتنی وسعت ہے کہ اپنے علاوہ کسی کو برداشت کرلے، قدرتی عذاب ایک طرف اپنی پوری ہولناکی کے ساتھ عبرت کا کوڑا بن کر برسا ہے، اور دوسری طرف کچھ لوگ اعلان کرتے پھر رہے ہیں کہ ابھی تو ایک ہی جگہ ظلم ہوا ہے (اجودھیا اور بابری مسجد) ابھی اور بھی ظلم وتشدد کے نشانے ہیں جن تک انھیں پہونچنا ہے، کاش ظالموں کی آنکھیں کھلتیں، بہرحال یہ حادثہ اکیسویں صدی کا شدید ترین حادثہ ہے، اس سے سب کو سبق حاصل کرنا چاہئے، خواہ کسی مذہب کا ماننے والا ہو۔

بالخصوص وہ لوگ جنھیں اللہ پر ایمان رکھنے کا شرف حاصل ہے، وہ اجتماعی طور پر اپنے آپ میں تبدیلی پیدا کریں، وہ اللہ کی طرف رجوع کریں، اطاعت وعبادت سے اسے راضی کریں، ان کا اشارہ ہوگا تو ہر نقصان کی تلافی ہوگی، اور اس ایمان وانابت اور استغفار واطاعت کی حالت میں موت آئے گی تو آخرت کی زندگی جو اصل زندگی ہے سنور جائے گی، کوئی ایسی حرکت نہ کریں جو خدا کی ناراضگی کا سبب ہو، نہ بڑے بول بولیں، نہ کسی کی مصیبت پر خوشی محسوس کریں، اللہ کا غضب جہاں اترتا ہے تہس نہس کردیتا ہے۔ **رب اغفر وارحم وتجاوز عما تعلم إنک أنت الاعز الاکرم أللٰھم إنا نعوذ بک من غضبک وعذابک یاارحم الراحمین۔** (ذی قعدہ ۱۴۲۱ھ/ فروری ۲۰۰۱ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حوادث و مصائب کا سرچشمہ

گجرات میں اس صدی کا عظیم ترین تباہ کُن زلزلہ آیا، ہزاروں عمارتیں زیر و زبر ہوگئیں، لاتعداد انسان اور حیوان لقمۂ اجل بن گئے، مال و زر کی بہت بڑی مقدار زیر زمین چلی گئی، ان سب کی گنتی اللہ ہی جانتا ہے، انسانوں کو انسانوں سے ہمدردی ہے، ساری دنیا کے انسان گجرات کی طرف امداد اور راحت کا سامان لیکر دوڑ پڑے، جس سے جو کچھ بن پڑتا ہے مدد کرنے کی کوشش کرتا ہے، انسانیت سے ہمدردی کا یہی تقاضا ہے کہ مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کی جائے، ان کے رنج و غم میں شریک ہوا جائے، اس طرح صدمہ ہلکا ہو جاتا ہے۔

ایک طرف یہ کام ہو رہا ہے اور اچھا ہو رہا ہے، گو کہ اس میں بدنیت افراد خرابیاں بھی پھیلا رہے ہیں، تاہم راحت رسانی کا کام ہو رہا ہے، لیکن دوسری طرف کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اس زلزلہ کی توجیہات کی تلاش میں سرگرداں ہیں، زلزلہ کیوں آیا؟ کون کون سے علاقے زلزلے کی زد میں ہیں؟ کب کب زلزلہ آیا؟ کہاں کہاں آیا؟ بس یہی تحقیقات ہو رہی ہیں اور ان تحقیقات کے نتائج اخبارات میں آتے رہتے ہیں۔ عجیب بات ہے، عذابِ الٰہی کا ایک جھٹکا ایک بہت بڑے خطے کو زیر و زبر کر گیا، اس سے عبرت حاصل کرنے کے بجائے غافل انسان اس کی حقیقت اور ماہیت کی کھوج لگا رہا ہے، اور یہ کہہ کر مطمئن ہونے کی کوشش کر رہا ہے کہ پہلے بھی بہت سے زلزلے آ چکے ہیں اور زمین کے اندرونی حصے میں فلاں فلاں حرکتیں ہو رہی ہیں، جن کے اثر سے وہ ہل جاتی ہے، پھٹ جاتی ہے، بس تحقیق ہوگئی اور کام ختم ہوگیا۔ انسان ان درمیانی مرحلوں میں کھو جاتا ہے، اور اس طرح کے حادثات سے جو سبق لینا چاہئے اس سے آنکھیں موند لیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے پچھلے انبیاء کا، ان کی قوموں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ: وَمَا اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّا اَخَذْنَا اَھْلَھَا بِالْبَاسَاءِ وَالضَّرَّاءِ لَعَلَّھُمْ یَضَّرَّعُوْنَ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَکَانَ السَّیِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰی عَفَوْا وَقَالُوْا قَدْ مَسَّ آبَاءَ نَا الضَّرَّاءُ وَالسَّرَّاءُ فَأَخَذْنَاھُمْ بَغْتَةً وَّھُمْ لَایَشْعُرُوْنَ ۔ اور ہم نے جب بھی کسی بستی میں کوئی نبی بھیجا تو ہمیشہ ایسا ہی ہوا کہ اس کے نہ ماننے پر وہاں کے باشندوں کی ہم نے سختی اور تکلیف میں گرفت کی تاکہ روئیں گڑگڑائیں، اور اپنی سرکشی سے باز آئیں، پھر ہم نے اس تکلیف اور عذاب کے بجائے اتنی بھلائی عطا کی، وہ راحت و آرام میں بہت بڑھ گئے اور کہنے کہ یہ دستورِ فطرت ہے، ہمارے باپ دادوں کو بھی مصیبت و راحت کا سامنا کرنا پڑا تھا، پھر ایسا ہوا کہ ہم نے انھیں ناگہانی طور پر پکڑا جس کا انھیں احساس تک نہ تھا۔

جاہلیت ہر زمانے میں یکساں رہی ہے، آج بھی جب ارادۂ الٰہی کوئی عبرت انگیز طمانچہ لگاتا ہے تو بجائے اس کے کہ اس سے سبق حاصل کیا جائے، غافل اور نادان انسان پچھلی تاریخ کریدنے لگتا ہے، اور یہ کہہ کر مطمئن ہونے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، پہلے بھی ایسا بارہا ہوچکا ہے، یہ تو فطرت کا دستور ہے، اس لئے گویا چونکنے کی ضرورت نہیں ہے، ہم خواہ کچھ کرتے رہیں ایسا ہی ہونا ہے، اس میں خدا کے قہر وجلال کا دخل نہیں ہے، حالانکہ اگر وہ تلاش کرتا تو اسے معلوم ہوتا کہ پچھلے مصائب وشدائد بھی کسی نہ کسی نافرمانی اور سرکشی پر تازیانۂ عبرت ہی تھے، پھر انسان جب سبق لینے سے انکار کرتا ہے تو قدرت کی طرف سے اچانک کوئی ایسی پکڑ آجاتی ہے کہ پھر زندگی کی ذرا بھی مہلت نہیں ملتی، موجودہ حوادث میں عبرت آموزی کا پورا سامان موجود ہے، مگر انسانوں کا رخ اللہ کی طرف ہونے کے بجائے کسی اور ہی طرف معلوم ہوتا ہے، جو لوگ مصائب کا شکار ہوئے ہیں وہ تو زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے، مال ومتاع کھو چکے، آس پاس کی آبادیوں والے جو بچ گئے وہ سبق نہیں لے رہے ہیں، تبصرے کررہے ہیں، اخبار پڑھ کر، ٹی وی دیکھ کر اپنے معلومات میں اضافہ کررہے ہیں اور جو اصل کام ہے اس سے غافل ہورہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

أَفَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرىٰ أَنْ يَّاتِيَهُمْ بَاسُنَا بَيَاتاً وَّهُمْ نَائِمُوْنَ ٥ أَوَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرىٰ أَنْ يَّاتِيَهُمْ بَاسُنَا ضُحىً وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ ٥ أَفَأَمِنُوْا مَكْرَ اللهِ فَلَا يَامَنُ مَكْرَ اللهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ (کیا ان آبادیوں میں بسنے والے اس بات سے مطمئن ہو گئے کہ ہمارا عذاب ان پر رات میں اس حال میں آجائے کہ وہ سو رہے ہوں، یا کیا انھیں اس بات کا اندیشہ نہیں ہے، کہ ہمارا عذاب ان پر دن دوپہر آجائے جبکہ وہ کھیل کود میں مصروف ہوں، کیا وہ اللہ کی غیبی تدبیروں سے مطمئن ہو گئے، اللہ کی غیبی تدبیروں سے وہی مطمئن ہوتا ہے جو خسارے میں مبتلا ہو)

انسانو! دیکھو تمہارا مالک وخالق کیا کہہ رہا ہے؟ اس کو سنو! یہی سچی بات ہے، اس کے علاوہ سب سخن سازی ہے، دل کا بہلاوا ہے، اگلی داستانوں کو مت دیکھو، یہ دیکھو کہ داستان بار بار کیوں دہرائی جارہی ہے؟ یہ سبب اپنے سے باہر مت تلاش کرو، اپنے اندر تلاش کرو، مصائب وآفات کا سرچشمہ تمہاری بداعتقادیاں اور بداعمالیاں ہیں، زمینی حادثات کے فیصلے آسمان پر ہوتے ہیں اور آسمانی فیصلوں کی بنیاد انسانی اعمال وخیالات بنتے ہیں۔

اور یہ جو کچھ ہو رہا ہے، یہ اتفاقات نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ کی مشیّت اور ارادوں کارفرمائیاں ہیں، حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: **وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ أَوْ تَحُلُّ قَرِيْباً مِنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللهِ إِنَّ اللهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ** (اور ہمیشہ یونہی ہوتا رہتا ہے کہ ان کفار کو ان کی کرتوتوں کی وجہ ایک نہ ایک صدمہ پڑتا رہتا ہے، یا ان کی قریبی آبادیوں میں عذاب اترتا ہے، اور یہ ہوتا ہی رہے گا، یہاں تک کہ اللہ کے وعدے کا وقت آجائے، یعنی قیامت کا دن آجائے، اور اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتے)

اللہ کے کلام کی صداقت آج بھی جگمگا رہی ہے، اس ملک نے اور اس کے باشندوں نے اعتدال وانصاف کی کوئی حد ایسی نہیں چھوڑی ہے جس کو پامال نہ کر ڈالا ہو، اور کرتے ہی جارہے ہیں، پس اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہر طرف عذاب الٰہی کا کوڑا برس ہی جاتا ہے، مگر اس ملک نے اس سے کتنا سبق لیا؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: **يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَاتِيْهِمْ مِنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِؤُنَ** (بندوں کے حال پر افسوس ہے، جب بھی

ان کے پاس کوئی رسول آتا ہے، تو اس کے ساتھ مذاق کا معاملہ کرتے ہیں) رسول آئے تو ان کے ساتھ مذاق کا معاملہ کیا گیا، اب یہ قدرتی طمانچے پڑتے ہیں انسان سنجیدہ نہیں ہوتا، سطحی اور بے مطلب باتیں بناتا ہے۔

أَوْ تَحُلُّ قَرِيبًا مِنْ دَارِهِمْ کے سلسلے میں مشہور عالم دین، مفسر قرآن حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب علیہ الرحمہ معارف القرآن میں لکھتے ہیں کہ:

> ”آیت مذکورہ سے معلوم ہوا کہ جس قوم اور جس بستی کے قرب وجوار میں کوئی عذاب یا آفت ومصیبت آتی ہے تو اس میں اللہ جل شانہ کی یہ حکمت بھی مستور ہوتی ہے کہ آس پاس کی بستیوں کو تنبیہ ہو جائے اور وہ دوسروں سے عبرت حاصل کر کے اپنے اعمال درست کرلیں، تو یہ دوسروں کا عذاب ان کے لئے رحمت بن جائے، ورنہ پھر ایک دن ان کا بھی وہی انجام ہونا ہے جو دوسروں کا مشاہدہ میں آیا۔
>
> آج ہمارے ملک میں، ہمارے قرب وجوار میں روز روز کسی جماعت، کسی بستی پر مختلف قسم کی آفتیں آتی رہتی ہیں، کہیں سیلاب کی تباہ کاری، کہیں ہوا کے طوفان، کہیں زلزلہ کا عذاب، کہیں کوئی اور آفت، قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق یہ صرف انھیں بستیوں اور قوموں کی سزا نہیں ہوتی، بلکہ قرب وجوار کے لوگوں کو بھی تنبیہ ہوتی ہے، پچھلے زمانہ میں اگرچہ علم وفن کی ٹیپ ٹاپ نہ تھی مگر لوگوں کے دلوں میں خدا کا خوف تھا، کسی جگہ اس طرح کا کوئی حادثہ پیش آجاتا تو خود وہ لوگ بھی اور اس کے قرب وجوار والے بھی سہم جاتے، اللہ کی طرف رجوع کرتے، اپنے گناہوں سے تائب ہوتے، استغفار، صدقہ وخیرات کو ذریعۂ نجات سمجھتے، اور آنکھوں سے مشاہدہ ہوتا تھا کہ ان کی مصیبتیں بڑی آسانی سے ٹل جاتی تھیں، آج ہماری غفلت کا یہ عالم ہے کہ مصیبت کے وقت بھی خدا ہی یاد نہیں آتا اور سب کچھ یاد آتا ہے، دنیا کے عام غیر مسلموں کی طرح ہماری نظریں بھی صرف مادی اسباب پر جم کر رہ جاتی ہیں، مسبب الاسباب کی طرف توجہ کی اس وقت بھی توفیق کم لوگوں کو ہوتی ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ اس طرح کے مسلسل حوادث ہیں جن سے دنیا ہمیشہ دوچار رہتی ہے۔ (ج:۵، ص:۲۰۶)

بڑی ہی سخت بات ہے کہ اللہ کی طرف سے تنبیہ ہو، اور انسان پھر بھی ہوشیار نہ ہو،

سائنس دانوں نے زمین میں پلیٹیں تو دیکھ لیں جو سرک رہی ہیں، ان کے سرکنے کی مقدار کو بھی ناپ لیا، لیکن جو ذات ان پلیٹوں کو سرکا رہی ہے، پھر انھیں ٹکرا رہی ہے اس کو نہیں جانتے ، اس سے آنکھیں بند کئے ہیں، سائنس کے مارے ہوئے لوگ آنکھیں بند کریں یا کھولیں ، جن کی آنکھیں اللہ کی طرف کھلی ہوی ہیں، جنھیں ایمان نصیب ہے وہ کیوں زبردستی آنکھیں بند کرتے ہیں؟

ایمان والو! تمہارا ایمان واعتقاد اور تمہارے اعمال واحوال آسمانوں کے فیصلے بن جاتے ہیں، تمہاری درستگی ہو جائے تو دنیا کو عارضی ہی سہی مگر بہت راحت مل جائے گی۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

(مارچ ۲۰۰۱ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دخل در معقولات

کچھ دنوں پہلے اخبار ''راشٹریہ سہارا'' میں ایک مراسلہ نظر سے گذرا، جس میں کسی صاحب نے چرم قربانی کے سلسلہ میں علماء کرام کو للکارا ہے، کہ وہ قربانی کے بارے میں صحیح موقف سے آگاہ نہیں کرتے، سال بھر پہلے اسی اخبار میں سوال اٹھایا گیا تھا مگر علماء نے کوئی جواب نہیں دیا، اور بھی بہت کچھ ارشاد فرمایا گیا تھا۔ اللہ جانے اخبار میں مراسلہ شائع کر کے لوگ کیا تیر مار لیتے ہیں، یہ تو اپنی بے علمی کی نمائش ہے۔ چرم قربانی کا مسئلہ کوئی پیچیدہ اور لاینحل تو نہیں ہے کہ اس کو اخبارات میں موضوع بحث بنایا جائے۔ سیدھی سادی بات یہ تھی کہ اگر کسی صاحب کو کوئی مسئلہ معلوم نہیں ہے تو کسی معتبر عالم کے یہاں سوال لکھ کر بھیج دیں، وہاں سے جواب آجائے گا، اس کا یہ طریقہ سرے سے غلط ہے کہ اخبار میں مراسلہ چھاپ کر انتظار کیا جائے کہ علماء اس کا جواب دیں گے، جو لوگ تدریس وفتاویٰ کے کام میں مشغول ہیں ان کو ان مراسلات کے پڑھنے کا موقع ہی کب ملتا ہے، اور ان کے ذمہ یہ کب ہے کہ وہ اخبار ضرور ہی پڑھیں؟ اور جو کسی نے سوال اٹھایا ہو اس کا جواب ضرور دیں؟ ان سے براہ راست سوال کیجئے، وہ اگر نہ جواب دیں تب البتہ ایک بات ہے، ہر کام کا ایک طریقہ ہوتا ہے، اسی طریقہ سے اس کو کرنا چاہئے۔

اور یہ جو عرض کیا گیا کہ چرم قربانی کا مسئلہ کوئی ایسا پیچیدہ مسئلہ نہیں کہ اس کو اخبارات میں موضوع بنایا جائے، تو در حقیقت یہ ایک سیدھی بات ہے کہ چرم قربانی کا مالک وہی ہے جس نے قربانی کی ہے، اس کا صدقہ کرنا اس کے ذمے واجب نہیں ہے، اسے اختیار ہے، خود اپنے استعمال میں لائے یا کسی کو دیدے۔ ہاں اسے بیچ کر اس کی قیمت اپنے

مصرف میں نہیں لاسکتا ہے، قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہے، بالکل وہی مسئلہ ہے جو قربانی کے گوشت کا ہے، خود کھائے، دوسروں کو کھلائے، لیکن اگر اسے بیچے گا تو قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہوگا، دوسرے کو دیدیا تو اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، دوسرا اسے فروخت کرے یا اپنے پاس رکھے، اس کے حق میں وہ ہدیہ ہوگیا۔ بس اتنی سی بات ہے، مگر شاید یہ بات گراں گذرتی ہو کہ عموماً عربی مدارس والے بطور چندہ کے وصول کرلیتے ہیں اور وہ اسے فروخت کرکے مدرسہ کی ضروریات میں خرچ کرتے ہیں۔ شاید یہ بات کچھ لوگوں کے لئے باعث تکلیف ہو کہ اسے علماء مدارس کے واسطے کیوں لے لیتے ہیں، اگر یہ بات ہے تو انھیں سوچنا چاہئے کہ مدارس قوم کی سب سے بڑی ضرورت کو پورا کرتے ہیں، دینی تعلیم کا سارا انحصار انھیں مدارس پر ہے، اور انھیں سے مسلم قوم کی شناخت باقی ہے، یہ نہ رہیں تو ''رام دھن'' اور ''عبداللہ'' میں فرق مٹ جائے گا، تو اگر قربانی کی کھال ایک اچھے مصرف میں لگ جاتی ہے تو اس سے مطمئن ہونا چاہئے نہ کہ ناخوش!

ایک صاحب نے رائے دی کہ قربانی کی کھال فروخت کرکے اسے گجرات کے مصیبت زدگان کو بھیج دیا جائے۔ مصیبت زدوں کی مدد بہت اچھا کام ہے، لیکن معلوم ہونا چاہئے کہ جب قربانی کا مالک اسے بیچے گا تو یہ رقم واجب التصدق ہوجائے گی، اسے کسی غیر مسلم کو نہیں دیا جاسکتا، تو چرم قربانی کی رقم بھیج کر کتنی احتیاط کریں گے، دوسرے یہ کہ ان ہنگامی مصیبت زدوں کے لئے تو ساری دنیا سے اتنی امداد آرہی ہے کہ انھیں از سرنو پورے طور سے آباد کیا جاسکتا ہے، حکومت سے کہئے کہ اس آنے والی امداد کا صحیح انتظام کرائے، وہاں تو ایسا سنا جاتا ہے کہ امداد تقسیم کرنے والے مالدار ہوتے جارہے ہیں اور جو مستحق ہیں ان کے آنسو بھی نہیں پُنچھ رہے ہیں۔ مدارس عربیہ کی امداد اور ان کے نظم ونسق کو چلانے کے لئے تو بس یہی محدود رقم زکوٰۃ کی، صدقہ وخیرات کی اور چرم قربانی کی ہوتی ہے، اس کو اُدھر بھیج کر کیا چاہتے ہیں کہ مدارس بند ہوجائیں، اور یہ عبادت والی رقمیں ایسے ہاتھوں میں منجمد ہوجائیں، جن کی غرض زراندوزی کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں۔ مسلمانوں کی طرف سے ایسی

باتیں ظاہر ہوتی ہیں تو افسوس ہوتا ہے، ان مدارس کی مدد کرو، خدانخواستہ اگر اس ملک میں یہ نہ رہے تو نہ آپ کے ایمان کی خیر ہے نہ جان کی!

☆☆☆☆☆

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے

ایک بات سننے میں آئی ہے۔ معلوم ہوا کہ اخبار ’’آواز ملک‘‘ میں یہ بات اٹھائی گئی ہے کہ حجاج کرام کے لئے ہوائی جہاز کے کرائے میں حکومت جو رعایت دیتی ہے، یعنی ان کے لئے ہوائی جہاز کے اصل کرائے سے بہت کم، غالباً آدھے سے کچھ زیادہ کرایہ متعین کیا جاتا ہے، اور باقی کرایہ کی رقم گورنمنٹ اپنے خزانے سے ادا کرتی ہے، جس کو اصطلاح میں ’’سبسڈی‘‘ کہتے ہیں۔ غالباً سعودیہ عربیہ کے حوالے سے یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ یہ درست نہیں ہے، حاجی پر جو حج فرض ہوتا ہے، اپنی رقم پر فرض ہوتا ہے، اس میں گورنمنٹ کی دی ہوئی رقم کا دخل نہیں ہونا چاہئے، اور حج ایک عبادت کا سفر ہے، گورنمنٹ کا مال نہیں شامل کرنا چاہئے، معلوم نہیں اس کی آمدنی حرام ہے یا حلال؟ اس سوال کو معلوم کرکے بس یہ کیفیت ہے کہ

ناطقہ سربہ گریباں ہے اسے کیا کہئے

ایک طرف تو یہی سوال اٹھا کر علماء کو للکارنے والے، علماء پر اتہام رکھتے ہیں کہ گورنمنٹ طرح طرح سے اپنے عوام کی مدد کرتی ہے، ان مولویوں کو خبر ہی نہیں ہوتی ورنہ حکومت کی مدد سے مدارس اور مقابر وغیرہ کے بہت سے کام ہوسکتے ہیں، وہاں انھیں خیال نہیں ہوتا کہ وہ رقم حلال ہے یا حرام، اور دوسری طرف ایک ایسی مدد جس کی عام طور پر بیشتر حجاج کو خبر بھی نہیں ہوتی، اس کے جائز و ناجائز ہونے کو آسمان پر اٹھا رہے ہیں۔

ایک حاجی کو صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ہوائی جہاز کا کرایہ اتنا ہے، اسے عموماً خبر نہیں ہوتی کہ اصل کرایہ کتنا ہے اور اس میں سے کتنا گورنمنٹ ادا کرتی ہے، بات یہ ہے کہ

ہوائی جہاز کی سروس گورنمنٹ کا ایک ادارہ ہے، اور گورنمنٹ اپنے انتظام میں ملک کے اندر اکثر اور ملک کے باہر تو تمامتر وہی سفر کراتی ہے، اسے اختیار ہے کہ جس کے لئے جتنا چاہے مقرر کرے، طلبہ کے لئے ملک کے اندر ریلوے سفر کا کرایہ آدھا ہو جاتا ہے، گورنمنٹ اس متعلقہ ادارہ کی کمی کو اپنے کسی اور خزانے سے پورا کرلے تو اس کا کوئی تعلق سفر کرنے والے سے نہیں، سفر کرنے والے کے ذمہ جتنا کرایہ ہے حج کی فرضیت اس کے حساب سے ہوگی، وہی اس کا اصل کرایہ ہے، باقی دوسروں سے کیا لیا جاتا ہے اس کی کوئی ذمہ داری اس پر نہیں ہے، اس لئے عدم جواز کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، یہ تو ایسا ہی ہے کہ کسی تاجر کا عام ریٹ مثلاً کوئی ہے، لیکن اس نے غرباء ومساکین کے لئے طے کردیا ہے کہ ان سے نصف قیمت لی جائے، لیکن دکان کا حساب پورا کرنے کے لئے باقی رقم وہ اپنے کسی دوسرے فنڈ سے ادا کردیتا ہے۔ یہی حال یہاں ہے کہ حجاج سے کرایہ کی ایک خاص رقم جو دوسروں کے کرایہ سے کم ہے، گورنمنٹ نے مقرر کردی، اس کی وجہ سے جو کمی واقع ہو رہی ہے اس کو گورنمنٹ نے اپنے کسی فنڈ سے ادا کردیا تو اس میں ہیرا پھیری کا جو بھی مسئلہ ہے اس کا تعلق گورنمنٹ سے ہے حاجی سے نہیں۔ اس طرح کے مسائل کو اخبار میں اچھالنے سے پہلے علماء سے تحقیق کرنی چاہئے، یہ بڑی بے دانشی کی بات ہے کہ تحقیق سے پہلے ہی چیلنج اور ملامت کا انداز اختیار کرلیا جائے، یہ قوم کے اور ملک کے حق میں بھلائی نہیں بلکہ مشکلات پیدا کرنا ہے۔

اخباری اہل قلم کی غیر ذمہ داری ملاحظہ ہو، آواز ملک کے اداریہ نگار نے بلند آہنگی کے ساتھ فتویٰ صادر کیا ہے کہ جن لوگوں نے سرکاری سبسڈی کے ماتحت حج کیا ہے، کسی کا حج گناہ سے خالی نہیں ہوا، غالباً یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان کا حج ہی نہیں ہوا، اور دلیل کیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلاً، اور اللہ کے واسطے لوگوں پر حج فرض ہے، جو وہاں جانے کی استطاعت رکھتا ہو۔ اس کا مطلب اداریہ نگار نے یہ بتایا ہے کہ اپنی جائز اور حلال کمائی سے جس کے پاس اتنی رقم جمع ہو کہ وہ جا سکے اور آسکے، اور اس درمیان اپنے گھر والوں کے خرچ کا انتظام کرسکے، بس اسی کے لئے حج جائز

ہے، قرض لے کر یا کسی حکومت وغیرہ کی مدد سے حج کرنے گیا تو اس کا یہ عمل غیر شرعی اور ناجائز ہے۔

قرآن کریم اور اسلام پر یہ فتویٰ کتنا بڑا ظلم ہے، بس کیا کہا جائے، قلم ہر ایک کے ہاتھ میں ہے، جس کا جو جی چاہے لکھ مارے۔ اس آیت میں حج کی فرضیت کا بیان ہے، جو شخص مذکورہ بالا استطاعت رکھتا ہے اس پر فرض ہے کہ حج کے لئے جائے، یہ بات نہیں ہے کہ جس کے پاس یہ قدرت واستطاعت ہو حج میں جانا اسی کے لئے جائز ہو اور اگر نہ ہو تو حج میں جانا جائز ہی نہیں۔ حج کا فرض ہونا دوسرا مسئلہ ہے، اور حج کا جائز ہونا دوسرا مسئلہ ہے، یہ تو اور اندھیر ہے کہ صرف اپنی ہی کمائی سے جانا جائز ہے، تب تو بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی صاحب ثروت انسان کسی دوسرے کو اپنے ساتھ اپنے خرچ سے حج میں لے جانا چاہتا ہے یا بھیجتا ہے، تو یہ بھی جائز نہیں ہونا چاہئے، اس لئے کہ وہ اپنی کمائی سے نہیں جا رہا ہے، حالانکہ اگر کوئی یہ فتویٰ دے تو بالکل غلط ہے، ہاں جائز آمدنی والی بات معقول ہے۔

اداریہ نگار کو اپنی غلطی کا اعتراف کرنا چاہئے، اس سے توبہ ومعذرت کرنی چاہئے، سبسڈی کی حقیقت واضح کی جا چکی ہے۔ (اپریل ۲۰۰۱ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہنامہ ضیاء الاسلام (والاسلام) کے اجراء کی داستان

رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ میں جامعہ عربیہ انوار العلوم جہانا گنج، ضلع اعظم گڈھ سے ماہنامہ انوار العلوم کا اجرا ہوا تھا، جو سال بھر تک پابندی سے نکلا، علماء ومشائخ نے بھی اور عام قارئین نے بھی بہت پسند کیا، مگر بارہ شمارہ نکلنے کے بعد وہ بند ہوگیا۔ دوبارہ اسے محرم ۱۴۲۰ھ میں شروع کیا گیا، ابھی پانچ شمارے نکلے تھے کہ وہ پھر التوا میں پڑ گیا، اس کے بعد اس کے مدیر محترم مولانا عبد الرب صاحب اعظمی سے اجازت لے کر اس کا نقش ثانی مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور اعظم گڈھ سے بنام ’’الاسلام‘‘ جاری کیا گیا، جس کے بحمد اللہ اٹھارہ شمارے منظر عام پر آچکے ہیں، الحمد للہ یہ بھی مقبول خاص وعام ہو رہا ہے، اس کے ڈکلیریشن کی درخواست حکومت کے متعلقہ شعبے کو دی گئی، تو بجائے ’’الاسلام‘‘ کے ماہنامہ ’’ضیاء الاسلام‘‘ شیخوپور کی منظوری ملی۔ قارئین کے ہاتھوں میں ماہنامہ ’’ضیاء الاسلام‘‘ کا پہلا شمارہ حاضر ہے، جنوری سے جون تک چھ شمارے ’’الاسلام‘‘ کے اور جولائی سے دسمبر تک چھ شمارے ’’ضیاء الاسلام‘‘ کے، اس طرح بارہ شماروں کی ایک جلد ہو جائے گی ۲۰۰۲ء کے آغاز سے اس کی دوسری جلد شروع ہوگی جو بارہ شماروں پر مکمل ہوگی۔ اسی طرح انشاء اللہ سال بسال نظام رہے گا، قارئین دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اس سلسلہ کو استقامت بخشیں۔ آمین

آئندہ ماہ سے رسالہ میں چند عنوانات مستقل ہوں گے، جن کے تحت مضامین شائع کئے جائیں گے۔ انشاء اللہ

(۱) آغاز سخن: جس میں مختلف اور متنوع موضوعات پر ادارہ کی جانب سے اظہار خیال ہوگا۔

(۲) ضیاء القرآن اور ضیاء السنۃ: ان دونوں عنوانوں میں سے کسی ایک یا دونوں کے

لئے چند صفحات مختص ہوں گے، اہل علم حضرات سے درخواست ہے کہ ان دونوں موضوعات پر اپنے رشحات قلم سے رسالہ کو نوازیں۔

(۳) علمی و دینی اور اصلاحی مقالات۔

(۴) قندِ مکرر: اس عنوان کے تحت اکابر سلف کے مضامین یا ان کے ترجمے یا ان کی تلخیص پیش کی جائے گی۔

(۵) ملفوظات: حضرات اکابر کے ملفوظات و حکایات جس سے ایمان میں تازگی پیدا ہو، اعمال کا شوق اور ان کی رغبت بیدار رہو، انھیں نقل کیا جائے گا۔

(۶) استفسار و جواب: اس عنوان کے تحت فتاویٰ، قارئین کے علمی و دینی سوالات کے جواب اور اشکالات کے حل پیش کئے جائیں گے۔

(۷) جدید مطبوعات پر تبصرے

یہ ایک خالص دینی رسالہ ہے، جو ایک دینی مدرسہ کا ترجمان ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں میں صحیح دینی علم پھیلے، معاشرہ کی اصلاح ہو، باطل نظریات وخیالات کا احتساب ہو، حق کی روشنی عام ہو، قرآن وسنت کا نور غالب ہو۔ ادارہ کے ذمہ دار اللہ کے حضور دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے جادۂ حق پر استقامت بخشیں، شرور وفتن سے محفوظ رکھیں، اسے مسلسل جاری رکھیں، تمام مسلمانوں کے لئے اسے نافع بنائیں، اسے دین کا سچا خدمت گار بنائیں، اور اپنے فضل وکرم سے اسے قبول فرمائیں۔

ایں دعا از من از جملہ جہاں آمین باد

حضرات قارئین بھی دعا فرمائیں، اور اس کی توسیع اشاعت کے لئے کوشش کریں۔ (جولائی ۲۰۰۱ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اقتصادی بدحالی اور اس کا حل

کچھ دنوں پہلے کی بات ہے، ایک صنعتی جگہ میں کوئی غیر مسلم سرکاری عہدیدار آیا، وہ لوگوں کے احوال معلوم کر رہا تھا، جن کے درمیان وہ تھا، وہ سب مسلمان تھے، ان لوگوں نے اقتصادی بدحالی کی شکایت کی اور بتایا کہ معاشی کاروبار ٹھپ پڑا ہوا ہے، لوگ مالی مشکلات میں بہت زیادہ مبتلا ہیں، اس پر اس غیر مسلم نے جو کچھ کہا، اس کا خلاصہ یہ تھا:

> ”آپ لوگوں پر تو اس کاروباری پریشانی کا کوئی اثر نہیں، سنیما کی کھڑکیوں پر آپ لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے، کہیں مشاعرہ ہوتا ہے تو لاکھوں لاکھ کی رقمیں آپ لوگوں کے جیب سے نکلتی ہیں، ناچ گانا ہو تو آپ لوگ دور دور سے پہونچ جاتے ہیں، غرض فضول خرچی بلکہ گناہ کے کاموں میں آپ لوگ بہت آگے رہتے ہیں، پھر مالی مشکلات کی کیا شکایت ہے، ہم تو جب جانتے کہ آپ لوگ کاروباری اعتبار سے پریشان ہیں، جب آپ ان جگہوں میں نظر نہ آتے، روپئے احتیاط سے خرچ کرتے، لیکن کیا ایسا ہوتا ہے؟ ہم تو نہیں دیکھتے۔

یہ اس غیر مسلم کا مسلمانوں کے منہ پر غیرت کو للکارنے والا ایک زوردار طمانچہ ہے، لیکن کیا ہماری قوم کو حیا آئی؟ کیا انھیں غیرت آئی، انھوں نے اپنی زندگی کے پروگرام میں کوئی تبدیلی پیدا کی؟

بے شک لوگ کاروباری اعتبار سے پریشان ہیں، معاشی مسائل ایسے غیر یقینی احوال کے شکار ہیں کہ ہر شخص کو خواہ وہ بڑا تاجر ہو یا معمولی صنعت کار، مستقبل اندھیرا ہی نظر آتا ہے۔ ہر شخص کی زبان شکایت کے کلمات سے آلودہ ہے، کوئی حکومت کو برا بھلا کہہ رہا ہے کہ اس کی غلط پالیسیوں نے کاروبار کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کر دیا ہے، بلاشبہہ یہ بھی

صحیح ہے کہ حکومت کی نیت و عمل دونوں غلط ہیں، تاہم کیا ہمارے تبصروں، کچھ لوگوں کے احتجاجوں اور ہڑتالوں سے یہ پالیسیاں صحیح ہو جائیں گی۔

ہر مسلمان جانتا ہے بلکہ کافر بھی جانتا ہے کہ روزی اور مالداری و غربت کا تعلق اللہ تعالیٰ کی بارگاہ عالی سے ہے۔ اَللّٰہُ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَاءُ مِنْ عِبَادِہٖ وَیَقْدِرُ لَہٗ ، اللہ تعالیٰ جس کیلئے چاہیں روزی کشادہ کر دیتے ہیں، اور جس کیلئے چاہیں تنگ کر دیتے ہیں۔ اس مضمون کی متعدد آیات قرآن پاک میں ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے اقتصادی پابندی کی منصوبہ بندی کرنے والوں کے سلسلے میں یہ بھی فرمایا کہ: وَلِلّٰہِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضِ وَلٰکِنَّ الْمُنَافِقِیْنَ لَایَفْقَھُوْنَ ، اور اللہ ہی کی ملکیت میں زمین و آسمان کے تمام خزانے ہیں لیکن منافقین نہیں سمجھتے۔

بے شک منافقین اس بات کو نہیں سمجھتے کہ زمین و آسمان کے تمام خزائن اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں، ان کی حکمت و مصلحت جب تقاضا کرتی ہے، بندوں کے درمیان اسے تقسیم فرماتے ہیں: وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَ نَا خَزَائِنُہٗ وَمَا نُنَزِّلُہٗ اِلَّا بِقَدْرٍ مَّعْلُوْمٍ ، اور ہر چیز کے خزانے ہمارے ہی پاس ہیں، اور ہمیں انھیں ایک متعین اور معلوم مقدار میں نازل کرتے ہیں۔ یہ بات منافقین کی سمجھ میں نہیں آتی، کیونکہ ان کے دل ایمان سے خالی ہیں، لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ جو لوگ ایمان و یقین کی سعادت رکھتے ہیں وہ بھی انجان بن جاتے ہیں، ان کے احوال و آثار سے ایسا ہی محسوس ہوتا ہے جیسے اس موٹی اور بدیہی ایمانی بات کو وہ بھی نہیں جانتے۔

یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے، جس کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جس چیز کا جو مالک ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ وہ صاحب قدرت و اختیار ہو، اس سے لڑ کر، اس کو ناراض کر کے وہ چیز نہیں حاصل کی جا سکتی، اس کا ایک ہی راستہ متعین ہے کہ اسے راضی کیا جائے، کسی ڈھب سے اسے خوش کیا جائے، جبھی وہ چیز مل سکتی ہے، روزی اور کاروبار کو نہ کسی حکومت کی پالیسی نے ٹھپ کیا ہے، اور نہ کسی قوم نے، یہ تمام تر اسی مالک و مولیٰ کی مشیت ہے جس نے اعلان فرمایا ہے اور بار بار

اعلان فرمایا ہے کہ زمین وآسمان اوراس کے تمام خزائن اس کے ہاتھ میں ہیں، اسی مالک نے ارادہ فرمایا اور کاروبار مندا پڑ گیا، پھر جب وہی ارادہ کرے گا تو کاروبار کھلے گا۔

ایسے حالات میں کیا یہی کرنے کے کام ہیں کہ، اللہ کا نام لینے والے مشاعرے کرائیں اور ان پر اپنی جان اور مال خرچ کریں، شاعروں کے پیچھے دوڑیں، وہ شاعر جن کے پیچھے دوڑنے والوں کو اللہ تعالیٰ گمراہ قرار دے۔ وَالْشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُوْن، اور شاعر ان کے پیچھے وہی لوگ لگتے ہیں جو گمراہ ہیں۔ کیا یہی کام رہ گیا ہے کہ مشاعروں کی راہ میں مسلمان اپنی جیبیں خالی کریں، مسلمانوں کا سرمایہ دار اس میں بھاری بھاری چندے دے، اور کیا مسلمان نوجوانوں کے لئے یہ مشغلہ رہ گیا ہے کہ کاروبار مندا ہو گیا ہے، معاشی کام بند پڑا ہے، تو لاؤ کھیل کے میدان کو سجائیں، غول کے غول اچھل کود کریں، کرکٹ یا فٹ بال یا والی وال میں اپنے قیمتی اوقات کو اپنے دل ودماغ کو ضائع کریں، کچھ کھیلنے والے، ان سے زیادہ کھیل کو دیکھنے والے، صرف تھوری دیر تفریح کے لئے نہیں، تازگی طبع کے لئے نہیں، مستقل مشغلہ بنا کر کھیل کود میں اپنے معاشرہ کو تباہ کریں، سنیما گھروں کو رونق ان سے ہو، کیا یہی کام رہ گیا ہے، اور اگر یہ نہیں تو آپسی لڑائی جھگڑے، ایذا رسانیاں، بدخواہیاں وغیرہ کریں، کیا یہی وہ کام ہیں جن سے بند پڑا ہوا کاروبار کھل جائے گا، روزی کے بند دروازے وا ہو جائیں گے، تباہ ہوتی ہوئی معیشت آباد ہو جائے گی، کیا انھیں مشغلوں سے خَزَائِنُ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ کا مالک خوش ہو جائے گا اور وہ خزانوں کو ہم پر انڈیل دے گا، کلاثم کلا، کبھی نہیں! ہرگز نہیں!

تو اے مسلمانو! یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟ کیا سربلندی کا راز اسی میں ہے؟ اگر نہیں تو خدارا بتاؤ کہ ہمارا یہ راستہ کن لوگوں کا راستہ ہے، کیا یہی نبی کا راستہ ہے، کیا اسی پر اللہ کے آخری پیغمبر نے ہم کو چلایا تھا؟ کیا نبی ﷺ اور صحابہ کرام کے دور میں جب آفات کی یلغار ہوتی تھی، تو وہاں بھی یہی طریقے اختیار کئے جاتے تھے۔

کام یہ نہیں ہیں، کام یہ ہے کہ تباہی کے ان حالات میں آدمی سنجیدہ ہو جائے، اپنی

غلطیوں کا احتساب کرے، کاروبار میں آدمی ایمان داری اور دیانت کو اختیار کرے، حال یہ ہے کہ معاشی مشغلہ اختیار کرنے والا ہر طبقہ بے عنوانیوں کا شکار ہے۔ کوئی بھی تجارت اور کوئی بھی صنعت، کوئی کاروبار ایسا نہیں ہے جس میں مختلف قسم کی بددیانتیوں کا عمل دخل نہ ہو، کیا وہ سرمایہ دار طبقہ ہو، کیا وہ مزدور طبقہ ہو، اور کیا وہ ملازم پیشہ طبقہ ہو، جس کو جتنا اور جہاں موقع ملتا ہے، خوفِ خدا سے بے نیاز ہو کر اپنی ظاہری منفعت کو اختیار کرتا ہے، یہ کاروباری بددیانتی جب اجتماعی شکل اختیار کرلیتی ہے تو اللہ کا فیصلہ بدلتا ہے، گناہ کی کثرت اور اس پر توبہ وندامت کا نہ ہونا کاروبار کو فیل کردیتا ہے، یہ بددیانتی وہ ہے جس کی تلافی نفل نمازوں سے بھی نہیں ہوتی، لیکن آہ! کہ ہم نفل نماز کا نام کیا لیں، یہاں تو فرائض غفلت کی نذر ہیں، یہ اور ایک معصیت ہے، اور بڑی مصیبت ہے کہ اسلام کا نام لینے والا اپنے ہی ہاتھوں اسلام کی بنیاد کھودرہا ہے، مسجدیں شاندار بن گئی ہیں، مگر نمازی نہ رہے، بالخصوص فجر کی نماز سے تو وہ غفلت ہے کہ ہر مسجد روتی ہے، یہی وقت ہے جب اللہ تعالیٰ کی جناب سے روزی کے، صحت کے، مغفرت کے، فیصلے ہوتے ہیں اور یہ سب چیزیں خدا سے چاہنے والا خوابِ غفلت میں پڑا رہتا ہے، بھلا اس کا بھلا کیسے ہوگا؟

اس اقتصادی بدحالی اور کاروباری پریشانی کا علاج یہ ہے کہ ہر شخص اپنے تمام گناہوں سے توبہ کرلے، بالخصوص وہ گناہ جس کا ضرر بندوں پر پڑتا ہے، جیسے بددیانتی، بے ایمانی، جھوٹ، جھوٹا وعدہ، ناجائز ملاوٹ، لین دین میں دھوکہ، قرض لے کر بے فکر ہوجانا، احسان کرکے جتلانا یا احسان لے کر نمک حرامی کرنا، ان سے سچی توبہ کرے، انھیں ترک کرے، بقدر امکان اس کی تلافی کرے، فرائض کی پابندی کرے، رات کے آخری حصے میں اٹھ کر اللہ تعالیٰ کے حضور گریہ وزاری کرے، حساب کرکے پائی پائی کی زکوٰۃ ادا کرے، پھر انشاء اللہ حالات بدلتے دیر نہیں لگے گی، ہاں گناہوں اور فضول خرچی میں مال برباد نہ کرے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے عافیت نصیب فرمائیں۔ (اگست ۲۰۰۱ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الیکشن کا موسم

ہندوستان میں ایک بار پھر الیکشن کا ہنگامہ گرم ہونے والا ہے۔ یہ ہنگامہ آئے دن گرم ہوتا رہتا ہے، موسم پر بھی اور بے موسم بھی، یہ ہنگامہ جب ٹھنڈا ہوتا ہے تو حکومتیں بنتی ہیں، ان کے بننے میں بھی بڑی کشمکش، آویزش اور ہنگامہ آرائی ہوتی ہے، کچھ مدت اس میں صرف ہوتی ہے، پھر کچھ دن حکومت کے درو بست کے درست کرنے میں صرف ہوتے ہیں، ان میں بھی چین کے دن کم ہی ملتے ہیں۔ پھر اچانک معلوم ہوتا ہے کہ الیکشن کا ناچ دوبارہ شروع ہونے والا ہے۔ انھیں طوفانی موجوں میں ہندوستانی عوام کی ناؤ، کاروباری ناؤ، سکون واطمینان کے انتظار کی ناؤ، آپسی تعلقات کے بناؤ کی ناؤ، تہ وبالا ہوتی رہتی ہے۔ پھر اسی ہنگامہ کی خبر گرم ہے، حکومت واقتدار کے لئے کچھ نئے کچھ پرانے ہتھیار بنائے اور تیز کئے جا رہے ہیں، خدا ہی جانتا ہے کہ اس تیز وتند طوفان کی تہ سے کیا چیز باہر آئے گی۔ کاش کوئی معقول، کوئی نیک نیت اور خلوص سے ملک کی اور عوام کی خدمت کرنے والی حکومت آتی، گوکہ آثار ایسے نظر نہیں آتے، نہ ارباب، حکومت کے احوال پُر امید ہیں اور نہ عوام کے حالات درست ہیں۔

حکومت کی بدنیتی کا حال تو سب کو معلوم ہے، اور اس کے آثار بھی ملک بھر میں نمایاں ہیں، حکومت جب خوش نیت ہوتی ہے تو رعایا آسودہ اور خوشحال ہوتی ہے، آسمان اور زمین کی برکتیں کھل جاتی ہیں، اور حکومت بدنیت ہوتی ہے تو عوام میں ٹکراؤ ہوتا ہے اور بے چینی ہوتی ہے۔ زمینی آفات، آسمانی بلائیں سب گھیرتی ہیں، حکومت کی نیت کا اثر پورے ملک پر پڑتا ہے، زندگی کا ہر شعبہ اس سے متاثر ہوتا ہے۔

’’اخلاق محسنی‘‘ فارسی کی ایک کتاب ہے، جو پہلے عام طور سے مدارس عربیہ کے نصاب میں داخل تھی۔ اس میں مصنف نے ایک سبق آموز واقعہ نقل کیا ہے: کوئی بادشاہ شکار کے لئے نکلا، جنگل میں اپنے ایک وزیر کے ہمراہ شکار کی تلاش میں دور تک نکلتا چلا گیا، پیاس لگی تو پانی کی تلاش میں ایک گاؤں کے کنارے پہونچ گئے، ایک بوڑھا کسان گنے کا رَس کولھو کے ذریعہ نکال رہا تھا، بادشاہ نے پانی مانگا، بوڑھا یہ تو نہ جان سکا کہ یہ کون لوگ ہیں، لیکن چہرے بشرے سے تاڑ گیا کہ بڑے لوگ ہیں، اس نے اپنی حیثیت کے مطابق عزت واکرام سے بیٹھایا اور ایک گنّا کولھو میں لگایا، اور ایک بڑے پیالے میں اس کا رَس بھر کر حاضر خدمت کیا، بادشاہ نے دیکھا کہ ایک گنے سے اتنا زیادہ رَس نکلا ہے تو اس نے دل میں خیال کیا کہ میرے ملک میں کسان بہت خوشحال ہیں، خوشحالی کے لحاظ سے ان پر ٹیکس کم لگایا گیا ہے، اسے بڑھانا چاہئے، یہ سوچ رہا ہے اور رس پی رہا ہے۔ اس کے بعد وہ بوڑھا پیالہ لے کر لوٹا کہ اب دوسرے ساتھی کے لئے رَس نکالے، اب کے اس نے کئی گنے کولھو میں لگائے تب پیالہ بھر کر رَس نکلا، اس نے پیالہ حاضر کیا، بادشاہ اسے بھی دیکھ رہا تھا، اسے تعجب ہوا، اس نے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے کہ پہلے ایک ہی گنے سے اتنا رس نکلا کہ پیالہ بھر گیا اور اب جانے کتنے گنے تم نے لگا ڈالے تب پیالہ بھرا، کہنے لگا کہ وجہ تو اللہ ہی جانے، کھیت وہی، بیج وہی، گنا وہی، پھر اللہ ہی جانے اتنا فرق کیوں ہوا؟ مجھ کو ایسا لگتا ہے کہ ہمارے بادشاہ کی نیت خراب ہوگئی ہے، بادشاہ کو ایک زوردار طمانچہ لگا، اس نے اپنا ارادہ تبدیل کرلیا، اور پھر اس سے ایک پیالہ رس مانگا، اب کے پھر وہی ایک گنا اور وہی پیالہ رس سے لبالب! بادشاہ نے پھر اپنا سوال دہرایا کہ اب کیا حال ہے؟ بولا حضور معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بادشاہ کی نیت درست ہوگئی ہے۔

یہ محض ایک قصہ نہیں ہے سراپا حقیقت اور پکی صداقت ہے، تمام آسمانی کتابیں، سارے جہاں کی تاریخ اس کی شاہد ہے، یہ واقعہ جیسے کل سچا تھا آج بھی سچا ہے، حکومتوں کے ارادے کہاں کہاں تک اثر انداز ہوتے ہیں، اس کا ایک نمونہ اس مثال میں موجود ہے،

اندازہ کرنے والے اسی سے اندازہ کر سکتے ہیں۔

اب عام پبلک کی بات سنئے! ان کے حالات کا مشاہدہ کیجئے تو ہر شخص کا حال عجیب نظر آئے گا۔ خودغرضی، مفاد پرستی، جتنا بس چل سکے دوسروں کو دبانا، طاقت کے بقدر ظلم وغیرہ، ایک عجیب افراتفری کا عالم ہے، اس حالت میں کیا توقع خیر کی ہو سکتی ہے، اور کیا امید کی جا سکتی ہے کہ اس الیکشن کے طوفانِ بلاخیز سے کوئی اچھی حکومت ابھر سکتی ہے۔

ایک بزرگ سے کسی نے ظالم حکمراں نے شکایت کی، تو انھوں نے ارشاد فرمایا کہ دو یار ہم سفر تھے، ایک نے کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے سلطنت عطا فرمائے تو ایسا عدل وانصاف کروں اور جود وکرم کی وہ داد دُوں کہ کبھی کسی نے سنا بھی نہ ہو۔ دوسرا بولا کہ اگر میں بادشاہ ہو جاؤں تو ہر روز ایک آدمی کو قتل کیا کروں، اور ایسے ایسے ظلم ایجاد کروں کہ جو کسی کے خیال میں بھی نہ گزرے ہوں! خدا کی قدرت! کچھ مدت کے بعد وہ ظلم دوست آدمی صاحب تخت وتاج ہو گیا اور اپنے ارادہ ومنشا کے مطابق اس نے ایسے ایسے ظلم شروع کئے کہ تمام ملک میں شورِ قیامت برپا ہو گیا۔ اتفاقاً وہ عدل پسند یار بھی وہاں آنکلا، لوگوں نے اس کے روبرو واویلا کی کہ صاحب! بادشاہ آپ کا قدیم دوست ہے، کچھ تم ہی سمجھاؤ کہ جورِ بے حد سے باز آئے۔ اس نے تنہائی میں نصیحت کی کہ یار! کچھ تو خدا سے ڈر، کیوں خلقت کو تباہ کرتا ہے، اس نے جواب دیا! اے احمق! اگر اللہ کو لوگوں پر رحم کرنا منظور ہوتا تو مجھ کو دولت وسلطنت کیوں دیتا، تجھ ہی کو نہ بادشاہ بناتا، کیا تجھ کو یاد نہیں کہ میں نے اس سفر میں کیا کہا تھا؟

اس سے معلوم ہوا کہ بادشاہت خود سے نہیں برپا ہوتی، خدا جس کو چاہتا ہے بادشاہت عطا فرماتا ہے، ارشاد ہے: **قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِیَدِکَ الْخَیْرُ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ o**

تم کہہ دو کہ اے اللہ، اے ملک کے مالک آپ جسے چاہتے ہیں غلبہ عطا فرماتے ہیں اور جس کو چاہتے ہین ذلت کے گڈھے میں گرا دیتے ہیں، آپ ہی کے ہاتھ میں سب

خیر ہے، بلاشبہ آپ ہر چیز پر قادر ہیں۔

جب یہ ہے تو اللہ کے بندے اپنے احوال واعمال جیسا بناتے ہیں، اسی طرح کی حکومت مسلط کی جاتی ہے، اگر بندے اس لائق ہوتے کہ ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے تو اچھی حکومت لاتے۔

اگر واقعی اچھی حکومت درکا ہے تو رعایا میں ایمان داری، سچائی، باہمی ہمدردی، خیر خواہی کا چلن عام ہونا چاہئے، ورنہ بدچلن رعایا بدچلن حاکم ہی کا انتظار کرے، بالخصوص مسلمان جن کو یہاں کی حکومت سے سب سے زیادہ شکایت ہے۔ الیکشن کی تمام زور آزمائیوں کا یہ بارہا تجربہ کر چکے ہیں، نتیجہ ہمیشہ خلاف رہا، ہر اگلا دن پچھلے دن سے مشکل آتا گیا ہے، ان کے پاس تو زندگی کا ایک مکمل اور پاکیزہ دستور العمل ہے، یہ اس دستور العمل کو سیکھتے اور اپنے اوپر اس کو نافذ کرنے کا حوصلہ رکھتے، تو رنگ بدلتے دیر نہ لگتی، مگر ہماری حالت نہایت افسوسناک ہے، ہم دنیا میں دو ہی چیز دیکھتے ہیں، اپنا ہنر اور دوسروں کا عیب! جو کوئی ہنر دیکھتا ہے تو اپنی ذات تک محدود رہتا ہے، اور اگر کوئی عیب تلاش کرنا شروع کرتا ہے تو دوسرے سے اس کی ابتدا کرتا ہے، اپنے کو ہمیشہ مستثنیٰ کر لیتا ہے۔

ہم حکومت کو کیا مخاطب کریں کہ اس کے ایوانِ بلند تک ہماری ضعیف آواز کی رسائی کہاں؟ ہم غیر مسلموں سے کیا کہیں کہ ان کے سوچنے اور سمجھنے کا انداز تک ہم سے میل نہیں کھاتا، ہم اپنے بھائیوں کو یعنی اسلام کے نام لیواؤں کو پکار سکتے ہیں اور پکارتے ہیں کہ یہ تو اپنے دستور العمل (قرآن وحدیث) کا پاس ولحاظ رکھیں، علماء ومشائخ اس کے اولین ذمہ دار ہیں، پھر عوام پر لازم ہے کہ ان علماء ومشائخ سے اپنے اعمال وکردار کی اصلاح کرائیں، تاکہ خدا تعالیٰ راضی ہوں اور وہ اپنے اختیار سے حکومت میں کوئی بڑی تبدیلی پیدا کریں۔ **وما ذٰلک علی اللہ بعزیز**

(ستمبر ۲۰۰۱ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حالات کے بحران میں دستور العمل

ہمارے ملک کے حالات رفتہ رفتہ وہ رخ اختیار کرتے جا رہے ہیں جس سے علماء کرام، مسلم سیاسی زعماء اور عام مسلمانوں میں بے چینی اور بے یقینی کی کیفیت بڑھتی جا رہی ہے، ہم نے پہلے انھیں صفحات میں ذکر کیا تھا کہ موجودہ حکومت ملک کے حق میں عموماً اور مسلمانوں کے حق میں خصوصاً بدنیت ہے، اس کی بدنیتی کے مظاہر وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتے رہتے ہیں، یہی بدنیتی تھی جس نے اجودھیا کی ایک تاریخی مسجد کو منہدم کرایا، اور اس کے نتیجے میں ملک بھر میں فسادات کی ایک لہر چل پڑی، اور پھر اس کے بعد خدائی قہر کا کوڑا بھی خوب برسا، پھر جب سے مرکز میں موجودہ حکومت بنی ہے اس کی بدنیتی کا ظہور جلد جلد ہونے لگا ہے۔ اس حکومت کو..... حکومت ہی کیا..... اور ہر شخص کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کو دینی استقامت، مذہبی پختگی اور اسلامی تشخص بخشنے کا عمل ان مدارس دینیہ میں انجام پاتا ہے جن کے قیام و بناء کا آغاز اسی وقت ہوا تھا جب ہندوستان میں مسلمانوں کی مغلیہ حکومت کا چراغ جھلملا جھلملا کر ۱۸۵۷ء میں بجھ گیا تھا۔ دار العلوم دیوبند قائم ہوا، اس کے بعد مدارس کا سلسلہ چل نکلا، مدارس ہی کے طفیل ہندوستان میں مسلمان بچے رہے، اسلامی تشخص بچا رہا، ان مدارس سے اتنے طاقتور علماء اٹھے جو حکومتوں سے بے تکلف ٹکرا سکتے تھے، وہ انگریزی سامراجیت سے ٹکرائے، اور ایسا ٹکرائے کہ اسے پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ ۱۹۴۷ء میں جب ملک تقسیم ہو گیا تو ہندوستان کے مسلمان ایک مرتبہ پھر لہولہان ہو گئے، اور اندیشہ ہو چلا تھا کہ پاکستان بننے کے انتقام میں یہاں کی اکثریت انھیں نگل جائے گی، لیکن یہ علماء ہی تھے جنھوں نے اللہ کی توفیق سے مسلمانوں کو، ان کے دینی وجود کو، ان کے اسلامی قانون و شریعت کو سنبھالا اور بچایا۔

یہ علماء، یہ شاہین کا جگر رکھنے والے علماء، عقاب کی نگاہ رکھنے والے علماء کہاں بنتے اور کہاں ڈھلتے ہیں؟ یہ مدارس ہی ہیں جہاں سے ہر ضرورت کے وقت ایک سے ایک جگردار اور دور اندیش علماء پیدا ہوتے ہیں، دنیا چاہے انھیں کتنا ہی رجعت پسندی اور بنیاد پرستی کا طعنہ دے، مگر دین اسلام کی حفاظت میں جان لڑا دیتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ جب تک یہ مدارس ہیں اور جب تک یہ علماء ہیں، مسلمان کا جسم تو لہولہان ہوسکتا ہے، اس کا مال تہس نہس ہوسکتا ہے مگر اس کی روح فنا نہیں ہوسکتی ہے۔ حکومت نے بھی یہ سمجھا اور اس نے سازشوں کا رُخ ادھر پھیر دیا۔ ایک غُل مچا ہوا ہے کہ مدارس کے اندر صرف دینی تعلیم نہیں ہوتی بلکہ تخریب کی مشق کرائی جاتی ہے، بغاوت کے لاوے پکائے جاتے ہیں، اللہ جانے کن کن تباہ کاریوں کا مرکز انھیں بتایا جاتا ہے، بے بنیاد الزام! بے حقیقت تہمت! لیکن اس زور وشور سے انھیں پھیلایا جاتا ہے جیسے یہی حقیقت ہو، پہلے تو ملک کے سرحدی مدارس کو خطرے کا نشان بتایا گیا، اب آگے بڑھ کر دارالعلوم دیوبند کو.....جو اس ملک میں جدوجہد آزادی کا بڑا مرکز رہ چکا ہے .....نشانہ بنایا جارہا ہے، یوم آزادی کے موقع پر اس سے کچھ دنوں پہلے سے خاص دیوبند میں اس کے خلاف سرگرمیوں کے آثار پائے جارہے تھے، پھر کچھ روز پہلے ٹرین میں ایک بم دھماکہ ہوا، جس میں دارالعلوم دیوبند کا ایک طالب علم شہید ہوگیا اور تین زخمی ہوئے، اور پھر الزام انھیں پر رکھا گیا کہ اس دھماکہ کے مجرم یہی تھے، حالانکہ بعد میں یہ بات غلط ثابت ہوئی، لیکن جو بات آگ کی طرح پھیل جاتی ہے اس کو محو کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

ان حالات سے مسلمان بہت وحشت زدہ اور کبیدہ خاطر ہیں، اور ہونا بھی چاہئے کیونکہ قومی پیمانے پر انھیں ہراساں کرنے اور پھر مٹا دینے کا منصوبہ ہر وقت زیر غور رہتا ہے، بلکہ بروئے کار آتا رہتا ہے، لیکن مسلمانوں کی خدمت میں عرض ہے کہ ؎

دشمن اگر قوی ست نگہباں قوی تر ست

دشمن اگر مضبوط ہے تو نگہبان اس سے کہیں زیادہ طاقتور ہے۔

مسلمان وحشت میں مبتلا نہ ہوں، نہ کچھ خوف کریں، مسلمان بزدل نہیں ہوتا، اس

کا مرکز قلب اور مطمحِ نگاہ صرف اور صرف ایک ہے، یہ مشرک نہیں کہ کمزور خداؤں سے مایوس ہوجائے، یہ موحد ہے، اس کا ایمان اللہ پر ہے جس کے اشارے پر ساری کائنات ہے، مشرک تو عذابِ دائمی میں گرفتار ہے، شرک کی ظاہری اور عارضی چمک دمک سے نگاہیں اگر خیرہ ہوگئیں تو تَوحید اور ایمان کی سخت توہین ہے، مسلمانوں کو صرف اس کی ضرورت ہے کہ ان ناموافق حالات میں جبکہ بحالت موجودہ طاقت کے مجتمع کرنے اور اسے استعمال کرنے سے یکسر مجبوری ہے، شریعت اسلامی کے احکام معلوم کریں اور بغیر کسی تذبذب کے ان پر جم جائیں اور یقین کی قوت کے ساتھ ان پر عمل پیرا ہوجائیں، پھر دیکھیں کہ ان کی مدد کے لئے آسمان سے فرشتے اتر آئیں گے۔

اِنَّ الَّـذِيْـنَ قَـالُـوْا رَبُّـنَـا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰئِكَةُ اَنْ لَّا تَـخَافُوْا وَلَاتَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِىْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ، نَحْنُ اَوْلِيَاءُ كُمْ فِى الْـحَيٰـوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ وَلَكُمْ فِيْهَا مَاتَشْتَهِىْ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَاتَدَّعُوْنَ نُزُلاً مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ. (سورہ حم السجدۃ: ۳۰، ۳۱، ۳۲)

بیشک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر اپنے اس قول پر مضبوط رہے، ان پر فرشتے مسلسل اُترتے ہیں کہ نہ کچھ اندیشہ کرو، نہ افسوس میں پڑو اور جنت کی خوش خبری حاصل کرو، جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا ہم تمہارے دوست ہیں دنیاوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی، اور تمہارے لئے اس میں ہر وہ چیز ہے جو تمہارا جی چاہے، اور تمہارے لئے اس میں ہر وہ چیز ہے جو تم مانگو، یہ سب سامان مہمانی ہے، مغفرت کرنے والے رحم وکرم کرنے والے کی جانب سے۔

یہ اللہ کا فرمان ہے، جو ہر قسم کے شک وشبہے سے پاک ہے، اور اگر مسلمان ہوکر مسلمان ہونے کی وجہ سے، اسلام پر ثابت قدم ہونے کی وجہ سے ستائے جاتے ہیں، مارے جاتے ہیں، لوٹے جاتے ہیں، تو کچھ غم نہیں، جس ذات کے نام پر ستائے جارہے ہیں، مارے جارہے ہیں، لوٹے جارہے ہیں، اس کو سب خبر ہے، ہر دشمن اس کی گرفت میں ہے،

اور مسلمان کی تو بڑی سعادت ہے اس کے پروردگار کے نام پر اور اس کی وجہ سے ستایا اور مارا جائے۔ مارے گئے تو شہید ہیں، جن کے بارے میں پروردگار کا حکم ہے کہ انھیں مردہ نہ سمجھو، وہ زندہ ہیں انھیں روزی ملتی ہے، اور اس دنیا سے کہیں بڑھ کر انھیں بڑے بڑے انعام سے نوازا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود ارشاد فرماتے ہیں: فَالَّذِیۡنَ ھَاجَرُوۡا وَاُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِیَارِھِمۡ وَاُوۡذُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِیۡ وَ قٰتَلُوۡا وَقُتِلُوۡا لَاُکَفِّرَنَّ عَنۡھُمۡ سَیِّاٰتِھِمۡ وَلَاُدۡخِلَنَّھُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِھَا الۡاَنۡھَارُ ثَوَاباً مِنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ عِنۡدَہٗ حُسۡنُ الثَّوَابِ (آل عمران) پھر وہ لوگ جنھوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے، اور میری راہ میں ستائے گئے اور لڑے اور مارے گئے، ان سے ان کی برائیاں دور کردوں گا، اور ان کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، یہ اللہ کی جناب سے بدلہ ہے، اور اللہ کے پاس بہترین ثواب ہے۔

ان آیات میں جو چند چیزیں اللہ نے ذکر فرمائی ہیں، یعنی (۱) ہجرت کرنی (۲) گھروں سے نکلنے پر مجبور کیا جانا (۳) اللہ کی راہ میں ستایا جانا (۴) جہاد کرنا (۵) اور پھر شہید ہونا۔

مسلمان نہ مرنے سے گھبراتا ہے اور نہ ستائے جانے سے، بشرطیکہ وہ اللہ کے لئے ہو، کسی اور مقصد سے مارا جانا یا ستایا جانا اس کے لئے باعث ننگ ہے، مگر اللہ کے لئے یہ سب ہو تو صد رشک عبادت ہے۔

پس یہ حالات ایک مسلمان کے لئے مایوسی کا سبب نہیں ہیں، وہ اللہ سے امید کبھی نہیں توڑتا، اس کی قدرت میں ہے جب چاہے حالات کو پلٹ دے۔

پس اے مسلمانو! ☆ اللہ کی اطاعت کرو، ☆ رسول کی سنت پر چلو، ☆ نمازوں کی پابندی کرو، ☆ صرف اللہ سے مدد مانگو، کسی اور آستانے پر مت جھکاؤ، ☆ بدعت سے اجتناب کرو، ☆ دل سے کینہ کپٹ کو دور کرو، ☆ حقوق کے ادا کرنے میں سبقت کرو، ☆ کسی کا حق نہ مارو، نہ ستاؤ، ☆ وراثت کو شرعی قانون کے مطابق تقسیم کرو، ☆ اپنی ظاہری

شکل وصورت کو شریعت کے مطابق رکھو۔ داڑھی بڑھاؤ، مونچھوں کو ترشواؤ، ☆ ہر ناجائز آمدنی سے پرہیز کرو، ☆ غلط خرچ سے خود کو بچاؤ، ☆ جھوٹ سے، تہمت تراشی سے، غیبت سے، آبروریزی سے اپنی مجلسوں کو پاک رکھو، ☆ مال بقدر نصاب ہو اور سال گزر جائے تو فوراً زکوٰۃ ادا کرو، ☆ حج کی استطاعت ہو جائے تو بلا تاخیر حج کرو، ☆ رمضان شریف کے روزے رکھو اور تراویح کا اہتمام کرو۔

یہ وہ چیزیں ہیں جن سے کوئی نہیں روک سکتا، اتنا کرلو تو دیکھنا کیسا انقلاب آتا ہے، جس کی آج طاقت نہیں ہے، کل وہ کام آسان ہوگا، کوئی حکومت کسی کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی، خیر وشر سب خدا کی قدرت میں ہے، ان کی بات مانو اور اطمینان سے ان پر توکل کرو: وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ، (سورۃ الطلاق: ۳) جو اللہ پر بھروسہ کرتا ہے، اللہ اس کو کافی ہے۔

قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ ۔ (سورۃ الملک) کہہ دو وہی رحمٰن ہے، اسی پر ہم ایمان لائے اور اسی پر ہم نے توکل کیا، جلد ہی تم کو معلوم ہو جائے گا کہ کھلی ہوئی غلطی اور گمراہی پر کون تھا۔

(اکتوبر ۲۰۰۱ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

طاقت کا نشہ اور اس کا انجام

طاقت کا نشہ بھی عجیب ہوتا ہے۔ طاقت دی ہوئی خدا کی ہوتی ہے اور اتراتا اٹھلاتا آدمی ہے! کتنا نادان ہے وہ جو خود کو دانا کہتا ہے، کیا جو چیز اپنی ملکیت میں نہیں ہے اس پر بھی اترایا جاتا ہے؟ حکومت مل گئی تو یہ اتراتا ہے، دولت مل گئی تو دماغ نہیں ملتا، اسباب وآلات ہاتھ آ گئے تو خدائی پر اتر آیا، اس سے عقل مند تو وہ ڈاکیہ ہے جس کے تھیلے میں بہت ساری رقم ہے، مگر اسے ذرا بھی غرور نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ میری ملکیت نہیں ہے، میرے پاس امانت ہے، اور تھوڑی دیر کے بعد اس کا حساب پیش کرنا ہے، مگر بادشاہ سلامت ہیں کہ ہاتھ سے نکلے جا رہے ہیں، کہ حکومت مل گئی ہے۔ ایک صاحب کو مصر کی بادشاہت ملی تھی، وہ خدا بن بیٹھے۔ ایک صاحب عراق میں تخت وتاج کے مالک ہوئے، ان کے سر میں بھی خدئی کا سودا سمایا، اور اللہ جانے کتنے لوگوں پر طاقت وحکومت کا نشہ چڑھا اور خدائی تک پہونچے، لیکن ان سب خداؤں کا حشر کیا ہوا؟ پنپ سکی ان کی خدائی؟ ایک پانی میں ڈوبا، تو دوسرا کسی اور عذاب میں گرفتار ہوا۔

کسی زمانہ میں سپر پاور کی مالک ایک قوم تھی، اس کو جب خدا سے اور خدا کے عذاب سے ڈرایا گیا، تو اس قوم نے بڑے طنطنے سے جواب دیا: مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً۔ ہم سے زیادہ کس میں زور ہیں۔ اس نے غرور سے سر اونچا کر رکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: فَـأَمَّـا عَـادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۔ وہ جو عاد تھے، وہ ناحق ملک میں غرور کرنے لگے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم سے زیادہ طاقتور کون ہے؟ تفسیر موضح القرآن میں ہے کہ ”ان کے جسم بہت بڑے بڑے ہوتے تھے، بدن کی قوت پر غرور آیا، غرور کا دم بھرنا اللہ کے وہاں

وبال لاتا ہے۔'' اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اَوَلَمْ یَرَوْا أَنَّ اللهَ الَّذِیْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً۔ (سورہ حم السجدہ) کیا انھوں نے یہ نہیں دیکھا اللہ جس نے انھیں پیدا کیا ہے، وہ ان سے کہیں زیادہ طاقتور ہے۔

پھر جب اللہ کی طاقت ظاہر ہوئی، تو جو جہاں تھا وہیں بجھ گیا، ہوا کا ایک طوفان آیا اور درختوں جیسی لاشیں ہر طرف بکھرتی چلی گئیں۔ بعد کی قومیں اگلی قوموں کے حالات سے سبق نہیں لیتیں، طاقت کا نشہ پہلے خدا ہی سے انسان کو کاٹتا ہے، یہ نشہ آدمی کو، اسی آدمی کو جو اپنی پیدائش کے وقت اتنا کمزور تھا کہ ایک ہلکا جھٹکا برداشت نہیں کرسکتا تھا، خدا سے نڈر بنا دیتا ہے، وہ اپنی طاقت کے نشے میں مظالم کا ڈھیر لگا دیتا ہے۔

ابھی کتنے دنوں کی بات ہے، ایک صدی بھی نہیں بیتی ہے، ایک قوم نے اپنے ملک (روس) سے خدا کو باہر کردیا، بڑی گستاخیاں کی تھیں، مدارس بند کرادئے، مساجد کو ویران کردیا، خانقاہیں تباہ کردیں کہ ان میں خدا کا نام لیا جاتا ہے، مگر جن آنکھوں نے یہ گستاخیاں اور شوخ چشمیاں دیکھی تھیں، انھیں آنکھوں نے یہ بھی دیکھا کہ یہ نشہ اتر گیا۔ پھر خدا کا نام لینے والے ایک نہیں متعدد ملک ابھر کر سامنے آگئے، وہ طاقت زوال کا شکار ہوگئی۔ اب ایک ہی صاحب (امریکہ) رہ گئے، جو مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (ہم سے زیادہ کون طاقتور ہے) کے نشہ میں چور تھے، جس پر چاہا ہاتھ چلا دیا، پاؤں سے روند دیا، کھانا پانی بند کردیا۔ باقی سب مارے خوف کے ''جی حضور'' ''جی حضور'' کا وظیفہ پڑھنا اپنی سعادت سمجھتے رہے۔ یہ صاحب ایک طرف اسرائیلی کتے کو غرانے اور کاٹنے کے لئے غذا مہیا کرتے رہے اور دوسری طرف مقابل والوں کو تھپک کر سلانے کی بھی کوشش کرتے رہے۔ ایک طرف ایک ملک کو اکسایا کہ ہاں شاباش! فلاں ملک کو ہڑپ لو، پھر اس کو ڈانٹا کہ کمبخت تو نے کیوں ایسا کیا، ہم تجھ پر بم ماریں گے، وغیرہ۔

کون جانتا تھا کہ یہ طاقتور ملک سرحد پر نہیں، اپنے عین قلب میں اتنی بڑی مار کھائے گا کہ اس کی کمر دہری ہوجائے گی، جس کی ہوشیاری اور خبرداری کا عالم یہ ہے کہ کوئی

کہیں کان کھجلائے ہم کو خبر ہو جاتی ہے، وہ اتنا بے خبر ہے کہ ٹھوکنے والے عین دل پر ٹھونکتے ہیں، آنکھوں کے سامنے آکر ٹھونکتے ہیں اور پتہ نہیں چلتا۔ کچھ تو یہ ملک سبق لیتا، دوسرے دیکھنے والے سبق لیتے، کہ یہ انہونی کہاں سے ہوگئی؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اللہ کی طرف سے جواب آگیا ہو کہ **اَوَلَمْ یَرَوْا أَنَّ اللّٰہَ الَّذِیْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً۔** (سورہ حم السجدہ) کیا انھوں نے یہ نہیں دیکھا اللہ جس نے ان کو پیدا کیا ہے، ان سے بہت زیادہ طاقتور ہے۔ نہیں دیکھا تھا تو اب دیکھو، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم دنیا میں دیکھنا چاہتی ہی نہیں، اتنا انہونا اور بھیانک واقعہ آنکھوں کی غلیظ ترین پٹی کو کھولنے کے لئے کافی ہے، مگر آہ! غافل انسان نے اور موٹی موٹی پٹیاں آنکھوں پر چڑھالی ہیں، وہ یہ ڈھونڈھ رہا ہے، کہ کس نے یہ ”دہشت گردی“ کی ہے، اور جب کوئی نہیں ملتا تو اتنا بڑا اور اتنا طاقتور ملک ایک ایسے فرد واحد پر الزام لگاتا ہے جو نہ کسی ملک کا بادشاہ ہے، نہ وہ اپنے ملک میں داخل ہوسکتا ہے، سب سے کٹا خانہ نشین کی حیثیت سے روپوش ہے۔ ایک ہاتھی پاگل ہوکر دوڑ رہا تھا، کیا بات ہے؟ مجھے ایک چیونٹی نے کاٹا ہے، اس کو ڈھونڈ رہا ہوں، ارے اسے تم اپنے سے باہر کہاں ڈھونڈ رہے ہو، تباہی کا تمام سامان تو تمہارے اندر بھرا پڑا ہے، کتنے شرم کی بات ہے، مگر وہ بڑا بے شرم ہے، جو ایک آدمی کو بے تحقیق مجرم قرار دے کر اس کی تلاش میں پاگل ہو رہا ہے اور اکیلا نہیں سب کو بلا رہا ہے، کہ آؤ میرے ساتھ مل کر اس اکیلے آدمی کو پکڑو، پھر شاید کسی نے شرم دلائی ہو، کچھ دنوں کے بعد اس نے دنیا بھر کی ”دہشت گردی“ ختم کرنے کا عنوان اختیار کیا ہے، کاش وہ یہ نہ کرتا، اپنے اندر کے فرعون کو ڈھونڈھتا، اسے سزا دیتا تو دنیا کو راحت مل جاتی، کاش اسے معلوم ہوتا کہ یہ انسان کی مار نہیں ہے، تم نے تو اس کا پورا انتظام کر رکھا تھا۔ یہ درحقیقت خدا کی مار ہے، اس سے تم کتنا لڑو گے، اب ایک چھوٹے سے ملک (افغانستان) پر غرانا بے کار ہے، اس سے الجھ کر کہیں تمہاری رہی سہی طاقت بھی نہ ختم ہو جائے، اسی سے وہ ملک بھی الجھا تھا جس کا شیرازہ بکھر گیا، اب تم بھی اسی سے الجھنے چلے ہو، کہیں تمہارے اپنے لالے نہ پڑ جائیں، بچو اس انجام سے جو ظالموں کا مقدر ہے۔

یہ گفتگو تو ان سے تھی جو طاقت کے نشہ میں سوجھ بوجھ سے محروم ہو گئے ہیں، چاہے وہ کتنا ہی سوجھ بوجھ کا دعویٰ کریں۔ اب کچھ باتیں خود اپنوں سے بھی کر لی جائیں، یعنی اسلام کے نام لیواؤں سے! کاش کہ یہ حروف ونقوش ان لوگوں تک بھی پہونچتے جو مسلم ممالک کی سربراہی کر رہے ہیں، جن کے دلوں میں غیر اللہ کا خوف اتنا گھسا ہوا ہے کہ ان کے اشارے کے بغیر شاید وہ پلک بھی نہیں جھپکا سکتے کیا ہم کو ہمارے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہی تعلیم دی ہے کہ دنیا کی حقیر و بے مایہ طاقتوں سے اس درجہ خائف اور مرعوب ہو جاؤ کہ حق کی آواز تمہارے گلے میں پھنس کر رہ جائے؟ یہ تم کس سے ڈر رہے ہو، جو خدا سے بالکل نہیں ڈرتے، تمہارے پاس تو ایک ہی ہستی ہے جس سے ڈرنا برحق ہے، اگر تم اس کے مقابلے میں دوسرے سے ڈر گئے تو کیا یہ شرک نہ ہوگا۔ ایک بڑا ''دہشت گرد'' ہے، وہ کہتا ہے کہ یا تو تم میرا ساتھ دو، ورنہ تم خود دہشت گرد ہو، تو تم اس اعلان کو سنتے ہو اور جلدی سے سر ہلا دیتے ہو کہ ہاں ہم تمہارے ساتھ ہیں، چاہے اس کے لئے ہم کو اپنے ہی لوگوں کی گردن مروڑنی پڑے۔ أَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللّٰهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَوْهُ ۔ کیا تم ان سے ڈرتے ہو، حالانکہ ڈرنا تو صرف اللہ سے چاہئے۔

ذرا دیکھو تو سہی، تم میں سے ایک شخص (اسامہ بن لادن) نے ڈرنے سے انکار کر دیا، تو یہ سپر پاور طاقتیں اس سے کس قدر خوف زدہ ہیں، خوف کے مارے اسے تلاش بھی نہیں کر پا رہی ہیں، تم نے ان طاقتوں سے خوف کیا تو اس شخص کو جلاوطن کر دیا، اور وہ نہیں ڈرا تو سب اس سے کانپ رہے ہیں، ایک چھوٹے سے غریب ملک نے بھی ان طاقتوں کا خوف نہیں کیا اور بے دھڑک اسے پناہ دیدی، تو اس سے بھی سب گھبرا رہے ہیں، اور وہ خود مطمئن ہے، خدا سے ڈرو تو سب تم سے ڈریں گے، اور اس کے مقابلے میں دوسروں سے ڈروگے تو ہر طرح کا خوف تم کو اپنے نرغے میں لئے رہے گا۔

اور عام مسلمانوں سے بھی کہنے کو جی چاہ رہا ہے..... یہ سطریں لکھنے والا بھی عام مسلمانوں کا ایک فرد ہے، خود یہ بھی مخاطب ہے..... کہ تمہارا کوئی نہیں، نہ تم کسی کے ہو، صرف

اللہ تمہارا حامی وناصر ہے، اور تمہارا تعلق صرف اللہ سے ہے، تم تو سراپا اطاعت بن جاؤ، آپس کے اختلافات بھول کر ایک دوسرے کے ہمدرد بنو، آپسی دشمنی چھوڑو، غیر اللہ کا ڈر دل سے نکالو، ہر معاملے میں اوّل خدا کی جانب رجوع ہو، پھر اسباب کی طرف جاؤ۔ نماز پنجگانہ، ذکر وتلاوت، زکوۃ وصدقات، روزہ وحج کا اہتمام کرو، اللہ کی نافرمانی سے اس طرح دور بھاگو جیسے سانپ بچھو سے بھاگا جاتا ہے، پھر جو بھی دشمن آئے کچھ پرواہ نہیں، تم آپس میں دشمن نہ ہو، تو تمہارا دشمن دور ہی سے تھرائے گا۔ غیر اللہ کا ڈر دل سے نکل جائے گا، تو ہر مخلوق تم کو سلام کرے گی، اور اول خدا کی جانب حاجات میں رجوع کروگے تو اجابت وقبولیت خود بڑھ کر استقبال کرے گی، عبادات میں سرگرم رہو گے تو تمہاری روحانیت طاقتور ہوگی، اور اسباب کی ضرورت کم سے کم ہوجائے گی، مدد الٰہی کا مسلسل نزول ہوگا، اور مسلمان کی کامیابی نصرت الٰہی ہی سے ہے، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آخرت کی ابدی زندگی دائمی عیش وراحت سے ہمکنار ہوگی۔

اور یہ طاقتیں جن کا خوف دلوں میں سمایا ہوا ہے، ان کی کل زندگی یہیں تک ہے، ان کا سارا سرمایہ ’’متاع الغرور‘‘ (دھوکے کا سامان) ہی ہے، پھر جہاں آنکھ بند ہوئی اور وہ ایمان خالی رہے، بس ثُمَّ لَا یَمُوْتُ فِیْھَا وَلَا یَحْییٰ (نہ موت آئے گی نہ زندگی) کا منظر ہوگا، اس وقت کوئی ایٹمی توانائی کام نہیں دے گی، نہ میزائلیں، نہ جنگی طیارے، نہ سمندری بیڑے، سب غرق ہوکر رہ جائیں گے، اور طاقت کے نشہ میں غرور سے بھرا ہوا سر ’’ویل وثبور‘‘ پکارتا رہے گا کہ ہائے موت آجاتی، میں مرجاتا، لیکن سب پکار بے کار ہوگی، کاش یہ بات دلوں میں اتر جاتی اور اسی زندگی میں اثر کرجاتی۔

(نومبر ۲۰۰۱ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہِ رمضان کی برکتیں

ماہِ مبارک رمضان المقدس سایہ فگن ہے، نیکیوں کا موسم بہار! طاعتوں اور عبادتوں کا مرکز انوار! نزول قرآن کا مہینہ، برکت ورحمت اور مغفرت کا خزینہ! دن بھی روشن، رات بھی روشن، دن کے اوقات روزوں سے معمور، رات کی گھڑیاں تراویح وتہجد سے پُرنور! ہر روز روزِ عید اور ہر شب شبِ برأت!

ماننے والوں کو اللہ نے وہ نعمت عطا فرمائی کہ ایک رات کی محنت وعبادت پر ہزار راتیں قربان! یقین کرنے والا دل چاہیئے، کرگزرنے والی دھن چاہیئے، رحمت پروردگار آغوشِ کرم کھولے ہوئے ہے، عبادت کرنے والے عبادت کی سوغات لائیں، قرآن پڑھنے والے تلاوت کا تحفہ لائیں، یاد کرنے والے ذکر کا ہدیہ لائیں، گناہگار اشک وندامت اور استغفار کی پونجی لائیں، قبولیت کی گھڑی ہے، یہ سال بھر کا جشن بہاراں ہے، ہر عبادت کی رونق بڑھی ہوئی، ہر طاعت کی قیمت چڑھی ہوئی۔ **يَا بَاغِيَ الْخَيْرِ أَقْبِلْ** ! اے طالبِ خیر آگے بڑھ! **يَا بَاغِيَ الشَّرِّ أَقْصِرْ** ! اور اے طالب شر! ٹھہر۔

دیکھنے والے دیکھیں! پیغمبر ﷺ کی آنکھ سے دیکھیں، ان کی دی ہوئی خبر پر ایسا یقین کریں گویا وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، پیغمبر صادق ومصدوق کی خبر ہے، نقل کرنے والے امام بخاری اور امام مسلم ہیں، اور ان کے علاوہ محدثین کی ایک بڑی جماعت سے فرماتے ہیں: **إذا جاء رمضان فتحت أبواب الجنة وغلقت أبواب النار وصفدت الشياطين** ۔ جب رمضان کا مہینہ آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، آگ کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں اور شیاطین کو بیڑیوں میں جکڑ دیا جاتا ہے۔

جنت کے دروازے کھلے تو رحمت کا دروازہ کھلا، اور آسمان سے موسلا دھار رحمتیں زمین پر برسیں، جہنم کے دروازے بند ہوئے تو عذاب کی لپک کم ہوئی، شیاطین جکڑے گئے تو گناہوں کی لپٹ ٹھنڈی ہوئی، ہر طرف فرشتوں کی دھوم دھام ہوئی۔

مبارک ہیں ایمان والے! ایمان کا تقاضا ہے کہ خواہشات اور ضروریات کو مرضی مولیٰ پر قربان کر دیا جائے، ایمان والا بے تکلف قربان کرتا ہے، سنو اے ایمان والو! پیغمبر علیہ السلام کا ارشاد سنو اور خود قربان ہو جاؤ، زندگی کی سب سے بڑی سعادت یہی ہے کہ آدمی اپنی زندگی کو ان کے فرمان والا شان پر نچھاور کر دے۔

ہمارے پاس کیا ہے؟ جو فدا کریں تجھ پر
مگر یہ زندگی مستعار رکھتے ہیں

ہائے! اوّل تو ہمارے پاس کوئی ایسی چیز نہیں جو اے پروردگار آپ پر قربان کریں، بس ایک جان ہی تو ہے، لیکن حسرت بالائے حسرت یہ ہے کہ وہ بھی اپنی نہیں آپ ہی کی دی ہوئی ہے، خیر یہ ہی سہی، قبول ہو جائے تو کرم ہی کرم ہے، وہ فرمان والا شان یہ ہے، حضرت سلمان فارسی ؓ راوی ہیں، شعبان کا آخری دن ہے، اللہ کے آخری نبی منبر پر تشریف فرما ہیں، اور ارشاد فرما رہے ہیں:

”اے لوگو! تمہارے سروں پر ایک بابرکت اور عظیم الشان مہینہ سایہ ڈال چکا ہے، اس میں ایک رات ایسی ہے جو ہزار مہینوں سے بڑھ کر ہے، اللہ نے اس کا روزہ فرض اور اس کی رات میں نماز کو نفل قرار دیا ہے، اگر کوئی اس میں نفل ادا کر کے اللہ کا تقرب حاصل کرتا ہے تو وہ ایسا ہے جیسے اس ماہِ مبارک کے علاوہ میں فرض ادا کرنے والا ہو، اور جو کوئی اس میں فرض ادا کرتا ہے ایسا ہے جیسے اس کے علاوہ کسی ماہ میں ستّر فرض ادا کیا ہو۔ یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے، یہ غمخواری کا مہینہ ہے، یہ وہ مہینہ ہے کہ اس میں مومن کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے۔ جس نے اس ماہ میں کسی روزہ دار کو افطار کرایا اس کے گناہوں کی مغفرت ہے، اور اسے جہنم سے رہائی کی بشارت ہے، اور اس کے لئے وہی ثواب ہے جو روزہ دار کو ہے، مگر روزہ دار کا ثواب کچھ کم نہ ہوگا۔

پوچھنے والوں نے پوچھ لیا کہ یا رسول اللہ! ہر ایک کو اتنی وسعت کہاں کہ روزہ دار کو افطار کرائے؟ (اس سوال پر رحمت کا دامن پھیل گیا) ارشاد ہوا، یہ ثواب اس شخص کو بھی ملے گا جو ایک کھجور کھلا کر، ایک گھونٹ پانی یا لسّی پلا کر افطار کرا دے۔ یہ مہینہ! اس کا ابتدائی حصہ رحمت ہے، درمیانی حصہ مغفرت ہے، اور آخری حصہ جہنم سے نجات ہے۔ اس ماہ میں جس نے اپنے خادم کے کام میں تخفیف کر دی، اللہ تعالیٰ اس کو گناہوں کے بوجھ سے ہلکا کر دیں گے اور جہنم سے آزاد فرمائیں گے۔

اس مہینہ میں چار کام کثرت سے کرو، دو کام وہ ہیں جن سے تم اپنے رب کو راضی کر لو گے، اور دو کام ایسے ہیں جن سے تم بے نیاز اور بے پرواہ نہیں ہو سکتے، وہ کام جن سے تم اپنے رب کو راضی کرو، وہ یہ ہیں لا الٰہ إلا اللہ کی گواہی دو، اور اس سے مغفرت مانگو۔ اور وہ کام جن سے تم کو بے نیازی نہیں ہو سکتی، وہ یہ ہے کہ اللہ سے جنت کا سوال کرو اور جہنم سے اس کی پناہ چاہو۔ جس نے روزہ دار کو پانی پلایا، اس کو اللہ تعالیٰ میرے حوض سے ایسا پانی پلائیں گے کہ جنت میں داخل ہونے تک (میدان قیامت کی شدید گرمی میں) پیاس نہیں لگے گی۔ (ابن خزیمہ)

اس ارشاد گرامی میں فضائل بھی ہیں، بشارتیں بھی ہیں اور احکام بھی ہیں، ایمان والے ان فضائل کے لئے، ان بشارتوں کے لئے، اور ان احکام کے لئے سینہ کھول دیں اور شوق و رغبت سے انھیں قبول کریں، رمضان کا مہینہ پورے سال کا مرکزی مہینہ ہے، یہ ماہ مبارک، منبع انوار اور مرکز رحمت پروردگار ہوا، تو پورا سال روشن اور تابناک رہے گا۔

مسلمانو! اسی ماہ مبارک میں سستی اور غفلت کو ترک کرو، طاعت و عبادت کے لئے مستعد رہو، شوق اور اہتمام سے تمام حقوق کی ادائیگی کے ساتھ روزے رکھو، تراویح میں شریک رہو، تلاوت قرآن کا التزام کرو، کثرت سے کلمۂ طیبہ کا ذکر اور مسلسل استغفار کرو، اللہ سے جنت مانگو، اور جہنم سے خدا کی پناہ میں آجاؤ، پھر دنیا بھی نور ہے، آخرت نور بھی ہے۔

خوب خیال رہے کہ جہاں یہ مہینہ نیکیوں کی قدر و قیمت کو بڑھاتا ہے، عبادتوں کا ثواب آسمان پر پہونچ جاتا ہے وہیں برائیوں کی قباحت کو بھی بڑھا دیتا ہے، گناہوں کی سزا کو سخت کر دیتا ہے۔ ایک فرمان اور ملاحظہ ہو: **ما مر بالمسلمين شهر خير لهم منه ولا بالمنافقين شهر شر لهم منه** (ابن خزیمہ بحوالہ ترغیب وترہیب) مسلمانوں کے حق میں رمضان سے بہتر کوئی مہینہ نہیں آیا، اومنافقین کے حق میں رمضان کے مہینہ سے بدتر کوئی مہینہ نہیں آیا۔ ایمان والا، اس ماہ مبارک میں نیکیوں کا اہتمام کرتا ہے اور اس کی نیکیوں کا ثواب بڑھتا ہے، اس کے برخلاف منافق برائیوں میں مبتلا ہوتا ہے اور اس پر گناہ کا بوجھ بڑھ چڑھ کر لدتا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مبارک مہینہ میں برائیوں پر اقدام مومن کرتا ہی نہیں، برائی کی طرف وہی بڑھتا ہے جس کے دل میں ایمان کے بجائے نفاق ہو، پس ایمان ایمان والوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے آپ و نفاقی تہمت سے بچائے رکھیں۔

روزہ کی برکت اور روزہ کا نور گناہوں سے اجتناب کے ساتھ ہے، اگر آدمی گناہوں میں ملوث رہا تو روزہ کا نور مٹ جائے گا، تراویح کی برکت جاتی رہے گی۔

(دسمبر ۲۰۰۱ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

طالبان! رحمت یا زحمت؟

افغانستان جیسے کمزور اور بے سروسامان ملک پر دنیا کے سب سے بڑے سرمایہ دار اور اسلحہ بند ملک امریکہ نے ایک بہانہ بنا کر اس صدی کا بدترین حملہ کیا، طالبان نے جو افغانستان میں حکمراں تھے اپنے حوصلوں سے بڑھ کر مقابلہ کیا، اس بڑی طاقت کا اندازہ تھا کہ وہ چند دنوں میں افغانستان پر فتح کا پرچم لہرا دے گی، مگر مہینوں کی شدید بمباری کے بعد بھی اسے حوصلہ نہیں ہوا کہ اپنے کو فاتح کہہ سکے، وہ چار ماہ سے افغانستان پر مسلسل بم برسا رہا ہے، مگر ابھی تک اس کا مقصد حاصل نہیں ہوا، تاہم اس حملے نے، اور طالبان کی حکومت کے خاتمے نے دنیا کے سامنے اور بالخصوص مسلمانوں کے سامنے طالبان پر ایک سوالیہ نشان لگا دیا ہے کہ کیا طالبان آج کل کی اصطلاح میں ’’دہشت گرد‘‘ تھے۔

دنیائے اسلام کے عام مسلمانوں کا تاثر اور خیال تو یہ ہے کہ یہ لوگ ہرگز ’’دہشت گرد‘‘ نہ تھے، مسلم حکمرانوں کا جو بھی خیال ان کے متعلق ہو، ان کی ’’سیاسی ذہانت‘‘ کو سمجھنا ہم جیسے ملّانوں کے بس کی بات نہیں ہے، لیکن دنیا بھر کے مسلمان خواہ وہ علماء ہوں، یا انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کا سنجیدہ طبقہ یا اَن پڑھ عوام ہوں، سب کا تقریباً اتفاق ہے کہ اس دور میں طالبان اور ان کی حکومت، ایک بہترین انصاف پرور اور دینی و ایمانی قدروں کی محافظ تھی، جس نے صدیوں کے بعد افغانستان میں امن وامان کی عام فضا قائم کی، اور ایک مدت کے بعد دنیا کے سامنے اسلامی حکومت کا ایک بے لوث نمونہ پیش کیا، کفر کی حکومتیں چاہے انھیں کتنا ہی ’’دہشت گرد‘‘ اور فسادی کہیں، یہ تو کفر کی پرانی رِیت ہے۔ حضرت نوح

علیہ السلام کے دور سے رسول اللہ ﷺ کی بعثت تک تمام قوموں نے ایمان والوں کو اپنی اپنی بولی میں ’’دہشت گرد‘‘ ہی کہا ہے، مگر انسانیت نوازی، عدل وانصاف، تقویٰ وللّٰہیت اور پابندیٔ عہد و پیمان کی مثالیں ایمان والوں سے جس قدر وابستہ ہیں انھیں کوئی شمار نہیں کرسکتا، اور جن لوگوں نے انھیں ’’دہشت گرد‘‘ کہہ کر انھیں بدنام وذلیل کرنا چاہا، ان کی جھولی میں ظلم وجبر، مکروفریب، جھوٹ اور خیانت نیز بدعہدی وبے وفائی کی اتنی گندگی ہے کہ اس کے تعفن سے دنیا بھر بھر گئی ہے۔ طالبان نے تقریباً چھ سال نظام حکومت کو اسلامی طرز پر چلایا، پروپیگنڈوں اور جھوٹے ہتھکنڈوں کی بات اور ہے، لیکن کوئی افغانیوں سے پوچھے کہ باوجود غربت کے ان کے دلوں میں کتنا اطمینان وسکون تھا، ان کی نگاہوں میں کتنی پاکیزگی آگئی تھی۔

کفر نے اسلام کو کبھی برداشت نہیں کیا ہے، کیونکہ اسلام کی طاقت کبھی کفر سے نہیں ڈری، اور کفر نے اس کو ہمیشہ ڈرا کر رکھنا چاہا، اسلام کا کفر سے نڈر رہنا ہی کفر کے نزدیک ناقابل معافی جرم ہے۔ طالبان نے اسلام کو زندہ کیا تو کفر کی سب سے بڑی طاقت اپنے سینہ میں کینہ دبائے بیٹھی تھی، اسے ذرا موقع ملا اور اس کے دل کا کینہ آگ برسانے لگا۔

جب یہ حملہ ہوا تو ساری دنیا کے مسلمان اپنی اپنی بساط کے مطابق دعاؤں اور تدبیروں میں لگ گئے، ادھر چند صدیوں میں غالباً کسی حکومت کے لئے تمام دنیا کے مسلمانوں نے اتنی دعائیں، اتنی آہ وزاریاں نہیں کی ہوں گی جتنی اب کی گئی ہیں، ہر جگہ نمازوں میں قنوت نازلہ پڑھی گئی، اجتماعاً وانفراداً بہت اہتمام سے دعائیں کی گئیں، وہ لوگ جو عام حالات میں اللہ سے اور دین سے بیگانے معلوم ہوتے ہیں، وہ بھی اللہ سے دعا کرنے میں لگے ہوئے تھے۔

طالبان کیا اور کون ہیں؟

طالبان کیا اور کون ہیں؟ عام معنوں میں یہ سیاسی نہیں ہیں، وہ پہلے حکومت میں دخیل نہ تھے، وہ دینی مدارس کے اساتذہ وطلبہ ہیں، پڑھنے پڑھانے والے لوگ تھے، جب روس کے خلاف افغانستان جہاد کررہا تھا تو یہ مجاہدین کی صف میں شامل ہوگئے، یہ لوگ شوقِ

شہادت میں سرشار تھے، جب افغانستان روسیوں کے ناپاک قدموں سے پاک ہوگیا تو وہاں کے قبائلی اور سیاسی لوگ آپس میں خونریزی کرنے لگے، حکومت بنانے کی کشمکش شروع ہوگئی، جہاد کا مقصد پورا ہونے کے بعد طالبان اپنے مدرسوں میں لوٹ گئے تھے اور تعلیم وتعلم کے مشغلے میں لگ گئے تھے، لیکن انھوں نے دیکھا کہ اب خود مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا خون بہہ رہا ہے، آگ اور خون کی بارش ہورہی ہے، تو یہ علماء ومشائخ اور طلبہ دوبارہ میدان میں اترے، اور اس مقصد سے اترے کہ متحارب گروپوں کے درمیان صلح کرائیں۔

۱۹۹۷ء میں اللہ تعالیٰ نے اس ظلوم وجہول کو حج وزیارت کی سعادت بخشی، مدینہ طیبہ میں مشہور عالم دین حضرت مولانا مفتی عاشق الٰہی صاحب بلند شہری علیہ الرحمہ کے دولت کدے پر بندہ حاضر تھا، معلوم ہوا کہ طالبان کے ایک اہم رکن حضرت مفتی صاحب سے ملاقات کے لئے تشریف لارہے ہیں، وہ تشریف لائے، نہایت متواضع، خاشع وخاضع، ''نرم دمِ گفتگو'' اور ''گرم دمِ جستجو'' کے ہو بہو مصداق! معلوم ہوا کہ طالبان کے مفتی اعظم ہیں، طالبان کے تمام مسائل اور نظام حکومت میں انھیں کا فتویٰ حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے، دیر تک ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ طالبان کے بعض فیصلوں پر فقہی نقطۂ نظر سے حضرت مفتی صاحب نے علیہ الرحمہ نے اشکال کیا، انھوں نے جس ادب اور تواضع کے ساتھ کتابوں کے حوالے سے جواب دے کر مفتی صاحب کو مطمئن کیا، اس سے طبیعت بہت متاثر ہوئی، علم میں انتہائی راسخ اور ادب وتواضع میں بہت کامل! یہ دونوں صفتیں جہاں جمع ہوجائیں، وہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی اصطلاح میں ''کبریت احمر'' ہے۔ ان سے حضرت مفتی صاحب نے یہ بھی کہا تھا کہ آپ لوگوں کو حکومت میں دخل نہیں دینا چاہئے تھا، انھوں نے جواب دیا کہ ہم لوگوں کا بالکل ارادہ نہ تھا، لیکن ہم نے دیکھا کہ باہمی خونریزی بڑھتی جارہی ہے، تب ہم لوگ متحارب گروپوں سے ملے، بہت کوشش کی کہ باہم صلح وصفائی ہوکر ایک اچھی حکومت بن جائے، مگر کوئی اپنی جگہ سے ہٹنے کے لئے تیار نہ ہوا، اس سلسلے میں مختلف وقفوں کے درمیان ہم لوگ وفد بنا بنا کر گیارہ مرتبہ لڑنے والوں سے

ملے اور صلح وصفائی کی بہت کوشش کی، مگر جب ہر طرف سے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور خونریزی بڑھتی ہی چلی گئی تو مجبوراً ہم نے حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔

طالبان جس جماعت کا نام ہے، وہ اللہ والے برگزیدہ لوگ ہیں، انھوں نے ایک بہترین اسلامی حکومت قائم کی، اور دنیا اسلامی حکومت کے فوائد سے آشنا ہوئی، لیکن موجودہ کفر کی حکومتوں کو یہ بات اچھی نہیں لگی کہ کوئی اسلامی حکومت قائم ہو، اور ایسے صاحب ایمان برسر اقتدار آئیں جو ان سے مرعوب نہ ہوں، روس کی طاقت تو بکھر چکی تھی، اب امریکہ کی واحد طاقت ہے، جس کا رعب سب پر قائم ہے، ساری دنیا جانتی ہے اور دل سے مانتی ہے، زبان سے کہنے کی ہمت ہو یا نہ ہو، کہ امریکہ نے اپنی بڑائی کی دھونس جمانے کے لئے مکروفریب، جبر وتشدد، ظلم وستم اور زور زبردستی کا کوئی حربہ نہیں چھوڑا ہے، جسے بے دریغ استعمال نہ کیا ہو۔ ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء کو امریکہ میں جو حادثہ ہوا، اس نے طالبان کے خلاف ایک موقع فراہم کردیا اور ساری دنیا کے منع کرنے کے باوجود اس نے جھوٹا الزام لگا کر نہایت بے دردی کے ساتھ افغانستان پر بم برسانا شروع کردیا۔

مسلمانوں کا ردعمل:

خیر یہ واقعہ تو ہو چکا، مگر مسلمانوں پر اس کا ردعمل یہ ہوا کہ ان میں ایک طرح کی مایوسی اور شکستگی سی طاری ہوگئی ہے، اور دلوں میں ایک خلش سی پیدا ہوگئی ہے کہ اتنی دعائیں ہوئیں لیکن کیا انھیں شرف قبولیت نہیں حاصل ہوا؟ کیا ان دعاؤں میں کوئی کمی تھی جو بارگاہِ الٰہی میں لائق قبول نہ بن سکیں؟ یا طالبان میں کوئی ایسی بڑی کمزوری تھی کہ ان کی طرف منسوب ہوکر دعاؤں کی طاقت گھٹ کر رہ گئی؟ یا ملأ اعلیٰ کی طرف سے امریکہ اور اس جیسی باطل قوتوں کو نصرت ملی ہوئی ہے؟ کہ ان مقابلے میں کی گئی دعائیں اپنا اثر کھودیتی ہیں؟ یہ سوالات مسلمانوں کے دلوں میں اٹھتے ہیں، کچھ لوگ زبان وقلم سے انھیں ظاہر کردیتے ہیں اور کچھ لوگ خاموش رہ جاتے ہیں، مگر خلش رہتی ہے۔

مذکورہ بالا ردِعمل کا حل:

اس موضوع پر اس خاکسار نے جہاں تک غور کیا ہے، اپنی نارسائی ذہن وفکر کے باوجود یہ عرض کرسکتا ہے کہ جو کچھ ہوا، وہ ہمارے لئے انہونا اوراجنبی واقعہ نہیں ہے، یہ سب کچھ عین اس کے مطابق ہوا ہے جس کی خبر اجمالاً رسول اللہ ﷺ دے چکے ہیں، اور رہی یہ بات کہ دعائیں قبول نہیں ہوتیں، تو یہ خیال عجلت پسندی اور اللہ تعالیٰ کی حکمتوں سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے، دعا میں عجلت بازی سے حدیث میں منع کیا گیا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ احادیث میں بکثرت قیامت کی آمد کا اور اس کی علامتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان علامات کا حاصل یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی بعثت مبارکہ قیامت کی آمد کا پہلا اعلان ہے، کیونکہ تکمیل نبوت کے بعد اب کسی اور نبی کا انتظار نہیں ہے۔ اب دنیا اپنی عمر کے آخری مرحلے میں داخل ہوگئی ہے، نبوت کے انوار وآثار جب تک باقی ہیں قیامت رکی ہوئی ہے، جوں جوں دنیا کی عمر کا کارواں آگے بڑھتا جائے گا اور زمانۂ نبوت سے دوری بڑھتی جائے گی، نورِ نبوت کے آثار مدھم پڑتے جائیں گے، نیکیاں سمٹیں گی، ان کی استعداد کمتر ہوتی جائے گی، برائیوں کا فروغ وشیوع ہمہ گیر ہوتا رہے گا، قیامت انھیں برائیوں پر قائم ہوگی۔ حدیث صحیح میں تذکرہ موجود ہے کہ جب تک زمین پر اللہ اللہ کہنے والا کوئی موجود ہے قیامت نہ آئے گی، تو جوں جوں دنیا کی عمر ڈھلتی جائے گی، برائیوں کا دنیا میں غلبہ ہوتا جائے گا، اب اس دنیا میں عمومی طور پر خیر وبرکت اور نیکی وسعادت کا وجود مشکل ہے۔

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا قانون اور اس کی سنت یہ ہے کہ ہر چیز میں تغیر لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: **اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّۃً ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ قُوَّۃٍ ضُعْفاً وَّ شَیْبَۃً یَخْلُقُ مَایَشَاءُ وَھُوَ الْعَلِیْمُ الْقَدِیْرُ** (سورہ روم: ۵۴)

اللہ ہی ہے جس نے تم کو اس حال میں پیدا کیا کہ تم کمزور تھے، پھر کمزوری کے بعد طاقت عطا فرمائی، پھر طاقت کے بعد کمزوری اور بڑھاپے کو مسلط کیا، جو چاہتا ہے وہ پیدا کرتا

ہے اور وہی ہے جاننے والا، قدرت والا۔

یہ قانون قدرت اگر غور کیا جائے تو صرف انسانوں کے لئے مخصوص نہیں ہے، بلکہ پوری کائنات اور پوری حیات دنیوی اس قدرتی قانون کے دائرۂ اثر میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ اَنْزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيَاحُ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا (سورۃ الکہف: ۴۵) ان کے سامنے دنیا کی زندگی کی مثال بیان کرو، جیسے پانی جسے ہم نے آسمان سے اتارا، اس سے زمین کی پیداوار ملی جلی نکلی، پھر آخر کار وہ چورا چورا ہوگئی، جسے ہوائیں اڑائے پھرتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر اقتدار رکھتا ہے۔

اسی قانون الٰہی کے مطابق خود مجموعی کائنات کا بھی حال ہے، اس کا بھی ایک بچپن اور ضعف و ناطاقتی کا زمانہ تھا، پھر قوت و شباب کا زمانہ آیا، اور اب جبکہ قیامت قریب ہے، اس کے ضعف اور بڑھاپے کا دور ہے، جس طرح بڑھاپے میں انسان صحت و قوت سے دور طرح طرح کی بیماریوں اور ناطاقتیوں میں گھر جاتا ہے، اسی طرح اس دنیا کا بھی اپنے بڑھاپے میں ہر طرح کی کمزوریوں اور بیماریوں یعنی برائیوں میں گھر جانا فطرت کے عین مطابق ہے۔ اس کمزوری کے دور میں اگر کسی چیز اور طاقت کا ظہور ہوگا تو کسی خاص مصلحت سے ہوگا اور عارضی ہوگا۔ اب دنیا کی بساط لپٹنی والی ہے، جلد ہی وہ وقت آجائے گا کہ بھلائی اور برائی کا حساب ختم کر کے دونوں کو الگ الگ جنت اور جہنم میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ اب اگر سعادت کا عام ظہور اور غلبہ ہوگا تو پیغمبرانہ طاقت سے ہوگا، اور وہ بھی ان کی زندگی ہی تک۔ چنانچہ جب دور اخیر میں ظلم اور شر کا انتہائی غلبہ ہوگا تو ایک طاقتور ہستی مہدی کی شکل میں ظاہر ہوگی، ان کے دورِ ظہور میں ہی اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر اور ملکوتی صفات والے پیغمبر سیّدنا عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اپنی مافوق الفطرت طاقت کے ساتھ تشریف لائیں گے، اور وہ ''دجال اکبر'' کو اپنی ملکوتی طاقت سے ختم کریں گے، اور پھر ایک طویل ہنگامہ کے بعد یاجوج ماجوج کا خاتمہ ہوگا۔ عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی تک خیر و سعادت کا دور رہے گا، ان کی وفات کے

بعد پھر بہت جلد اندھیرا چھا جائے گا، اور قیامت قریب سے قریب تر ہو جائے گی، تو دنیا کے اس ضعف اور بڑھاپے میں نیکی اور طاقت کی جو روشنی چمکے گی، وہ ایسی ہی ہوگی جیسے اندھیری رات میں جگنو چمکے، انفرادی طور پر نیکیاں ہوں گی، لیکن اجتماعی اور حکومتی پیمانے پر نیکیوں کا اگر ظہور ہوگا تو بس ایسا کہ دیر تک ان کی بقاء مشکل ہوگی۔

ہمارے ملک کی حد تک اس کی مثال ملاحظہ ہو، تیرہویں صدی ہجری کے نصف اول میں امیر المومنین حضرت سیّد احمد شہید قدس سرہ نے جہاد کی تحریک برپا کی، اور اپنی روحانی تربیت سے ایسے مجاہدین تیار کئے جو قرون اولیٰ کے نمونے تھے، انھوں نے صوبہ سرحد اور افغانستان کے بعض علاقوں پر مشتمل اسلامی حکومت قائم کی، اور اسلامی حکومت کے برکات سے دنیا کو مستفید فرمایا، مگر پانچ چھ برس کے عرصے میں اس حکومت کا باقاعدہ نظام جو قائم ہوا تھا، بکھر گیا۔ اس تحریک کے اثرات دیر تک چلتے رہے، مسلمانوں میں ایک نئی دینی زندگی پیدا ہوئی، شرک وبدعت کے اثراتِ بد سے مسلمانوں کو نجات حاصل ہوئی، پھر اس بکھرے ہوئے نظام کو شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی قدس سرہ نے مرتب کرنا چاہا، اس کی تیاریاں مکمل کر لی گئی تھی، مگر مرتب ہونے سے پہلے ہی ان میں بکھراؤ پیدا ہو گیا، دوسرے ملکوں میں بھی خیر وسعادت کی تحریکیں چلیں۔ سوڈان میں مہدی سوڈانی کی تحریک چلی، طرابلس میں سنوسی مشائخ اٹھے، مصر میں حسن البنّا نے ایک دینی تحریک کی داغ بیل ڈالی، مگر یہ سب تحریکیں کچھ عرصہ چل کر یا تو ختم ہوگئیں یا بعض کے راستے بدل گئے، لیکن ایسا نہیں ہے کہ ان کے اثرات باقی نہ رہے ہوں، اس طرح کی ہر تحریک نے عالم اسلام میں ایک نئی بیداری پیدا کی، انھیں تحریکات اور جدوجہد کی برکت سے مسلمانوں میں اسلام اپنی صحیح صورت میں باقی ہے۔ اس دورِ اخیر میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی علیہ الرحمہ نے ایک دینی تحریک کا آغاز کیا اور اپنی خاص بصیرت کے تحت انھوں نے اسے حکومت اور سیاست سے دور رکھ کر مسلمانوں کے معاشرہ کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا، یہ تحریک بہت کامیاب رہی اور اس کے اثرات بہت دوررَس ثابت ہوئے۔

بہرحال اندھیریوں میں مختلف چراغ جلتے رہے اور جلتے رہیں گے، اس سے یہ امت اپنی عمر کے آخری مرحلے تک صحیح راہ پر قائم رہے گی، اور جب دنیا کی آخری طاقتور ہستی حضرت مہدی کا ظہور ہوگا، نیز دنیا کے سب سے بڑے گمراہ کن دجال کا غلغلہ ہوگا، اور پھر اس کے ختم کرنے کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے نزول ہوگا، تو ان چراغوں سے روشنی حاصل کرنے والے حضرت مہدی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقدمۃ الجیش (ہراول دستہ) ثابت ہوں گے۔

اللہ کا انعام اس زمانہ میں یہ ہوا کہ افغانستان میں اس نے علماء ومشائخ کو توفیق بخشی اور انھیں اسلامی نظام اور اسلامی طرز حکومت کے احیاء کے لئے کھڑا کیا، انھوں نے تمام دنیا سے بے نیاز ہوکر بے خوفِ لومۃ لائم اس خداوندی نظام کو عملی صورت دی۔ یہ رات کی تاریکی میں جگنو کی روشنی سہی مگر اس نے پورے عالم کو متاثر کیا، دنیا کی طبعی عمر کے لحاظ سے اس طاقت کو ناطاقتی سے بدلنا تھا، بدل گئی، مگر جو لوگ اس میں شریک ہوئے وہ بہرحال کامیاب ہیں، کامیابی کا معیار دنیا کی کامیابی نہیں آخرت کی کامیابی ہے، یہ لوگ غازی بنے یا شہید ہوئے، انشاءاللہ اللہ کی رضا انھیں حاصل ہوئی۔

دنیا نے کامیابی کی جو صورت تجویز کر رکھی تھی وہ حاصل ہوئی یا نہیں ہوئی، اللہ نے جو تجویز کی تھی وہ تو بہرحال پوری ہوئی، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: اِنْ یَّمْسَسْکُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ وَتِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ وَ لِیَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَیَتَّخِذَ مِنْکُمْ شُهَدَاءَ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ (سورہ آل عمران: ۱۴۰)

اگر تم زخمی ہوئے تو تمہارے مخالفین بھی تو ایسے ہی زخمی ہو چکے ہیں، اور ہم وقت کو لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں، اور اس لئے تا کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو ظاہر کر دے اور تم میں سے بعض شہادت کا درجہ عطا فرمائے، اور اللہ تعالیٰ ظالموں سے محبت نہیں کرتا۔

اس آیت سے یہ بات واضح ہوگئی کہ نظام جہاد وحکومت کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اہل ایمان اور منافقین ممتاز ہو جائیں، اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ بعض ایمان والوں کو

شہادت کا درجہ عطا فرمائیں۔ یہ مقصد بحمد اللہ طالبان کو حاصل ہوا، اور یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ کون لوگ ایمان میں راسخ ہیں اور کون لوگ کفر کی طاقت سے خوفزدہ اور لرزہ براندام ہیں، اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اگر اہل ایمان کو زخم یا شہادت سے دوچار ہونا پڑے تو یہ اس لئے نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے ناراض ہیں یا اللہ تعالیٰ ان سے بے تعلق ہیں، اللہ تعالیٰ کی محبت سے تو ظالم محروم ہیں۔ پس اہل ایمان کو ظاہری اعتبار سے برباد کرنے والے یہ نہ سمجھیں، اور دوسرے تماشا دیکھنے والے بھی یہ خیال دل میں نہ لائیں کہ اللہ تعالیٰ ظالموں سے محبت رکھتے ہیں، حاشا و کلا خدا کو ان ظالموں سے قطعاً محبت نہیں ہے، یہ سزا و عذاب کے مستحق ہیں۔

سزا کہاں ہوگی؟

لیکن اہل ایمان اس عجلت میں نہ پڑیں کہ ظالموں کو اس دنیا میں ہی سزا مل جائے، سزا و جزا کی جگہ اصلاً یہ دنیا ہے ہی نہیں، یہ تو عمل اور امتحان کی جگہ ہے، سزا ملے گی اور ضرور ملے گی۔ شہداء اور مظلومین کو ثواب ملے گا اور ضرور ملے گا، مگر اس کی جگہ یہ دنیا نہیں آخرت ہے، اگر یہ فیصلہ مقدر اور متعین نہ ہوچکا ہوتا تو دنیا دیکھتی کہ سزا کا کوڑا یہیں برس رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ (سورہ شوریٰ: ۱۴) اگر تمہارے رب کی طرف سے ایک بات متعین نہ ہوچکی ہوتی تو یقیناً ان کے درمیان فیصلہ ہوچکا ہوتا۔ یعنی عقوبت و سزا کا معاملہ قیامت کے اوپر موقوف نہ ہوچکا ہوتا تو یہیں عذاب آجاتا، اس لئے دنیا میں عذاب نہ آنے سے اہل ایمان کو متاثر نہ ہونا چاہئے، ان کے عذاب کا وقت مقرر ہے، اس وقت کھلی آنکھوں دیکھ لیں گے کہ ظلم کرنے والے کس درجہ عذاب شدید میں مبتلا ہیں۔ بس انتظار چاہئے۔

کیا دعائیں قبول نہیں ہوئیں؟

امریکہ کے حالیہ حملے کے وقت تمام عالم اسلام کے مسلمانوں نے بہت دعائیں کیں مگر تب بھی طالبان بکھر گئے، دعا رائیگاں گئی؟ یہ سوال بہتوں کو پریشان کئے ہوئے ہے، جواب یہ ہے کہ اہل ایمان کی دعا کبھی رائیگاں نہیں ہوتی، لیکن قبولیت کے لئے جلد بازی نہیں

کرنی چاہئے، انتظار چاہئے۔ اللہ تعالیٰ دعا ضرور قبول کرتے ہیں، لیکن اس کے ظہور کا وقت مقرر فرمادیتے ہیں، وقت پر اس کا ظہور ہوگا۔ ہندوستان میں بابری مسجد شہید کردی گئی، مسلمانوں نے بہت دعائیں کیں، مگر اسے شہید کردیا گیا، وہ دعائیں کیا رائیگاں ہوئیں نہیں، اس کے عوض اسی سرزمین پر کتنی عالیشان مسجدیں وجود میں آگئیں، کتنے لوگ نمازی بن گئے، دین کی طرف متوجہ ہوگئے، اور سزا وعذاب کی کیسی کیسی شکلیں خود اسی حیٰوۃ دنیا میں ظاہر ہوئیں اور اصل ظہور تو بروز قیامت ہوگا۔ طالبان اور امریکہ کے سلسلے میں کی گئی دعائیں اور بددعائیں رائیگاں نہیں گئیں، دیر سویر ان کے اثرات ظاہر ہوں گے، عجلت مت کیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ کو خطاب فرمایا: فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ لَمْ يَلْبَثُوْا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ بَلٰغٌ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ (سورہ احقاف: ۳۵) پس (اے پیغمبر) تم ایسا صبر کرو جیسا کہ عالی ہمت رسولوں نے کیا، اور ان کے حق میں (عذاب کی) جلدی نہ کرو، یہ جس دن اس عذاب کو دیکھیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے، تو انھیں محسوس ہوگا جیسے دن کی ایک گھڑی دنیا میں ٹھہرے، پس بدکاروں کے علاوہ اور کوئی ہلاک نہیں کیا جائے گا۔

پس اے مسلمانو! جلد بازی کرکے اپنے ایمان کو خراب نہ کرو، ہمارے پیغمبر نے صبر کیا، ہم کو بھی صبر سے وقت کا انتظار کرنا ہوگا۔ دیکھئے حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام نے فرعون کے ظلم وستم اور اس کی عداوت سے مجبور ہوکر جب بددعا کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعَانِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (سورہ یونس:) فرمایا کہ تم دونوں کی دعا قبول ہوچکی ہے، سو تم ثابت قدم رہو، اور ان لوگوں کی راہ نہ چلنا جن کو علم نہیں۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ دعا کی قبولیت کا اعلان اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی فرمایا تھا، مگر اس کا ظہور چالیس سال کے بعد ہوا تو اگر ایک اولوالعزم پیغمبر کی دعا کا ظہور چالیس سال کے بعد ہوسکتا ہے، تو کسی اور کو اتنی عجلت کیوں ہو کہ آج دعا کی اور آج ہی اس کا ظہور ہوجائے، مایوس تو وہ ہو جس کا ایمان اللہ پر نہ ہو، یوم آخرت پر نہ ہو۔

غرض یہ کہ طالبان کا وجود اور ان کی حکومت ایک رحمت الٰہی تھی، اللہ نے جب تک چاہا اس کو اٹھالیا، ان میں سے جو شہید ہو گئے یا جو آئندہ شہید ہوں گے، زندگی تو دراصل انھیں کی زندگی ہے، اور موت بھی انھیں کی موت ہے، اللہ کے یہاں وہ سرخ رو ہیں، وہ ناکام نہیں ہیں۔

ہم مسلمانوں کے لئے کسی طرح زیبا نہیں ہے کہ انھیں ناکام قرار دے کر اور اللہ کے فیصلوں پر معترض ہو کر اپنے ایمان کو خراب وتباہ کریں۔ طالبان تو بہرحال پندرہویں صدی کے انسان ہیں، جو کفر وضلالت اور ظلم وستم کی تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی صدی ہے، اللہ نے کتنے پیغمبر ایسے بھیجے، جو زندگی بھر لوگوں کو ہدایت کی دعوت دیتے رہے، مگر کوئی ماننے کو تیار نہ ہوا یا بہت کم لوگوں نے مانا، پھر کتنوں کو ظالموں نے شہید کر ڈالا تو یہ بزرگوار ناکام ہو گئے، انھیں ناکام وہی قرار دے سکتا ہے جس کی نگاہ سے آخرت کی زندگی جو اصل زندگی ہے، اوجھل ہو۔

اے لوگو! نیکی اور سعادت کا کام جتنا تم سے ہو سکے کرتے رہو، اور مشیت الٰہی پر اپنی تجویزوں کو بنیاد بنا کر اعتراض نہ نکالو اور نہ شکوک وشبہات میں مبتلا ہو، اس دنیوی ”متاع غرور“ (دھوکے کے سامان) کو اپنی زندگی کا حاصل نہ قرار دو، ورنہ دائمی خسارہ میں مبتلا ہو گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ فَاِنْ أَصَابَهٗ خَيْرُ نِ اطْمَأَنَّ بِهٖ وَإِنْ أَصَابَتْهُ فِتْنَةُ نِ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ (سورہ حج:۱۱) بعض لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ اللہ کی عبادت ایک کنارے پر ہو کر کرتے ہیں، پس اگر انھیں کوئی بھلی بات حاصل ہوتی ہے تو مطمئن ہو جاتے ہیں اور اگر وہ آزمائش میں پڑ گئے تو منہ کے بل پلٹ جاتے ہیں، یہ دنیا وآخرت دونوں کے خسارے میں پڑے۔ دیکھو یہ کھلا ہوا خسارہ ہے۔

تو ایک آزمائش کی وجہ سے اے ایمان والو! کیوں دنیا وآخرت کا خسارہ مول لیتے ہو۔

(جنوری ۲۰۰۲ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اعظم گڈھ کا حادثۂ کبریٰ

اعظم گڈھ شہر کے مشہور ڈاکٹر، امراض قلب کے بہترین معالج ڈاکٹر محمد سلیم صاحب کو ڈاکوؤں نے مع خاندان کے شہید کرڈالا، اس حادثہ پر حضرت مولانا نے ایک تفصیلی اداریہ تحریر فرمایا، جو ماہنامہ ضیاء السلام، اپریل ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا، اس کے دو حصے تھے، ایک ڈاکٹر صاحب کی شخصیت سے متعلق تھا، وہ مولانا کی کتاب ”کھوئے ہوؤں کی جستجو۔۔۔“ میں شائع ہوچکا ہے، دوسرا حصہ رضا بالقضاء اعتماد علی اللہ کے مضمون پر مشتمل تھا، اسے اس کتاب کا جز بنایا جارہا ہے۔ (ضیاء الحق خیرآبادی)

ان حادثوں کی وجہ سے دل میں خوف اور دہشت نہیں ہونی چاہئے، مومن بجز اللہ کے کسی سے نہیں ڈرتا، نہ مال کا نقصان اسے ڈرا سکتا ہے، نہ جان کی تباہی، جب ایک دن مرنا ضرور ہے اور مرنے کے بعد آدمی ضائع نہیں ہوتا بلکہ خدا کے حضور پہونچ جاتا ہے تو اس سے ڈرنا کمزوری کی بات ہے، اللہ پر بھروسہ کرنا چاہئے، اور اس کے ساتھ اپنے بچاؤ کی تدبیریں مناسب حد تک کرنی چاہئیں، یہ تدبیریں بدرجۂ اسباب ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے واسطے سے انسانوں کی اور مالوں کی حفاظت فرماتے ہیں، ظاہری تدبیریں تو یہ حکومتی انتظامات ہیں، جن کی ناکامی یا بدنیتی کا ہم آئے دن مشاہدہ کرتے رہتے ہیں، اور اس کے علاوہ ظاہری تدبیریں جو شرعاً محمود ہوں، اختیار کی جائیں، لیکن ان سے پہلے وہ باطنی اور روحانی تدبیریں عمل میں لائی جائیں جن کے ذریعے ہم خود اور ہماری ملکیتیں اللہ کی حفاظت میں آجائیں۔

مال کے سلسلے میں اس کی آمد و خرچ پر نگاہ رکھی جائے، آمدنی پاک ہو، شرعی قانون اور دستور کے مطابق ہو، اور خرچ وہیں کیا جائے جہاں وہ مباح ہو، ناجائز امور سے پرہیز کیا

جائے، بالخصوص زکوٰۃ جو ایک شرعی فریضہ اور دین کی پانچ بنیادوں میں ایک اہم بنیاد ہے، اس کا پورا اہتمام کیا جائے، جس مال کی زکوٰۃ ادا کردی جاتی ہے، وہ سرکاری طور پر یعنی اللہ کی سرکار میں محفوظ ہوجاتا ہے، اب اس میں نقصان کا اندیشہ بہت کم ہوجاتا ہے، حساب کرکے پائی پائی زکوٰۃ ادا کرنی چاہئے۔ یہ مال اللہ کی ضمانت اور حفاظت میں آجاتا ہے، حدیث شریف میں آیا ہے: جس مال میں زکوٰۃ کا مال غلط طور سے شامل ہوجاتا ہے وہ مال معرض ہلاکت میں آجاتا ہے۔

دوسرے یہ کہ صبح وشام قرآن وحدیث میں واردشدہ دعاؤں کے پڑھنے کا اہتمام کیا جائے، کتنی بلائیں ان دعاؤں کی برکت سے اللہ تعالیٰ دفع فرماتے ہیں، اللہ کا نام بہت بڑا اور بہت بابرکت ہے، اس نام کو ہم بھول جاتے ہیں، تو طرح طرح کی بلائیں اترتی رہتی ہیں۔

(۱) **بِسْمِ اللهِ الَّذِیْ لَا یَضُرُّ مَعَ اسْمِهٖ شَیْئٌ فِیْ الْاَرْضِ وَلَا فِیْ السَّمَاءِ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ**۔ صبح وشام ۳/۳ بار پڑھ لیا جائے، تو انشاء اللہ ہر بلائے ناگہانی سے حفاظت ہوگی، یہ رسول اللہ ﷺ کی بشارت ہے۔

(۲) اوپر والی دعا کے ساتھ ۳/مرتبہ یہ کلمات بھی شامل کرلئے جائیں: **أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَاخَلَقَ**۔

(۳) رات میں سونے سے پہلے آیت الکرسی ایک مرتبہ۔ **آمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَااُنْزِلَ اِلَیْهِ** سے ختم سورۃ بقرہ تک، ایک مرتبہ سورہ طارق کی آخری آیتیں **إِنَّهُمْ یَكِیْدُوْنَ كَیْدًا** سے آخر تک ۲۵/مرتبہ پڑھ لیا جائے، تو چوروں، ڈاکوؤں اور شریر جن وانس سے حفاظت ہوتی ہے۔

(۴) **آمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَااُنْزِلَ اِلَیْهِ مِن رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ آمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَیْكَ الْمَصِیْرُ لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْساً اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَیْهَا مَا اكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَسِیْنَا اَوْ اَخْطَأْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَا**

اِصْـراً كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْلَنَا وَارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلٰى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ۔

(۵) إِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْداً وَّأَكِيْدُ كَيْداً فَمَهِّلِ الْكَافِرِيْنَ أَمْهِلْهُمْ رُوَيْداً

(۶) ذیل کی دعا صبح وشام اہتمام سے پڑھی جائے۔

اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ الْعَافِيَةَ فِيْ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۔اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فِيْ دِيْنِيْ وَدُنْيَايَ وَأَهْلِيْ وَمَالِيْ ۔اَللّٰهُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِيْ وَاٰمِنْ رَوْعَاتِي ۔اَللّٰهُمَّ احْفَظْنِيْ مِنْ بَيْنِ يَدَيَّ وَمِنْ خَلْفِيْ وَعَنْ يَمِيْنِيْ وَعَنْ شِمَالِيْ وَمِنْ فَوْقِيْ وَأَعُوْذُ بِعَظْمَتِكَ أَنْ أُغْتَالَ مِنْ تَحْتِيْ۔

(۷) کوئی خطرہ پیش آئے تو پڑھیں: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَجْعَلُكَ فِیْ نُحُوْرِهِمْ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ شُرُوْرِهِمْ۔

ان دعاؤں اور وظائف کو عمل میں لائیں، انشاء اللہ بلاؤں سے حفاظت ہوگی۔

☆☆☆☆☆

گجرات کا انسانیت سوز فساد

رام مندر کا نام لے کر، رام مندر والوں نے پھر قتل وخوں ریزی کا ایک وحشتناک ہنگامہ برپا کیا۔ احمد آباد، سورت اور گجرات کا ایک بڑا حصہ آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا، مسلمان قصوروار ہے، اس لئے کہ وہ بتوں کی پوجا نہیں کرتا، اللہ کے علاوہ کسی اور کو معبود نہیں مانتا، وہ صرف اللہ کی عبادت کرتا ہے، اس قصور کی بنا پر اسے ہندوستان میں جینے کا حق نہیں ہے: وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ إِلَّا أَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَاللهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (سورة البروج: ۹/۸) اور وہ ان سے صرف اس بات کا انتقام لے رہے تھے کہ وہ اللہ پر ایمان رکھتے تھے جو زبردست ہے، تعریف والا ہے، جس کی حکومت آسمانوں پر ہے اور زمین پر ہے، اور اللہ کے سامنے ہر چیز ہے۔

اخبارات میں تفصیلات آچکی ہیں، ظلم و بربریت کی چکی جو چلی ہے، اس نے انسانیت کو، رحم و مروت کے جذبات کو پیس کر رکھ دیا ہے، لیکن کیا ان مظالم کی وجہ سے مسلمان ختم ہو جائے گا، اسلام مٹ جائے گا، واللہ ایسا نہ ہوگا، یہ اہل اسلام کے لئے ایک آزمائشی دور ہے، کاش ان آزمائشوں کے نتیجے میں اپنے پروردگار کی طرف رجوع ہوتے، اسے راضی کرتے، واقعی وہ سب پر غلبہ رکھتا ہے، اور اس کی ذات لائق حمد ہے، آسمان و زمین سب اس کے حکم و ارشاد کے ماتحت ہیں، نہ یہاں کی حکومت، نہ یہاں کے باشندے، یہ یہاں کا قانون، کوئی درد کی دوا نہیں ہے، درد کی دوا خود ان کے پاس ہے، وہ ہے اللہ کی طرف پلٹنا۔ فَفِرُّوْا إِلَی اللهِ، (سورۂ ذاریات: ۵۰) اللہ کی طرف بھاگو۔ اس کے احکام و فرامین کا مجموعہ تمہارے پاس موجود ہے، نفسانی خواہشات اور مال و جاہ کی حرص و ہوس کو چھوڑ کر اللہ کی اطاعت پر جمع ہو جاؤ، اللہ کو راضی کرو، اسی کے حضور رووٗ، گڑ گڑاؤ، اور کسی کا خوف دل میں نہ لاؤ، وہی ہر درد کا علاج ہے۔

مسلمان اللہ کی اطاعت کرتا ہے، اور اللہ ہی پر بھروسہ کرتا ہے، اللہ کے علاوہ نہ کسی کا خوف اس کے دل میں ہوتا ہے، اور نہ کسی سے امید رکھتا ہے، مشکل یہ ہے کہ ہم سے اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری تو ہوتی نہیں، اور اپنی مرضی کے موافق اس سے مدد چاہتے ہیں، معاملہ دونوں طرف سے ہوتا ہے، اِدھر سے عبادت و اطاعت اور اُدھر سے نصرت و اجابت! حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَإِذَا سَأَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّی فَإِنِّیْ قَرِیْبٌ أُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَان فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ۔ (سورۃ البقرۃ:۱۸۶)

اور جب میرے بندے میرے بارے میں تم سے پوچھیں، تو میں قریب ہوں، دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں، تو انھیں چاہئے کہ میری بات مانیں اور مجھ پر یقین رکھیں تاکہ وہ راہ راست پر رہیں۔ (اپریل ۲۰۰۲ء [محرم ۱۴۲۳])

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کفر کی ایذا رسانی

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَتُبۡلَوُنَّ فِیۡۤ اَمۡوَالِکُمۡ وَاَنۡفُسِکُمۡ وَلَتَسۡمَعُنَّ مِنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ وَمِنَ الَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡۤا اَذًی کَثِیۡرًا وَاِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا اللّٰہَ فَاِنَّ ذٰلِکَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ۔ (سورہ آل عمران: ۱۸۶)

ترجمہ: ایسا ضرور ہوگا کہ تمہارے مالوں میں اور تمہاری جانوں تمہاری آزمائش ہوگی، اور یہ بھی ضرور ہوگا کہ تم اگلی کتاب والوں اور مشرکوں کی طرف سے بہت بدگوئی سنوگے، اور اگر تم صبر کرو اور پرہیزگاری سے کام لو تو یہ ہمت کی بات ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں کہ:

> ’’یہ خطاب مسلمانوں سے ہے کہ آئندہ بھی جان و مال میں تمہاری آزمائش ہوگی، اور ہر قسم کی قربانیاں کرنی پڑیں گی، قتل کیا جانا، زخمی ہونا، قید و بند کی تکلیف اٹھانا، بیمار پڑنا، اموال کا تلف ہونا، اقارب کا چھوٹنا، اس طرح کی سختیاں پیش آئیں گی، نیز اہل کتاب اور مشرکین کی زبانوں سے بہت جگر خراش اور دل آزار باتیں سننا پڑیں گی۔ ان سب کا علاج صبر و تقویٰ ہے، اگر صبر و استقلال اور پرہیزگاری سے ان سختیوں کا مقابلہ کروگے، تو یہ بڑی ہمت اور اولوالعزمی کا کام ہوگا، جس کی تاکید حق تعالیٰ نے فرمائی ہے۔ (فوائد عثمانی، ص: ۹۶، مطبوعہ شاہ فہد کمپلیکس، مدینہ منورہ)

کفر نے اسلام کو کبھی برداشت نہیں کیا ہے، شرک کو کبھی گوارا نہیں ہوا ہے کہ توحید کو فروغ ملے، شیطان نے ابتداء ہی سے آدم اور اولادِ آدم کے ساتھ لڑائی چھیڑ رکھی ہے،

کفر اور شرک کے مزاج میں جھوٹ اور منافقت کا خمیر ہے، اسے اسلام اور توحید کے خلاف پروپیگنڈہ کرنا ہے، اس کیلئے سچ غریب کیا مدد کر سکے گا، جھوٹ ہی کے کندھے پر پروپیگنڈے کی مشین رکھی جاتی ہے، جس دور سے ہم گزر رہے ہیں، اس میں پروپیگنڈہ ایک عالمگیر فن کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، اسے آج کی اصطلاح میں ''میڈیا'' کہتے ہیں۔ بات چاہے کتنی ہی غلط اور بے بنیاد ہو مگر میڈیا اسے ذہن ودماغ میں اس طرح اتار دیتی ہے جیسے وہی بے بنیاد، دنیا کی سب سے بڑی سچائی ہو، اور عمل خواہ کتنا ہی مخلصانہ اور عبادت کا ہو، میڈیا کا یہ ادنیٰ کرشمہ ہے کہ اسے کائنات کا سب سے زیادہ ڈر اور خطرناک ثابت کر دیتی ہے۔

اہل اسلام کو شروع ہی سے غلط سلط پروپیگنڈے کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اور آج تو اس پروپیگنڈے نے میڈیا کی شکل اختیار کر کے وہ قیامت بپا کر رکھی ہے کہ ہر جھوٹ سچ اور ہر بھلائی برائی بن کر رہ گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی مذکرہ بالا آیت میں مسلمانوں کو اسی بات پر متنبہ فرمایا ہے: لَتُبۡلَوُنَّ فِیۡ اَمۡوَالِکُمۡ وَاَنۡفُسِکُمۡ وَلَتَسۡمَعُنَّ مِنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ وَمِنَ الَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡا اَذًی کَثِیۡرًا، تمہیں یہودیوں، عیسائیوں اور کفر وشرک کے دوسرے پیروکاروں سے تکلیف کی بہت سی باتیں سنائی دیں گی۔

آج میڈیا پوری طاقت سے چیخ رہی ہے، اور ہر چہار جانب سے پکار رہی ہے کہ مسلمان دہشت گرد ہیں، رجعت پسند ہیں، بنیاد پرست ہیں، اسلام کے اصول وقوانین فرسودہ ہیں، دنیا کی ترقی سے مانع ہے، وغیرہ وغیرہ۔ یہ میڈیا وہی ہے جو یہود ونصاریٰ اور ہنود کے قبضے میں ہے، مسلمان گھبرا گھبرا کر کہتا ہے کہ اس تہمت کا جواب دینا چاہئے، لیکن اہل اسلام کے پاس وہ وسائل نہیں ہیں، اور اگر وسائل بھی ہوں تو جھوٹ بولنے کا وہ حوصلہ کہاں سے لائیں، جو ان یہود ونصاریٰ کو حاصل ہے، مسلمان کے دل میں اگر ذرا بھی ایمان کی رمق ہے تو اس کا ضمیر گریبان گیر ہوتا ہے، ہرگز زبان سے یا قلم سے جھوٹی بات صادر نہ ہو، اور واقعہ یہ ہے کہ پروپیگنڈے کا جواب پروپیگنڈہ نہیں ہے، جھوٹ کی کاٹ جھوٹ نہیں

ہے، تہمت کا جواب تہمت نہیں ہے۔ اس کا جواب وہ ہے جو حق تعالیٰ نے مذکورہ بالا آیت میں ارشاد فرمایا ہے کہ اس پروپیگنڈہ، اس تہمت طرازی اور اس جھوٹ کا جواب دو چیزوں کا مجموعہ ہے: ایک **صبر**، دوسری **تقویٰ**۔ صبر کا مطلب یہ ہے کہ پروپیگنڈے کی شدت سے متاثر ہو کر آدمی گھبرا نہ جائے، نہ اپنے عقائد و نظریات سے بدظن ہو جائے، نہ ایمان وعمل کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے، نہ اپنے اسلام وایمان سے شرمندگی محسوس کرنے لگ جائے۔ اور تقویٰ کا مطلب یہ ہے کہ اعمال وعقائد کے تمام شعبوں میں وہی چیز اہتمام سے اختیار کرے جو اللہ کی پسندیدہ ہو، یعنی ظاہر وباطن ہر اعتبار سے شریعت کے احکام کا پابند ہو، یہ نہیں کہ میڈیا جھوٹ بول رہی ہے، تو ادھر سے بھی جھوٹ کو فروغ دیا جائے۔

صبر وتقویٰ! دونوں چیزیں ہیں بڑے ہمت اور حوصلہ کا کام، مگر مسلمان بڑا حوصلہ مند ہوتا ہے، ہم ہمتی، بے حوصلگی مومن کا کام نہیں، اس مجموعہ پر اللہ تعالیٰ کی نصرت ورحمت کا نزول ہوتا ہے، کاش اسے ہم سمجھتے۔

(جولائی ۲۰۰۲ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عدیم الفرصتی کا بحران

آج کے دور کا انسان بڑا عدیم الفرصت ہے، یعنی اسے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ بہت سے ضروری کام وہ کر سکے، عموماً ہر شخص کو آپ اس کا شاکی پائیں گے کہ کیا کریں صاحب! فرصت نہیں۔ ہمارا ادارہ ایک دینی، اصلاحی، تربیتی رسالہ کا اہتمام کرتا ہے، یہ رسالہ بہت ضخیم نہیں ہوتا، کل ۴۸ صفحات پر مشتمل! مگر بہت سے احباب شکایت کرتے ہیں کہ پڑھنے کا موقع نہیں ملتا، خیر یہ تو ایک رسالہ ہے، اس کا پڑھنا نہ فرض ہے نہ واجب! فرصت ہو، جب بھی نہ پڑھیں، تو بھی نہ کوئی ملامت، نہ گناہ! لیکن شکایت تو اس کی ہے کہ لوگوں کو پانچ وقت نماز پڑھنے کی فرصت نہیں ملتی، تلاوت قرآن کا موقع نہیں ملتا، ذکر واذکار کا وقت نہیں ملتا، پڑوسیوں کی خبر گیری کی فرصت نہیں ملتی، علماء ومشائخ کی صحبت میں کچھ وقت گزارنے، ان سے کچھ حاصل کرنے کا وقت نہیں ملتا، اور بھی بہت سے وہ کام ہیں جن کی دینی زندگی میں بہت اہمیت ہے، اور جن کی آخرت میں بڑی پوچھ ہے، اور وہاں ان کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہے، ان کا موقع نہیں ملتا۔ آخر یہ عدیم الفرصت لوگ کس کام میں اتنا منہمک رہتے ہیں کہ اتنے ضروری اور مفید کاموں کے لئے انھیں وقت نہیں ملتا۔ ہمارے ایک دوست جو ڈاکٹر ہیں، ایک روز ان سے میں نے خیریت دریافت کی، تو فرمانے لگے کہ کیا کریں کام تو کچھ نہیں ہے، مگر مشغولیت بہت زیادہ ہے، میں چونک گیا کہ کام نہیں تو مشغولیت کیسی؟ وہ ہنسنے لگے کہ واقعی ایسا ہی ہے، دن بھر مصروف رہتا ہوں، مگر جب شام کو جائزہ لیتا ہوں تو دن بھر میں کوئی خاص کام ہوا ہو دکھائی نہیں دیتا۔

جی ہاں! کوئی کام نہیں، یا ہے تو بہت کم ہے، مگر مصروفیت بہت زیادہ ہے۔ کیا مصروفیت ہے؟ آج کا آدمی دنیا کمانے میں، مال حاصل کرنے میں بہت مصروف ہے، مگر جتنے وقت میں مال حاصل کرنے کا کام ہوتا ہے، اگر آدمی اس کا منصفانہ حساب کرے تو وہ ۲۴/ گھنٹے میں بہت زیادہ وقت نہیں ہوتا۔ تاجروں کی دوکانداری کے، ملازموں کی ملازمت کے، مزدوروں کی مزدوری کے اوقات متعین ہیں، کسی کی ڈیوٹی ۸/ گھنٹے کی ہے، کسی کی ۶/ گھنٹے کی ہے، کسی کو کسی گھنٹے کی پابندی نہیں ہے، مگر پھر بھی سارا وقت مصروف ہے، نماز کا وقت نہیں ملتا، تلاوت کا وقت نہیں ملتا، ذکر کا وقت نہیں ملتا، کسی دینی کتاب یا رسالہ کے مطالعہ کا وقت نہیں ملتا، پھر یہ عدیم الفرصت لوگ کیا کرتے ہیں؟ کوئی کاروبار ۲۴/ گھنٹے کا نہیں، کوئی ملازمت ۲۴/ گھنٹے کی نہیں، مگر حد یہ ہے کہ سونے جاگنے کے اوقات بھی غیر منضبط ہیں، کھانے پینے کے وقت میں گڑبڑ بہت ہے، آخر کیا بات ہے؟

کبھی آپ نے اس تضاد پر غور کیا، وقت بہت ہے، مگر فرصت بالکل نہیں ہے، اور یہ بھی نہیں ہے کہ دنیا اسی مسلسل مصروفیت کے سہارے چل رہی ہو، اگر اس مصروفیت کو کم کر دیا جائے یا چھین لیا جائے تو دنیا کی طبعی رفتار میں کوئی خلل آجائے گا، ایسا نہیں ہے، مصروف سے مصروف ترین انسان اچانک دنیا سے اٹھ جاتا ہے، اس کی مصروفیت ختم ہو جاتی ہے، وہ پوری فرصت کے ساتھ قبر میں لیٹ جاتا ہے اور دنیا چلتی رہتی ہے، اس کا گھر آباد رہتا ہے، دنیا کا نظام برقرار رہتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وقت سب کے لئے ایک بنایا ہے، سب کے حصے میں دن اور رات کے ۲۴/ گھنٹے آئے ہیں، ہاں عمروں میں فرق رکھا ہے، لیکن یہ فرق موت سے پہلے معلوم نہیں ہوتا، مسئلہ ان ۲۴/ گھنٹوں کے استعمال کا ہے، وقت نہیں ملتا، فرصت نہیں ملتی، وغیرہ یہ شکایتیں کیوں پیدا ہوتی ہیں، اس کے متعدد اسباب ہو سکتے ہیں۔

عموماً دیکھا جاتا ہے، آدمی لذت کا جویا ہے، وہ لذتوں کے پیچھے دوڑتا ہے، اسے وقت کے گزرنے کا احساس بہت کم ہوتا ہے، جب اسے نفس کی لذت حاصل ہوتی ہے۔

بہت دیکھا جاتا ہے کہ جو لوگ فرصت کی کمی کی شکایت کرتے ہیں، وہ اپنے اوقات کو ایسے کاموں، ایسی باتوں اور ایسی جگہوں میں بے تحاشا صرف کرتے ہیں جن میں ''لذت نفس'' کے علاوہ اور کوئی بات حاصل نہیں ہوتی، لایعنی باتیں، بلکہ گناہ کی باتیں، بے مقصد سیر وتفریح، بلکہ ایسا بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ فلاں جگہ اچھی چائے ملتی ہے، تو وہاں جارہے ہیں، فلاں جگہ پان اچھا ملتا ہے، تو وہاں چلے جارہے ہیں، گویا لذت نفس کی جستجو میں دوڑے پھرتے ہیں، پھر جن چیزوں میں نفس کی لذت نہیں ہے ان کے لئے فرصت کہاں سے آئے، وقت ملے تو کیسے ملے؟ آپ کہیں گے کہ یہ خصلت بچوں اور نوجوانوں کی ہے؟ لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ بچہ اور نوجوان جن لذائذ نفس پر پختہ ہوگا، کیا ادھیڑ عمر میں یا بڑھاپے میں اس سے نجات مل جائے گی، کل کا نوجوان جن عادتوں میں پلا بڑھا ہے، آج کا ادھیڑ اور بوڑھا انھیں عادتوں میں محصور ہے۔ یہ ''لذت نفس'' انسان کے لئے دوست نہیں دشمن ہیں، یہ ہر کمال کے حصول میں رکاوٹ ہیں، ان میں آدمی مال بھی برباد کرتا ہے، اور وقت کو بھی تباہ کرتا ہے، اور نتیجے میں اللہ کو بھی ناراض کرتا ہے۔

ہمارے معاشرے سے تربیت نام کی چیز رخصت ہوگئی ہے، بچہ اگر کچھ کما کر لا رہا ہے تو پھر وہ آزاد ہے، جو چاہے کرے، کسی کو فکر نہیں کہ وہ کس راہ پر جارہا ہے، اور گھر میں مال کی بہتات ہے تو ناز برداریاں ہیں، کہاں کی تربیت اور کہاں کی روک ٹوک! پھر یہی بچے انھیں آزادیوں اور گناہوں کو لئے عمر کی پختگی کو پہونچتے ہیں تو یہ عادتیں بھی پختہ ہوجاتی ہیں، پھر دنیا کی ضروریات، تقاضے انھیں گھیر لیتے ہیں، تو وہ مجبوراً ''کسب مال'' میں لگتے ہیں، اور کسب مال کے دھندے سے کچھ فراغت ہوتی ہے تو پچھلی عادتیں ظاہر ہونے لگتی ہیں، ان مشغولیتوں کے درمیان ظاہر ہے کہ طاعات وعبادات یا مطالعہ علم کی کہاں فرصت؟

ان بے معنی بلکہ گناہ کے مشاغل کی نحوست یہ ہوتی ہے کہ وقت کی برکت ختم ہوجاتی ہے، کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے، واقعہ یہی ہے کہ ایمان والے کا کام ظاہری وسعت وگنجائش سے نہیں بنتا، بلکہ اس راس المال (اصل سرمایہ) خدا کی طرف سے برکت ہے،

برکت مال میں بھی ہوتی ہے، وقت میں بھی ہوتی ہے، آل اولاد میں بھی ہوتی ے، اعمال میں بھی ہوتی ہے، قلوب اور ارادوں میں بھی ہوتی ہے، اور جہاں برکت آتی ہے وہاں آدمی کو کامیابی بھی ملتی ہے، اور دل کا اطمینان وسکون بھی ملتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک دعا اپنی امت کو تعلیم فرمائی ہے، وہ دعا بہت سے مقاصد کو مشتمل ہے، اس کا ایک حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے، فرماتے ہیں: **اَللّٰهُمَّ بَارِکْ لَنَا فِیْ اَسْمَاعِنَا وَاَبْصَارِنَا وَقُلُوْبِنَا وَاَزْوَاجِنَا وَذُرِّیَّاتِنَا وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ** ۔ اے اللہ! آپ ہمارے لئے ہمارے کانوں میں، نگاہوں میں، ہمارے دلوں میں، ہماری بیویوں میں اور ہماری اولاد میں برکت عطا فرمایئے، اور آپ ہم پر رحمت ومغفرت والی توجہ فرمایئے، بلاشبہ آپ توجہ فرمانے والے، رحمت والے ہیں۔

اس دعا سے معلوم ہوا کہ برکت کان میں بھی ہوتی ہے، آنکھ میں ہوتی ہے، دل میں بھی ہوتی ہے، وہ یہ کہ یہ اعضاء آخر تک صحیح وسالم اور بعافیت رہیں، اور کام ہی کی باتیں کان میں اور کام ہی کی چیزیں نگاہ میں، اور اچھے صاف ستھرے خیالات اور ارادے دل میں رہیں۔ دل الجھنوں سے، تشویش سے، آج کی اصطلاح میں ’’ٹینشن‘‘ سے پاک رہے، یہ دل کی برکت ہے، پھر بیوی بچوں میں بھی برکت ہوتی ہے، وہ یہ کہ انھیں دیکھ کر، ان کے درمیان رہ کر آدمی روح کا سکون پائے، یہ مطیع وفرمانبردار ہوں، باادب اور محبت کرنے والے ہوں، جیسے یہ سب برکتیں ہیں، اسی طرح وقت میں بھی برکت ہوتی ہے، وقت بظاہر تھوڑا ہوتا ہے، مگر کام بہت ہوتا ہے، وقت کی بے برکتی یہ ہے کہ آپ اپنی کسی حاجت میں نکلے، دن بھر متعلقہ جگہوں کا چکر لگایا، مگر کام نہیں ہوا، کبھی وہ آدمی نہیں ملا، جس سے کام ہونا تھا، کبھی ملا تو وہ خود پریشانی میں تھا، کبھی اور کوئی مجبوری سامنے آگئی، اور برکت یہ ہے کہ آپ کو ضرورت پیش آئی اور گھر بیٹھے اس کا انتظام ہوگیا، یا حرکت وعمل کی ضرورت پڑی، مگر مختصر سی کاوش کے بعد وہ کام پورا ہوگیا، پھر سارا وقت دوسرے کاموں کے لئے بچ گیا۔ ایک جگہ ایک نیک آدمی تھا، مٹھائی بنا کر بیچتا تھا، وہی ذریعہ معاش تھا، وہ رات کے حصے میں اپنے گھر والوں کی مدد سے ایک خاص مقدار میں مٹھائی بنالیتا تھا، صبح وقت پر دکان کھولتا تھا، اور اسی

وقت خریدار آ کر سب مٹھائی خرید لے جاتے تھے، باقی اس کا دن فارغ ہوتا تھا، جس کو وہ تلاوت وعبادت اور ذکر وفکر سے معمور رکھتا تھا۔

آج سے ۲۵؍سال پہلے کی بات ہے، میں حضرت مولانا قاری سیّد صدیق احمد صاحب باندوی علیہ الرحمہ کی خدمت میں حاضر تھا، اس وقت مولانا کے پاس خلقت کا اتنا ہجوم نہ ہوتا تھا، جتنا بعد میں رہنے لگا تھا، ان کا مدرسہ خاصا وسعت اختیار کر چکا تھا، دیہات کا علاقہ، بجلی کا نظم معقول نہ تھا، بعض مدرسین بیٹھے تھے، وہ مولانا سے کہہ رہے تھے کہ ایک چھوٹا سا ٹرانسفارمر مدرسے کے لئے لگ جاتا تو بجلی کی سہولت ہو جاتی، مولانا فرمارہے تھے، اس کے لئے کیا کیا کرنا ہوگا، کتنا دوڑنا پڑے گا، پھر بجلی کا محکمہ ہے، اللہ جانے اس کے قانونی اور غیر قانونی ضابطے کیا کیا ہوں؟ ابھی یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک صاحب جو پتلون پہنے اپنی کسی ضرورت کے لئے حضرت کے پاس بیٹھے تھے، بول پڑے کہ مولانا جی! اس محکمے کا ذمہ دار میں ہی ہوں، ایک درخواست مجھے لکھ کر دیدی جائے، میں ٹرانسفارمر لگوادوں گا، مولانا بہت خوش ہوئے، ان کو دعائیں دیں، کاغذ لایا گیا، درخواست بھی انھیں نے لکھی، مولانا نے دستخط کئے، انھوں نے اسے جیب میں رکھ لیا، کہنے لگا چار پانچ روز میں ٹرانسفارمر لگ جائے گا۔ میں نے اپنے جی میں کہا کہ وقت کی برکت یہ ہے؟ ورنہ اللہ جانے اس ایک کام کے لئے کتنا دوڑنا پڑتا اور کتنا وقت اور مال لگانا پڑتا۔

ہمارے یہاں وقت کی برکت کا ایک لمبا سلسلہ ہے، رسول اللہ ﷺ سے شروع ہو کر انھیں کے طفیل میں ان کے نائبین ووارثین تک ایک طویل تاریخ ہے، تھوڑے وقت میں ان حضرات نے بہت کام کئے، اور وقت کی تنگی یا عدیم الفرصتی کی شکایت نہیں کی۔

رسول اللہ ﷺ نے عالم انسانیت میں جو خوشگوار انقلاب برپا کیا، وہ کتنی مدت میں ہوا، صرف ۲۳؍سال کی مدت میں۔ آپ سیرت کی کتابیں پڑھ جایئے، حدیثوں کا مطالعہ کر لیجئے، کہیں آپ عدیم الفرصتی کی شکایت نہیں پائیں گے، فرصت کا تو یہ عالم ملے گا کہ نوافل میں گھنٹوں آپ کھڑے رہتے تھے، آپ کی سیرت کے تذکرے میں آپ کو ملے گا کہ آپ

سے جب کوئی مصافحہ کرتا تھا تو آپ اپنا ہاتھ اس وقت تک نہیں چھڑاتے تھے جب تک وہ خود نہ چھوڑتا، عدیم الفرصت آدمی ایسا کرسکتا ہے۔

آپ کے بعد آپ کے خلفاء کے حالات میں بھی یہی برکت نظر آتی ہے، امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کون عدیم الفرصت ہوسکتا ہے، مگر فرصت کی فراوانی کا حال یہ ہے کہ زکوٰۃ کا اونٹ بھاگ گیا ہے، تو امیر المومنین خود اس کی تلاش میں نکلے ہوئے ہیں۔ بدو کے یہاں رات میں ولادت کا مرحلہ ہے، اس کا خیمہ مدینہ سے باہر ہے تو آپ خود اپنی زوجہ مکرمہ کو لے کر اس کے پاس پہونچتے ہیں، اور جب تک بچہ بخیریت تولد نہیں ہوجاتا، وہاں سے ہٹتے نہیں، ایک عورت خالی ہانڈی آگ پر چڑھائے ہوئے ہے، آپ کو معلوم ہوتا ے تو بیت المال سے کھانے پکانے کا سامان لے کر خود جاتے ہیں، خود آگ جلاتے ہیں، خود پکاتے ہیں، بچوں کو کھلاتے ہیں اور خوش ہوکر آتے ہیں، کس قدر فرصت تھی۔

اب آیئے، تاریخ کے صفحات کو سمیٹتے ہوئے دار العلوم دیوبند تک آیئے! دار العلوم دیوبند میں ایک بڑا جلسہ ہو رہا ہے، علماء کرام کا مجمع ہے، عوام کی بھیڑ آرہی ہے، زبردست انتظام ہے، مگر منتظم اعلیٰ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب علیہ الرحمہ کو حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ دیکھتے ہیں کہ ہاتھ میں تسبیح لئے اطمینان سے ٹہل کر وظیفہ پڑھ رہے ہیں، جیسے ان کو اس انتظام سے کوئی تعلق ہی نہیں، حالانکہ تمام تر انتظام انھیں کا تھا، حضرت تھانوی نے عرض کیا، حضرت اتنا بڑا انتظام ہے، اور آپ اس درجہ اطمینان سے مصروف تسبیح وتہلیل ہیں، فرمایا میاں! یہ تو ایک مدرسہ اور ایک جلسہ ہے، ہم کو تو حکومت دیدو تو اسی طرح تسبیح پڑھتے ہوئے کام کرلیں گے۔ واقعی اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی طاعت میں برکت ہمہ گیر ہوتی ہے۔

لیکن اس کی طرف کون آتا ہے، بظاہر اس میں لذت نفس نہیں ہے، اس لئے آدمی اس سے گھبراتا اور کتراتا ہے، حالانکہ جس حال اور جس مشغلہ میں وہ ہے، وہ سراسر رنج وکلفت کا حال ہے۔ **إن فی ذلک لعبرة لاولی الابصار۔** (ستمبر ۲۰۰۲ء)

☆☆☆☆☆

بسم الله الرحمن الرحيم

میڈیا اور پروپیگنڈے کی حقیقت

أعوذ بالله من الشيطن الرجيم   بسم الله الرحمن الرحيم

﴿لَن يَّضُرُّوكُمْ﴾ اى اليهود يا معشر المسلمين بشئى ﴿اِلَّا اَذًى﴾ بـاللسان من سب و وعيد ﴿وَاِنْ يُّقَاتِلُوكُمْ يُوَلُّوكُمُ الْاَدْبَارَ﴾ منهزمين ﴿ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ﴾ عليكم بل لكم النصر عليهم۔ (سورہ آل عمران: ۱۱۱، جلالین شریف)

ترجمہ: اے مسلمانوں کی جماعت یہود (تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے سوائے) زبان سے (تکلیف پہونچانے کے) کہ کچھ گالی گلوج اور دھمکیاں دے لیں (اور اگر وہ تم سے لڑائی کر لیں تو پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے، پھر ان کی) تمہارے خلاف (مدد نہیں ہوگی) بلکہ تمہاری ہی مدد ان کے خلاف ہوگی۔

مسلمانوں میں تین چیزیں ہوں، جن کا تذکرہ اس رکوع کی پہلی آیت (۱) میں ہوا ہے یعنی امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور ایمان باللہ، اگر یہ تینوں باتیں موجود ہوں تو خبر دی گئی ہے کہ یہ یہود و نصاریٰ تم کو کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتے۔ ہاں اتنا ضرور ہوگا کہ ان کی زبان سے تمہیں تکلیف ہوگی، یہ تہمت تراشیاں کریں گے، برا بھلا کہیں گے، طرح طرح کی دھمکیاں دیں گے، اس سے تمہیں تکلیف ہوگی، ایک خوف کا ماحول بنا رہے گا۔ آج کی زبان میں ''دہشت گردی'' کریں گے۔

چنانچہ یہی بات آج بھی ہے، یہ قوم جھوٹے پروپیگنڈے پھیلانے میں سب سے طاق ہے، میڈیا اس کے ہاتھ میں ہے، ہمہ وقت کچھ نہ کچھ غلط سلط باتیں مسلمانوں کے خلاف ریڈیو، ٹی وی اور انٹرنیٹ کے ذریعے دنیا میں پھیلتی رہتی ہیں، ہر روز ایک نئی بات، یا روزانہ مکرر سہ کرر ایک ہی جھوٹی بات اتنی مرتبہ کہی جاتی ہے کہ وہ جھوٹ سچ بن کر رہے،

مسلمان بے چارہ کبھی صفائی دیتا ہے، کبھی اس جھوٹے پروپیگنڈے کے خلاف احتجاج کرتا ہے، قراردیں پاس کرتا ہے، مگر بات جوں کی توں رہتی ہے، پھر گھبرا کر علماء پر اور اپنے رہنماؤں پر خفا ہوتا ہے، کہ یہ لوگ کیوں نہیں ہمہ گیر قسم کا جواب دیتے کہ معاملہ بالکل صاف ہوجائے، پھر مزید ناراض ہوکر کہتا ہے کہ ان علماء نے سائنسی ترقی کی اہمیت کو نہیں سمجھا، یہ صرف اپنے مدرسوں میں بند رہتے ہیں، سائنسی طاقت ان کے ہاتھ میں ہوتی تو منہ توڑ جواب دیا جاسکتا تھا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں!

مسلمان اس آیت مبارکہ پر غور کریں اور انصاف سے اپنا، اپنے اعتقاد و یقین کا، اور اپنے کردار و گفتار کا جائزہ لیں، مسلمانوں کی سیاست اور ان کی زندگی کا اور اس کا محور اور ان کا مقصدِ زندگی تو آخرت کی سرخروئی اور کامیابی ہے اور ان کا اعتماد و انحصار اللہ کی ذات پر ہے، مسلمان پابند ہیں، آزاد نہیں ہیں، انھیں ہر عمل اور قول میں اللہ کے احکام کو پیش نظر رکھنا ہے اور ان پر عمل پیرا ہونا ہے، اس لئے مسلمان کسی بھی گناہ میں اس حد تک نہیں جاسکتا جہاں تک کافر پہونچتا ہے۔

جب یہ بات ہے تو اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو تمام دنیاوی تدبیروں کا مکلّف نہیں بنایا ہے، تقویٰ وطہارت کے ساتھ کچھ کچھ تدبیریں ان کے لئے کافی ہیں، تدبیروں میں انہماک اور غلو ان کے حق میں مفید تو کیا مضر ثابت ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے خیر امت ہونے کی تین بنیادیں اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمائی ہیں: ایک امر بالمعروف، دوسرے نہی عن المنکر، تیسرے ایمان باللہ، یہ تینوں چیزیں جس درجے میں مطلوب ہیں، انھیں حاصل کرنے کی مسلمان کوشش کرے، اس کے بعد یہود و نصاریٰ کی مشنری ان کے خلاف زہر اگلتی، ان کی میڈیا فضا میں آگ برساتی رہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ زبان وقلم کی ایذا رسانی رہے گی، لیکن مسلمان اپنے طریق کار پر مضبوطی سے ثابت قدم رہیں تو ان باتوں کا کوئی خاص ضرر نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اپنی غیبی نصرت وطاقت سے ہر ایک کا جواب فراہم کردیں گے۔

مگر افسوس یہ ہے کہ مسلمان غلط پروپیگنڈوں سے مرعوب ہوکر ان چیزوں سے

بھاگ کھڑا ہوتا ہے، جو مطلوب اور ضروری ہیں، اور دنیاوی تدبیروں کو اتنی اہمیت دینے لگتا ہے، جیسے وہی کارساز ہوں، ہمارے ملک میں تو مسلمان بہت کچھ بے بس اور کافروں کی زیادتیوں کے شکار ہیں، گو کہ انفراداً اور اجتماعاً یہاں بھی امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور ایمان باللہ کے میدان میں بڑی وسعت ہے، لیکن اللہ کو ماننے والا ادھر سے روگردانی کرکے، اپنے نفسانی جذبات کی تکمیل میں منہمک رہتا ہے، اسی میں مال بھی پھونکتا ہے، اسی میں وقت بھی ضائع کرتا ہے۔

ابھی پچھلے دنوں ایک جگہ یہ راقم موجود تھا، دوسری جگہ جانے کے لئے ایک کرایہ کی گاڑی کی تلاش جارہی تھی مگر مل نہیں رہی تھی۔ اتوار کا دن تھا، مجھے تعجب ہورہا تھا کہ اتنا مالدار شہر ہے، گھر گھر گاڑیاں ہیں پھر بھی نہیں مل پارہی ہے، معلوم ہوا کہ آج اتوار ہے، مسلمانوں کے خوش عیش گھرانے، ان کے بچے اور نوجوان گاڑیاں بک کرالیتے ہیں، اور ان میں بھر بھر کر دور دراز جگہ میں پکنک منانے جاتے ہیں، کھاتے ہیں، پیتے ہیں، رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ یہ سن کر دل کو بڑا دھکا لگا کہ ہمارے موجودہ حالات اس ملک میں کیا اس طرح کے بے جا اور بے تحاشا فضول بلکہ معصیت کے اخراجات کی اجازت دیتے ہیں؟ کیا انھیں لچھنوں پر اللہ کی نصرت وحمایت کی امید ہے؟

خیر یہ تو اپنے ملک کی بات ہے، جہاں سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے مسلمان مغلوب ہیں۔ رونا تو یہ ہے کہ جہاں مسلمان سیاسی اعتبار سے بالادست ہیں، وہاں بھی خیر امت ہونے کے مذکورہ اوصاف ناپید ہیں، ان کا انتظام حکومتوں کو کرنا چاہئے، مگر دکھ کی بات ہے کہ وہ اللہ کی تعلیم کو نظر انداز کرکے کفار کے سامنے کاسۂ گدائی لئے نظر آتے ہیں، ڈرتے ہیں کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہم کو بڑا نقصان پہونچ جائے گا، لیکن اللہ تعالیٰ نے کیا فرمایا ہے، ذرا مذکورہ بالا آیت پر غور کریں، راستہ بھی کھلے گا، تسلی بھی ہوگی، اور حق تعالیٰ کی طرف سے نصرت بھی ہوگی۔ (اکتوبر ۲۰۰۲ء)

☆☆☆☆☆

بسم الله الرحمن الرحيم

اہل اسلام کی ذمہ داریاں

آخر امریکہ نے عراق پر ہلہ بول ہی دیا۔ ساری دنیا ہاں ہاں کرتی اور پکارتی رہ گئی، ہر صدا بے اثر، ہر درخواست نا قابل اعتناء، ہر دلیل نا کام، بس ؎

بگڑتی ہے جس وقت ظالم کی نیت　　نہیں کام آتی دلیل اور حجت

ظالم کی نیت پہلے ہی سے بگڑی ہوئی تھی، انجام سے بے پرواہ ہوکر، عراق پر نہیں، عالم اسلام پر اس نے وار کر دیا۔ اسے عراق سے دشمنی نہیں، نہ صدام حسین کوئی چیز ہے، اسے دشمنی اسلام سے ہے، عالم اسلام سے ہے، اس نے جب طالبان سے جنگ چھیڑنے کا ارادہ کیا تھا، تو بے ساختہ اسے ''صلیبی جنگ'' سے تعبیر کر گیا تھا اور یہ اس کے دل کی آواز تھی، اسی جنگ کی یہ دوسری قسط اس نے چھیڑی ہے، اس کا نشانہ عالمِ اسلام ہے، اس کی نگاہیں حرمین شریفین پر لگی ہوئی ہیں۔ وہ وہاں تک تو نہیں پہونچ سکے گا کیونکہ وہاں کا دروازہ کفر اور کافروں پر بند ہو چکا ہے۔ اور کفار کو شاید اس کی بہت تکلیف ہے، کہ دنیا کا کوئی گوشہ اور کوئی خطہ ایسا نہیں ہے جہاں پر ہر مذہب کا ماننے والا نہ جا سکتا ہو، صرف حرمین شریفین کی پاک اور مقدس سرزمین وہ ہے جہاں کفر و شرک سے آلودہ قلب اور ناپاک قدم نہیں جا سکتا، چاہے وہ وقت کا نمرود و فرعون ہی کیوں نہ ہو، سب کو اپنی سواری کا رخ ادھر سے ہٹانا ہی پڑتا ہے، کفر کو اس سے بڑی تکلیف ہے، وہ اسے اپنی توہین سمجھتا ہے۔ ''دجال اکبر'' اپنی تمامتر طاقتوں، شعبدوں اور کوششوں کے باوجود ان دونوں جگہوں میں نہیں گھس سکے گا۔

کعبۂ مقدسہ، مرکز جلال الوہیت ہے، مظہر معبودیت و محبوبیت ہے، حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السّلام کو حکم تھا کہ: ﴿أَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِيْنَ وَالْعَاكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ

السُّجُوْدِ﴾ (سورۃ البقرۃ) میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع وسجدہ کرنے والوں کے واسطے پاک وصاف رکھو، یعنی کفر وشرک کی آلودگی، اور بتوں کی نجاست سے پاک رکھو، پھر ایک عرصۂ دراز تک اللہ کا یہ گھر ہر قسم کی آلودگی سے پاک رہا، حضور اکرم ﷺ کی ولادت شریفہ سے تقریباً تین سو سال پہلے، ایک سر پھرے گمراہ نے اس میں بت نصب کر دیا تھا، پھر یہ گندگی بڑھتی گئی، یہاں تک کہ رسول اکرم ﷺ کی ولادت کے وقت تین سو سے زائد بتوں کو وہاں رکھ دیا گیا، ہجرت کے آٹھ سال بعد جب آپ نے مکہ فتح کیا تو ان بتوں کو، اور بت پرستوں کو حرم مکہ سے نکال باہر کیا، آپؐ کی برکت سے اب یہ علاقہ بشمول مدینہ منورہ بت پرستی اور کفر وشرک کی نحوست سے پاک ہے، طاغوت نے ہر دور میں زور لگایا کہ اس حرم خداوندی میں دخل اندازی کرے مگر جلال الوہیت وغیرتِ محبوبیت نے اسے توڑ کر رکھ دیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيْمٍ﴾ (سورۃ الحج) جو اس میں یعنی حرم میں از روئے سرکشی ظلم کا ارادہ کرے گا، ہم اسے دردناک عذاب چکھائیں گے۔ تاریخ کی شہادت ہے کہ جس نے حرم مکہ کے ساتھ ظلم وزیادتی کا ارادہ کیا، وہ ٹوٹ کر رہا۔ کبھی دنیا میں بھی اس نے سزا بھگتی، کبھی بظاہر دنیا میں بچا رہا، مگر آخرت کے سخت عذاب سے اسے نجات نہ ملی۔ بت پرستی ایک عرصہ تک اس مرکز توحید میں گھسی رہی، مگر بت پرستوں نے کعبۃ اللہ شریف کے ظاہری ادب کا دامن ہاتھ سے چھوڑا نہیں تھا۔ وہ بیت اللہ کا طواف کرتے تھے، اور طواف کرتے وقت **اللّٰھم اغفر لي** (اے اللہ میری مغفرت کر دیجئے) کی گردان کرتے تھے، وہ حج کے ارکان ادا کرتے تھے، حد یہ ہے کہ جب کعبہ شریف میں ایک بار آگ لگی، اور اس کی عمارت خستہ ہوگئی، تو اس کی تعمیر نو کے لئے حلال مال کا انھیں بت پرستوں نے جن کے پاس زیادہ تر سرمایہ مالِ حرام کا تھا، اتنا اہتمام کیا اور اس میں اتنی شدت برتی کہ کعبہ کی تعمیر کے لئے خالص حلال مال اتنا نہ جمع ہوسکا جس سے اس کی پوری تعمیر ہوسکتی، تو انھوں نے کعبہ کی عمارت کو چھوٹا کرنا گوارہ کیا، مگر اللہ

کے اس پاک گھر میں ناپاک مال لگانا گوارا نہ کیا، چنانچہ حطیم کا حصہ کعبہ مقدسہ کا جز تھا، اب وہ اس کے باہر ہے، غرض یہ ہے کہ کفر وشرک اور بت پرستی نے خانہ کعبہ کا ظاہری ادب برقرار رکھا تو اسے کچھ عرصہ تک مہلت ملی رہی، پھر ابرہہ نے اس مقدس گھر کے ساتھ شوخ چشمی کی، اس کے انہدام کے لئے فوج لیکر چڑھا۔ اہل مکہ باوجودیکہ بت پرست تھے، مگر جانتے تھے کہ یہ گھر ان بتوں کا نہیں ہے، اللہ کا ہے، انھوں نے اللہ کا گھر اللہ کے حوالے کیا، بتوں کے حوالے نہیں کیا، انھیں مقابلے کی طاقت نہیں تھی، تو اپنی جان لیکر پہاڑوں میں چلے گئے۔ پھر اللہ نے اپنے گھر کی حفاظت کر لی، ابرہہ اپنے لشکر سمیت پرندوں کے مسلسل حملوں کی تاب نہ لا سکا، اور سب کھائے ہوئے بھس کی طرح ریزہ ریزہ ہو کر رہ گئے۔

اس دور کے طاغوتوں نے پھر اس دیار مقدس پر نگاہ جمائی ہے، عالم اسلام ان کے مقابلے میں کمزوری محسوس کر رہا ہے، سامان جنگ کی بھی کمزوری، فوج کی بھی کمزوری، ہمّت وحوصلہ کی بھی کمزوری، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایمان کی بھی کمزوری! یہی وجہ ہے کہ عالم اسلام اگرچہ زمین کے ایک بڑے رقبے پر پھیلا ہوا ہے، مسلمانوں کی حکومتیں بہت سی ہیں۔ اور بہت صاحب ثروت بھی ہیں، قدرتی خزانوں سے مالا مال ہیں، مگر سب سہمے ہوئے ہیں، ہر ایک حکمراں کو یہ فکر ہے کہ اس کی حکومت نہ چلی جائے، اس لئے کوئی دم سادھے بیٹھا ہے، کوئی ہم نوائی اور موافقت میں پیش قدمی کرتا ہے، چند ایک ہیں جو اس طاغوت کو للکارتے ہیں، اگر سارا عالم اسلام ایک آواز ہو کر اٹھ کھڑا ہوتا، تو کسی طاغوت کی ہمت نہ ہوتی کہ وہ آنکھ دکھاتا۔ اگر یہ حکومتیں مظلوم طالبان کی حمایت پر کمر بستہ ہو گئی ہوتیں، جن پر محض ناحق ظلم کے پہاڑ توڑے گئے، تو آج بغداد پر چڑھ دوڑنے کی ہمت نہ ہوتی۔ مگر ''حبّ دنیا'' اور ''کراہیت موت'' نے ان حکمرانوں کے قلوب کو دیمک کی طرح چاٹ لیا ہے، مشہور حدیث ہے جس کو امام ابوداؤد نے حضرت ثوبانؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ:

> رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قریب ہے (وہ زمانہ) کہ (دشمن) قومیں تمھارے خلاف (جنگ کرنے اور تم کو مٹا دینے کے لئے) ایک دوسرے کو اس طرح دعوت دیں

گی جس طرح کھانے والی جماعت کے آدمی کھانے کی لگن کی طرف ایک دوسرے کو بلاتے ہیں۔ کسی نے عرض کیا کیا اس دن ہماری تعداد کی قلت کی وجہ سے ایسا ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا: (نہیں) بلکہ تم اس وقت بڑی تعداد میں ہوگے، لیکن سیلاب کے کوڑے کرکٹ کی طرح ہوگے اور اللہ تعالیٰ تمھارے دشمنوں کے دلوں سے تمھاری ہیبت نکال دیں گے، اور تمھارے دلوں میں ''وہن'' ڈال دیں گے، دریافت کیا گیا حضرت! وہن کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا:

دنیا کی محبت اور موت کی کراہت

آج یہی دنیا کی محبت اور موت سے ناگواری کی دیمک قلوب کو چاٹ گئی، کیا حکمرانوں کا طبقہ، کیا اصحاب ثروت کا طبقہ، کیا عوام کی بھیڑ اور کیا خواص کا مجمع! ہر ایک کا ایک ہی حال ہے، **الاّ ما شاء اللہ**

حکمراں طبقہ چپ ہے، یا طاغوت کی ہاں میں ہاں ملا رہا ہے، اصحاب ثروت اپنے مال واسباب کی فکر اور اس کے اہتمام میں غلطاں وپیچاں ہیں۔ انھیں جہاں مال کا نقصان محسوس ہوتا ہے متحیر اور حیرت زدہ ہو کر کھڑے رہ جاتے ہیں، عوام ضرور شور مچاتے ہیں، مگر ان کا شور وغل صرف زبان کی حد تک رہتا ہے، ان سے اتنا بھی نہیں ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو ان طریقوں سے الگ کر لیتے جن پر غیروں کی چھاپ لگی ہوئی ہے، اور وہ طریقہ اختیار کرتے، جو اللہ ورسول کا عطا فرمودہ ہے، کافروں کے خلاف شور وغوغا ضرور ہے، مگر ان کو برتا جائے اور دیکھا جائے تو، پورے پورے کافرانہ طور وطریق پر ملتے ہیں، کیا صورت میں۔ کیا سیرت میں، کیا اخلاق وکردار میں، کیا مال ودولت کی محبت میں، کیا منصب وحکومت کی لالچ میں، کسی رخ سے اسلامی طور وطریق کا پتہ نہیں چلتا۔

رسول اللہ ﷺ کی پیشن گوئی، جو اوپر نقل کی گئی ہے، وہ صرف پیشن گوئی نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کیلئے ایک انتباہ ہے، ایک درس عمل ہے، ایک ہدایت ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ہر وہ سبب جس سے دنیا کی محبت پیدا ہوتی ہے، اور ہر وہ بات جس کے نتیجے میں موت

ناخوشگوار معلوم ہوتی ہے، اسے اپنی زندگی سے خارج کریں، اگر ایسا کرلیا گیا، تو دشمنوں کو حوصلہ نہ ہوگا کہ وہ آپس میں مسلمانوں کے خلاف اس طرح دعوت دیں، جیسے وہ کوئی تر نوالہ ہوں۔ بلکہ ان کی ہیبت دلوں میں اس طرح بیٹھ جائے گی، کہ انھیں اٹھنے کا حوصلہ نہ ہوگا۔

کفر وشرک کے طاغوت، بغاوت اور دہشت گردی کے فرعون نے تمام دنیا میں جنگ کا ایک ماحول بنادیا ہے، یہ جنگ کسی ایک ملک کے خلاف نہیں ہے، پورے عالم اسلام کے خلاف ہے، اس جنگ میں ہر مسلمان کو اپنی بساط کے مطابق عالم اسلام کی مدد کرنی ہے، یہ ایک فریضہ ہے، جسے اہل اسلام نہ فراموش کریں، نہ اس سے غفلت برتیں، نتیجہ خدا کے اختیار میں ہے، لیکن عمل کی ذمہ داری ہماری ہے۔

مسلمان حکمرانوں کا فریضہ ہے کہ اپنے اختلافات اور ذاتی مفادات کو ایک طرف رکھ کر ہر ممکن طاقت سے اس طاغوت کی شکست وریخت کا بندوبست کریں، حکومت دنیا کی کسی طاقت کے ہاتھ میں نہیں ہے، **مالک الملک** کے ہاتھ میں ہے، وہ برملا اعلان کردیں اور اپنے دل میں یہ یقین جمالیں کہ ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِیَدِکَ الْخَیْرُ إِنَّکَ عَلیٰ کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ (سورہ آل عمران: ۲۶) تم کہہ دو کہ اے اللہ! اے ملک کے مالک! آپ جسے چاہتے ہیں حکومت دیتے ہیں، اور جس سے چاہتے ہیں حکومت چھین لیتے ہیں، جسے چاہتے ہیں غلبہ عطا فرماتے ہیں، اور جسے چاہتے ہیں کمزور اور بے بس بنادیتے ہیں، آپ کے ہاتھ میں خیر ہے بے شک آپ ہر چیز پر قادر ہیں۔

وہ ہرگز یہ اندیشہ دل میں نہ لائیں کہ یہ طاغوت بکھر گیا یا بپھر گیا تو حکومت خطرے میں پڑ جائیگی، اس کا سرا کہیں اور ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میری یہ آواز بادشاہوں کے ایوانوں تک نہیں جائیگی، لیکن بات ضروری ہے اسلئے کہی گئی۔

خواص علماء کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے اپنے دائرے میں پیغام حق کو پوری قوت کے ساتھ پہنچائیں۔ اسلام کو اپنے اوپر نافذ کریں، مخلص مسلمان بنیں، اور قوم وملت کے دل

سے خوف وہراس اور نا امیدی کی کیفیت کو دور کردیں۔ اسلام اور اسلامی تعلیمات سے محبت پیدا کرنے کا اہتمام کریں۔ اللہ ورسول کی محبت دلوں میں پیدا ہوگی تو بڑے بڑے خطرات آسان ہوں گے۔ دل کی زندگی اور زندگی کی حرارت اسی محبت سے ہے، یہی محبت نہ ہو تو انسان طرح طرح کی کمزوریوں کا شکار بن جاتا ہے، علامہ اقبالؒ نے ارمغانِ حجاز میں ایک رباعی لکھی ہے، کہتے ہیں:

شبے بگریستم پیش از خدا زار　　مسلماناں چرا زارند و خوارند
ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم　　دلے دارند و محبوبے ندارند

ایک رات میں خدا کے حضور بہت رویا، کہ خداوندا! مسلمان کیوں ذلیل وخوار ہو رہے ہیں۔ ندا آئی کہ یہ قوم دل تو رکھتی ہے، مگر دل کا مرکز یعنی محبوب سے محروم ہے۔

علماء ومشائخ کی اولیں ذمہ داری یہ ہے، کہ مسلمانوں کے قلوب کیلئے محبوب کا اہتمام کریں۔ محبت جاگے گی تو بڑا انقلاب لائے گی، پھر سارا عالم اسلام محبت کے اس زریں دائرے میں آجائے گا، اور سب ایک بدن کے اعضاء کی طرح ہو جائیں گے،

عام مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ دشمنان اسلام کے طور طریقوں کی طرف میلان سے اجتناب کریں، ایمان کی مضبوطی اور اعمال صالحہ کی پختگی کا انتظام کریں، تا کہ خدا کی رحمت عمومی طور پر متوجہ ہو، خاص طور سے فرائض کا اہتمام کریں، خواہ ان کا تعلق جسم وجان سے ہو، یا مال سے ہو، یا اخلاق سے ہو، نماز اور روزے کی پابندی، زکوٰۃ کی ادائیگی اور حقوق مالیہ کے ساتھ انصاف، یہ وہ چیزیں ہیں، جو براہ راست خدا کی رحمت کو متوجہ کرتی ہیں۔

(مئی ۲۰۰۳ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عالم کی لغزش

جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور، ضلع اعظم گڈھ کے مشرقی خطے کا ایک مرکزی اور معتبر ادارہ ہے، اس خاکسار نے اپنی ابتدائی عربی تعلیم کے چار سال اس میں گزارے ہیں، شعور کی ابتداء سے اس کی محبت اور اس کی عقیدت رگ وریشے میں رچی بسی ہے، اس وقت اس کے سربراہ حضرت مولانا عبدالباری صاحب نور اللہ مرقدہٗ تھے، مولانا عبدالباری صاحب صرف اس مدرسے کے ہی سربراہ نہ تھے۔ بلکہ مبارکپور اور اس کے اطراف کے مسلمانوں کے مسلّم سربراہ تھے۔ کوئی دینی وسماجی کام خواہ انفرادی ہو، یا اجتماعی، ان کے بغیر انجام نہیں پاتا تھا، آجکل اس ادارے کے سربراہ میرے رفیق درس جناب مولانا عبدالمعید صاحب قاسمی ہیں، جامعہ عربیہ احیاء العلوم کی قدیم روایت رہی ہے کہ ہر سال اس کے وسیع صحن میں ایک بڑا دینی جلسہ ہوتا ہے، اس میں ملک کے مشہور اور معتبر علماء شرکت فرماتے ہیں، ان کے مواعظ سے مبارکپور اور اس کے اطراف کے لوگ مستفید ہوتے ہیں، اسی دستور کے مطابق اس سال بھی ۶/۷/صفر کو وہ روایتی جلسہ منعقد ہوا، دوسرے روز کے جلسے میں ایک مشہور خطیب مولانا سید سلمان ندوی کی تقریر ہوئی، ندوی صاحب خطیب تو واقعی نمونے کے ہیں، اندازِ بیان بہت خوب ہے، قرآن کریم کی آیات اس طرح پڑھتے ہیں کہ طبیعت وجد میں آجائے، ان کی تقریر نہایت مرصع، اور فصاحت وبلاغت کا ایک دلآویز مرقع ہوتی ہے، کہ سننے والے جھوم جھوم جائیں۔

لیکن کاش وہ کچھ مطالعہ کر کے تقریر کرتے، صرف زور بیان سے کام نہ لیتے، بلکہ علمائے حق کی ترجمانی کرتے، قرآن کریم کی تفسیر میں اپنی رائے کو نہ داخل کرتے، لیکن واقعہ

یہ ہے کہ ان کی تقریر سن کر بہت افسوس ہوا، ان کی تقریر کا مرکزی موضوع ہی جادۂ حق سے منحرف تھا، پھر اس کی تائید میں انھوں نے قرآن کریم کی جن آیات کو پیش کیا، ان سے ان کے مدعا کی تائید نہیں ہورہی تھی، تو انھوں نے ترجمہ میں اضافہ کرکے، اپنے اسی پیش کردہ اضافہ سے استدلال کیا، اس سے غلط فہمی ہوتی ہے کہ وہ قرآن سے استدلال کررہے ہیں، حالانکہ اس اضافہ کا تعلق قرآن کریم سے نہ تھا۔

انھوں نے اپنی تقریر کا آغاز اس نکتہ سے کیا کہ یہ مدرسہ ''احیاء العلوم'' ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس مدرسہ کو ''**العلوم**'' کے احیاء کے لئے قائم کیا گیا ہے، ''العلوم'' سے مراد دینی اور انبیائی علوم ہیں، انھیں زندہ کرنا ہے، پھر انھوں نے بتایا کہ ''دین'' کی تشریح مشہور حدیث جبرئیل سے ہوتی ہے، حضرت جبرئیل رسول اللہ ﷺ کے وصال سے کچھ پہلے اجنبی بن کر آپ کی مجلس میں آئے، اور پوچھا **ما الاسلام** ؟ اسلام کیا ہے؟ **ما الایمان** ؟ ایمان کیا ہے؟ **ما الاحسان** ؟ احسان کیا ہے؟ آپ نے تینوں سوالوں کے جواب بہت وضاحت کے ساتھ دئے۔ وہ چلے گئے، تو آپ نے فرمایا کہ پوچھنے والے کو واپس بلاؤ، لوگوں نے تلاش کیا تو نہیں ملے، فرمایا وہ جبرئیل تھے، تم کو تمھارا دین سکھانے کے لئے آئے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام، ایمان اور احسان کے مجموعے کا نام ''**الدین**'' ہے، اس دین تک پہنچنے کا راستہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اس کی رہنمائی ان آیات میں کی ہے جو بالکل آغاز نبوت میں نازل ہوئی تھیں یعنی: ﴿**إقرأ باسم ربک الذی خلق، خلق الانسان من علق، اقرأ وربک الاکرم الذی علم بالقلم علم الانسان ما لم یعلم**﴾ پڑھو اپنے رب کے نام سے لگ لپٹ کر جس نے پیدا کیا انسان کو جونک جیسے جمے ہوئے خون سے، پڑھ اور تمہارا رب بڑا کریم ہے، جس نے قلم سے علم سکھایا، انسان کو وہ سب کچھ سکھایا، جو وہ نہیں جانتا تھا، اور دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کے کارہائے نبوت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا ﴿**کما أرسلنا فیکم رسولاً منکم یتلو علیکم آیاتنا ویزکیکم ویعلمکم الکتاب والحکمة ویعلمکم مالم تکونوا**

تعلمون ﴾ جیسا کہ ہم نے تم میں ایک رسول تمہارے ہی درمیان سے بھیجا، وہ تم کو ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے، اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے، اور تم کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، اور وہ سب کچھ تم کو سکھاتا ہے، جو تم نہیں جانتے تھے۔

پہلی آیت سے معلوم ہوا کہ جو کچھ انسان نہیں جانتا تھا، اللہ نے اسے وہ سب کچھ سکھا دیا ہے، اب اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ جو کچھ پڑھے، اللہ کے نام سے لگ لپٹ کر پڑھے، جو کچھ بھی اس طرح پڑھا جائے گا، وہ سب ''العلوم'' میں داخل ہوگا۔

دوسری آیت سے معلوم ہوا کہ پیغمبر علیہ السلام کا منصب جہاں یہ ہے کہ وہ ''تلاوت آیات'' کریں، ''تزکیۂ نفوس'' کریں، کتاب وحکمت کی تعلیم دیں، اسی طرح ان کا منصب یہ بھی ہے کہ وہ تمہیں وہ سب کچھ سکھائیں، جو تم نہیں جانتے، یعنی دنیوی علوم وفنون، جن کا تعلق اسباب دنیا سے ہے، جن کی ضرورت انسانی زندگی میں ہوتی ہے، آلات جنگ وغیرہ بنانے کا علم، جن سے اقوام وممالک کو فتح اور زیر کیا جائے وغیرہ۔

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ ''علوم دین'' صرف اتنے ہی میں منحصر نہیں ہیں، جو ہمارے مدرسوں میں پڑھائے جاتے ہیں، ہم نے ایک عرصہ کی غلامی کے نتیجے میں ''العلوم'' کو تفسیر وحدیث اور فقہ میں محدود کر دیا ہے، ورنہ انبیائی علوم کا دائرہ بہت وسیع ہے، ہم نے اس وسیع دائرہ کے ایک بہت مختصر جز کو لے لیا ہے، اور باقی علوم کو اس دائرے سے خارج کر دیا ہے،

موصوف نے مزید وضاحت کرتے ہوئے حضرت نوح علیہ السلام کی ذات گرامی کو پیش کیا کہ انھیں اللہ تعالیٰ نے کشتی بنانے کا حکم دیا، چنانچہ وہ ایک ماہر کاریگر تھے، وہ کشتی بنانے کا فن جانتے تھے، انھوں نے اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں ایک عظیم الشان کشتی بنائی، معلوم ہوا کہ یہ فن بھی انبیائی علوم کے دائرے میں آتا ہے، مگر ہم نے اسے بھی دوسروں کے حوالے کر رکھا ہے۔

پھر انھوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کا اسم گرامی پیش کیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے

﴿**و ألنا لهٗ الحدید**﴾ ہم نے ان کیلئے لوہا نرم کر دیا، موصوف نے کہا کہ لوہے کو نرم کرنے کا مطلب شعبداتی ذہن اور کراماتی مزاج رکھنے والوں کے نزدیک یہ ہے کہ لوہا ان کے ہاتھ میں آکر موم کی طرح نرم ہو جاتا تھا، اور وہ اسے جس طرح چاہتے تھے موڑ دیتے تھے، مگر یہ غلط ہے، واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے بڑی بڑی بھٹیاں، لوہے کو تپانے اور گلانے کیلئے بنا رکھی تھیں، ان میں لوہا گلا کر زرہیں بنائی جاتی تھیں اور ہتھیار ڈھالے جاتے تھے، یہ فن حضرت داؤد علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا تھا، پس یہ بھی انبیائی علوم میں شامل ہے، جس کا احیاء کرنا ہماری ذمہ داری ہے،

پھر انھوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر چھیڑا کہ وہ جناتوں سے بڑی بڑی بلڈنگیں، مجسمے، کوہ پیکر دیگیں اور لگن بنوایا کرتے تھے، ان کے پاس ایک زبردست بحری بیڑہ تھا، جس کی رفتار صبح وشام ایک ایک ماہ کی مسافت کے بقدر تھی، ﴿**غدوّھا شھرٌ وروٰحھا شھرٌ**﴾

بلڈنگوں کی تعمیر، مجسموں کی صنعت، لگن اور دیگیں بنانے کا فن، اور بحری بیڑے بنانے کی تکنیک، یہ سب انبیائی علوم میں شامل ہیں، پھر آخر میں رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ کیا کہ آپ کے پاس وہ سب ہتھیار تھے، جو دوسرں کے پاس تھے، بلکہ وہ ہتھیار بھی تھے، جو اوروں کے پاس نہ تھے، چنانچہ منجنیق اور دبابہ کو آپ نے غزوۂ طائف میں استعمال کیا تھا، یہ ہتھیار عربوں کے پاس نہ تھے، اس سے معلوم ہوا کہ اسلحہ سازی کا فن انبیائی علوم میں داخل ہے، ہم نے غلطی سے اپنا دائرہ محدود کر کے علوم دین کو چند علوم میں منحصر کر دیا ہے، یہ بہت بڑی غلطی ہے، انھیں علوم کے فقدان نے ہم کو دنیا میں ذلیل، اور شکست سے دوچار کر رکھا ہے۔ ہمارے علماء نے غلطی سے علوم دینیہ کو صرف انھیں چیزوں میں محدود کر دیا ہے، جو مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں، حالانکہ وہ علوم بھی انبیائی علوم ہیں، جنھیں ہم نے کالجوں، یونیورسٹیوں کے حوالے کر دیا ہے، اور جنھیں ہم دنیاوی علوم کہتے ہیں، ان سب کو ہمارے دائرۂ عمل میں آنا چاہئے، ہماری ذلت کا ایک بڑا سبب یہ علوم دین اور علوم دنیا کی تفریق ہے۔

یہ ہے ندوی صاحب کی تقریر کا حاصل، جس کو انھوں نے تفصیل کے ساتھ خطیبانہ آہنگ میں بیان کیا تھا، مگر واقعہ یہ ہے کہ ندوی صاحب کا دعویٰ بھی غلط ہے، اور ان کا استدلال بھی غلط در غلط ہے، اختصار کے ساتھ قدرے تفصیل ملاحظہ ہو۔

(۱) یہ دعویٰ کہ انبیائی علوم اور دینی علوم کا دائرہ اتنا وسیع ہے، کہ اس میں دنیاوی علوم وفنون بھی شامل ہیں، ایک ایسا دعویٰ ہے، جو علمائے امت میں اب تک کسی نے نہیں کیا ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ، انبیاء جو علوم اللہ کے پاس سے لائے ہیں، اور جس کی انھوں نے دعوت دی ہے، وہ علوم ہیں، جن سے بندوں کا ربط اللہ تعالیٰ کے ساتھ درست اور استوار ہو، چنانچہ حدیث جبرئیل علیہ السلام میں رسول اللہ ﷺ نے تینوں سوالات کے جو جوابات دئے ہیں، جن کے مجموعے کو موصوف نے بھی ’’الدین‘‘ ہونے کا اعتراف کیا ہے، اس میں کہیں دنیاوی علوم کی ہلکی سی بھی جھلک نہیں ہے۔

اسلام کیا ہے؟ کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اسلام یہ ہے کہ تم اس بات کی شہادت دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں، اور یہ کہ نماز قائم کرو، اور زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کا روزہ رکھو، اور اگر استطاعت ہو تو حج بیت اللہ کرو۔ **(الاسلام أن تشهد أن لا إلٰه إلا الله وأن محمداً رسول الله، و تقيم الصلٰوة، وتؤتي الزكوٰة، وتصوم رمضان، وتحج البيت إن استطاع إليه سبيلاً)**

اور ایمان کیا ہے؟ کے جواب میں آپ نے فرمایا: اللہ پر ایمان لاؤ، اور اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر اور یوم آخرت پر ایمان لاؤ، نیز تقدیر پر اس کے خیر وشر پر ایمان لاؤ۔ **(أن تومن بالله وملٰئكتهٖ وكتبهٖ ورسلهٖ واليوم الآخر وتومن بالقدر خيرهٖ وشرهٖ)**

اور احسان کیا ہے؟ کے جواب میں فرمایا کہ اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو، اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو، تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ **(أن تعبد الله**

کأنک تراہ فإن تکن تراہ فإنہ یراک)

اس مجموعے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دین کا مقصد یہ ہے کہ بندوں کا اللہ تعالیٰ سے ربط صحیح ہو، اس مقصد سے متعلق جو علوم ہوں گے، وہی علوم دین ہوں گے۔ اس پر تمام امت کا اجماع ہے، اب تک امت میں کسی معتبر عالم نے ان علوم دنیا کو جنھیں موصوف نے علوم دین میں داخل کرنا چاہا ہے، اور جن کے اختیار نہ کرنے کو علماء کی غلطی قرار دیا ہے۔ دینی علوم میں شامل نہیں کیا ہے، پس یہ بنیاد اور مقصد ہی سرے سے غلط ہے۔ بلکہ گمراہ کن ہے۔

رہی یہ بات کہ **علّم الانسان مالم یعلم**، انسان کو وہ سب کچھ سکھایا، جو وہ نہیں جانتا تھا، اور **یعلمکم مالم تکونوا تعلمون**، تم کو وہ سب کچھ سکھاتے ہیں، جو تم نہیں جانتے، تو یہ قرآن کے ترجمے میں اپنی رائے سے بغیر کسی دلیل کے ایک بے جا اضافہ ہے۔ ان دونوں آیتوں میں ایسا کوئی لفظ نہیں ہے، جس کا ترجمہ سب کچھ کیا جائے، اسی سب کچھ سے موصوف نے استدلال کیا ہے، کہ تمام علوم وفنون انبیائی علوم کے دائرے میں آتے ہیں، یہ ”سب کچھ“ قرآن میں نہیں ہے، کیونکہ **ما** اگرچہ عام ہے، مگر وہ اثبات میں استغراق کیلئے نہیں آتا۔ یعنی ”سب کچھ“ اس کے عموم میں شامل نہیں ہوتا، اور موصوف کے استدلال کی بنیاد یہی ”سب کچھ“ ہے، پس یہ استدلال قرآن سے نہیں، ان کی اپنی رائے سے ہے، مگر ان کے بیان سے ایسا تاثر ہوتا ہے، جیسے وہ قرآن ہی سے استدلال کر رہے ہوں۔

علماء جانتے ہیں استدلال کی یہ فن کاری کن لوگوں کا شیوہ ہے۔ ﴿**وان منهم لفريقا يلوٗن السنتهم بالكتاب لتحسبوه من الكتاب وما هو من الكتاب ويقولون هو من عند الله وما هو من عند الله ويقولون على الله الكذب وهم يعلمون**﴾ اور ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں، جو کتاب کو پڑھنے میں زبان کو توڑتے مروڑتے ہیں، تاکہ تم یہ سمجھو کہ یہ بات بھی کتاب اللہ ہی کی ہے حالانکہ کتاب سے اس کا تعلق نہیں ہے، اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، حالانکہ وہ اس کی طرف سے نہیں ہے، اور اللہ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، ﴿**وما أوتيتم من العلم**

إلا قليلا ﴾علم کا بہت تھوڑا سا حصہ تمہیں دیا گیا ہے، لیکن موصوف فرماتے ہیں کہ اللہ نے وہ سب کچھ سکھایا، جو انسان نہیں جانتا تھا۔ کتنا فرق ہے کلام الٰہی میں اور دعویٰ انسانی میں؟

حضرت نوح علیہ السلام نے بے شک کشتی بنائی تھی، اور اللہ کے حکم سے بنائی تھی، اس کے بنانے کی ضرورت تھی، عذاب آنے والا تھا اس سے حفاظت کیلئے بنائی تھی، لیکن کیا کسی اشارے سے بھی یہ بات ملتی ہے کہ کشتی بنانے کا فن کوئی دینی اور انبیائی علم ہے، کیا حضرت نوح علیہ السلام نے یا ان کے بعد کسی بھی نبی نے اپنی امت میں بطور علم دین کے اس کو رواج دیا، یا اس کی ترغیب دی، حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال تک اپنی قوم کو دین کی دعوت دی تھی، کیا اس دعوت کا کوئی جز یہ بھی تھا کہ فن کشتی سازی سیکھو؟

حضرت داؤد علیہ السلام کیلئے اللہ تعالیٰ نے لوہا نرم کر دیا تھا، یہ ان کا معجزہ تھا، شعبداتی اور کراماتی ذہن والوں سے نہیں متعدد تابعین جن میں حضرت حسن بصری، قتادہ اور اعمش شامل ہیں مروی ہے کہ لوہا ان کے ہاتھ میں آکر نرم ہو جاتا تھا (دیکھئے ''تفسیر ابن کثیر'') اور اگر لوہا ان کے ہاتھ میں نرم ہونے سے یہی مراد ہے کہ وہ لوہے کو بھٹیوں میں پگھلاتے تھے، اور اس مقصد کیلئے انھوں نے بھٹیاں بنوا رکھی تھیں، تو یہ کون سی خاص بات ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اتنے اہتمام سے بطور احسان کے بیان کیا ہے، اسطرح کی چھوٹی بڑی بھٹی تو ہر لوہار کے پاس ہوتی ہے، اور داؤد علیہ السلام کے زمانے سے پہلے بھی ہوا کرتی تھی، کیونکہ لوہے کے ہتھیاروں کا استعمال بہت پہلے سے عام ہے، قرآن کی شہادت ہے کہ داؤد علیہ السلام سے صدیوں پہلے، یوسف علیہ السلام کے دور میں زنانِ مصر کے پاس چھریاں تھیں، جن سے انھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے، ظاہر ہے کہ بغیر ان بھٹیون کے جن میں لوہا تپایا اور گلایا جائے، چھری بنانے کی کوئی اور صورت نہیں ہے، یہ ساری افسانہ طرازی انھوں نے اسلحہ سازی کے فن کو دینی علوم میں شامل کرنے کی غرض سے کی ہے، مگر دونوں باتیں غلط ہیں، اس فن کو علوم دین میں شامل کرنا بھی اور یہ افسانہ طرازی بھی، کہ انھوں نے لوہا گلانے کے لئے بھٹیاں بنا رکھی تھیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلاشبہ جنات سے کام لیا، ان سے بلڈنگیں تعمیر کرائیں، مجسمے بنوائے، لگن اور دیگیں ڈھلوائیں، لیکن کیا اس سے اشارۃً بھی کوئی ثبوت ملتا ہے کہ یہ فن علوم دین میں شامل ہے اور اس کا براہ راست دین سے کوئی تعلق ہے۔ ہاں ان کی اس استدلالی منطق سے اگر کوئی چاہے، تو یہ ثابت کرسکتا ہے کہ جنات کو مسخر کرنے اور ان کو اپنے کاموں میں استعمال کرنے کا فن البتہ دینی اور انبیائی علم ہے، کیونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کیلئے جنات مسخر تھے، اور وہ ان سے کام لیا کرتے تھے، مگر وہ شاید اس کو پسند نہ کریں۔

اور تختِ سلیمانی کے بارے میں مولانا موصوف نے مودودی صاحب اور مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کی تقلید میں ایک نیا انکشاف کیا ہے، جس کا شاید اب تک کسی کو علم نہ رہا ہو کہ وہ ایک زبردست بحری بیڑہ تھا، جو سمندروں میں گشت کرتا پھرتا تھا، کاش اس کیلئے موصوف کوئی دلیل پیش کئے ہوتے۔

رسول اللہ ﷺ نے یقیناً غزوۂ طائف میں منجنیق کا استعمال فرمایا تھا، مگر ہمارے ناقص علم میں اب تک یہ بات نہیں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے اسلحہ سازی کو علم دین قرار دیا ہو، یا بطور علم دین کے اس کی ترغیب دی ہو، یا کم از کم اس کیلئے کوئی کارخانہ بنایا ہو، ضرورت کے بقدر ہتھیار مہیا کرنا، دشمنوں سے مقابلہ کی تیاری کرنا، اس کے ذرائع و وسائل فراہم کرنا لاریب کہ مطلوب ہے، مگر اسلحہ سازی کو دینی علوم کی حیثیت دے دی جائے، اس کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے،

ضرورت کی چیزیں ضرورت کیلئے ہوتی ہیں، وہ مقاصد نہیں ہوتیں، کھانا پکانے کا فن، کپڑا سینے اور بننے کا فن ایک انسانی ضرورت ہے، مگر ان فنون کو دینی علم قرار دینا ستم ظریفی ہے،

موصوف غالباً علم دین اور علم دنیا میں تفریق کے قائل نہیں ہیں، وہ شاید علم کو ایک اکائی سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ بات بداہۃً غلط ہے، واقعہ یہ ہے کہ علم دین، جسے علم آخرت کہا جا سکتا ہے، وہ الگ ہے، اور علم دنیا، جسے فن اور ہنر کا نام دینا مناسب ہے، وہ الگ ہے، علم

دنیا میں بعض علوم ناجائز اور حرام ہیں، جیسے علم سحر و طلسمات وغیرہ، اور بعض جائز ہیں۔ اور پھر جائز میں تفصیل ہے کہ کس حد تک جائز ہیں، تفصیل دیکھنی ہو تو امام غزالی کی شہرۂ آفاق کتاب ’’**إحياء علوم الدين**‘‘ کا مطالعہ کریں۔ اس کی تفصیلات ہمارے موضوع بحث سے علیحدہ ہیں۔

(جون ۲۰۰۳ء)

☆☆☆☆☆

نوٹ: اس سلسلہ میں ایک تفصیلی مضمون مجلّہ ’’المآثر‘‘ مئو میں بہ عنوان ’’سبیل المومنین سے انحراف‘‘ شائع ہوا۔ دیکھئے: اگست، ستمبر، اکتوبر ۲۰۰۳ء / ربیع الثانی، جمادی الاولیٰ، جمادی الاخریٰ ۱۴۲۴ھ، ص: ۵۴ تا ۶۵۔

(ضیاء الحق خیرآبادی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

درسِ قرآن کی ضرورت اور فوائد

صوبۂ بہار کے شہر دربھنگہ سے اس خاکسار کا تعلق زمانۂ طالب علمی ہی سے ہے، میرے محترم ومکرم دوست حضرت قاری شبیر احمد صاحب مدظلہٗ اسی ضلع سے تعلق رکھتے ہیں، پھر میرے مخدوم بزرگ حضرت ماسٹر محمد قاسم صاحب مدظلہٗ کا مرکز بھی اسی ضلع میں ہے۔ میرے بہت ہی عزیز ومحبوب طالب علم جناب مولانا قاضی حبیب اللہ صاحب سلمہٗ جنھوں نے میرے تدریس کے ابتدائی زمانہ میں مجھ سے تعلیم حاصل کی ہے۔ اور اب صوبۂ بہار کے ممتاز علماء میں شمار کئے جاتے ہیں، ان کا تعلق بھی اسی ضلع سے نکلے ہوئے ضلع مدھوبنی سے ہے، ان تینوں حضرات کی وجہ سے دربھنگہ اور مدھوبنی میرا آنا جانا بکثرت ہوتا رہتا ہے، حضرت ماسٹر صاحب مدظلہٗ اور قاری شبیر احمد صاحب مدظلہٗ کے واسطے سے شہر دربھنگہ کے ایک اور بزرگ حضرت حافظ احسن اللہ صاحب (ریٹائرڈ اے۔ ڈی۔ ایم) سے تعارف وتعلق ہوا۔ ان کے صاحبزادے جناب نور اللہ صاحب (ایل۔ ایل۔ ایم) سے دوستی ہوئی، ان باپ بیٹوں نے اس خاکسار کو اپنی محبت میں اس طرح گرفتار کیا، کہ ان کی ہر فرمائش بلکہ ہر اشارہ میرے لئے حکم بن گیا، حافظ احسن اللہ صاحب کو حفظ قرآن کا بہت ذوق ہے، انھوں نے اپنے بیٹوں، پوتوں اور پوتیوں کو اہتمام سے قرآن کریم حفظ کرایا، ان کے اشارے پر نور اللہ بھائی نے تعلیم قرآن کا ایک مرکز قائم کیا۔ اور اس میں حفظ وناظرہ کی تعلیم کا بہت معقول نظم کیا۔ ۱۹؍شوال (۲۴ھ) مطابق ۱۴؍دسمبر (۲۰۰۳ء) کو انھوں نے ایک جلسۂ دستار بندی منعقد کرنے کا ارادہ کیا۔ تاکہ حفظ قرآن سے فارغ شدہ طلبہ کو دستار دی جائے۔ اس کے لئے انھوں نے اس احقر کو دعوت دی، اور اتنے ہی پر انھوں نے اکتفا

نہیں کی ، بلکہ اپنے دینی ذوق کی بنا پر شہر کے مختلف مقامات اور مساجد میں درس قرآن کا منصوبہ بنایا، اور فرمائش کی کہ اس کے لئے کم از کم دس دن اس شہر کے واسطے وقف کروں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ ان کی فرمائش میرے لئے حکم ہے، میں اس کو ٹال نہ سکا، اور ۱۲/ دسمبر کو دربھنگہ حاضر ہو گیا۔ آج ۱۳/ دسمبر کو یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ محلّہ کرم گنج کی مسجد میں کل درس قرآن کا آغاز ہوا۔ سورۂ کہف کی تفسیر وتذکیر تجویز ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق شامل حال رہی تو دس گیارہ مجالس میں اس سورہ شریفہ کا درس اپنی استعداد کے مطابق پورا کروں گا۔

جس وقت یہ رسالہ قارئین کے ہاتھوں میں پہونچے گا۔ میں ان مجالس سے فارغ ہو کر واپس مدرسہ آچکا ہوں گا۔ ان شاء اللہ، قارئین کرام حسن قبول کی دعا فرمائیں۔

ان سطروں کی تحریر سے مقصود خودنمائی نہیں ہے، یہ گنہگار اور حقیر بندہ کتنا رُوسیاہ اور بے حیثیت ہے، یہ خوب معلوم ہے، خداوند تعالیٰ کی ستاری اور دوستوں کی نگاہ محبت ہے، کہ بہت سے لوگوں کو حسنِ ظن ہے، اور اس حسن ظن کو میں اپنے لئے سرمایۂ نجات سمجھتا ہوں، ورنہ اگر واقعی حقیقت کھل جائے، تو تمام دوستوں کو شرمندگی ہوگی کہ گندگی کے کس ڈھیر سے ہم دھوکہ کھا گئے ، اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائیں۔ یہ سطریں اس لئے لکھی جارہی ہیں کہ میرے دوستوں کو اس کا احساس ہے کہ درس قرآن کے اس سلسلے سے عامۃ المسلمین کو بہت نفع ہوتا ہے، شہر اعظم گڈھ میں ہر ہفتہ اتوار کو یہ سلسلہ چودہ سال کے عرصے سے جاری ہے، اس کے اثرات وفوائد اعظم گڈھ کے مسلمانوں پر بہت نمایاں ہیں۔ اگر ہمارے لائق فائق علماء ومشائخ اپنے اپنے ماحول ومعاشرہ کی مناسبت سے قرآن کریم کا درس جاری کریں اور عام مسلمانوں کو اس کے حقائق ومعارف سے آگاہ کریں، اور اس کے ذریعے سے ایمان وعمل کی تخم ریزی کریں، تو امید ہے کہ قلوب میں خاصا انقلاب آجائے۔ برائیاں اگر بہت تیزی سے بڑھ رہی ہیں، تو بھلائیوں کے پھیلانے میں بھی سرگرمی چاہئے، تا کہ برائیاں کچھ سمٹیں اور ان کی تاریکیاں کچھ چھٹیں۔

شیخ الھند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ جب مالٹا کی جیل سے

ہندوستان واپس آئے، تو اپنے تلامذہ کو جو ہندوستان کے بڑے بڑے علماء تھے، تلقین فرمائی تھی کہ قرآن حکیم کے درس کا سلسلہ قائم کرنا چاہئے، نیز مسلمانوں کو باہمی اختلافات سے بچانے کی کوشش کرنی چاہئے، اس کی ضرورت جیسے حضرت شیخ کے زمانے میں تھی، آج بھی ہے بلکہ اس سے کچھ زیادہ!

بہت سے صاحب ذوق حضرات قرآن کریم کے اردو ترجموں کا مطالعہ کرتے ہیں، مگر بعض اوقات وہ کسی کسی الجھن میں مبتلا ہوجاتے ہیں، کہیں کہیں ناتمام علم کی وجہ سے مطلب سمجھنے میں غلطی کرجاتے ہیں، اور دل میں کوئی غلط مضمون بیٹھا لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ قرآن میں یہی ہے، حالانکہ اس کا تعلق قرآن سے نہیں غلط فہمی سے ہوتا ہے۔ انھیں علماء سے دریافت کرنے کا موقع نہیں ملتا، یا ایسا عالم دستیاب نہیں ہوتا، جس سے اپنی الجھن رفع کرسکیں، معتبر علماء اگر درس قرآن کا سلسلہ رکھیں، تو ان الجھنوں اور غلطیوں کا سدباب آسان ہوجائے۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائیں۔

☆☆☆☆☆

اعتذار

پانچ ماہ کے طویل وقفے میں ماہنامہ ضیاء الاسلام کا خصوصی شمارہ ''قاضی اطہر نمبر'' پیش کرنے کے بعد ہم پھر بدستور سابق ماہانہ شماروں کا ہدیہ لے کر حاضر ہیں، خدا کرے خصوصی شمارہ پسند خاطر ہوا ہو، وہ نمبر ہم نے بڑے آزمائشی مرحلوں کے دوران پیش کیا ہے۔ اس وقت ادارہ ضیاء الاسلام بھی اور مدرسہ شیخ الاسلام بھی مالی اعتبار سے آزمائش وامتحان کی سختیوں میں مبتلا تھا۔ بعض وقت ناامیدی سی ہونے لگتی تھی کہ قارئین کرام سے کیا گیا وعدہ شاید پورا نہ ہو، مگر کمر ہمت کس لی گئی تھی حق تعالیٰ نے مدد فرمائی۔ اور ایسے مخلص حضرات کو کھڑا کردیا جن کے تعاون سے یہ مرحلہ بظاہر آسانی سے طے ہوگیا۔ مگر ادارہ قرضوں سے گراں بار ہوگیا، ارباب انتظام کو فکر ہے کہ حق تعالیٰ نے جس طرح اس کا چھپنا آسان فردیا، اسی طرح قرضوں سے سبکدوشی بھی آسان فرمادیں۔ اگر قارئین حضرات جن

میں ماشاء اللہ بہت سے اصحاب خیر بھی ہیں، قدرے توجہ فرمادیتے تو یہ بار اتر جاتا۔

☆☆☆☆☆

مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور۔۔۔ بطور تحدیث نعمت کے عرض ہے کہ۔۔۔ اس کے آغاز ہی سے اللہ تعالیٰ کے فضل ورحمت کا خاص سایہ ہے، مکتب کی شکل میں تو یہ مدرسہ ایک عرصۂ دراز سے دینی تعلیم کی خدمت کررہا ہے، لیکن جب شیخوپور کے حوصلہ منداصحاب کا ارادہ ہوا کہ اسے عالمیت اور درجات حفظ وتجوید کا ادارہ بنایا جائے، تو گاؤں کے باہر سے متصل ملک کے باوقار وبابرکت بزرگ علماء کے ہاتھوں اس کی بنیاد رکھوائی۔ محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی قدس سرہٗ، مرشد امت حضرت مولانا شاہ عبد الحلیم صاحب جونپوری نوراللہ مرقدہٗ، فدائے ملت حضرت مولانا سید اسعد مدنی دامت برکاتہٗ اور دوسرے اکابر علماء نے اس کی بنیاد رکھی، ان بزرگ علماء ومشائخ کی برکتیں جلد ہی ظاہر ہوئیں، اور دیر نہیں گزری کہ یہ مدرسہ علماء وطلبہ کا مرجع ومرکز بن گیا۔ اللہ کا فضل ہے اس کی رحمت ہے کہ باوجود قلت وسائل کے یہ ادارہ سال بسال ترقی کرتا گیا۔

اس کے سرپرست اول محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی قدس سرہٗ تھے، ان کی وفات کے بعد حضرت مولانا عبدالحق صاحب اعظمی شیخ الحدیث دارالعلوم کی سرپرستی کا شرف اسے حاصل ہے، ان دونوں بزرگوں کی موجودگی میں استاذ محترم حضرت مولانا محمد مسلم صاحب اعظمی نوراللہ مرقدہٗ اپنی حیات تک اس کے خاص نگراں رہے۔ اس کے اہتمام ونظامت کی ذمہ داری مولانا محمد عارف صاحب عمری رفیق دارالمصنفین اعظم گڈھ کے کاندھوں پر تھی، وہ نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ادارہ کی خدمت کررہے تھے، اور اسے ترقی دینے کے لئے مسلسل کوشاں رہے۔ مگر پچھلے سال بعض مصلحتوں کی بنا پر وہ بمبئی گئے اور وہاں طویل قیام کا ارادہ کیا۔ انھوں نے نظامت کی ذمہ داری سے معذرت کی، مدرسے کے لئے یہ ایک سخت مرحلہ تھا۔ ان کی نظامت واہتمام کے سائے میں، تمام خدام مدرسہ نہایت اطمینان سے مدرسہ کی خدمت گزاری میں مصروف تھے، ان کی اس

معذرت سے سب کو فکر لاحق ہوئی۔ خصوصیت سے اربابِ شوریٰ نہایت فکرمند ہوئے کہ قرعۂ فال کس کے نام آئے اور کس کو یہ ذمہ داری سپرد کی جائے۔

اللہ کا کرنا ہوا کہ سب کی نگاہ گاؤں ہی کے ایک نوجوان فاضل دیوبند مولانا انتخاب عالم صاحب پر ٹھہری، ان سے فرمائش کی گئی کہ وہ اس ذمہ داری کو قبول کریں۔ اول تو انھوں نے بہت معذرت کی، مگر چونکہ ان کے انتخاب پر سب کا اتفاق تھا۔ اس لئے انھیں مجبوراً قبول کرنا پڑا۔

چنانچہ انھوں نے یہ ذمہ داری سنبھال لی اور ماشاء اللہ نہایت مستعدی اور لگن کے ساتھ، وہ انتظامی امور سے دلچسپی لے رہے ہیں۔ خدا تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی کاوشوں اور کوششوں میں برکت عطا فرمائیں گے اور مدرسہ حسب سابق ترقی کرتا رہے گا۔ بلکہ اس سے بڑھ کر!

جس وقت ذمہ داری کا یہ بوجھ ان پر ڈالا گیا، اس وقت مدرسہ قرض کے بار تلے دبا ہوا تھا۔ رمضان شریف کے بعد بحمد اللہ پچھلے قرض تو ادا ہو گئے، لیکن موجودہ تعلیمی سال میں کیا ہوگا؟ اس کا انتظام کیسے ہوگا؟ یہ ایک سوال ہے جو ارباب انتظام کو پریشان کئے ہوئے ہے، جن لوگوں کی نگاہ سے یہ سطریں گزریں، ان سے درخواست ہے کہ مدرسہ کے حق میں بارگاہِ الٰہی میں دعا کا ہاتھ اٹھائیں کہ حق تعالیٰ خزانۂ غیب سے اس دینی تعلیمی ادارے کی مدد فرمائیں، تنگی کو فراخی سے اور مشکلات کو آسانیوں سے بدل دیں۔ ان کے فضل ورحمت کا ایک ہلکا سا جھونکا بھی متوجہ ہو جائے، تو ہر دشواری کا خاتمہ ہو جائے گا۔

مدرسہ کے مالی بحران کی وجہ سے ارادہ تھا کہ طلبہ کی تعداد محدود اور مختصر رکھی جائے گی، تاکہ اس راہ سے بھی اس بحران کا قدرے ازالہ ہو، لیکن ہوا یہ کہ ابھی شوال المکرّم کی صرف پانچ تاریخ ہوئی تھی۔ کہ طلبۂ علم دین کے قافلے، مدرسہ میں وارد ہونے لگے، مدرسہ کی تعطیل ۱۰؍ شوال کو ختم ہونے والی تھی، مگر پانچ چھ دن پہلے ہی سے وہ ہجوم شروع ہوا کہ ۱۰؍ شوال آتے آتے ایسا لگا کہ پرانے طلبہ کی تعداد کے برابر نئے طلبہ آ گئے۔ اللہ کا احسان ہے

کہ اس ذوق وشوق سے طالبان علوم دین امنڈ کر آ رہے ہیں، مگر مدرسہ میں رہائش کی گنجائش اتنی نہیں ہے کہ ان سب کو تو کیا معنی؟ ان میں سے قلیل تعداد کو بھی داخل کیا جا سکے، اور اگر واپس کیا جائے تو یہ خوف دامن گیر کہ اللہ تعالیٰ کی ناشکری نہ ہو جائے۔ بڑی کشمکش کی حالت ہوئی۔ لیکن قیام گاہ کی مجبوری ایسی تھی کہ بادل ناخواستہ طلبہ کی بڑی تعداد کو واپس کرنا پڑا۔ اللہ تعالیٰ نے دارالاقامہ میں وسعت عطا فرمائی، تو مجبوری کے اس عمل سے نجات مل جائے گی۔

(جنوری، فروری ۲۰۰۴ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ظالموں کی طرف میلان جرم ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورہ ہود میں ارشاد فرمایا ہے: وَلَا تَرْکَنُوْا إِلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّکُمُ النَّارُ وَمَالَکُم مِنْ دُوْنِ اللہِ مِنْ أَوْلِیَاءَ ثُمَّ لَاتُنْصَرُوْنَ ، (۱۱۳) اوران لوگوں کی طرف مت جھکو جو ظالم ہیں، مبادا تمہیں بھی آگ اپنی لپیٹ میں لے لے، اور کوئی نہیں تمہارا اللہ کے سوا مددگار، پھر کہیں مدد نہ پاؤ گے۔

اس کی تفسیر میں علامہ شبیر احمد عثمانی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں کہ جو لوگ ظالم (حد سے نکلنے والے) ہیں، ان کی طرف تمہارا ذرا سا میلان اور جھکاؤ بھی نہ ہو، ان کی موالات، تعظیم وتکریم، مدح وثنا، ظاہری تشبہ، اشتراک عمل ہر بات سے حسب مقدور محترز رہو، مبادا آگ کی لپیٹ تم کو نہ لگ جائے، پھر نہ خدا کے سوا تم کو کوئی مددگار ملے گا، اور نہ خدا کی طرف سے کچھ مدد پہونچے گی۔

حافظ ابن کثیر علیہ الرحمہ، ابن جریر طبری کے حوالے سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد نقل کرتے ہیں وہ ﴿لَاتَرْکَنُوْا﴾ کی تشریح وتفسیر فرماتے ہیں کہ ولاتمیلوا إلی الذین ظلموا۔ ظالموں کی طرف تمہارا میلان نہیں ہونا چاہئے۔ پھر فرماتے ہیں کہ وھٰذا القول حسن اے لاتستعینوا بالظلمة فتکونوا کأنکم قد رضیتم بإعمالھم (ج:۲ص:۱۴۷) یہ قول بہتر ہے، یعنی ظالموں سے تم مدد نہ مانگو ورنہ یہ ہوگا کہ گویا تم ان کے اعمال سے خوش اور راضی ہو۔

قرآن کی تعلیم کو ماننے والے، جو اسے خدا کی آخری کتاب تسلیم کرتے ہیں، اور جو اس پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں، جو مانتے ہیں کہ اس کا حرف حرف حق وصداقت کا

ترجمان ہے، بلکہ عین حق وصداقت ہے، اوراس کے خلاف جو کچھ ہے، جہل وضلالت ہے، وہ عرب ہوں یا عجم، افراد ہوں یا حکومتیں، کاش ایسا ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان واجب الاذعان پرغور کرتے، اپنے دلوں سے ظالموں کی محبت ومرعوبیت نکالتے، اللہ کے ارشاد پر محکم یقین رکھتے اوراپنے ظاہر وباطن کو، اپنے قول وعمل کواپنے حال ومقام کوظالموں کے پنجے سے نکال کراللہ اوررسول کے حوالے کرتے!

ظالم کون ہے؟ وہ جوخدا کا باغی ہے، جس کے پاس نہ اللہ کی کتاب ہے، نہ اللہ کی طرف سے کوئی علم ہے، بس وہ اندھا دھند، اپنے گھڑے ہوئے نظریات اورنفس کی خواہش کی پیروی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿قُلْ فَاْتُوْا بِکِتَابٍ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ ھُوَ أَھْدَیٰ مِنْھُمَا أَتَّبِعْہُ إِنْ کُنْتُمْ صَادِقِیْنَ، فَإِنْ لَّمْ یَسْتَجِیْبُوا لَکَ فَاعْلَمْ أَنَّمَا یَتَّبِعُوْنَ أَھْوَاءَ ھُمْ وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ ھَوَاہُ بِغَیْرِ ھُدًی مِّنَ اللّٰہِ إِنَّ اللّٰہَ لَایَھْدِی الْقَوْمَ الظَّالِمِیْنَ﴾ (سورہ قصص: ۵۰،۴۹) ترجمہ: تم کہو کہ کوئی ایسی کتاب لاؤ اللہ کے پاس سے، جوان دونوں (یعنی قرآن وتوریت) سے بہتر ہو کہ میں اس کی پیروی کروں اگرتم سچے ہو، پھر اگرتمہارا کہا ہوا نہ کرلائیں، توسمجھ لو کہ وہ اپنی نری خواہش پر چلتے ہیں، اوراس سے بڑا گمراہ کون ہوگا، جواپنی خواہش پر، بغیر اللہ کی ہدایت کے چلے، بے شک اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت کی راہ نہیں دیتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ظالم وہ ہے، جو اللہ کی ہدایت سے رُوگردانی کرکے اپنی خواہش اوراپنے نظریہ پر چلتا ہو، اسے ہدایت ربانی کی کوئی پرواہ نہ ہو۔ آج دوفریق بہت نمایاں ہیں۔ ایک جماعت وہ ہے، جس کے پاس صحیفۂ ہدایت ہے۔ اور وہ اس پر ایمان رکھتی ہے۔ اورایک فرقہ وہ ہے، جس کواس صحیفۂ ہدایت سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ وہ اپنی خواہش کومعیارعلم وعمل قرار دیتا ہے اس فرقے میں بے شمار گروہ ہیں۔ ہرایک اپنی اپنی ڈفلی بجارہا ہے۔ لیکن صحیفۂ ہدایت قرآن کریم اوراسلام کے خلاف سب یک زبان ہیں۔ یہ ظالم ہیں انفراداً بھی اوراجتماعاً بھی، حکومت وسیاست کی سطح پر بھی اورتمدن ومعاشرت کے لحاظ

سے بھی۔ یہ سب وہ ہیں، جن کے سامنے صرف دنیا ہے، اور دنیا کی زندگی ہے۔ قرآن کریم کی زبان میں یہ سب ظلم کے مرتکب ہیں۔ ان سے رُوگردانی کرنا عین فریضہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا رشاد ہے، ﴿**فَاعْرِضْ عَمَّنْ تَوَلّٰی عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا، ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِنَ الْعِلْمِ**﴾ (سورہ النجم ۲۹/۳۰) تم اس سے رُوگردانی کرو، جو ہماری یاد سے منھ موڑے اور دنیا کی زندگی کے ماسوا کچھ ارادہ نہ کرے، ان کی سمجھ کی پہونچ یہیں تک ہے۔

انھیں ظالموں کے بارے میں ہدایت کی گئی ہے کہ ان کی طرف تمہارا میلان بالکل نہیں ہونا چاہئے، ورنہ اندیشہ ہے کہ جو آگ ان پر دہک رہی ہے اس کی لپٹ تم کو بھی نہ لگ جائے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تمہارا والی وناصر بجز اللہ کے کوئی نہیں ہے۔ اگر تم ان ظالموں کی طرف میلان رکھو گے تو یقین ہے کہ خدا کی نصرت سے محروم ہو جاؤ گے۔

اس آیت کریمہ کے آئینے میں ہماری صورت کیا نظر آتی ہے؟ انفرادی حال یہ ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت نہیں غالب اکثریت کا ظالموں کی طرف صرف میلان نہیں، بلکہ اچھی خاصی ان کی پیروی میں مبتلا ہیں۔ نہ شکل وصورت سے مسلمان معلوم ہوتے، نہ رہن سہن سے، بس کبھی مسجد میں حاضری ہوتی ہے تو مسلمان معلوم ہوتے ہیں۔ اور مسجد میں حاضری کا حال یہ ہے کہ مسلمانوں کی بھری پُری آبادیاں ہیں، اور مسجد میں دیکھئے تو صف دو صف سے زیادہ نہیں ہوتی، یہی لوگ کبھی کبھی کسی داعیے یا موقعے سے جب اکثر مسجد میں پہونچ جاتے ہیں، تو وہاں تل دھرنے کی جگہ نہیں ہوتی، نمازیوں کو باہر کھڑا ہونا پڑتا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فرض نمازوں کو جان بوجھ کر چھوڑنے والے شاید نوے فیصد ہوتے ہیں۔ جہاں اتنی زبردست اکثریت ظالموں کی طرف جھکاؤ رکھتی ہو، وہاں اللہ کی نصرت کی کیا امید کی جاسکتی ہے۔ کاش! اہل ایمان اس پر غور کرتے اور ہمت باندھ کر اطاعت الٰہی پر کمربستہ ہوتے، ریڈیو سننے والے، ٹی، وی دیکھنے والے، اخبار پڑھنے والے بہت ملتے ہیں۔ مگر قرآن پڑھنے والے کتنے ملتے ہیں۔ گھر کا گھر خالی، کنبہ کا کنبہ کا محروم!

یہ حال صرف ہمارے ملک ہندوستان ہی کا نہیں ہے، عالم اسلام میں جہاں جہاں

جائیے، ظالموں کی نقالی عام ہے، مسلمانوں کی صورت غائب، انگریزوں کی صورت غالب، اور صرف صورت ہی نہیں تہذیب وتمدن بھی، سوچ وفکر بھی! ارادہ اور عمل بھی! عبادت ہر جگہ بار ہے، قرآن کی تلاوت ہر جگہ مشکل ہے، اسلامی فکر وعمل ہر جگہ مفقود ہے۔ سیاسی ضرورت ہو تو اسلام کا نام لیا جاتا ہے، مگر عمل کا مطالبہ ہو تو سب کو نیند آنے لگتی ہے۔

یہ حال تو عوام وخواص کا انفراداً ہے، اب ذرا حکومتوں پر ایک نظر ڈالئے، تو معاذ اللہ! عالم اسلام کے جتنے حکمراں ہیں، الا ماشاء اللہ سب پر ظلم وطغیان کا ہوّا چھایا ہوا ہے۔ ایک ظالم کچھ بولتا ہے تو سب اس کے پیچھے جی ہاں جی ہاں کرتے ہیں۔ کچھ دن پہلے کچھ جانبازوں اور سرفروشوں نے اسلامی سیاست وحکومت کو زندہ کرنے کی کوشش کی تھی تو ظالموں کا یہ سرغنہ غرانے لگا۔ پھر سب دم سادھ کر بیٹھ گئے۔ اور اس نے اپنی ظالمانہ کارروائیوں سے ایک خطۂ زمین کو جہنم زار بنادیا، پھر اس کی نگاہ گرم ایک جگہ اور پڑی، وہاں بھی سب چپ ہوگئے، اور اس نے ایک ملک کو تباہ کرکے رکھدیا، اتنے کے بعد بھی اس کا دعویٰ ہے کہ وہ دنیا میں امن وامان کا نقیب ہے، اور سب کہہ رہے ہیں کہ جی حضور! کسی کے سینے میں دل اور کسی کے منہ میں زبان نہیں کہ اس کو ٹوک سکے، اور اب شور ہے کہ اس کی جرأت بیجا کے نشانے پر اللہ کی کتاب بھی آرہی ہے۔ قرآن کریم میں جہاد کی آیتیں ہیں، قتل وقتال کے احکام ہیں، مخالفین کی سرکوبی کی ہدایات ہیں۔ ان ظالموں کو ان میں دہشت گردی نظر آرہی ہے۔ شاید منشا یہ ہے کہ انھیں قرآن سے نکال دو، ان کی تلاوت نہ کرو، مدارس میں ان کا درس نہ دو مجمع عام میں ان کی تبلیغ نہ کرو۔ اور مسلمانوں کی حکومتیں ہیں کہ انھیں اس کے خلاف بھی کہنے کی جرأت نہیں ہے، اللہ جانے بات کا سلسلہ کہاں تک پہونچے گی، یہ مرعوبیت، ظلم وطغیان کے سامنے سرافگندگی، ظالموں کی طرف یہ جھکاؤ اور میلان اس کا سلسلہ کہاں تک دراز ہوگا۔ جو لوگ توحید کے بڑے دعوے دار ہیں۔ ان کا جذبۂ توحید کہاں گیا؟ إنا لله وإنا إليه راجعون۔

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی مصیبتوں میں اسی طاغوت کی دہائی دیتے ہیں، اسے اپنے

ملکوں پر مسلط کر دیتے ہیں، حالانکہ اس سے منع کیا گیا ہے، ﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ أَنَّهُمْ آمَنُوْا بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ أَنْ يَّتَحَاكَمُوْا إِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ أُمِرُوْا أَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ أَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلَالاً بَعِيْداً﴾ (سورہ نساء: ٦٠) ترجمہ: کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا، جو دعویٰ کرتے ہیں کہ جو کچھ تمہاری طرف اترا اور جو کچھ تم سے پہلے اترا، اس پر ہم ایمان لائے، چاہتے ہیں کہ شیطان کے پاس معاملہ لے جائیں، حالانکہ حکم ہو چکا ہے کہ اس کو نہ مانیں، اور شیطان تو چاہتا ہی ہے کہ انھیں بہکا کر دور پھینک دے،

ان طاغوتوں کا جواب یہ نہیں ہے کہ ان کی خوشامد کی جائے۔ ان کی خوشامد سے اللہ ناراض ہوتے ہیں۔ ان کا جواب یہ ہے کہ ان کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر ان سے دوٹوک بات کی جائے اور اگر وہ حملہ آور ہوتے ہیں، تو تمام کلمہ گو ایک ہو کر اس کا مقابلہ کریں۔ اس صورت میں یقین ہے کہ خدا کی نصرت آئے گی اور اگر وہ کہیں غالب بھی نظر آئیں، تو بالآخر مغلوب ہوں گے۔

مگر رنج کی بات یہ ہے کہ ایک عرصہ سے یہی تماشا ہم دیکھ رہے ہیں کہ کوئی ہمت والا کھڑا ہوتا ہے، تو جو بے ہمت ہیں وہ بجائے اس کے کہ اپنے اندر ہمت پیدا کرتے، کمزور بنے پڑے رہتے ہیں۔ بلکہ سازشوں اور نفاق وشقاق کے طوفان اٹھانے لگتے ہیں، ٹیپو سلطان کے ساتھ یہی ہوا، حضرت سید احمد شہیدؒ کے ساتھ یہی ہوا، سوڈان میں یہی ہوا، سنوسی مجاہدین کے ساتھ یہی ہوا، خلافت عثمانیہ اسی طرح فنا ہوئی۔ اور ادھر دور اخیر میں افغانستان میں یہی ہوا۔ لعل الله يحدث بعد ذلك أمراً

(مارچ ٢٠٠٤)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حفاظت دین وایمان کی حکمت
اور مدارس اسلامیہ

ہندوستان میں مدارس اسلامی کی کیا حیثیت ہے؟ یہ بات اہل نظر پر پوشیدہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسلامی حکومت کے زوال کے بعد یہاں کے مسلمانوں کو مدارس اسلامیہ کی شکل میں ایک مضبوط اور محفوظ پناہ گاہ عطا فرمائی ہے، جس کے حصار میں دین وایمان کی حفاظت ہوتی ہے،

صدیوں پہلے کی بات ہے، کسی خطۂ زمین پر کافرانہ نظامِ حکومت تھا۔ وہاں کا حاکم اس بات پر تلا ہوا تھا کہ دین حق کا کوئی رواج باقی نہ رہے، اس دور کے لحاظ سے جو سیاسی اور مذہبی ہتھکنڈے ہوسکتے تھے، دین حق کے نام ونشان مٹانے میں استعمال کر لئے گئے تھے، اس وقت چند جوان تھے، جو اپنے ایمان پر پختہ تھے، ان کے سامنے دو راہیں تھیں، ایک یہ کہ وہ برملا اعلان حق کر کے اس کافرانہ نظام حکومت کے مدمقابل کھڑے ہوجاتے، اور اپنے غلبۂ واقتدار کی جدوجہد کرتے، پھر وہ ظالم بادشاہ کی دستبرد میں آ کر جامِ شہادت نوش کر کے زندۂ جاوید ہوجاتے، یا حالات کی سنگینی میں ایمان بھی کھو دیتے۔ دوسرے یہ کہ اپنے دین وایمان کو بچانے کیلئے کوئی ایسی راہ اختیار کرتے کہ ایمان بھی بچتا، اور اس دنیا کی زندگی بھی محفوظ رہتی، بجائے سیاسی چھیڑ چھاڑ اور غلبۂ واقتدار کی کشمکش کے یکسوئی کے ساتھ اپنے گرانمایہ ایمان وعمل کی حفاظت میں لگتے، شاید اللہ تعالیٰ بعد میں اس کی برکت سے حالات پلٹ دیں۔

حق تعالیٰ نے قرآن پاک میں خبر دی کہ ان جوانوں نے دوسری راہ اختیار کی، اور بجائے کافرانہ نظام حکومت کے سامنے ڈٹ جانے اور مقابلہ کرنے کے، ایک مرتبہ اعلانِ حق کیا، اور باہم مشورہ کر کے ایک پہاڑی کہف (کھوہ) میں پناہ لینے چلے گئے وہاں ایمان کی حفاظت تو یقینی تھی، کیونکہ کفر کی نگاہوں سے وہ روپوش ہو چکے تھے، مگر زندگی کا مسئلہ اور ضروریات زندگی کا معاملہ اہم تھا۔ یہاں کیا کمائیں گے؟ اور کیا کھائیں گے؟ پھر زندگی کی دوسری ضروریات سے کیسے عہدہ برآ ہوں گے؟ یہ سوال بہت مشکل تھا، مگر ایمان کے تحفظ وبقاء کے خیال نے اس کی پرواہ نہ ہونے دی، تاہم اس سے صرف نظر ممکن نہ تھا۔ کھوہ میں پہونچ کر وہی ایمان جو انھیں یہاں تک لے کر آیا تھا، اسی ایمان نے ایک راستہ ان پر کھولا۔ انھوں نے پورے اعتماد کے ساتھ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں دعا کی کہ ﴿رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَةً وَهَیِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَداً﴾ سورہ کہف: ۱۰) اے ہمارے پروردگار! آپ ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرمایئے۔ اور ہمارے لئے ہمارے اس معاملہ میں ہدایت کا سامان مہیا فرما دیجئے۔

مطلب یہ ہے کہ زندگی کے لئے اور ایمان ویقین کے لئے جس جس سامان رحمت کی ضرورت ہے، سب کا انتظام آپ فرما دیجئے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور انھیں نیند کی آغوش میں سلا دیا، اور بغیر اسباب ظاہر کے ان کی زندگی، صحت اور حفاظت کا مکمل انتظام تین سو سال تک قائم رکھا۔ پھر جب ان کی آنکھ کھلی تو اس خطۂ زمین پر ایک خوشگوار انقلاب آچکا تھا، کافرانہ نظام حکومت فنا ہو چکا تھا۔ باطل کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ اہل حق غلبہ پا چکے تھے۔ اس ہدایت میں کیا ان سونے والے اصحابِ کہف کا دخل نہیں تھا؟ اسباب ظاہر کی خوگر نگاہ تو یہی سمجھے گی کہ اس انقلاب میں ان سونے والوں کا دخل نہیں ہے۔ لیکن قرآن نے جس سیاق میں یہ واقعہ بیان کیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ، اس ہدایت کے پھیلنے اور انقلاب کے آنے میں اصحاب کہف کا یہ خاموش عمل ہی اصل عامل ہے، ان کے اس مجاہدانہ اور متوکلانہ اقدام کا یہ ثمرہ ظاہر ہوا کہ دنیا بدل گئی۔

قرآن میں بیان کردہ اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا میں انقلاب لانے کا ایک ہی ذریعہ نہیں ہے کہ کفر سے راست ٹکر لی جائے۔ حالات کے لحاظ سے ٹکراؤ کا راستہ بدلا بھی جاسکتا ہے، البتہ روح دونوں جگہ ایک ہوگی، وہ یہ کہ اللہ پر کامل ایمان اور مکمل توکل انسان کا شعار ہو، پھر ہجرت بھی سرچشمۂ ہدایت ثابت ہوگی، اور جہاد وقتال بھی!

دنیا طلبی اور اقتدار پسندی ہر دوصورت میں نہ ہو، ورنہ خدا کے نزدیک اس کی کوئی قیمت نہ ہوگی۔

یہ واقعہ جو ہم نے قرآن کریم میں پڑھا، پچھلی تاریخ کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنی پسندیدگی کی مہر اس پر لگا کر ہمیشہ کے لئے اہل ایمان کے واسطے ایک لائحۂ عمل متعین کردیا ہے۔

اب آیئے، اس دور میں آیئے، جس کا ایک حصہ ہم اور ہمارے قریبی اسلاف ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان سے مسلمانوں کی حکومت کا مکمل خاتمہ ہوگیا۔ اس وقت انگریزوں سے راست ٹکراؤ کا انتظام، اس ملک والوں نے بالخصوص مسلمانوں نے کیا تھا۔ مگر اس ٹکراؤ کے نتیجے میں جو کچھ رہی سہی برائے نام مسلمانوں کی حکومت تھی وہ بھی ختم ہوگئی، علماء اسلام نے اس ٹکراؤ میں بڑا اہمہ گیر حصہ لیا تھا۔ اس لئے انگریزوں نے انھیں خاص طور سے اپنے نشانے پر رکھا، اور علماء شہادت سے سرفراز ہوئے، جو بچ گئے تھے، اب ان کے سامنے وہی دوسرا راستہ رہ گیا تھا، جو اصحابِ کہف نے اختیار کیا تھا، چنانچہ موجود علماء نے بھی وہی راہ اختیار کی، اور اپنے کو کافرانہ نظام حکومت کے سامنے سے ہٹالیا۔ ایک خاصی تعداد ہجرت کرکے ارضِ اسلام یعنی حرمین شریفین چلی گئی، حتیٰ کہ اس وقت جو بزرگ امیر المومنین بنائے گئے تھے یعنی حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکیؒ وہ بھی مکہ شریف پہونچ گئے، لیکن اپنے دوخلفاء کو ہندوستان میں چھوڑ گئے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی
قدس سرھما

ان دونوں بزرگوں نے اپنے کو حکومت وقت کی نگاہ سے اس طرح ہٹایا کہ ایک

تعلیم گاہ کا حصار بنالیا، اوراس میں روپوش ہوگئے، یہ مدرسہ ان کیلئے بمنزلۂ کہف کے تھا۔ یہاں بھی معاش ومعیشت کا سوال تھا، توان لوگوں نے بھی توکل اور دعا سے کام لیا۔ پھر ایک بڑی تعداد اس کہف میں آتی چلی گئی، اس مدرسہ میں اوراس کے زیراثر دوسرے مدرسوں میں ایسی تعلیم کا انتظام کیا گیا، جس سے کافرانہ حکومت کو نہ کوئی سروکار ہو، نہ بظاہر کوئی خطرہ! حکومت کی نگاہ سے بچ کر دین وایمان کے تحفظ کا مستحکم عمل یہاں ہوتا رہا، دنیا کا قافلہ جس طور پر سفر کررہا تھا، اس کے لحاظ سے مدرسے والے گویا کہ خواب غفلت میں تھے، دنیا جدھر بھاگ رہی ہے، یہ ادھر رخ ہی نہیں کرتے، اس لئے دنیا انھیں سوتا سمجھ کر آگے بڑھتی چلی گئی اور یہ اپنی آخرت اور اپنا دین سنبھالے بیٹھے رہے، دنیاوی نظام کے لحاظ سے ان کی معاش اور دوسری ضروریات زندگی کا مسئلہ قابل غور تھا، مگر انھوں نے اس پر غور کرنے کے بجائے خدا کے حوالے کردیا۔

ان بزرگوں نے ایک نظام بنایا کہ ایمان واسلام یہاں محفوظ رہے، اور بحمداللہ وہ محفوظ رہا۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک یہ **کہفی نظام** چلتا رہا۔ بہت سے لوگوں نے انھیں طعنہ دیا کہ یہ زمانے سے بے خبر لوگ آخر زمانے کی خبر کیوں نہیں لیتے، کفر بڑھا اور چڑھا چلا جارہا ہے، مگر یہ خاموشی کے ساتھ اپنی بے خبری میں مست رہے۔ پھر جب ۹۰/سال کے بعد ایک انقلاب آیا تو زمین کے نقشے پر مسلمانوں کی ایک سیاسی طاقت پاکستان کے نام سے وجود میں آچکی تھی، جو زمین کے دو بڑے حصوں پر مشتمل تھی، پھر تکوینی طور پر وہ دونوں حصے الگ الگ ملک بن گئے۔ یہ دونوں ملک چاہے جیسے ہوں، مگر ان کا مذہب اسلام ہے۔ اور یہ مدارس دونوں جگہ آباد ہیں۔ ہم جس خطۂ زمین پر ہیں، اس کا مذہب اسلام نہیں ہے، لیکن یہاں بھی مدارس کے کہف کی شکل میں ایمان واسلام کے تحفظ کا پورا انتظام موجود ہے۔

تو یہ مدارس درحقیقت دین وایمان کے تحفظ کے بہترین قلعے ہیں۔ ان کا نظام وہی بہتر ہے کہ کفر وسیاست کی نگاہیں ان پر نہ پڑیں۔ اصحابِ کہف نے بیدار ہونے کے بعد اپنے ایک آدمی کو کھانے کیلئے باہر بھیجنے کا جب ارادہ کیا تو اس باہر جانے والے کو ہدایت کی کہ

﴿فَلْيَنْظُرْ أَيُّهَا أَزْكَىٰ طَعَاماً فَلْيَاتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ أَحَداً﴾ مطلب یہ ہے کہ جانے والا پاکیزہ اور حلال کھانے کی جستجو کرے اور اس میں سے کچھ کھانا لے کر آئے، اور اس طرح آہستگی اور خفیہ طریقے پر جائے کہ تمہارے وجود کا کسی کو پتہ نہ چلے۔ کیونکہ ﴿إِنَّهُمْ إِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ أَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْا أَبَداً﴾ اگر وہ تم کو جان لیں گے تو تمہیں پتھروں سے ماریں گے یا تم کو اپنی ملت میں لوٹا لیں گے، اور اگر ایسا ہوا تو تم کبھی کامیاب نہ ہو سکو گے۔

آج بھی ان مدارس کیلئے یہی طریقۂ کار متعین ہے کہ کفران کے احوال اور ان کی سرگرمیوں پر مطلع نہ ہو، ورنہ یہ کفر انھیں ہلاک کرنے کی کوشش کریں گے، تہمتیں لگائیں گے، پریشان کریں گے، یا پھر اپنے طور طریقے پر لانے کی جدوجہد کریں گے۔ ان مدارس کا خاموش عمل ہی مؤثر ہے، اور یہ نہ سمجھیں کہ ان کا یہ خاموش عمل بے اثر ہوگا، یا اس سے ان کی معیشت تباہ ہوگی۔ اللہ پر بھروسہ کریں، تو دین وایمان بھی محفوظ رہے گا۔ جان کی بھی حفاظت ہوگی، اور بقدرِ ضرورت معاش کا بھی انتظام ہوتا رہے گا۔ اور خوشگوار انقلاب کے دروازے پر دستک بھی ہوتی رہے گی۔

کہنے والے جو چاہیں کہتے رہیں، طعنہ دینے والے جو چاہیں طعنہ دیتے رہیں لیکن مدارس کو انھیں خطوط پر عامل رہنا چاہئے جو ابتداءً بزرگوں نے متعین کردئے تھے۔ بانیٔ دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے چند رہنما اصول دارالعلوم دیوبند کیلئے ابتداءً متعین فرمائے تھے، یہی اصول تمام مدرسوں کے لئے ہیں۔ ان میں سے چند دفعات یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

(☆)......اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں ہے جب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرطِ توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا، اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانہ یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امدادِ غیبی موقوف ہوجائے گی اور کارکنوں

میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا، القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔

(☆)......سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی مضر معلوم ہوتی ہے۔

(☆)......تا مقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندہ سے امید ناموری نہ ہو، بالجملہ حُسنِ نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے،

(☆)...... یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین باہم متفق المشرب ہوں اور مثل علمائے روزگار خود بین اور دوسروں کے درپئے توہین نہ ہوں، خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔

کاش کہ اب بھی اسی طریقے پر کام ہوتا رہتا۔ اور لوگوں میں پروپیگنڈے کا شوق نہ ہوتا، اور ہر خزانہ سے مال حاصل کرنے کی ہوس نہ ہوتی، بلکہ صرف وہی مال حاصل کیا جاتا جو خوب پاکیزہ ہوتا۔ اور معلوم ہے کہ حکومتوں کا مال کتنا پاکیزہ ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ ان سے ربط رکھا جائے، تو وہ ہمارے احوال پر مطلع ہو کر ہمیں جان اور ایمان دونوں طرح کی مشکلات میں ڈال دیں گے اور ایسا ہی ہو رہا ہے۔ اب دین وایمان کے ان قلعوں میں ہمارے ہی کچھ لوگوں نے حکومت وقت اور اس کے کافرانہ نظام کو پہونچا دیا ہے۔

بہر حال مدارس کی جو حیثیت روز اول سے چلی آ رہی ہے، وہی باقی رہنی چاہئے۔

(جون ۲۰۰۴ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

چراغ تلے اندھیرا

مشرقی یوپی میں ضلع اعظم گڈھ علم کی بہتات، علماء کی کثرت تعداد، اور مدارس کی رونق کیلئے مشہور رہے۔ ہندوستان کے بکثرت عربی مدارس ایسے ہیں، جن میں اعظم گڈھ کے رہنے والے علماء درس وتدریس میں مصروف ہیں، بڑے بڑے مدارس اور علمی اداروں سے یہ ضلع مالامال ہے، ۱۹۸۸ء میں انتظامی امور کی سہولت کے لئے حکومت نے اسے دوضلعوں میں تقسیم کردیا ہے، مغربی حصہ اعظم گڈھ ضلع میں شامل ہے اور مشرقی علاقہ مئو کے ساتھ موسوم ہوا۔ اب یہ دوضلعے ہیں اور دونوں ہی تعلیم وتعلم کی دولت سے مالامال ہیں۔ میری گفتگو ان دونوں ضلعوں کے عربی دینی مدارس کے متعلق ہے۔ انگریزی اسکول وکالج زیر بحث نہیں ہیں۔ ان مدارس میں جایئے، یہاں کے اساتذہ وطلبہ سے ملئے، تو علم کا ایک روشن ماحول ملتا ہے، دینداری کا ایک نمایاں رنگ نظر آتا ہے، طلبہ ہیں، درسگاہیں ہیں، دارالاقامے ہیں، کتب خانے ہیں، جلسے ہیں، علماء کی آمدورفت ہے، تبلیغی جماعتوں کا گشت ہے، پڑھنے پڑھانے کا ماحول ہے، گاؤں گاؤں میں مکتب ہیں، مسجدیں ہیں۔ یہ حال ضلع اعظم گڈھ کا بھی ہے اور ضلع مئو کا بھی۔

ضلع اعظم گڈھ میں مبارک پور میں جامعہ عربیہ احیاء العلوم، الجامعۃ االاشرفیہ، مدرسہ دارالتعلیم، جہاناگنج میں جامعہ انوارالعلوم، شہر اعظم گڈھ میں دارالمصنفین، جامعۃ الرشاد، مدرسہ تعلیم الاسلام، شیخوپور میں مدرسہ شیخ الاسلام، جیراج پور میں مدرسہ تعلیم الاسلام، بلریاگنج میں جامعۃ الفلاح، انجان شہید میں دارالعلوم حسین آباد، کوٹلہ میں مدرسہ دینیہ

اشاعت العلوم، منگراواں میں مدرسہ قاسم العلوم، مظفر پور میں جامعہ اسلامیہ، دیوگاؤں میں مدرسہ فیض عام، سرائے میر میں مدرسہ بیت العلوم، مدرسۃ الاصلاح، فیض العلوم شیرواں، لونیاڈیہہ میں **الجامعة الشرقية** وغیرڈ لک۔

ضلع مئو میں خیرآباد میں مدرسہ منبع العلوم، مدرسہ ضیاء العلوم اشرفیہ، ولید پور میں مدرسہ نورالاسلام، محمد آباد میں ضیاء العلوم سیدواڑہ، دارلعلوم برئی پور، پورہ معروف میں مدرسہ معروفیہ، مدرسہ اشاعت العلوم، گھوسی میں مدرسہ قاسم العلوم، مرکزی دارالعلوم محمدیہ، خیر المدارس، مدرسہ شمس العلوم، مئو میں دارالعلوم، مفتاح العلوم، مرقاۃ العلوم، تعلیم الدین، مدرسہ فیض عام، جامعہ اثریہ دارالحدیث، مدرسہ بحرالعلوم، ادری میں چشمۂ فیض، مدرسہ دارالسلام، اور نہ جانے کتنے مدرسے ہیں، جو بڑے مدارس کے زمرے میں آتے ہیں، چھوٹے چھوٹے مکاتب کی تعداد تو شمار کرنی مشکل ہے، ان میں علماء کی خاصی تعداد پڑھانے میں اور طلبہ کی بڑی تعداد پڑھنے میں لگی ہوئی ہے۔ مدارس و علماء و طلبہ کی اس تعداد کے بعد یہ کہنا اور سمجھنا بجا معلوم ہوتا ہے کہ مشرقی یوپی کے یہ دونوں ضلع علم دین کے نور سے معمور ہیں۔ دنیاداری کی خرابیاں اپنی جگہ پر، مسلمانوں کے درمیان اختلافات و نزاعات مسلم، مگر کیا یہ کم خوشی کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں اس ماحول میں، جس میں دین اور دینی تعلیم کے خلاف تباہی کی آندھیاں چل رہی ہیں اور چلائی جارہی ہیں، علم کے یہ جگمگاتے اور روشنی بکھیرتے مینار کھڑے کر رکھے ہیں۔ ان میں جو علماء و مشائخ پائے جاتے ہیں ان کے انفاس طیبہ سے قلوب میں ایمان کی بہاریں تازہ ہوتی رہتی ہیں۔ اللہ کا بے پایاں احسان ہے اور زبان اس کے حمد و شکر میں مصروف ہے۔

لیکن معاملہ کا یہ ایک رُخ ہے، جو سب کی نظروں کے سامنے ہے، اس کا ایک رخ اور بھی ہے جس پر عموماً نگاہیں نہیں پڑتیں۔

یہ خاکسار بچپن سے مدارس ہی کا پروردہ ہے، بچپن سے جوانی اور جوانی سے کہولت، اور اب بڑھاپے کے مرحلے تک پہونچنے میں جو وقت گزرا ہے، مدارس ہی میں

گزرا ہے، پھر تدبیر الٰہی کی حکمت ہے، کہ شروع سے میں عوامی ربط میں رہتا آیا ہوں۔ تدریس کے بالکل ابتدائی دور میں جبکہ میری عمر ۲۲۔۲۳ سال سے زیادہ نہ تھی، بہار کے ایک کوردہ علاقہ سنتھال پرگنہ میں پہونچا دیا گیا، جہاں کئی سال تک پورا رمضان گزارتا رہا، بالکل ناخواندہ لوگوں کے درمیان شرک وبدعت کے طوفان میں گھرا ہوا۔ اس کی ایک دلچسپ داستان ہے، جو ضرورت ہوئی تو کبھی قارئین کو سنائی جائے گی۔ یہ عوامی ربط جو قائم ہوا، تو اب تک اس کا سلسلہ کسی نہ کسی عنوان سے چلا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں عجیب وغریب تجربے ہوئے، لیکن ۱۹۹۰ء تک میری جو بھی مصروفیت رہی ضلع اعظم گڈھ اور ضلع مئو سے باہر رہی، حالانکہ جغرافیائی اعتبار سے میری جائے پیدائش پہلے اعظم گڈھ میں تھی اور اب ضلع مئو میں ہے مگر مدارس میں تدریس کے لحاظ سے بنارس، غازی پور، الہ آباد اور جونپور میں میری مصروفیت رہی، اس لئے ضلع اعظم گڈھ کے احوال سے زیادہ واقفیت نہ ہوسکی ۱۹۹۰ء میں شیخوپور ضلع اعظم گڈھ اپنے استاذ محترم حضرت مولانا محمد مسلم صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے حکم سے آیا، تو یہ خوشی تھی کہ علم وفضل کے لہلہاتے گلستاں میں پہونچ گیا ہوں۔ لیکن آہستہ آہستہ جب یہاں عوامی رابطہ بڑھا، اور انجانے گاؤں اور دیہاتوں تک معلومات کا دائرہ پھیلا تو اندازہ ہوا کہ ان روشن چراغوں تلے بڑا گھنا اندھیرا ابھی ہے۔

اس وقت مجھے ضلع اعظم گڈھ کا جائزہ لینا منظور نہیں ہے۔ میں ضلع مئو کے ایک مخصوص خطہ کا ایک ہلکا سا جائزہ پیش کرنا چاہتا ہوں، اور اہل علم واصحاب درد حضرات کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اپنے اپنے علاقوں کی طرف توجہ فرمائیں، کیا عجب کہ یہ صورت حال جو میں ابھی ذکر کروں گا، دوسری جگہوں پر موجود ہو۔

میں عموماً اپنے طالب علموں میں یہ ذہن پیدا کرنا چاہتا ہوں کہ وہ رسمی طالب علمی سے فراغت کے بعد تلاش معاش میں دور دراز نہ نکلیں، مسلمانوں کا ہر خطہ محتاج خدمت ہے، اللہ پر بھروسہ کرکے، مشکلات وموانع کا مقابلہ کریں، اور اپنے اپنے علاقوں میں دین کی خدمت انجام دیں، حق تعالیٰ روزی کے کفیل ہیں، جہاں بھی آدمی دین کی خدمت کرے گا وہ

ذات کریم روزی پہونچائے گی۔ وَمَامِنْ دَابَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا وَیَعْلَمُ مُسْتَقَرَّھَا وَ مُسْتَوْدَعَھَا۔ جوکوئی بھی زمین پر چلتا پھرتا ہے، اللہ تعالیٰ ہی کے اوپر اس کی روزی ہے، وہ اس کے مستقر کو بھی جانتا ہے اور عارضی قیام گاہ کو بھی۔ بندہ جہاں ہوگا روزی وہیں پہونچ جائے گی۔ اسی نقطۂ نظر سے میں اپنے ہر طالب علم کیلئے یہی پسند کرتا ہوں کہ وہ اپنے وطن میں خدمت دین کرے۔

مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور کے طالب علموں میں ایک صاحب مولوی ابرار الحق سلّمہٗ ہیں، ابتدائی درجات سے متوسطات تک شیخوپور میں تعلیم حاصل کی، پھر دو سال دار العلوم دیوبند میں رہ کر تعلیم کی تکمیل کی۔ فراغت کے دو سال کے بعد اسی خاکسار کے مشورے سے انھوں نے اپنے گاؤں چھپرا میں جو چریا کوٹ سے تھوڑے فاصلہ پر مشرق میں ہے، ایک تعلیمی ادارہ سراج العلوم کے نام سے قائم کیا ہے، یہ علاقہ ضلع مئو میں واقع ہے، اور کافی طول وعرض میں کثیر تعداد میں چھوٹے بڑے گاؤں کا مجموعہ ہے۔ اس علاقہ میں غیر مسلم آبادی کی نمایاں اکثریت ہے، مدرسہ سراج العلوم کی مناسبت سے مجھے اس علاقے میں بار بار جانے کا اتفاق ہوا۔ بعض قریبی مواضع میں بھی گیا، جہاں مسلمان قلیل تعداد میں آباد ہیں، ان کی دینی ودنیاوی حالت دیکھی تو طبیعت پر خاص اثر ہوا، غیر مسلموں کے درمیان مسلمانوں کی آبادیاں۔ انھیں دیکھ کر کسی طرح یقین نہیں آتا تھا کہ یہ مسلمان ہوں گے، کسی کسی گاؤں میں ایک آدھ مسجد وہ بھی سجدوں سے محروم! کفر وشرک کی رسمیں جاری، بدعات وخرافات عینِ اسلام! مولوی صاحب موصوف کی محنت وکوشش سے اکا دکا بچے ان گاؤں سے نکل کر مدرسہ سراج العلوم میں پہونچنے لگے۔ میں نے مولوی صاحب سلّمہٗ کو مکلّف کیا کہ چھپرا کو مرکز بنا کر اطراف کے گاؤں کا جائزہ لیں کہ کس گاؤں میں مسلم آبادی کتنی ہے؟ وہاں مسجد ہے یا نہیں؟ تعلیم کا نظم ہے یا نہیں؟ مکتب ومدرسہ کی صورت حال کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دیں مولوی صاحب موصوف نے گاؤں گاؤں کا دورہ کیا، ہر جگہ کی معلومات بہم پہونچائیں، اور مرتب کر کے مجھے دیا۔ انھوں نے چھپرا کو مرکز قرار دے کر مغرب ومشرق اور شمال وجنوب

میں غالباً دس پندرہ کلومیٹر تک جائزہ لیا، اور ۸۳/ گاؤں کی رپورٹ مرتب کی۔ نام بنام پوری رپورٹ شائع کرنی تو باعث طوالت ہے۔ ایک اجمالی جائزہ ملاحظہ ہو۔

ان میں ۳۶/ گاؤں ایسے ہیں، جن میں مسلمانوں کے گھر دس سے کم ہیں، ۲۷/ گاؤں ایسے ہیں، جن میں ۱۰/ اور ۲۰/ کے درمیان مسلمانوں کے گھر ہیں۔ ۹/ گاؤں وہ ہیں جن میں مسلمانوں کے گھر ۲۰ اور ۳۰/ کے درمیان ہیں، ۶/ ایسے گاؤں ہیں جن میں مسلمانوں کے گھر ۳۰/ اور ۴۰/ کے درمیان ہیں، ۳/ گاؤں میں مسلمانوں کے گھر ۴۰/ اور ۴۵/ کے درمیان ہیں۔ ایک گاؤں میں ۱۰۰/ گھر، ایک گاؤں میں ۲۰۰ گھر، ایک گاؤں میں ۳۰۰ گھر اور بس۔

پھر ان ۸۳/ گاؤں میں ۴۸/ گاؤں ایسے ہیں جن میں ایک یا دو مسجدیں ہیں۔ اور ۲۹/ گاؤں میں معمولی مکتب کا نظم ہے، جو لشٹم پشٹم چلتے ہیں اور بند ہوتے ہیں۔ بعض گاؤں میں مسجدوں میں تعلیم کا ہلکا پھلکا نظم ہے۔ غرض یہ کہ تعلیم کا دِیا علاقہ کے تقریباً ایک تہائی حصہ میں جلتا تو ہے، مگر ٹمٹماتا اور جھلملاتا ہوا، جہل کے سائے نہایت دبیز ہیں، مسلمان عام طور سے غیر مسلموں کے معاشرے میں دبے ہوئے ہیں، کفر وشرک کی نہ جانے کتنی رسمیں ان میں جاری ہیں، اور بہت سے لوگ بدعات میں گرفتار ہیں، شراب خوری، بدچلنی، آوارگی اور جھگڑے فساد کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں، علم کا فقدان، جہالت کا طوفان۔ مرد وعورت سب ایک رنگ میں رنگین، ان لوگوں میں دین کی تعلیم کو جمانا، اور انھیں دینی اعمال پر لانا ایک بڑا مجاہدہ ہے۔

ان کے سامنے صرف کھانا کمانا، شادی بیاہ کرنا، جینا اور مرجانا ہی زندگی کی کل کائنات ہے، ان جگہوں پر نہ علماء پہونچ پاتے ہیں اور نہ تبلیغی جماعتیں پہونچتی ہیں، اور یہ تو اپنی دنیا میں مست ہیں، یہ خود علماء کے پاس کیوں آنے لگیں، اگر کوئی پہونچتا ہے تو وہی نذرانے وصول کرنے والے ہیں۔ وہ انھیں شرکیات وبدعیات میں سلا کر اپنا نذرانہ لے کر چل دیتے ہیں۔

میرا ارادہ تھا کہ ہفتہ دو ہفتے وقت نکال کر ان گاؤں کا دورہ کروں گا۔ ارادہ تھا کہ سردیوں کے ختم ہونے کے بعد ایک پروگرام مرتب کیا جائے گا، مگر اللہ کو منظور نہ تھا، سردیوں کے شباب میں میری طبیعت خراب ہوئی، اور ابھی تک سفر کے لائق نہیں ہوسکا ہوں۔

ماشاء اللہ مولوی ابرار الحق سلّمہٗ لگن سے کام کر رہے ہیں، ان کی آمد و رفت ان گاؤں میں رہتی ہے، وہاں سے چھوٹے بچوں کو لاتے ہیں۔ اور اپنے مدرسہ میں ان کی تعلیم اور قیام و طعام کا مناسب انتظام کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی اور ان کے رفقاء کی نصرت فرمائیں، اور مسلمانوں کے تاریک گھروں کو علم اور دین کے نور سے اجالا کریں۔

میرا اندازہ ہے کہ یہ صورت حال بکثرت علاقوں میں موجود ہوگی، ضلع اعظم گڑھ میں، خود شہر کے آس پاس نیز گھاگھرا کے ترائی علاقوں میں جنھیں ''دیوارا'' کہا جاتا ہے، ان جگہوں میں دینی کام کی سخت ضرورت ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ اہل علم کی توجہ ادھر نہیں ہوتی، اور اہل ثروت حضرات اپنی ثروت کو لہو و لعب اور بیجا سیاسیات میں پھونکتے اور برباد کرتے ہیں۔ محض جھوٹی ناموری اور جھوٹی عزت کیلئے دولت بے جگہ بہاتے ہیں۔

علماء کا علم و تدین اور مال داروں کی دولت و ثروت مذکورہ جگہوں کی جانب منعطف ہوجائے، تو ماحول و معاشرہ میں اچھی خاصی تبدیلی آسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق بخشیں۔ (اگست ۲۰۰۴ء)

☆☆☆☆☆

بسم الله الرحمن الرحيم

فتنوں کی طغیانی

دین اسلام اللہ تعالیٰ کا ایک عظیم انعام ہے، جو بندوں پر انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے واسطے سے اتارا گیا ہے۔ اور اس کو آخری تکمیلی شکل حضرت خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے ذریعے عطا کی گئی۔

چنانچہ ارشاد خداوندی ہے: اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْناً ، آج میں نے تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کر دیا، اور تم پر اپنے احسان کی تکمیل کردی، اور تمہارے لئے میری رضامندی دین اسلام کے ساتھ مختص ہوگئی۔

آیت کریمہ رسول اللہ ﷺ کے آخری حج کے موقع پر میدانِ عرفات میں نازل ہوئی۔ انسانوں پر اللہ تعالیٰ نے یہ احسان انسانیت کی ہدایت اور فلاح کیلئے کیا ہے۔ اولادِ آدم کی کامیابی اور فلاح کا یہی راستہ متعین ہے، اس کے علاوہ نہ کوئی دین معتبر ہے، اور نہ کوئی طریقہ اور نظریہ!

وہ لوگ جنھوں نے اس دین کو تسلیم نہیں کیا، وہ خواہ بظاہر کچھ نظر آتے ہوں۔ دولت وامارت، حکومت وسیاست اور قیادت وعظمت کے جس بلند معیار پر دکھائی دیتے ہوں مگر وہ خسارے میں ہیں، تباہ و برباد ہیں۔ وَمَنْ یَبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْناً فَلَنْ یُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِی الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِیْنَ (سورہ آل عمران: ۸۵) جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اور طریقہ اختیار کرے گا، وہ طریقہ ہرگز قبول نہ ہوگا، اور وہ آخرت میں گھاٹے میں پڑے گا۔

قرآن میں متعدد افراد واشخاص، اور کئی ایک اقوام کا متعین طور پر ذکر آیا ہے کہ انھوں نے اسلام کے خلاف قدم جمایا، اور بالآخر تباہ وبرباد ہوئے، اور جہنم ان کا ٹھکانا بنی۔ تاریخ عالم اس بات کی صداقت پر گواہ ہے۔

دین اسلام کا رحمت ہونا، ایک ایسی صداقت ہے، جس کو دنیا کے کسی دور میں چیلنج نہیں کیا جاسکا ہے، اس کے ماننے والے کم ہوں، یا زیادہ، کمزور ہوں یا قوی! اسلامی احکام و تعلیمات، اسلامی تہذیب، اسلامی معاشرہ اور اسلام کے اختصاصات وامتیازات کچھ ڈھکی چھپی چیزیں نہیں ہیں، جن سے دنیا کا پڑھا لکھا طبقہ واقف نہ ہو۔

ہاں! لیکن کبھی کبھی اس کے مخالفین، اس کے خلاف جہالت وتشکیک کی اتنی گرد اُڑاتے ہیں کہ اس کا حسن وجمال بظاہر مخفی ہونے لگتا ہے، اور گرد وغبار کا کرکرا پن نمایاں ہوجاتا ہے، اور ناواقف اسے اسلام کا کرکرا پن سمجھتا ہے۔

دنیا کی زیب وزینت، دنیا کی مقصودیت اور دنیا کی شان وشوکت اسلام کا موضوع نہیں ہے۔ اسلام کا مقصود فکر آخرت رضاء الٰہی اور عدل وانصاف ہے۔ خواہ اس کی وجہ سے بظاہر دنیا کا نقصان نظر آئے۔

لیکن دنیا نے ہمیشہ یہ گناہ کیا ہے کہ دنیا ہی کو مقصود ومعبود بنایا۔ اور آخرت سے غفلت اختیار کی، اور اس کی وجہ سے اسلام سے دوری بڑھتی رہی۔ غیروں سے شکایت نہیں ہے۔ غیروں سے متاثر ہوکر خود اپنوں نے بھی یہ گناہ کیا، دنیا کو اتنی اہمیت دی، جس کی وہ مستحق نہ تھی، اور دنیا کو جتنی جتنی اہمیت دی جاتی رہی، اسلام کا دامن ہاتھ سے چھوٹتا رہا۔ اور اب یہ حالت ہوگئی، کہ اللہ کا یہ احسانِ عظیم اب دل ودماغ پر گراں گزر رہا ہے۔ کچھ لوگ اسلامی تعلیمات کو خیر باد کہہ رہے ہیں انھوں نے اپنے آپ کو بدل ڈالا ہے۔ اور اپنے اندر اور باہر اسلام کی کوئی علامت بجز قومیت کے نہیں رہنے دی ہے۔ قومیت کا مطلب یہ ہے کہ اپنا شمار مسلمانوں میں کرتے ہیں، مسلمانوں جیسا نام رکھتے ہیں، اور کبھی کبھی کسی اسلامی شعار کو عارضی طور پر اختیار کرلیتے ہیں، اور کچھ لوگ ایسے ہیں کہ اسلامی تعلیمات کو توڑ پھوڑ

رہے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ غیر اسلامی چیزوں کا جواز اسلام میں تلاش کر لیں۔

اسلامی تعلیمات واحکام میں غیر اسلامی چیزوں کو داخل کرنا ایک بڑا فتنہ ہے، اس فتنے کے عام ہونے کے بعد یہ معلوم کرنا مشکل ہوگا کہ اسلام کیا ہے؟ اور کفر کیا ہے؟ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب میں انسانوں نے جب اپنی اپنی رائے اور اپنا اپنا نظریہ داخل کیا، تو ان مذاہب میں حق وباطل کا امتیاز باقی نہیں رہا، کیا اصل تعلیم ہے، اور کیا کیا اس سے خارج ہے؟ آج اسلام کے علاوہ کسی بھی مذہب میں اس پر خط فاصل نہیں کھینچا جا سکتا۔

اس کے برخلاف اسلام کے تمام اصول وفروع، قواعد واحکام واضح ہیں، کسی غیر اسلامی چیز پر اسلامی لیبل چسپاں کرنا ایک مشکل کام ہے۔

یہاں بڑی آسانی سے بتایا جا سکتا ہے کہ اسلام کیا ہے، اور کفر کیا ہے؟ طاعت کیا ہے اور معصیت کیا ہے؟ عبادت کیا ہے اور بدعت کیا ہے؟ کیونکہ اسلام کی بنیادی کتاب قرآن کریم ہے اور دوسری بنیادی چیز سنت رسول ہے، یہ دونوں بالکل اپنی اصلی حالت پر آج بھی مسلمانوں کے ہاتھوں میں موجود ہیں، مسلمان جب تک ان دونوں کو مضبوط پکڑے رہے گا، گمراہ نہ ہوگا۔

مگر اس زمانے میں قرآن وسنت سے آنکھ بند کرنے کا عام دستور سا ہوتا جا رہا ہے، نئی نئی چیزیں، نئے نئے نظریات وخیالات، جن کو قرآن وسنت سے کوئی مناسبت نہیں ہے، بلکہ ان کی وجہ سے قرآن وسنت سے دوری ہوتی ہے، مسلسل اور پے بہ پے یکے بعد دیگرے آتے چلے جا رہے ہیں۔ اور دنیا داری میں جو لوگ مست ہیں وہ کوشش کرتے ہیں کہ انھیں اسلام میں داخل کر دیا جائے، اور اس سلسلے میں اتنا شور وغل کیا جاتا ہے اور اتنی غوغا مچائی جاتی ہے، کہ وہ چیزیں جو صریحاً اسلام کے خلاف ہیں، وہ عین اسلام کے مطابق باور کر لی جاتی ہیں، ایک خبر بار بار دہرائی جائے، بار بار نظروں کے سامنے لائی جائے، تو طبیعت اسے گوارا کرنے لگتی ہے، پھر نوبت یہاں تک پہونچ جاتی ہے کہ وہی چیز پسندیدہ بن جاتی ہے۔ کسی سلیم الطبع آدمی کے پاس بدبو کی کوئی چیز لائی جائے، تو اسے متلی آنے لگے گی، وہ منہ بگاڑے

گا، لیکن اگر اسے اس کا عادی بنا دیا جائے، تو اس کے بغیر چین نہیں پاتا۔

اسلام کے خلاف گندے سے گندے فتنے کا بھی یہی حال ہے۔ شروع میں طبیعت انکار کرتی ہے، مگر مسلسل وہی چیز سامنے آتی ہے، تو آدمی اسے قبول کر لیتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

تعرض الفتن علی القلوب کالحصیر عوداً عوداً فأی قلب أشربها نکتت فیه نکتة سوداء وأی قلب أنکرها نکتت فیه نکتة بیضاء حتیٰ یصیر علیٰ قلبین أبیض بمثل الصفاء فلاتضرهٗ فتنة مادامت السموٰت والارض ولآخر أسود مرباداً کالکوز مجخیاً لایعرف معروفاً ولاینکر منکراً الا ماأشرب من هواه (رواہ مسلم) قلوب پر فتنوں کی بارش اس طرح ہوگی، جیسے چٹائی کے تنکے یکے بعد دیگرے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے رہتے ہیں، پھر جو قلب ان سے متاثر ہوتا ہے، اس میں ایک سیاہ دھبہ پڑ جاتا ہے، اور جو قلب اسے رد کر دیتا ہے، اس میں ایک روشن نقطہ ظاہر ہوتا ہے، بالآخر یہ دو طرح کے قلب ہو جاتے ہیں، ایک نہایت صاف وشفاف اور روشن! اسے کوئی فتنہ رہتی دنیا تک نقصان نہیں پہونچا سکتا اور ایک سیاہ راکھ جیسا۔ جیسے اُلٹا پیالہ، وہ نہ کسی اچھائی کو پہچانتا اور نہ کسی بری چیز پر انکار کرتا، اسے صرف وہ چیز سمجھ میں آتی ہے، جو اس کے نفس کی خواہش کے مطابق ہو۔

حق تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے:

قُلْ لَایَسْتَوِی الْخَبِیْثُ وَالطَّیِّبُ وَلَوْأَعْجَبَکَ کَثْرَةُ الْخَبِیْثِ فَاتَّقُوْا اللّٰهَ یَا أُوْلِی الْأَلْبَابِ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔ (سور مائدہ: ۱۰۰)

تم کہہ دو کہ گندی چیز اور پاک چیز برابر نہیں ہوسکتی، اگر چہ گندگی کی کثرت تمہیں بھلی معلوم ہو، پس اللہ سے اے عقل والو! ڈرو، شاید تم کامیاب ہو۔

ہمارے اس دور میں اسلامی تعلیمات واحکام اور اسلامی تہذیب کے خلاف گندگی کی وہ کثرت ہوگئی ہے کہ لوگوں کی نگاہ میں وہ گندی چیزیں بھلی معلوم ہونے لگی ہیں، لیکن قرآن

کا فیصلہ ہے کہ جو چیز گندی ہے، وہ بظاہر کیسی ہی خوشنما اور مفید معلوم ہو، گندی ہی رہے گی۔

آج کل ان فتنوں کی بارش بہت بڑھ گئی ہے، کوئی آنکھ، کوئی کان، کوئی دل ایسا نہ ملے گا، جس پر فتنوں کی برسات نہ ہو رہی ہو، جتنے ذرائع اِبلاغ بڑھتے جارہے ہیں، اتنے ہی فتنے بڑھتے جارہے ہیں۔ اور جتنی تیز رفتار سواریاں بڑھ رہی ہیں، اتنی ہی برق رفتاری سے فتنے ترقی کررہے ہیں، ایک زمانہ تھا کہ خاص خاص جگہوں میں ناچ گانے کی بزم سجائی جاتی تھی، ان میں خاص خاص لوگ شرکت کرتے تھے، پھر سنیما کی ایجاد نے اس میں عموم پیدا کیا، اب ناچ گانا عام ہوگیا، لیکن پھر بھی ایک مخصوص عمارت تک جانا پڑتا تھا۔ کتنے لوگ معاشرے کی شرم کی وجہ سے نہیں جاسکتے تھے، پھر ایجاد کرنے والوں نے ہاتھ میں ریڈیو تھمادئے کہ جب چاہو گانا سنو! مگر نگاہیں محروم تھیں، پھر ٹی، وی نے باقی کسر پوری کردی۔ اب جہاں چاہئے سنیما ہال بنالیجئے۔ اور اس طرح موجودہ معاشرہ کی بیشتر خرابیوں کا سرچشمہ یہی ٹی، وی ہے۔ گانے بجانے، شراب وکباب، ماردھاڑ، قتل وخونریزی، چوری اور غارت گری کون سا ایسا جذبۂ فساد ہے، جو ٹی، وی کے اسکرین سے دل ودماغ کی شریانوں میں پیوست نہیں ہوتا اور انسان کے رگ وریشہ میں نہیں دوڑتا۔ بچوں سے لیکر جوان اور بوڑھے تک سب ٹی، وی کے اسکرینوں کی نقالی میں تھرکتے، ناچتے، کودتے اور عجیب وغریب حرکات میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے، جس کا انکار بجز ان لوگوں کے اور کوئی نہیں کرسکتا، جنھوں نے حقائق سے آنکھوں کو بند کرنا ہی اپنا شیوہ بنا رکھا ہو، یہ تسلیم کہ ٹی، وی اور ریڈیو پر خبریں نشر ہوتی ہیں، بجا کہ بعض اچھی معلومات بھی فراہم کی جاتی ہیں، مانا کہ اس کے ذریعے تجارت کا فروغ ہوتا ہے۔ مگر پوچھئے کہ یہ خبریں انسانیت کی کون سی خدمت انجام دیتی ہیں، کیا ان خبروں میں سیاسی بازی گری نہیں ہوتی، کیا یہ خبریں جھوٹ کو سچ نہیں بناتیں، کیا یہ خبریں سچائی کی آنکھ میں دھول نہیں جھونکتیں، کیا یہ خبریں سن سن کر انسان ''ٹینشن'' میں نہیں مبتلا ہوتا، کیا ان خبروں کے نتیجے میں معاشرہ بے تحاشا فسادات وخونریزی میں تہ وبالا نہیں ہوتا؟ پھر یہ بھی دریافت کیجئے کہ یہ اچھی معلومات جو ریڈیو اور ٹی، وی سے

فراہم کی جاتی ہیں ان میں دینی معلومات، فکر آخرت اور دنیا کی بے حقیقتی کا کتنا عنصر ہوتا ہے یہ معلومات انسان کو حُبِّ دنیا میں مبتلا کرتی ہیں، یا فکر آخرت کا تحفہ عطا کرتی ہیں۔ ان معلومات سے سنجیدگی پیدا ہوتی ہے، یا لہو ولعب کی لت پڑتی ہے۔

واقعہ یہ ہے، اور یہ سو فی صد حقیقت کہ موجودہ دور کے یہ ذرائع ابلاغ جن کی دُہائی عام طور سے ترقی کے نام پر دی جاتی ہے، یہ انسانیت کی جانکنی ہیں، ان کا کردار اسلامی عقائد ونظریات کے ٹھیک برعکس ہے۔ یہ فرنگی ایجادات انسانیت کی خدمت تو کیا کرتے، انسانی قدروں کو فنا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ان سے کچھ کچھ فوائد ضرور وابستہ ہیں، مگر اول تو وہ صرف دنیاوی فوائد ہیں، اور جو فوائد دینی رنگ میں دکھائی دیتے ہیں، وہ بھی صرف صورۃً دینی فوائد ہیں، حقیقۃً ان کو دین سے مناسبت بالکل نہیں ہوتی، اور دینی فائدہ وہی معتبر ہے جو دین کی روح سے مناسبت رکھتے ہوں۔ اس طرح کے فوائد تو ہر بری چیز میں تلاش کئے جاسکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

يَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ، قُلْ فِيْهِمَا اِثْمٌ کَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ

جب شراب خوب پی جاتی تھی، اور اس کی حرمت کا تصور نہ تھا، تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

”یہ لوگ شرب اور جوے کے متعلق پوچھتے ہیں، تم کہہ دو کہ ان دونوں میں گناہ بڑا ہے، اور لوگوں کیلئے کچھ فوائد بھی ہیں۔“

جس وقت یہ آیت نازل ہوئی، اسی وقت لوگوں نے سمجھ لیا تھا کہ اب شراب اور جوئے کی خیر نہیں، اور یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ ان دونوں میں خیر نہیں شر ہے۔ پھر بالآخر منافع للناس ہوتے ہوئے، شراب اور جوا کو پورے طور پر حرام کر دیا گیا۔

اس سے دین اسلام کی رُوح کا پتہ چلتا ہے، کہ جو چیزیں اپنے اندر مزاج وطبیعت کے لحاظ سے شر کا غلبہ رکھتی ہیں، ان میں اگر کچھ فوائد بھی ہوں، تو بھی انھیں حرام ہی قرار دیا جائے گا۔

ریڈیو ہو یا ٹی، وی۔ انٹرنیٹ ہو یا وی، سی، آر۔ دینی نقطۂ نظر سے کوئی صاحب غور کرلیں کہ ان کے استعمال میں شر کا عنصر کتنا ہے اور خیر کا جز کتنا ہے؟ جن کے نزدیک گانا بجانا، عورتوں کے نغمے سننا، ناچ گانے والی عورتوں سے دلچسپی لینا، عریانیت وفحاشی میں گھسے رہنا، ہر جھوٹ اور لغو کا سننا اور اس میں مشغول رہنا تصویروں کا دیکھنا اور انھیں گھروں میں رکھنا، کوئی عیب نہ ہو، وہ ہمارے اس مضمون کے مخاطب نہیں ہیں۔ اور نہ اسلام کو ان سے کوئی مطلب ہے۔ بات ان لوگوں کی ہے، جو اسلام کی حرام کردہ چیزوں کو حرام مانتے ہیں، بتایا جائے کہ ان کے نزدیک ان چیزوں کے استعمال میں شر کتنا ہے، اور خیر کتنا ہے؟

لوگ صحیح استعمال کی بات کرتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ آج کتنے سلیم الطبع اور تربیت یافتہ لوگ ملتے ہیں، جو ریڈیو اور ٹی، وی میں صرف سنجیدہ پروگرام دیکھتے اور سنتے ہوں اور اگر کوئی اکا دکا آدمی ایسا مل بھی جائے، تو اس کے گھر میں بچوں اور عورتوں کا راستہ کون سا ہوگا؟

میں اور جگہ کی بات نہیں کرتا، مکہ شریف جیسی مقدس سرزمین میں ایک عالم دین جو ماشاءاللہ حدیث شریف کی خدمت میں ممتاز ہیں۔ وہ اس بندے کو اپنے گھر لے گئے۔ اس وقت ان کے اہل وعیال اپنے وطن ہندوستان آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں آپ کو ٹیپ ریکارڈ سے نعت شریف سنواتا ہوں۔ مجھے اس سے دلچسپی نہیں ہے، میں نے معذرت کی، انھوں نے بے تکلفی میں اصرار کیا۔ اور بہت سی کیسٹیں اُٹھالائے۔ کم از کم تین چار درجن! اور فرمایا کہ ہمارے گھر صرف نعت اور قرأت کی کیسٹیں ہیں اور وہی سنی جاتی ہیں۔ گانے بجانے سے بالکلیہ احتراز ہے، وہ یہ کہتے کہتے ایک کیسٹ ٹیپ میں لگانے لگے، میں نے منع بھی کیا۔ میرے نہیں نہیں کہتے کہتے انھوں نے لگا ہی دی۔ اب جو آواز آئی تو نسوانی آواز تھی اور وہ فلمی گانا گا رہی تھی گھبرا کر انھوں نے دوسری لگائی۔ وہ بھی اسی رنگ میں تھی، پھر وہ کیسٹ بدلتے رہے، مگر رنگ نہیں بدلا۔ میں نے عرض کیا جانے دیجئے۔ نعت وقرأت کی کیسٹ وطن گئی۔ وہاں ان کیسٹوں کی گنجائش نہ تھی، یہاں صرف گانے کی کیسٹیں ہیں۔

یہ ایک گھر کا واقعہ نہیں ۔ ہر وہ دیندار گھر جس میں کسی مجبوری کی وجہ سے ٹی ، وی ، ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈ استعمال کیا جاتا ہے ، ہر گھر کا یہی قصہ ہے ۔ اور جہاں اتنی سی بھی دینداری کی فکر نہیں ہے ، وہاں تو قرأت ونعت کی گنجائش ہی نہیں !

جن چیزوں کے یہ لچھن ہوں ۔ ان کے بارے میں دین اسلام سے یہ توقع رکھنا کہ وہ ان کے جواز کا فتویٰ دے گا ، خوش فہمی ہے ۔ دین اسلام کا راستہ اور اس کی منزل الگ ہے ، اور کفر وشرک کا راستہ اور اس کی منزل علیٰحدہ ہے ۔ دونوں کہیں ایک دوسرے سے نہیں ملتے ۔ ہر وہ چیز ، جو مسلمان کو اس کے دین سے ، فکر آخرت سے زہد وقناعت سے برگشتہ کرے ۔ اس سے اجتناب لازم ہے ، خواہ وہ دنیاوی ترقی کیلئے کتنی ہی ضروری اور بھلی معلوم ہو ۔

اب فتنے کی طغیانی ملاحظہ ہو ۔

روزنامہ سہارا کی ۲۲ / اگست ۲۰۰۴ء بروز اتوار کی اشاعت میں دارالعلوم دیوبند سے جاری شدہ ایک فتویٰ کو مشق ستم بنایا گیا ہے ۔ اس کی تمہید میں مذکورہ اخبار نے لکھا ہے کہ :

> ”دینی پروگرام کی نشر واشاعت کے لئے ٹیلی ویژن کا استعمال شرعی ہے یا غیر شرعی ، اس مسئلہ پر دارالعلوم دیوبند نے گزشتہ دنوں ایک سوال کے جواب میں فتویٰ جاری کیا جس میں ٹیلی ویژن کو ایک آلۂ لہو ولعب قرار دیتے ہوئے اس کے استعمال کو انتہائی قبیح بتایا گیا ہے ۔
>
> ایسا نہیں ہے کہ اس طرح کا فتویٰ پہلی بار آیا ہے ، اس سے قبل دارالافتاء ڈابھیل ، ندوۃ العلماء لکھنؤ اور اسلامک فقہ اکیڈمی کے فتوے آچکے ہیں ۔

تمہید نگار نے یہ نہیں بتایا کہ اور جگہوں سے کیا کیا فتوے آئے ، یہ بتائے بغیر وہ لکھتا ہے کہ

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک ہی موضوع پر بار بار فتویٰ کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی ، کسی حتمی فتویٰ پر اکتفاء کیوں نہیں کیا جاتا ۔

اس تمہید نگار سے کوئی پوچھے کہ آخر یہ حتمی فتویٰ ہی تو ہے جو بار بار دیا گیا ، اور مختلف جگہوں سے بار بار سوال کئے جائیں گے ، تو بار بار جواب بھی دیا ہی جائے گا ۔

تمہید نگار کہتا ہے:

اس سے کنفیوژن پیدا نہیں ہوگا، آخر اختلاف کی راہیں کیوں کھل رہی ہیں؟

فتویٰ تو ایک ہی ہے۔ اس سے اختلاف کی راہ نہیں کھل رہی ہے، البتہ اخبار نے اس میں کنفیوژن پیدا کرنے کوشش کی ہے، اور مختلف الخیال اور مختلف العمل لوگوں سے مضمون لکھوا کر اختلاف کی راہ کھول رہا ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ اس طرح کے مسائل جب ہر قسم کی گپ شائع کرنے والے اخباروں میں چھیڑے جاتے ہیں، تو اختلاف کی راہ وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ علماء کے فتاوے اس اختلاف کے ذمہ دار نہیں، اخبارات کے بازاری صفحات اختلاف پیدا کرتے ہیں۔

اب وہ فتویٰ سنئے، جس پر اخبار نے کئی گرم مضامین شائع کئے ہیں اور یہ تاثر دینا چاہا ہے کہ علماء کے درمیان اس موضوع پر اختلاف ہے، کوئی شبہ نہیں ہے کہ جن لوگوں نے اس فتوے سے اختلاف کیا ہے، ان میں سے بعض حضرات علماء میں شمار کئے جاتے ہیں، لیکن ان کے مضامین پڑھ کر بہت افسوس ہوا کہ ان حضرات نے پڑھا لکھا سب بھلا دیا، یا بالقصد انحراف کیا۔ ان مضامین کی وجہ سے وہ اپنی جگہ سے ہٹے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان مضامین کو پڑھنے سے قرآن پاک کی ایک آیت ذہن پر روشن ہوئی، جو حق تعالیٰ نے منافقین کی بے وفائی کے متعلق ایک خاص موقع پر نازل فرمائی ہے:

هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيْمَانِ (سورہ آل عمران: ۱۶۷)

اس دن وہ ایمان کے مقابلے میں کفر کے زیادہ قریب تر تھے۔

میں نہیں کہتا کہ ان حضرات کے حال پر یہ آیت منطبق ہو رہی ہے، مگر یہ ضرور ہے کہ علماء حقانی کی صف سے یہ حضرات خود کو باہر کرنے کے درپے معلوم ہوتے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ ملاحظہ ہو

”اصل یہ ہے کہ ٹی۔ وی اصالۃً آلۂ لہو ولعب ہے۔ دینی پروگرام چلانے کیلئے اس کا استعمال کرنا انتہائی قبیح ہے، اشاعت اسلام اور حفاظت اسلام کے جو طرق بے غبار اسلام میں

مقرر ہیں، شریعت مطہرہ نے ان کی اجازت دی ہے، ان طریقوں کو سختی سے اپنانے کی ضرورت ہے۔ ٹی۔ وی کے دینی پروگرام بھی دیکھنے والے لہو ولعب کے انداز سے ہی دیکھنے کے عادی ہیں، امورِ محرمہ سے اسے پاک صاف کر دینا تقریباً ناممکن ہے، اس لئے اس کے استعمال کو دینی پروگرام کیلئے بھی جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔

☆☆☆☆☆

یہ فتویٰ بالکل صحیح ہے، مگر اخبار نے اس کا تماشا بنادیا ہے، دینی احکام وتعلیمات کی تبلیغ اور اس کی نشر واشاعت کا ایک خاص مزاج ہے۔ سب سے بنیادی بات یہ ہے کہ دین اور دینی تعلیمات ایک مقدس اور پاکیزہ اور نہایت سنجیدہ امر ہے، لہو ولعب سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کی نسبت اللہ اور رسول کے ساتھ ہے، اس کا ایک خاص ادب واحترام ہے۔ ادب واحترام کے اس حصار کو اگر توڑ دیا جائے، تو ظاہری شکل چاہے دین کی رہ جائے مگر اصل روح غائب ہو جائے گی۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ذٰلِکَ وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللہِ فَاِنَّھَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ (سورہ حج، ۳۲)
جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرتا ہے، تو یہ قلب کے تقویٰ کا اثر ہے۔

دینی پروگراموں کو خواہ ٹی۔ وی پر لائیں، ریڈیو پر لائیں، یا انٹرنیٹ پر لائیں، سب سے پہلے ان کا احترام وتقدس غائب ہوتا ہے، اور یہ بات ایسی نہیں ہے جس پر کسی دلیل کے قائم کرنے کی ضرورت ہو۔ ہاں اگر تقدس واحترام کا مفہوم ہی بدل دیا جائے، یا اس کو لغو وفضول چیز قرار دے دیا جائے تو بات دوسری ہے۔ اور دنیا داری کے غلبہ اور آخرت فراموشی کے اس دور میں یہ تماشا بھی بہت عام ہو چکا ہے۔ اکبر کے زمانے میں یہ صورت حال رہی ہو یا نہ رہی ہو، مگر اب تو کھلے بندوں یہ تماشا ہو رہا ہے کہ ؎

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبرؔ نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

خدا کا نام فیشن کے طور پر تو لیا جاتا ہے، مگر آخرت کا نام لینا، اور دنیا کو بے وقعت

سمجھنا، تو واقعی جرم بن چکا ہے، میں یہ باتیں لکھ رہا ہوں اور سمجھ رہا ہوں کہ بہت سی پیشانیاں شکن آلود ہوں گی، بعض زبانیں یاوہ گوئی کریں گی، بعض قلم حرکت میں آئیں گے۔ لیکن جو حقیقت ہے اسے بیان کیا جائے گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اسلام کی تبلیغ اور اسلامی علوم کی نشر واشاعت ان نامعتبر آلات واسباب سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی، اس کا تعلق افراد ورجال سے ہے، دین، اصحابِ دین سے پھیلتا ہے، علم دین، اربابِ علم سے پرورش پاتا ہے۔

اگر گانے بجانے کے آلات سے تبلیغ کا کوئی تصور ہوتا، تو زمانۂ رسالت مآب ﷺ میں گانے بجانے کے آلات بہت تھے، اور ان سے دلچسپی رکھنے والے بھی بہت تھے، مزامیر پر قرآن پڑھا جاتا، تو لوگ بہت دلچسپی سے سنتے، مگر ان کا استعمال تو کیا ہوتا، انھیں صراحۃً حرام قرار دے دیا گیا، اللہ جانے آج کے ٹی۔ وی کی حمایت کرنے والے ہوتے، تو کیا حکم صادر کرتے۔

دین سیکھنا ہو، تو ٹی، وی کے دینی پروگرام سے نہیں دینداروں سے حاصل کیا جائے گا، ہر چیز اپنے محل پر مناسب ہوتی ہے، کسی چیز کو بے محل استعمال کرنا ظلم ہے۔ قرآن شریف کو بیت الخلاء میں رکھ دیا جائے، تو بیت الخلاء چاہے جتنا خوبصورت ہو، گناہ ہوگا، سنیما ہال میں قرأتِ قرآن کی مجلس منعقد کی جائے تو اس کو کون جائز کہے گا۔ (بقول ایک ظریف عالم کے کہ اگر زمانہ بہت ترقی کر جائے، اور کوئی آدمی رَس گُلا ہگے، تو اسے کھایا جائے گا؟ یہاں صرف اصل شے نہیں دیکھی جاتی، حصول کے ذرائع کو بھی پرکھا جاتا ہے۔)

اخبار میں متعدد لوگوں نے ٹی، وی پر اسلامی پروگراموں کی اشاعت کے جواز پر زور دیا ہے۔ لیکن عقلی تک بندیوں، مغرب سے مرعوبیت اور بے معنیٰ جذباتیت کے علاوہ کوئی قابل لحاظ دلیل قرآن وحدیث کی روشنی میں پیش نہیں کی، جو کچھ کہا گیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:

’’اسلام کے خلاف دنیا میں پروپیگنڈے ہو رہے ہیں۔ اس لئے مسلمانوں پر فرض ہے

کہ وہ پروپیگنڈے کی جگہوں پر جا کر اپنا دفاع کریں"، اس ایک بات کے علاوہ جو باتیں کہی گئی ہیں، وہ مغربی تہذیب سے تاثر بلکہ مرعوبیت کے آثار ہیں۔

اسلام کے خلاف پروپیگنڈے کی جو بات ہے، وہ صحیح ہے، مگر اسلام نے، قرآن وحدیث نے پروپیگنڈے کا جواب پروپیگنڈا نہیں بتایا ہے، پروپیگنڈے کی بنیاد سچ کے ساتھ بہت سارے جھوٹ پر ہے۔ آدمی دل کھول کر جھوٹ بولے اور اتنا بولے کہ وہ سچ معلوم ہونے لگے، ظاہر ہے کہ اسلام اس کی اجازت کبھی نہیں دے سکتا، اور یہ تصور بھی غلط ہے کہ جس ماحول میں پروپیگنڈا ہو رہا ہے، اسی ماحول میں ہم جا کر تردید کریں۔ حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا:

لَتُبْلَوُنَّ فِيْ أَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ أَشْرَكُوا أَذىً كَثِيْراً، وَإِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَإِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ (سورہ آل عمران: ١٨٦)

ایمان والوں سے فرمایا گیا ہے کہ تمہارے جان ومال میں تمہاری آزمائش ضرور ہوگی، اور تم اگلے اہل کتاب (یعنی یہودیوں، عیسائیوں) اور مشرکین سے بہت زیادہ تکلیف دہ باتیں سنو گے، اور اگر تم صبر کرو گے اور تقویٰ پر جمے رہو گے تو یہ بہت پختہ اور عزیمت کی بات ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے پروپیگنڈے کے جواب کا جو طریقہ بتایا ہے، وہ صبر اور تقویٰ ہے،

معترضین اور مشرکین کے ہر اعتراض کا جواب ہی کہاں ضروری ہے، ان سے تو اعراض ہی مناسب ہے۔ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَاماً (سورہ فرقان: ٦٣)

جب جہالت والے ان سے مخاطب ہوتے ہیں، تو یہ سلامتی کی بات کہہ کے ہٹ جاتے ہیں۔

وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَاماً (سورہ فرقان:۷۲)

جب لغو باتوں پر ان کا گزر ہوتا ہے، تو شرافت سے گزر جاتے ہیں۔

ٹی، وی تو گندگی کا خزانہ ہے۔ اخبارات میں جب کوئی غلط بات اُچھالی جاتی ہے، اور پھر بعض اہل قلم اس کا تحقیقی جواب دیتے ہیں تو کیا نتیجہ نکلتا ہے، دیکھنے میں تو یہی آتا ہے کہ سوائے اختلاف اور جہالت کی صورت حال بڑھنے کے اور کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وأعرض عن الجاهلين (سورہ اعراف:) جاہلوں سے اعراض کرو۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ کس کس جھوٹ کا جواب دیں گے۔ اس پروپیگنڈے کا جواب علمی اور سنجیدہ انداز میں جتنا دے سکیں اس سے زیادہ کا اللہ تعالیٰ نے مکلّف نہیں بنایا ہے، اور نہ ہر ایک بات کا جواب دیا جانا مناسب ہے۔ آگے صبر اور تقویٰ ہی اصل علاج ہے، جو قرآن کی نص صریح سے ثابت ہے، اور جس پر نصرتِ الٰہی کا وعدہ ہے۔

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے **وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئاً اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ** (سورہ آل عمران:) اور اگر تم صبر کروگے اور تقویٰ اختیار کروگے، تو ان کی سازشیں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں، بے شک یہ لوگ جو کچھ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے احاطۂ قدرت میں ہے۔

اہل اسلام کا معاملہ صرف ظاہری اسباب پر نہیں ہے کہ اس میں اتنا غلو کیا جائے کہ ساری اہمیت اسی کو حاصل ہو جائے۔ جواز کے دائرے میں بقدر ضرورت اسباب اختیار کئے جائیں گے اسباب کے دائرے سے بہت بڑا دائرہ نصرت الٰہی کا ہے جس پر یقین ایک مسلمان ہی کو ہو سکتا ہے۔ کفار دنیادار اس سے محروم ہیں۔ پھر مسلمانوں کو کفار کے طریقوں پر دوڑانا، ان کے ذرائع ابلاغ کو اختیار کرنے کی تلقین کرنا بالکل غلط اور لغو ہے۔

مسلمانوں کو تو کفار اور یہود و نصاریٰ کے طریقوں سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ جن چیزوں کی بنیاد خلاف شرع امور پر ہے، وہ یہود و نصاریٰ کا طریقہ تو ہو سکتا ہے۔ اہل

اسلام کا نہیں۔ ٹی، وی کی بنیادی چیز تصویریں ہیں اور وہی اسلام میں ناجائز ہیں۔ پھر دینی پروگرام کی گنجائش اس میں کیونکر ہوگی۔

جو لوگ کھینچ تان کر اسے جائز بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اسلام کی خدمت نہیں، اسلام کو مذاق بنانا چاہتے ہیں۔ وہ خود ٹی، وی دیکھتے ہوں تو دیکھیں، مگر اسے جائز بتا کر ساری امت کو جہنم میں ڈھکیلنے کی کوشش نہ کریں۔

ایک مرتبہ لاہور میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ محدث دیوبند، علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب ایک جگہ تشریف فرما تھے۔ اس وقت کے مشہور صحافی غلام رسول مہؔر اور عبدالمجید سالکؔ ان حضرات کی خدمت میں آئے۔ یہ صحافی حضرات دنیاوی معلومات سے اتنے متاثر و مغلوب ہوتے ہیں کہ شریعت کی حرام کردہ چیزیں ان کیلئے اجنبی بن جاتی ہیں۔ جیسے آج ٹی، وی کی حرمت اجنبی معلوم ہوتی ہے۔ اس وقت سود کی حرمت پر ان دونوں حضرات کو بہت اشکال ہو رہا تھا۔ سالکؔ صاحب سود کے جواز پر بحث کر رہے تھے، علامہ عثمانی جواب دے رہے تھے، بحث کافی طویل ہوگئی۔ سالک صاحب ماننے کے لئے تیار نہ تھے، علامہ کشمیری خاموش سن رہے تھے، جب دیر ہوگئی تو علامہ انور شاہ نے فرمایا:

> ''میاں سالک! تم تو ہو سالک، میں ہوں مجذوب، میری بات کا برا مت ماننا، خدا کی بنائی ہوئی جہنم بہت وسیع ہے، تم کو اس میں کودنا ہو تو کودو، مگر ہمارے کندھوں پر پاؤں رکھ کر کودو گے تو ہم پکڑ لیں گے۔ (یعنی ہمارے فتوے کے ذریعہ جواز چاہو تو ہم اس کے جواز کا فتویٰ نہیں دیں گے)

یہی بات یہاں بھی ہے کہ کوئی صاحب ٹی، وی سے لطف اندوز ہو کر عاقبت برباد کرنا چاہیں تو کریں، مگر اس کے جواز کا فتویٰ دینا چاہیں گے، تو اس کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اور جب ٹی، وی کے لئے اسلامی پروگراموں کی اجازت ہوگی، تو ظاہر ہے کہ اس کے گھر گھر رکھنے کے جواز کا فتویٰ بھی دینا پڑے گا۔ اور اس کا جو حشر ہوگا، وہ ظاہر ہے کہ اسلامی پروگرام کا بہانہ ہوگا اور تمام واہیات و خرافات سے گھر بھرے ہوں گے۔

بعض مضمون نگاروں نے علماء پر طعن کیا ہے کہ یہ لوگ ابتداء میں لاؤڈ اسپیکر ریڈیو وغیرہ کو بھی قبول نہیں کرتے تھے، مگر اب وہ پچھلی بات نہ رہی۔ اس سے یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ ان کی بات کا کچھ اعتبار نہیں، کل ایک بات کو ناجائز کہتے تھے، جب وہی چیز عام ہوگئی تو وہ جائز ہوگئی۔

لیکن ان کا یہ طعن درست نہیں ہے، دین، علماء اور عوام کا وضع کردہ نہیں ہے، اللہ ورسول کی طرف سے ہے، تو جب بھی کوئی نئی چیز آئے گی، تو دیانت کا تقاضا یہی ہے، کہ اس کی اچھی طرح تحقیق کریں۔ چنانچہ ہر مسئلے میں یہی ہوا ہے، جب تک اچھی طرح وضاحت نہیں ہوگئی ہے۔ اس کے جواز یا عدم جواز دونوں پہلوؤں پر گفتگو رہی۔ پھر جب کوئی ایک رُخ واضح ہوگیا، تو فیصلہ ہوگیا، لیکن بعض چیزیں ایسی ہیں کہ ان کے عدم جواز یا کراہت کا رخ اگرچہ متعین ہے، مگر ان کے رواج کا اتنا غلبہ ہوگیا ہے کہ ان کی برائی ذہنوں سے محو سی ہوگئی ہے، اور بعض چیزوں میں خود اصحاب دین کسی درجہ میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ اس کی وجہ سے نکیر کی شدت میں کمی ہوگئی ہے، تو بعض لوگوں نے اس کے جواز کا فیصلہ سمجھ لیا۔

مثلاً تصویر کشی اصلاً ناجائز ہے، مگر اب اس کی وہ کثرت ہے کہ الامان والحفیظ! شاید ہی کوئی مجلس اور کوئی شخص اس سے بچا ہو، مسجدوں میں نمازیوں کی تصویریں۔ علماء ومشائخ کی تصویریں۔ مجلس وعظ کی تصویریں۔ مجلس نکاح کی تصویریں۔ کتابوں میں تصویریں۔ گھروں میں تصویریں۔ غرض کہاں تصویریں نہیں ہیں۔ اب اگر کوئی تصویر پر نکیر کرتا ہے تو اجنبی سی بات معلوم ہوتی ہے، اس مسئلے میں علماء ومشائخ بھی ڈھیلے نظر آتے ہیں، مگر ہے وہ ناجائز ہی۔

لاؤڈ اسپیکر کے مسئلے میں جواز وعدم جواز کی جو بنیاد تھی، وہ واضح تھی لیکن اس بنیاد کا اس پر انطباق مختلف فیہ ہوا، اس سے نفس مسئلہ میں اختلاف ہوا، مگر پھر تحقیقات سے یہ بات منقح ہوگئی کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز بعینہٖ بولنے والے کی آواز ہی ہوتی ہے۔ دوسری کوئی آواز نہیں ہوتی، تو اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں رہ گیا۔ گو کہ اب بھی بعض علماء اس میں کراہت تصور کرتے ہیں، اور یہ ان کے احتیاط کا پہلو ہے۔

ٹیلی ویژن بھی اب اتنا عام ہو چکا ہے کہ اس کی بھی قباحت ذہنوں سے محو ہوتی جاتی ہے۔ اب تو بعض علماء بھی ٹی، وی کا جلوہ دیکھتے نظر آتے ہیں۔ اور کچھ حضرات تو بہ نفس نفیس ٹیلی ویژن میں جلوہ افروز بھی ہوتے ہیں، اس سے دین کا فائدہ تو ہوتا نہیں، ہاں ان کی شہرت ہو جاتی ہے۔

نص قرآنی کا قطعی فیصلہ ہے کہ خبیث چیز خبیث ہی رہے گی خواہ وہ کثرت کی وجہ سے بھلی معلوم ہونے لگے۔ قُلْ لَایَسْتَوِی الْخَبِیْثُ وَالطَّیِّبُ وَلَوْأَعْجَبَکَ کَثْــــرَۃُ الْخَبِیْثِ ۔ (سور مائدہ: ۱۰۰)

دنیا پرستی اور دین اسلام دونوں جمع نہیں ہو سکتے۔ دین اسلام دنیا کو برتنے کی صحیح تعلیم دیتا ہے، مگر اس کو معبود و مقصود بنانے اور اس میں مرنے کھپنے سے منع کرتا ہے۔ دنیا کا استعمال آخرت کیلئے، رضاء الٰہی کیلئے صحیح استعمال ہے۔ اور دنیا کو صرف دنیا کے لئے آخرت کو فراموش کر کے استعمال کرنا دنیا پرستی ہے۔ اس سے صریح ممانعت قرآن میں موجود ہے۔ دورِ حاضر کے دنیا پرستوں کے سامنے آخرت کا کوئی مسئلہ نہیں، اس سے بے نیاز ہو کر آنکھیں بند کر کے دنیا کی پوجا ہو رہی ہے، ان کی پیروی جب مسلمان کرے گا، تو وہ بھی اسی گناہ میں مبتلا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿و لا تَرْکَنـــُوا اِلَی الّذِینَ ظَلَمُوا فَتَمَسّکُمُ النّارُ ﴾ (سورۂ ھود: ۱۱۳) تم ظالموں کی طرف میلان نہ رکھو، ورنہ آگ تمہیں پکڑ کر رہے گی۔ ظالموں کی طرف میلان یہی ہے کہ اپنا طریقہ چھوڑ کر کفار و مشرکین کے طریقوں کو اختیار کیا جائے۔

حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْتَرِیْ لَھْوَ الْحَدِیْثِ لِیُضِلَّ عَنْ سَبِیْلِ اللہِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَیَتَّخِذُھَا ھُزُواً (سورہ لقمان: ٦) اور کچھ لوگ وہ ہیں جو کھیل کی باتیں خریدتے ہیں، کہ اللہ کے راستے سے علم کے بغیر بھٹکا دیں، اور اسے مذاق کی چیز بنائیں۔

یہ ان اشقیاء کا ذکر ہے جو اپنی جہالت اور ناعاقبت اندیشی سے قرآن کریم کو چھوڑ

کر ناچ رنگ کھیل تماشے یا دوسری خرافات وواہیات میں مستغرق ہیں ، چاہتے ہیں کہ دوسروں کو بھی ان مشاغل اور تفریحات میں لگا کر اللہ کے دین اور اس کی یاد سے برگشتہ کردیں، اور دین کی باتوں پر خوب ہنسی اُڑائیں، حضرت حسن بصریؒ **لھو الحدیث** کے متعلق فرماتے ہیں: **کل ما شغلک عن عبادۃ اللہ وذکرہ من السمر والاضاحیک والخرافات والغنا ونحوھا** (روح المعانی) یعنی **لھو الحدیث** ہر وہ چیز ہے جو اللہ کی عبادت اور یاد سے ہٹانے والی ہو، مثلاً فضول قصہ گوئی، ہنسی مذاق کی باتیں، واہیات مشغلے اور گانا بجانا وغیرہ (تفسیر عثمانی)

ٹیلی ویژن ہو، ریڈیو ہو، انٹرنیٹ ہو، سنیما ہو، ان سب کا بڑا مصرف ”**لھو الحدیث**“ ہے جو شخص ان امور میں دلچسپی رکھتا ہے، وہ اللہ کی عبادت اور ذکر الٰہی، تلاوت قرآن سے ضرور غافل ہوتا ہے، کتنے لوگ ہیں، جو ٹیپ ریکارڈ سے تلاوت سن لیتے ہیں، اور یہ سننا بطور تفریح کے ہوتا ہے، پھر انھیں تلاوت کی توفیق نہیں ہوتی، ٹیلی ویژن پر حرم شریف کی نماز اور تراویح کا منظر دلچسپی سے دیکھتے ہیں، مگر نہ فرض نماز پڑھتے نہ تراویح سے واسطہ رکھتے، یہ کہنے کو تو اسلامی پروگرام ہوتے ہیں، مگر فی الحقیقت اسلامی اعمال واحکام سے روکنے والے ہوتے ہیں۔

پھر یہ بھی خیال کرنے کی بات ہے کہ اسلامی پروگرام دیکھنے والے کتنے ہوتے ہیں اور جو ہوتے بھی ہیں، تو اس کے معاً بعد ناچ گانے کے پروگرام میں مست ہوجاتے ہیں۔

وحید الدین خاں صاحب جو ٹی، وی کو ”خدا کی دین“ قرار دیتے ہیں، وہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ:

> ”تاہم اس کا ایک اور پہلو ہے، اس کا تعلق ان پروگراموں سے ہے، جو آج کل اسلامی پروگرام کے نام سے ٹی، وی پر دکھائے جاتے ہیں .... دوسرے پروگراموں کی طرح ان اسلامی پروگراموں کو بھی تفریح کے روپ میں ڈھال دیا گیا ہے“

وحید الدین خاں کے نزدیک ہر چیز کا معیار عیسائیوں، یہودیوں اور غیر مسلموں

کے یہاں ملتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی مسیحی پروگرام کو بطور معیار اور نمونے کے پیش کیا ہے۔ واقعی رسول اللہ ﷺ نے سچ فرمایا:

لتتبعن سنن من قبلکم شبراً بشبرٍ وذراعاً بذراعٍ حتیٰ لو دخلوا جحر ضبٍّ تبعتموهم قلنا یا رسول اللہ الیهود والنصاریٰ قال فمن (بخاری شریف، ص: ۱۰۸۸) تم اپنے سے پہلی امتوں کے طریقوں کی ہو بہو پوری پوری نقلیں ضرور اتار کر رہو گے، یہاں تک کہ اگر بالفرض ان میں کوئی شخص گوہ جیسے ذلیل جانور کے تنگ سوراخ میں گھسا ہوگا ہو تو تم بھی اس میں ضرور گھس کر رہو گے۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا پہلی امتوں سے آپ کی مراد یہود و نصاریٰ ہیں، آپ نے فرمایا تو پھر اور کون مراد ہوتے؟

رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یقیناً ایک وقت ایسا آئے گا کہ میری امت کے کچھ لوگ اگلی امتوں کے گمراہ لوگوں کی قدم بقدم پیروی کریں گے۔ جن گمراہیوں اور غلط کاریوں میں وہ مبتلا ہوئے ہیں، یہ بھی ان میں مبتلا ہوں گے، یہاں تک کہ اگر ان میں سے کسی سرپھرے پاگل نے گوہ کی بل میں گھسنے کی کوشش کی ہوگی، تو میری امت میں بھی ایسے پاگل ہوں گے، جو یہ مجنونانہ حرکت کریں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اس طرح کی احمقانہ حرکتوں میں بھی ان کی پیروی اور نقالی کریں گے۔ (معارف الحدیث ج: ۸، ص: ۱۳۰)

رسول اللہ ﷺ نے آئندہ زمانوں میں ظاہر ہونے والے فتنوں کی تفصیل سے خبر دی ہے، تاکہ فتنوں اور فتنہ پردازوں کی شناخت رہے، اور امت اندھیرے میں نہ رہے۔ غیروں کی اندھا دھند نقالی اور ان کے طریقوں اور نظریوں کی طرف رجحان و میلان بھی ایک فتنہ ہے، دیکھ لیجئے کتنے لوگ ہیں کہ ان کو نمونہ اور معیار نہ اسلام میں ملتا، نہ مسلمانوں میں۔ وہ ہر بات میں مغرب کا، یورپ کا، امریکہ کا، برطانیہ کا حوالہ دیتے ہیں۔ وہی یورپ، وہی برطانیہ وہی امریکہ جس کی نگاہ بھی اُٹھتی ہے تو اسلام کو کوئی زخم لگانے کی کوشش کرتی ہے۔

''سہارا'' کے ایک مضمون نگار (مفتی اعجاز ارشد قاسمی) نے اچھی بات لکھی ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

> ’’ٹیلی ویژن کے ذریعہ اسلامی پروگرام پیش کرنے کے سلسلے میں اپنی رائے میں نرمی پیدا کرنے سے پہلے یہ بات اچھی طرح سوچ لینا ہوگا کہ کیا اس طرح کا فتویٰ صادر کرنے سے گھروں میں ٹی، وی رکھنے کی گنجائش نہیں نکلتی ہے اور جب ہم ہر مسلمان کو اپنے گھروں میں ٹی، وی رکھنے کی عام اجازت دے دیں گے، تو کیا ہر گھر میں ٹی، وی کا استعمال صرف اسلامی پروگراموں کے لئے ہو سکے گا؟ کیا ٹی، وی کے استعمال کی اجازت، تھوڑے منافع کی خاطر بہت سے شرور وفتن کو دعوت دینے کے مترادف نہیں ہوگا؟ یقیناً ہوگا اور ۹۹ رفی صد گھروں میں ٹی، وی اسلامی پروگراموں تک محدود نہیں رہ سکے گا۔ ٹیلی ویژن اطلاعاتی انقلاب ہے، جس کی طاقت کا ہر کسی کو اعتراف ہے اور اس سے فائدہ نہ اُٹھانا بظاہر غیر دانشمندی ہے، لیکن ان حقائق کے باوجود اس بات سے قطعاً انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج ٹی، وی کے ذریعہ اس طرح کے پروگرام پیش کئے جانے کے باوجود وہ آلۂ لہو ولعب کی علامت بن چکا ہے اور بیشتر ٹی، وی چینلز کا اولیں مقصد ناظرین کو ذہنی عیاشی کا سامان فراہم کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج یورپی ممالک اس بات پر سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں کہ ٹی، وی پر پیش ہونے والے پروگراموں کی وجہ سے جو جنسی بے راہ روی اور پُر تشدد واقعات رُونما ہو رہے ہیں ان پر کیسے کنٹرول کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جب یورپی ممالک کو ٹی، وی کلچر کا اتنا تلخ تجربہ ہے، تو پھر ہمارے معاشرہ کا کیا حال ہوگا۔ ایسی حالت میں حدیث نبوی واضح طور پر ہماری رہنمائی کرتی ہے کہ ’’جس میں شک ہو اسے چھوڑ دو اور جس میں یقین ہو اسے اختیار کرو‘‘۔ (مشکوٰۃ)

بہر کیف اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ٹی، وی ایک مؤثر ترین پیغام رسانی کا ذریعہ ہے، جس کی طاقت مسلم ہے، لیکن جس طاقتور آلہ کے استعمال سے اپنا تشخص مٹ جانے کا خطرہ ہو، جس کے نقصانات یقینی ہوں، جس کے تجربات بہت تلخ ہوں، اس طرح کے ذریعہ ابلاغ کے استعمال کی بھلا کیسے اجازت دی جا سکتی ہے۔ یہ کہنا کہ ٹی، وی کے سلسلے میں دارالعلوم نے جو فتویٰ دیا ہے، اس پر آج کے دور میں عمل کرنا ناممکن ہے، بالکل

غلط ہے۔ پوری دنیا کے مسلمان دارالعلوم دیوبند کے فتویٰ کا احترام کرتے ہیں اور اس کے ہر فتویٰ پر عمل کرنے میں جذباتی حد تک فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض مسائل میں عملی کوتاہی ہوجاتی ہے“۔

یورپی ممالک سنجیدگی سے کیا غور کریں گے، ان کی سنجیدگی سے تو کچھ اور مزید فتنے ابلیں گے۔ وہ غور کریں یا نہ کریں، ہمیں تو قرآن وسنت سے وابستہ رہنا ہے۔ ٹی، وی اور انٹرنیٹ کا کوئی اسلامی پروگرام، اسلامی مزاج سے میل نہیں کھاتا، اور اگر کچھ علماء، کچھ بظاہر دیندار لوگ ان پروگراموں سے دلچسپی لیتے ہیں، تو وہ اسلام کو نقصان پہونچاتے ہیں۔ قیامت کے دن اس کے وہ جواب دہ ہوں گے، اسلام اور اسلامی حدود وتعلیمات کا تحفظ ضروری ہے، ان حدود کو توڑ کر اسلام کا نام تو باقی رہ سکتا ہے۔ اسلام باقی نہیں رہے گا، اور وہی بات ہوگی جس کی خبر حدیث میں دی گئی ہے۔ **لا یبقیٰ من الاسلام الا اسمه ٗ ولا یبقیٰ من القرآن الا رسمه ٗ**۔ دین کا صرف نام ہی نام باقی رہے گا، اور قرآن کا صرف نقش ہی نقش رہ جائے گا۔

کوئی مانے یا نہ مانے، سنے یا نہ سنے، دینی حدود کا تحفظ ضروری ہے، جو کچھ غلط ہے، اسے غلط کہنا ضروری ہے، خواہ اکثریت اسی غلطی پر ٹوٹی پڑ رہی ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اُتْلُ مَا اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ کِتَابِ رَبِّکَ لَامُبَدِّلَ لِکَلِمَاتِهٖ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحِداً** (سورہ کہف: ۲۷) تمہارے رب کی جانب سے جس کتاب کو بطور وحی کے نازل کیا گیا ہے، اس کی تلاوت کرو، اس کے کلمات کوئی بدل نہیں سکتا، اور اس کے علاوہ تم کوئی پناہ گاہ نہیں پاؤ گے۔

ہدایت کل بھی قرآن میں تھی، وحی الٰہی میں تھی اور آج بھی وہیں ہے اس کی تلاوت، اس میں غور وتدبر کو چھوڑ کر لہویات وخرافات کی مشغولیت بجز گمراہی کے اور کچھ نہیں ہے۔

(اکتوبر ۲۰۰۴ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تماشائے عبرت

پچھلے دنوں دو عجیب تماشے دیکھنے میں آئے ، حیرت کے تماشے ! عبرت کے تماشے ! یہ خاکسار راقم الحروف ریڈیو اور اخبارات سے کچھ خاص اشتغال نہیں رکھتا، ریڈیو تو کبھی نہیں سنتا، البتہ اخبار کبھی کبھی نظر سے گزرتا ہے، نہیں ملتا، تو اس کی طلب نہیں ہوتی، مل جاتا ہے، تو سرسری نظر ڈالنے سے انکار نہیں، چند ماہ پہلے ہفتوں اخبار دیکھنے کی نوبت نہیں آئی ، ایک روز ایک دوست نے فون پر خبر دی کہ دارالعلوم دیوبند کا ایک فتویٰ فلاں اخبار میں شائع ہوا ہے کہ اشاعت دین وتبلیغ اسلام کے لئے ٹی ۔ وی کا استعمال جائز نہیں، اس پر اس اخبار میں کچھ علماء کی طرف سے خوب لے دے ہو رہی ہے، مجھے حیرت ہوئی ٹی ۔ وی کے استعمال کا عدم جواز تو بدیہی ہے، شریعت مطہرہ کے اصول کا جو معمولی حرف شناس بھی ہوگا وہ بھی جانتا ہے کہ فحاشی ، عریانی ، بے راہ روی کا یہ ڈبہ اشاعت اسلام تو بڑی مقدس چیز ہے، کسی معمولی مقصد کیلئے بھی اس کا استعمال جائز نہ ہوگا، کوئی گندگی پھیل جائے، تو وہ پاک نہ ہوگی ۔ لیکن اللہ جانے اصحابِ علم کہلانے والے ایک طبقہ نے کہاں سے، کون سا نسخہ سونگھ لیا ہے کہ وہ دن کے اُجالے میں اندھیر مچا رہے ہیں ۔ خاکسار نے اسی وقت اس موضوع پر ایک تفصیلی مضمون لکھا، جو ماہنامہ ضیاء الاسلام شمارہ اکتوبر میں آغازِ سخن کے ذیل میں شائع ہوا ۔

اسی دوران ایک دوسرا تماشا بھی اخبار کے صفحوں میں ؎
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

کا مصداق بنا ہوا چل رہا تھا ۔ اس وقت امریکہ میں صدارتی الیکشن کی تیاریاں شروع ہونے والی تھیں، یا شروع ہوگئی تھیں، معلوم ہوا کہ وہاں کے صدر نے ہندوستان سے

اور شاید دنیا بھر کے ممالک سے مسلمان علماء کو اپنے یہاں مدعو کیا ہے، بعض علماء وہاں پہونچ رہے ہیں، امریکہ کی کچھ تعلیمی میدان میں سرگرمیاں بھی ہیں جو علماء اور اہل مدارس کے ذہنوں میں اُتاری جارہی ہیں۔ ان سرگرمیوں کا مرکز حیدرآباد میں ہے، دہلی میں ہے، ہمارے قریب جامعۃ الفلاح بلریا گنج میں اس موضوع پر ایک ورکشاپ منعقد ہوا تھا، معلوم ہوا کہ علماء کی کئی کھیپ ہندوستان سے امریکہ پہونچ چکی ہے، اور امریکہ کی ضیافت سے متمتع ہوکر کچھ لوگ واپس بھی آچکے ہیں، کچھ لوگ جانے کی تیاریاں کررہے ہیں، پھر معلوم ہوا کہ گئے بھی، اور آئے بھی۔ پھر صدارتی الیکشن ہوا، اور سابق صدر دوبارہ صدارت کی کرسی پر براجمان ہوگیا۔ اب سناٹا ہے۔

اسی وقت اس موضوع پر لکھنے کا ارادہ ہوا۔ مگر موقع نہ مل سکا۔ اس تماشے پر بہت حیرت ہوئی، ابھی کتنے دن کی بات ہے، کہ یہی امریکہ ایک معمولی بہانہ بناکر افغانستان پر بم برسا رہا تھا، اسے تباہ وبرباد کرکے رکھ دیا، اس سے پہلے عراق کو نشانہ بناچکا تھا، افغانستان کے بعد عراق کو دوبارہ تاکا، اور اسے تہس نہس کرکے رکھ دیا، اسرائیل کی پشت پناہی یہ مستقلاً کررہا ہے، عرب ممالک کو کنگال کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے، اور وہاں کے معادن اور ذخائر کو ہر قیمت پر اپنے تصرف میں رکھنا چاہتا ہے، دنیا بھر کے دینی مدارس کو دہشت گردوں کے مراکز اور علماء کو دہشت گرد قرار دے کر پروپیگنڈے کی ساری طاقت اس پر جھونک رہا ہے، وہی امریکہ جس کے ظلم وبربریت کا شہرہ چہار دانگ عالم میں پھیلا ہوا ہے، اندھا بھی اس کے ظلم وستم کو دیکھ رہا ہے، بہرا بھی اس کے مظلوموں کی چیخ وپکار سن رہا ہے، جس کے ظلم وستم کے لئے کسی دلیل وبرہان کی ضرورت نہیں ہے، وہ امن کا نعرہ لگاکر بدامنی پھیلاتا ہے، وہ حفاظت کا نام لے کر ملکوں کو اُجاڑتا ہے، ابھی کتنے دنوں کی بات ہے کہ ہمارے علماء امریکہ کی مصنوعات کو بائیکاٹ کرنے کی تلقین کررہے تھے، ان مصنوعات کی فہرست شائع کررہے تھے، ان کے بجائے ملکی مصنوعات کے استعمال کی ترغیب دے رہے تھے، پیپسی بند، کوکاکولا بند، فلاں سگریٹ بند، فلاں فلاں سامان ناقابل استعمال!

اور پھر چند ہی دنوں میں یہ کیا ہوا کہ امریکہ کے قاصد مدارس میں اور علماء کے پاس دوڑتے پھر رہے ہیں، انھیں دعوتیں دے رہے ہیں، امریکہ آنے کے لئے اصرار کر رہے ہیں، اور وہی علماء جو امریکہ سے اظہارِ نفرت کر رہے تھے، اب اس سے محبت کی پینگیں بڑھا رہے ہیں، ایسا بھی نہیں ہے کہ امریکہ کا ظلم ختم ہو گیا ہو، یا اسے پچھلے کرتوتوں پر ندامت ہوئی ہو، یا اس نے اسرائیل کی پشت پناہی سے ہاتھ کھینچ لیا ہو، یا افغانیوں اور عراقیوں پر اس نے کچھ مہربانی فرما دی ہو، یا مدارس کو دہشت گردی کا اڈہ کہنا بند کر دیا ہو، یا علماء وطلباء کو معصوم قرار دے دیا ہو، ایسا کچھ نہیں، وہ اپنی سابقہ روش پر حسب دستور ہے، پھر اچانک یہ کیا ہوا پلٹی! موسم کیونکر بدلا۔ اس کو اتنی گنجائش کیسے مل گئی کہ اس کے فرستادے، اس کے قاصد علماء کے بیچ مدارس کے صحن و دفتر میں کھڑے بیٹھے نظر آرہے ہیں، ان سے باتیں کی جارہی ہیں، ان کا پیغام سنا جارہا ہے، بعض انکار کر رہے ہیں، بعض ان کا پیغام قبول کرنے اور امریکہ جانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

یا للعجب !یا ویلا ہ ! واأسفاہ !

ایک مرکزی درسگاہ میں امریکی سفیر پہونچا، اپنی دعوت پیش کی، درسگاہ کے ذمہ داروں نے دعوت نہیں قبول کی، کرنے والوں نے ان پر اعتراض کیا، کہ امریکی سفیر وہاں کیوں پہونچا؟ ذمہ داروں نے جواب دیا کہ ہمارا دروازہ سب کے لئے کھلا ہوا ہے، آنے کو ہم روک نہیں سکتے، یہ جواب دے کر وہ مطمئن ہو گئے کہ اعتراض ختم ہو گیا، حالانکہ ایسا ہوا نہیں، آپ کا دروازہ ان دشمنوں کے لئے کیوں کھلا ہوا ہے، جو آپ کے دین کو، آپ کی پوری ملت کو تباہ کئے جارہے ہیں۔ آپ کے اندر ان کے مقابلے کی طاقت نہیں ہے، تو کم سے کم اظہارِ نفرت کرتے ہوئے ان کے لئے اپنا دروازہ تو بند کر سکتے ہیں، آپ کی غیرت کو کیا ہوا، کہ ایسا خونخوار دشمن جس کے ہاتھ آپ ہی کی ملت کے خون سے رنگین ہیں آپ کے گھر آئے، اور دروازہ کھول کر آپ اس کا استقبال کریں اور اس کے اسی خونیں اور نجس ہاتھوں سے آپ مصافحہ کریں۔

پھر ان لوگوں کی غیرت وحمیت کو کیا کہا جائے ، جو امریکہ کے دسترخوان پر جا پہونچے اور اس خوانِ یغما سے آسودہ ہوکر لوٹے ، **ایں چہ بو العجبی ست** ، رویہ کی اتنی جلد تبدیلی اور اتنی بڑی تبدیلی حیرت در حیرت ہے۔

قرآن کریم میں حق تعالیٰ نے سورۂ اعراف میں ایک ایسے شخص کا تذکرہ کیا ہے، جس کے بارے میں ارشاد ہے کہ **آتیناہ آیاتنا** ، اس کو ہم نے اپنی آیات سے نوازا تھا، لیکن اس نے اس عظیم نعمت کی قدر نہیں کی ، اس نے اللہ کی آیات کے تقاضوں کو پس پشت ڈال دیا، اور ان کے آثار وثمرات اور ان کے برکات وحسنات سے خود کو باہر نکال لیا، جب وہ آیات کے حصار سے نکل گیا تو ظاہر ہے کہ شیطان کا لقمۂ تر بننے میں اسے دیر نہیں لگے گی۔ چنانچہ شیطان اس کے پیچھے لگ گیا، حالانکہ اس علم اور ان آیات کا مرتبۂ ومقام وہ تھا کہ ان کی وجہ سے اس کو اللہ ہی جانتا ہے کتنی رفعت حاصل ہوتی ، مگر وہ ظالم دنیا اور متاعِ دنیا، اور فانی لذتوں کی تلاش میں کھو گیا، اور اس کی خواہشات اس کے لئے قبلۂ مقصود بن گئیں ، تو اس کی مثال کتے جیسی ہے، کہ وہ زبان نکال کر ہانپتا ہے، ذلیل وخوار ہوتا ہے، بے سبب بھی مشقت اور تکلیف میں رہتا ہے۔

اندازہ کیجئے ، وہ کون سی چیز تھی ، جس نے ایک ایسے صاحب علم اور صاحب آیات کو جس کے صاحب علم وآیات ہونے کی شہادت اللہ تعالیٰ دیتے ہیں ، کتے کے درجے میں اُتار دیا، قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ متاعِ دنیوی اور لذاتِ فانیہ کی حرص اور اس کی نفس پروری تھی ، وہ ظالم تو اپنی صفت مذمومہ میں آخری حد تک چلا گیا، کہ ایمان بھی اس کا بالکلیہ غارت ہوگیا۔ لیکن جو جس حد تک اس حرص اور نفس پروری میں ملوث ہوگا۔ اس حد تک اس کے ایمان کا چراغ مدھم ہوگا۔ اور کیا عجب کہ مدھم ہوتے ہوتے بجھ جائے۔

بہت ڈرنے کا مقام ہے، علم دین کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم نعمت سے سرفراز فرمایا تھا، مگر مال ودولت کی حرص نے اس عظیم نعمت کی برکات سے محروم کر دیا۔

علماء واصحابِ مدارس وخوانق کا اصحاب ثروت کی ثروت اور امراء وحکام کی دولت

اوران کے مادی وسائل پر للچائی نگاہیں ڈالنا، دنیا وآخرت کا عظیم ترین خسارہ ہے، علماء، انبیاء کے وارث ہیں، انبیاء کی وراثت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی قوموں سے برملا فرمادیا:

لا أسالكم عليه أجراً إن أجري إلا على الله

میں تم سے اپنے دین اور تبلیغ دین پر کوئی اجر نہیں چاہتا، میرا اجر تو اللہ پر ہے، اللہ کے علاوہ انھوں نے کسی سے کوئی نفع نہیں چاہا۔ تو کیا وہ محروم ہوگئے؟ یہی وراثت اگر علماء بھی مضبوطی سے تھام لیں، تو کیا وہ محروم رہ جائیں۔ کلا دنیا والوں کے پاس دنیا کے علاوہ کیا ملے گا۔ پھر دنیا حاصل کرنے کے لئے ان کے پاس جانا، اپنے دین وایمان اور غیرت وآبرو کو خطرے میں ڈالنا ہے۔ قرآن میں جس عالم کا ذکر کیا گیا ہے، وہ مال کی لالچ میں پھنس گیا تھا، اور عبرت کا تماشا بن گیا۔ عالم وہی ہے بلکہ مومن وہی ہے، جو اس بدحالی سے سبق لے۔

لوگ امراء وحکام کے پاس جاتے ہیں، شاید کچھ دولت حاصل ہوجاتی ہو، مگر دین تو برباد ہوکر رہتا ہے۔ مشہور ہے کہ ایک دنیادار پیر سے اس کا ایک مالدار مرید اپنا خواب بیان کررہا تھا کہ آپ کے ہاتھ سے شہد ٹپک رہا ہے اور میرا ہاتھ پاخانہ میں ملوث ہے، پیر صاحب نے فرمایا کہ اور کیا؟ تم نے اپنی اور میری حالت خواب میں دیکھی، مرید کہتا ہے ابھی خواب پورا نہیں ہوا ہے، میں دیکھ رہا ہوں کہ میں آپ کا ہاتھ چاٹ رہا ہوں، اور آپ میرا ہاتھ!

دنیادار امراء واصحاب ثروت کے دربار میں حاضری دینے والوں کی یہی مثال ہے، کاش کہ اصحاب علم، علم اور دین کے مرتبہ اور مقام کو پہچانتے، اور اس کے تقاضوں پر عمل کرتے، تو اللہ کی رحمتیں ان پر اترتیں۔

(جنوری، فروری ۲۰۰۵ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مسلمانوں کے معاشرہ میں اخلاق کی حالتِ زار

یہ خاکسار راقم الحروف پچھلے دنوں گورکھپور کے قصبہ بڑھل گنج سے شہر غازی پور جا رہا تھا، دوہری گھاٹ میں چند پولیس والوں نے گاڑی رُکوائی اور ایک کانسٹبل کو اس پر بیٹھا دیا کہ انھیں مئو شہر میں اتار دیجئے گا، گاڑی چل پڑی، میں نے کانسٹبل سے اس کے تعارف کے متعلق پوچھا، وہ اپنا نام ونسب اور وطن بتاتا رہا، اسے جب بولنے کی گنجائش ملی تو دیر تک بولتا رہا، وہ کہہ رہا تھا کہ میں ڈیوٹی کے لئے مختلف جگہوں میں جاتا رہتا ہوں، لیکن مسلمانوں کی فلاں فلاں آبادی میں جتنے جاہل لوگ ہیں اتنے جاہل میں نے کہیں نہیں پائے، میں یہ سن کر سناٹے میں آ گیا، میں نے دل میں سوچا کہ جن جگہوں کا نام لے رہا ہے وہاں پڑھے لکھے لوگ بہت ہیں، مگر یہ پولیس ہے، اس کا سابقہ پڑھے لکھے لوگوں سے کیوں پڑنے لگا، اسے تو معاشرہ کے جاہل افراد ہی ملیں گے، مگر وہ جہالت کی جو باتیں ذکر کر رہا تھا، اسے سن کر سر شرم کی وجہ سے جھک گیا، وہ جو کچھ کہہ رہا تھا بالکل سچ کہہ رہا تھا، انداز ذرا تیکھا اور کڑوا تھا، اور ایک پولیس والے سے اور کیا توقع کی جاسکتی ہے؟

وہ کہہ رہا تھا اور اپنی مخصوص زبان میں کہہ رہا تھا، میں اس کا حاصل لکھ رہا ہوں کہ مسلمان نوجوانوں اور عام لوگوں کی خودسری اور آوارگی کا یہ عالم ہے کہ کسی بڑے کی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے، انھیں سمجھایا جاتا ہے، مگر ذرا بھی اثر نہیں لیتے، کتنے کام اس سرکشی کی وجہ سے بگڑ جاتے ہیں، بات ماننے کا جذبہ سرے سے ہے ہی نہیں، بے وجہ لوگوں کو چھیڑنا، مذاق اڑانا، تکلیف پہونچا کر خوش ہونا جیسے شیوہ بن چکا ہے۔

دوسرے یہ کہ ان نوجوانوں کا حال یہ ہے کہ بات شروع کریں گے تو گالی سے

شروع کریں گے، فحش گالیاں، گندی گالیاں، جیسے یہ کوئی عیب نہیں ہے، پولیس والے خود سراپا گالیوں میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں، اسی لئے وہ بے تکلف گالی کے ان الفاظ کو نقل کررہا تھا، جن کو سننے کی تاب نہیں ہوئی۔

جو کچھ وہ بول رہا تھا، اس سے دل پر چوٹ لگ رہی تھی، میں خاموش ہوگیا، پھر وہ بھی خاموش ہوگیا، میں سوچتا رہا کہ وہ ذات اقدس جس کو اللہ تعالیٰ نے نمونہ اور معیار بنا کر بھیجا ہے، اور جن کی امت میں ہونے کی ہمیں سعادت حاصل ہے، اور جن کے نام کی بلندی سے ہمیں عزت وسربلندی حاصل ہوتی ہے، ان کے اخلاق کیا تھے؟ اور انھوں نے ہم کو کس اخلاق کی تلقین کی تھی؟ اور ہمارا معاشرہ کہاں چلا گیا کہ بدخلقی، بدتہذیبی، جہالت ہمارا نشان بنی ہوئی ہے۔ ایک غیر مسلم جو شاید اخلاق کے حروف سے بھی واقف نہ ہو، وہ اتنی جرأت کے ساتھ اخلاقی کمزوریوں کا تذکرہ کررہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سرورِ کائنات فداہ ابی وامی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں شہادت دی ہے کہ **إنک لعلیٰ خلقٍ عظیم** آپ بلند ترین اخلاق پر فائز ہیں۔ آج ان کی امت کے نوجوانوں کو ایک غیر مسلم اور وہ بھی پولیس کا آدمی ذلیل ترین اخلاق پر بتارہا ہے۔ **فوا أسفاہ**

رسول اللہ ﷺ نے امت کو کن بلندیوں پر پہونچایا تھا، اور اب امت کہاں پہونچی ہوئی ہے، ہمارے نوجونواں کو اس کا احساس نہیں ہے، وہ اپنے نفس کی خرمستیوں میں اس طرح گم ہیں کہ انھیں شاید اللہ ورسول کی یاد بھی نہیں آتی، گھروں میں تربیت کا فقدان ہے، میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں، اور جانتا ہوں کہ جن لوگوں کے بارے میں لکھ رہا ہوں، ان کی نگاہیں شاید ان سطروں پر کبھی نہ پڑیں، کیونکہ ہمارے معاشرے میں ٹیلی ویژن نے پڑھنے لکھنے کی استعداد کھودی ہے، اس سے فرصت ملتی ہے، تو جن کھیل تماشوں، اور ایمان سوز حرکتوں کا اس میں ان نوجوانوں نے مشاہدہ کیا ہے، ان کی عملی مشق کرتے ہیں۔ انھیں نہ فرصت ہے اور نہ توفیق کہ ان خشک اور بے مزہ سطروں کو پڑھیں، یا ان کی طرف توجہ دیں۔

لیکن میں ایک آواز لگارہا ہوں، جن لوگوں تک یہ حروف پہونچیں وہ اگر ماحول

ومعاشرے کے باثر اور ذمہ دار ہیں، تو خود کوشش کریں، اور اگر نہ ہوں تو باثر لوگوں کو متوجہ کریں کہ امت کا یہ حال بہت ہی قابل غور ہے۔ اخلاق حسنہ کی تعلیم عام کرنی چاہئے، اور بڑے حضرات اخلاقِ نبوی کو اپنائیں، تلاش کر کر کے اپنائیں تاکہ یہ سرمایہ چھوٹوں تک منتقل ہو، خود پابند ہوں، اپنے ماتحتوں اور زیر سرپرستی نوجوانوں کو اس کا پابند بنائیں، جناب نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: **كلكم راعٍ و كلكم مسئول عن رعيته** ،تم میں سے ہر ایک ذمہ دار نگراں ہے، اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا۔

میں ان لوگوں کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں، جن کو اللہ تعالیٰ نے علم وعمل یا دینی ودنیاوی کسی وجاہت سے نوازا ہے، وہ خود اسلامی اخلاق واعمال پر عمل پیرا ہوں، اور اپنے زیرنگرانی افراد کو اس کی تاکید کریں۔ امت میں اخلاقی کمزوریاں اس طرح سرایت کرگئی ہیں کہ پورا معاشرہ کھوکھلا ہوکر رہ گیا ہے۔

جھوٹ، بدعہدی، گالی گلوج، ایذا رسانی، دوسروں کا مال ہڑپ کرلینا، کسی کی تکلیف کی پروانہ کرنا، اپنے مفاد کے لئے پورے معاشرے اور ماحول کو فساد اور بگاڑ کی آگ میں جھونک دینا، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر معمولی معمولی باتوں پر مخالف کو قتل کردینا، جیل بھیجوا دینا، رشوتیں دے دیکر اپنے مخالف کو پولیس یا بدمعاشوں سے پٹوا دینا، کیا اللہ تعالیٰ کے یہاں سرخ رُو ہونے کے یہی اعمال واحوال ہیں؟ اور کیا دنیا میں پنپنے کے یہی انداز ہیں؟ اور کیا یہی اسلامی اخلاق ہیں؟

خوب سمجھ لینا چاہئے کہ بداخلاقیوں اور خودغرضیوں کے ساتھ کوئی قوم پنپ نہیں سکتی بلکہ زندہ ہی نہیں رہ سکتی، سیاسی سازشوں اور ہتھکنڈوں نے طبیعتوں کو اس درجہ برباد کیا ہے کہ اخلاق کا تصور مشکل ہوگیا ہے۔

لیکن مسلمانوں کے پاس تو ایک عظیم الشان خزانہ ہے، قرآن ہے، حدیث ہے، صحابۂ کرام کی سیرتیں ہیں، علماء سلف کے احوال وواقعات ہیں، اخلاق پر بیش قیمت کتابیں ہیں، اور بحمد اللہ آج بھی عملی نمونے ہیں، مدارس ہیں، خانقاہیں ہیں، علماء ومشائخ ہیں، اگر

مسلمان چاہیں، اور ذرا توجہ کریں تو اخلاق درست کئے جاسکتے ہیں، لیکن پیاسا خود نہ چاہے تو دریا کے کنارے رہ کر بھی پیاس سے مر سکتا ہے۔

اہل ایمان کا دامن رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بندھا ہوا ہے، یہ امت اگر ان کے طریقے اور ان کی سیرت سے انحراف کرے گی، تو دنیا میں بھی ذلت سے دوچار ہوگی، اور آخرت میں بھی اپنی شناخت کھو کر محروم ہوگی۔

معاشرہ کا ہر فرد ذمہ دار ہے کہ وہ اپنی اور اپنے گھر والوں کی فلاح کی فکر کرے، اخلاق کا بگاڑ گھر سے شروع ہوتا ہے، پھر غلط صحبتیں انھیں برباد کر کے رکھ دیتی ہیں، خاندان اور گھر کے بڑوں کو بچوں کے لئے نیک صحبتوں کا اہتمام کرنا چاہئے، اچھے لوگوں، نیک اور بزرگ حضرات کی خدمت میں بچوں کو نوجوانوں کا پہونچائیں، نیکی اور اخلاق کی اہمیت سے انھیں واقف کرائیں، اور ان حضرات کی خدمت کے آداب سکھائیں۔

اگر دولت، دولت کی منڈیوں میں اور دولت مندوں کے پاس ملتی ہے، تو اخلاق بھی دینداروں، متقیوں اور بزرگوں کے پاس ہی ملے گا، ان سے کٹ کر، ان سے دور رہ کر، ان سے بدگمان ہو کر، ان کی بے ادبی کر کے سوائے خرابی اور فسادِ اخلاق کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی اپنی عبادت سے قرب خداوندی کی جن بلندیوں تک پہونچ سکتا ہے، اخلاق حسنہ کے ذریعے سے بھی ان بلندیوں تک رسائی ہوسکتی ہے، اور معاشرہ تو بنتا ہی ہے اخلاق حسنہ سے! رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ۔ مسلمان تو وہی ہے، جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ و مامون رہیں۔ اور فرمایا: وَالْمُؤْمِنُ مَنْ أَمِنَ النَّاسُ بَوَائِقَهٗ۔ مومن وہ ہے جس کی ایذارسانیوں سے لوگ مامون رہیں، اور آپ نے ارشاد فرمایا: لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِأَخِيْهِ مَايُحِبُّ لِنَفْسِهٖ۔ کوئی شخص اس وقت تک صاحب ایمان نہیں ہوسکتا، جب تک اپنے بھائی کے لئے وہی بات نہ پسند کرنے لگے، جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

غور کیجئے، کون پسند کرے گا کہ اس کو گالی دی جائے، اسے ستایا جائے، اس کا مال ہڑپ لیا جائے، قرض مانگے تو نہ دیا جائے، یا قرض دے تو اسے واپس نہ کیا جائے، کون پسند کرے گا کہ اس کا پڑوسی اس سے جھگڑا کرے، اس کا بیٹا اس کی نافرمانی کرے، اس کا باپ اسے گھر سے نکال دے؟ کون پسند کرے گا کہ اس کی اولاد کے ساتھ کوئی بدسلوکی کرے، اس کے گھر والوں کے ساتھ بدتمیزی کرے؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی اسے پسند نہیں کرسکتا، شروع کی سطروں میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ پولیس والا گالی دینے والوں سے نفرت کا اظہار کرتا ہے، حالانکہ وہ خود گلے گلے تک گالی میں ڈوبا ہوا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ ان بداخلاقیوں اور بد اعمالیوں کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا، تو اے ایمان والو! ایمان کا لحاظ کرو، اور اے عقل والو! عقل کے ناخن لو! جو بات تمہیں پسند نہیں ہے، اسے دوسروں کے حق میں بھی پسند نہ کرو۔

دوسروں کی عیب جوئی سے پہلے اپنے عیبوں کو تلاش کرو، انھیں دور کرو، اپنے آپ دور کرنا مشکل ہے، تو اس کے لئے حکمائے قلوب یعنی بزرگانِ دین اور مشائخ سے رابطہ رکھو، ان کے سامنے اپنی بیماریاں رکھ کر ان سے علاج کراؤ، یا انھیں دیکھ دیکھ کر، ان سے سن سن کر اصلاح اخلاق کا اہتمام کرو۔ تاکہ دنیا بھی سنورے، اور آخرت کا دائمی امن وسکون حاصل ہو، اللہ راضی ہوں، اللہ کے بندے بھی راضی ہوں۔

(اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۵ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اعتذار

کئی ماہ کے ناغے کے بعد ماہنامہ ضیاء الاسلام کا مارچ ۲۰۰۶ء کا شمارہ قارئین کی خدمت میں ہم لے کر حاضر ہو رہے ہیں۔ شرمندگی کے ساتھ، معذرت کے ساتھ، معذرت پر بھی شرمندگی ہو رہی ہے، ماہانہ رسالہ اگر وقت پر ممبروں کے ہاتھ نہ پہونچے تو انھیں کوفت ہوتی ہے، بددلی پیدا ہوتی ہے، یہ خیال گزرتا ہے کہ انتظامیہ کو یا تو انتظام کا سلیقہ نہیں، یا وہ دیانت دار نہیں!

بلاشبہ جن حضرات نے پیشگی رقم رسالے کے لئے جمع کی ہے، انھیں ایسا سوچنے کا حق ہے، لیکن ہم قارئین کی خدمت میں عرض گزار ہیں کہ:

(۱) ادارے نے اپنی جیسی پوری کوشش کی کہ وقت مقرر پر رسالہ پریس سے آجائے، اور ٹھیک وقت پر ڈاک کے حوالے ہو جائے، اس سلسلے میں ہم پریس کے ممنون کرم ہیں کہ اس کے ذمہ داروں نے ہمارے ساتھ ہر ممکن تعاون کیا، وقت پر رسالہ چھاپا، نقد رقم ہم نہ دے سکے تو اسے خوشی سے گوارا کیا۔ پریس کی اسی مہربانی اور تعاون کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم اتنے وقت تک رسالہ کو چھاپ کر قارئین کے ہاتھوں پہونچاتے رہے، لیکن یہ گرانباری بڑھتی رہی اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ قرض کی گنتی ایک لاکھ سے آگے بڑھ گئی۔ اب ادارے کو شرمندگی لاحق ہوئی، ہچکچاہٹ ہونے لگی کہ اس قرض کو کب تک بڑھنے دیا جائے گا۔ ہاتھ کو دیکھا تو خالی تھا، خریدار حضرات کا رجسٹر دیکھا گیا، پچھلے دنوں کے بقایا کا حساب لگایا گیا تو حضراتِ خریداران کے ذمے اتنی رقم باقی نکلی کہ اگر وہ سب رقم مل جائے تو قرض کا بار یکلخت اتر جائے، مگر وہ رقم ملے تو کیونکر ملے، مختلف وقفوں میں درخواست کی گئی، ایک مرتبہ منی آرڈر فارم اور خطوط بھیجے گئے، لیکن تجربہ کار حضرات مشورہ دیتے رہے کہ ادارہ کی طرف سے آدمی

بھیجا جائے، مگر ہمیں مجبوری رہی کہ اس کا خاطر خواہ انتظام نہ کر سکے، کبھی انتظام ہوا تو ادھورا اور نا تمام! نتیجہ یہ ہوا کہ قرض جوں کا توں باقی رہا، کچھ رقم ہاتھ آئی، اور پریس پہونچایا، تو قرض میں جو کچھ کمی آئی، اگلے پرچے کی اشاعت نے پھر وہیں تک پہونچا دیا۔ یہی چکر چلتا رہا، یہاں تک کہ دسمبر ۲۰۰۵ء میں بندہ سفرحج کی سعادت حاصل ہوئی، اور فروری میں واپسی ہوئی، بڑی مشکل سے نومبر دسمبر کا شمارہ مشترک نکلا تھا، واپسی کے بعد جنوری فروری کا شمارہ شائع کیا گیا، اس کے بعد سے ارادے پر ارادے ہوتے رہے، مگر ہمت نہیں ہوتی تھی کہ قرض کی گرانباری مزید بڑھائی جائے۔ اشاعت کا سلسلہ رک سا گیا، دلوں میں وسوسے آنے لگے کہ رسالہ کو باقی رکھا جائے یا بند کر دیا جائے۔ باقی رکھنے کی جو دشواری ہے وہ سامنے ہے، بند کرنے میں یہ دقت تھی کہ جہاں بیشتر حضرات کے ذمے رقمیں باقی ہیں وہیں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں، جن کی رقمیں پیشگی موصول ہو چکی ہیں، ان کو اطلاع دینی، پھر ان کی رقموں کی واپسی ایک دردسر تھا، پھر بہت سے بزرگوں نے تاکید کی کہ رسالہ جاری رکھا جائے، اس راہ سے خدمت دین کا سلسلہ بند نہ کیا جائے۔ فتنوں کے دور میں علومِ صیحہ اور مضامین حقہ کی اشاعت اللہ کے نزدیک ان شاء اللہ بڑے اجر وثواب کی چیز ہے، اور رسالہ جب شروع کیا گیا تھا، اس وقت یہی جذبہ تھا کہ علوم دین کی صحیح تبلیغ کی جائے، اس راہ میں دقتیں آئیں گی، انھیں جھیل لیا جائے گا، مگر شدید مالی تنگی نے ارادہ کو ہرا دیا۔ ہر وقت اس تنگی کی دُہائی دیتے رہنا طبیعت پر گراں بھی ہے، اور قارئین کی ناگواری کا اندیشہ بھی لگا رہتا ہے، تو اربابِ انتظام کشمکش کا شکار ہوئے کہ کریں تو کیا کریں؟

پھر غور وفکر کے بعد اور تمام احوال کو پیش نظر رکھنے کے بعد فیصلہ یہی ہوا کہ انتظام میں تھوڑی وسعت دی جائے، حالانکہ اس میں ہمارے لئے دشواری ہے، تاہم اس دشواری کو جھیلا جائے، اور رسالہ کی اشاعت باقی رکھی جائے۔ اللہ سے دعا کی جائے کہ غیبی نصرت شامل حال رہے۔

اس فیصلے کے بعد کئی ماہ کے وقفے کے بعد یہ شمارہ نکالا جا رہا ہے، اگرچہ خلا خاصا لمبا

ہے، لیکن ترتیب کو بدلا نہیں گیا، جنوری فروری کا شمارہ نکل چکا ہے، اس ترتیب کے لحاظ سے یہ مارچ کا شمارہ ہے، اس شمارے کی اشاعت کے بعد ادارے کی طرف سے ایک صاحب بھیجے جائیں گے، جن کے پاس بقایا کے پچھلے حسابات ہوں گے، آپ حضرات سے گزارش ہے کہ پچھلا حساب بیباق کر دیں اور سال رواں کا بھی سالانہ زر خریداری جمع کر دیں۔

اپنے معاونین سے ایک درخواست اور بھی ہے کہ بعض حضرات کی خدمت میں ڈاک کی خرابی کی وجہ سے کبھی کبھی رسالہ نہیں پہونچتا۔ اس میں ادارے کی کوتاہی نہیں ہوتی، ادارہ نے تو یہ انتظام کیا ہے کہ بجائے مقامی چھوٹے ڈاک خانے کے جو بلریا گنج میں ہے، جس کو اتنے رسالوں کو بیک وقت بھیجنے کا تحمل نہیں ہوتا، مرکزی ڈاک خانہ سے بھیجا جائے، جو اعظم گڈھ شہر میں ہے، اس میں بعض اہل تعلق بھی ہیں جو بہت اہتمام اور خلوص سے پرچے کی ترسیل کا انتظام کرتے ہیں، اس لئے ہمیں اطمینان ہے کہ رسالہ پورے احتیاط سے روانہ کیا جاتا ہے، لیکن کیا کیا جائے کہ ہمارا یہ محکمہ اتنا نیک بخت ہے کہ کبھی کبھی ایک خط سال سال بھر بعد پہونچتا ہے، اور اکثر تو اس کی زحمت ہی نہیں کرتا، فون کے عموم وشیوع نے اس کی کارکردگی کو اور بھی ناکارہ بنادیا ہے۔

تو قصور ڈاک کے محکمہ کا ہوتا ہے، اور کچھ حضرات غصہ ادارے پر اتارتے ہیں، چلئے یہ بھی گوارا! مگر وقت پر اطلاع ہو جائے، تو رسالہ دوبارہ روانہ کر دیا جائے، لیکن ہمیں اطلاع ہوتی ہے، تو بصورت غصہ! اور صاحب معاملہ کو یہ یاد نہیں رہتا کہ کس کس ماہ کا نہیں ملا ہے، پوچھنے پر فرمادیتے ہیں کہ دیکھ کر بتائیں گے، اور پھر بسا اوقات دیکھنے کی نوبت نہیں آتی اور دوبارہ ہم انکے غصے کا شکار ہو جاتے ہیں۔

تو معاونین سے درخواست یہ ہے کہ ان معاملات پر ناراض ہو کر رقم دینے سے انکار کے بجائے خدمت دین کے تعاون کے جذبہ سے رقم دیدیں۔ شکایتوں کی تلافی کرنے کیلئے ہم بقدر امکان حاضر ہیں، اور جو بھی شکایت ہو اسے تحریری طور پر تفصیل کے ساتھ دیں، یا ہمارا آدمی جو آپ کے پاس پہونچے گا، اس سے اپنے سامنے لکھوا دیں۔ (مارچ ۲۰۰۶ء)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کسی بزرگ کا قول ہے، **عرفت ربی بفسخ العزائم**، عزیمتیں ٹوٹتی رہیں، ارادے شکست وریخت ہوتے رہے، اس سے میں نے اپنے مالک وپروردگار کو پہچانا۔ انسان خواہ کتنا ہی عزم محکم کرے، کتنے ہی پختہ اسباب جمع کرلے، لیکن اگر رب العالمین کو منظور نہیں تو سارا عزم منہدم، سارے اسباب چکنا چور!

ناظرین کرام! انسان ضعیف البنیان نے بہت چاہا، تدبیریں کیں کہ رسالہ ضیاء الاسلام کی گاڑی لائن پر آجائے، مگر اس کے لائن پر آنے کی شرط تھی کہ اہل تعاون کے ہاتھ بڑھیں، اور قرض کا جو بوجھ اس پر لد گیا ہے، اسے اتاریں، لیکن وہ نہیں ہوسکا، اس لئے چل چل کر یہ گاڑی رکتی رہی، الحمد للہ کہ اس کے قدرداں بہت ہیں، انھوں نے مفید مشورے دئے، مگر ہم اپنی کوتاہ دامانی کی وجہ سے ان مفید مشوروں پر عمل نہ کرسکے۔ مشورہ یہ تھا کہ خریداروں کی خدمت میں آدمی بھیجا جائے، اور وہ فرداً فرداً سب سے بقایا کہ رقم وصول کرے، اس میں قدرے پیش رفت ہوئی، اور اس کے نتائج بھی بحمد اللہ اچھے نکلے مگر پورے طور پر عمل نہ ہوسکا۔ بہر حال جو کچھ عمل ہوسکا اس کے نتیجے میں تین چار ماہ کے رسالے ہم قارئین کے ہاتھوں تک پہونچا سکے، مگر قرض جوں کا توں رہا۔ اب ادارے نے ایک انہونا فیصلہ کیا ہے، اور زبانی اس کی اطلاع اس خاکسار نے اپنے دوستوں کو کر بھی دی ہے، اور انھوں نے خوشی سے اسے منظور بھی کرلیا ہے، وہ یہ کہ ۲۰۰۶ء کے تین پرچے شائع ہوئے ہیں، اور ماہانہ رسالہ کی ترتیب بگڑی اور بگڑتی چلی گئی ہے۔ اب دسمبر تک کوئی پرچہ شائع نہیں ہوسکا ہے، تو ۲۰۰۶ء کو اتنے ہی رسالوں پر موقوف کردیا جائے، اور جن حضرات نے ۲۰۰۶ء کی پوری رقم عنایت فرمادی ہے...... اور ایسے لوگ شاید سو [۱۰۰] سے زیادہ نہیں ہیں...... ان کی خدمت میں معذرت کرلی جائے کہ تین پرچوں سے زائد رقم کو رسالہ کیلئے ''تعاون محض'' بنا کر ادارے کو اس سے بری کردیں، اور ۲۰۰۷ء کا سالانہ بدل اشتراک عنایت فرمادیں۔ میرا سفر بہار در بھنگہ ومدھوبنی کا ہوا تھا، وہاں کے احباب سے میں نے اس کا ذکر کیا

، تو سب نے نہ صرف بشاشت سے اسے قبول کیا، بلکہ جن دوستوں نے اب تک ۲۰۰۶ء کی رقم نہیں دی تھی، انھوں نے وہ بھی دی، اور ۲۰۰۷ء کی رقم بھی عنایت فرمائی۔ اب صورت حال یہ ہے کہ ۲۰۰۶ء کو تین پرچوں کی ناتمام جلد پر مکمل کر دیا گیا ہے، اور زیر نظر شمارہ سے ۲۰۰۷ء کی جلد شروع ہو رہی ہے۔ کوئی دعویٰ نہیں ہے، لیکن کوشش ہے کہ اب سے شمارے بالترتیب پابندیٔ وقت سے شائع ہوں۔

تاہم دو باتیں ملحوظِ خاطر رہیں۔

(۱) ترتیب اور پابندی کے باقی رکھنے کے لئے ہمیں اپنے دوستوں کے تعاون کی شدید ضرورت ہے۔ اس کے لئے کرنا یہ ہے کہ ۲۰۰۷ء کا چندہ پورے اہتمام سے ادا کریں، اور اس کا حلقہ بڑھانے کی جدوجہد کریں، اس مقصد سے ادارے کی طرف سے ایک صاحب ان شاء اللہ بھیجے جائیں گے۔ ان کا ہمارے احباب ساتھ دیں۔

(۲) دوسرے یہ کہ رسالے پر قرض اور خسارے کا جو بوجھ تھا، وہ قدرے تخفیف کے ساتھ اب بھی باقی ہے، جن کے ذمے پچھلا بقایا ہے، وہ خوش دلی سے ادا کر دیں، اس کے ساتھ احباب وسعت کچھ اور بڑھ کر بہ نیت اداءِ قرض مزید حصہ لے لیں تو یکلخت یہ بوجھ اتر جائے۔

یہ اتنی لمبی چوڑی عبارت اس لئے لکھنی پڑی کہ دل بار بار اس وسوسے میں مبتلا ہوا کہ پرچہ ہی بند کر دیا جائے، اور اپنے خاص احباب کی مدد سے قرض کی کھڈ پاٹ دی جائے، یہ کام ہے تو مشکل! مگر آگے گرانباری تو نہ آئے گی، مگر جب بھی اس کا تذکرہ کسی سے کیا، بشدت انکار ہوا۔

پرچہ نکلنا چاہیئے، قرض ادا ہوتا رہے گا، بالآخر وسوسہ اُڑ گیا، اور عزم یہی رہا کہ پرچہ نکالا جاتا رہے۔ پس فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ کے ارشادِ خداوندی کے مطابق مذکورہ بالا صورت اختیار کی گئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے قارئین اس صورتحال کو گوارا بھی کریں گے اور مزید تعاون سے نوازیں گے۔ واللہ ولی التوفیق

(جنوری، فروری ۲۰۰۷ء)

﷽

آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

> علماء نے اور دینی مدارس کے ذمہ داروں نے مغرب کی اور انگریزی کالجوں کی نقالی میں بہت سی ایسی چیزیں اختیار کر لی ہیں جو اسلام کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہیں، ان پر تنبیہ کی گئی ہے۔

امام بخاری علیہ الرحمہ نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ کا ایک ارشاد نقل فرمایا ہے: **لتتبعن سنن من كان قبلكم شبراً شبراً وذراعاً بذراعٍ حتىٰ لو دخلوا جحر ضبٍ تبعتموهم**، (بخاری شریف: **كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة**)

تم لوگ اگلے لوگوں کی پیروی بالشت بالشت اور گز گز بھر کرو گے، حتیٰ کہ اگر وہ کسی گوہ کی بل میں گھسے ہوں گے تو تم بھی ایسا کرو گے۔

اس پر صحابہ نے عرض کیا کہ کیا یہود و نصاریٰ کی پیروی؟ آپ نے فرمایا کہ اور کس کی؟

یہ روایت مسلم شریف میں بھی ہے، اور اسے امام حاکم نے بھی نقل کیا ہے، حاکم کی روایت میں اتنا اضافہ ہے کہ **حتىٰ لو أن أحدهم جامع إمرأته بالطريق لفعلتموه**، اور یہاں تک کہ اگر ان میں سے کسی نے برسرِ راہ اپنی بیوی سے جماع کیا ہوگا، تو تم بھی ایسا کرو گے۔ حاکم کی روایت میں **لتتبعن** کے بجائے **لتركبن** ہے، یعنی تم اگلے لوگوں کی راہ پر ضرور سوار ہو گے۔

اس کی تشریح میں علامہ عبدالرؤوف المناوی فیض القدیر ج: ۵، ص: ۲۶۱ میں لکھتے ہیں کہ: بالشت کے برابر اور ہاتھ کے برابر پیروی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس امت کے

بہت سے افراد اگلے لوگوں یعنی یہود ونصاریٰ اور آتش پرستوں کی تقلید وپیروی کے بہت زیادہ حریص ہوں گے، اور یہ تقلید واتباع گناہوں اور شریعت کی خلاف ورزی کے باب میں ہوگی، کفر کے متعلق نہیں۔

حدیث کے یہ الفاظ بظاہر خبر ہیں، لیکن مقصود اس سے اتباع اور تقلید سے ممانعت ہے، درحقیقت اس امت کو حکم دیا گیا ہے وہ یہود ونصاریٰ کی تقلید نہ کریں، نہ دین اسلام کے علاوہ کسی اور طریقے کی طرف التفات کریں، کیونکہ نورِ اسلام کے سامنے تمام انوار ماند پڑ چکے ہیں، اور شریعت اسلامی نے دوسری شریعتوں کو منسوخ کر دیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی یہ پیشین گوئی درحقیقت آپ کا معجزہ ہے، چنانچہ یہی ہوا کہ آپ کی امت میں بہتیرے لوگوں نے مجوسیوں کا نقش قدم اختیار کیا، ان کی جیسی شکلیں بنائیں، ان کے لباس اختیار کئے، ان کی جیسی سواریاں پسند کیں، جنگوں وغیرہ میں ان کے مخصوص طریقے اختیار کئے، اور بہتوں نے یہود ونصاریٰ کی تقلید میں مسجدوں کو خوب مزین کیا، قبروں کی تعظیم میں اتنا غلو کیا کہ عوام تو قبروں کے پجاری ہی بن گئے، سنیچر کے دن مریض کی عیادت نہیں کرتے، نوچندی جمعرات کو خوشیاں مناتے ہیں، وغیرہ۔

حافظ ابن حجر علیہ الرحمہ فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ: ابن بطال نے فرمایا کہ آپ کی امت نئی نئی باتوں اور بدعتوں اور اپنی ذاتی خواہشات ونظریات پر چل پڑے گی، جیسا کہ اگلی امتیں بھی اس حادثہ سے دوچار ہوئی تھیں، اور بہت سی احادیث میں متنبہ کیا گیا ہے کہ دورِ آخر شر ہوگا، اور قیامت اشرار ہی پر قائم ہوگی، اور دین تو بس خاص خاص لوگوں میں باقی رہ جائے گا'' حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ جن باتوں پر رسول اللہ ﷺ نے تنبیہ فرمائی تھی وہ اکثر ظاہر ہو چکی ہیں، اور بقیہ بھی ظاہر ہو کر رہیں گی۔

یہ بات حافظ ابن حجر آج سے ساڑھے پانچ سو برس پہلے کہہ رہے ہیں، آج ہوتے اور ہم مسلمانوں کے احوال دیکھتے تو معلوم نہیں کیا کہتے، اب تو دوڑ لگی ہوئی ہے کہ کون کتنا بڑھ کر یہود ونصاریٰ کا طریقہ اختیار کرتا ہے اور حال یہ ہے کہ علم بھی وہی ہے جو یہود ونصاریٰ

کے دربار سے آئے، اسی کو پڑھ کر آدمی تعلیم یافتہ ہوتا ہے، دانشور ہوتا ہے، روشن خیال ہوتا ہے، محض قرآن وحدیث پڑھا تو کچھ نہیں جب تک وہ علم نہ پڑھے جس پر یہود ونصاریٰ یعنی انگریزوں کی مہر توثیق لگی ہو، اگر ہمارے مدارس میں صرف قرآن وحدیث اور فقہ کی تعلیم ہوتی ہے، تو یہ ان مدارس کا نقص ہے، ان میں انگریزوں کی ہنرمندیاں ضرور شامل نصاب ہونی چاہئیں، ورنہ نصاب بیکار ہے، یہ مدارس آثارِ قدیمہ ہیں، ایسی مرعوبیت ومغلوبیت کہ روشنی صرف وہی ہے جو یورپ سے آئے، تنہا اسلام کی روشنی گھپ اندھیاری ہے، یہ بات عوام کہیں تو کہیں، انھیں تو کچھ معلوم نہیں، یہ بات اب وہ لوگ کہتے ہیں، جو اپنے کو علماء کی صف میں شامل کرتے ہیں، اپنے کو دین کا ترجمان سمجھتے ہیں، خود کو اسلام کا مفکر قرار دیتے ہیں، وہ بھی یہود ونصاریٰ ہی کے دامن میں پناہ لینا چاہتے ہیں۔ ہمارے بزرگوں نے دنیا کو دین کے لئے برتا تھا، جدید نسل کے بزرگ دین کو دنیا کے لئے برتنا چاہتے ہیں، اور یہ یہودیوں اور عیسائیوں کا طریقہ ہے، یہ لوگ دین کا نام ضرور لیتے ہیں، بلکہ دنیا پر دین کا رنگ وروغن چڑھا کر دنیا کو فریب دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ پرانے طرز کے مدارس کی وجہ سے اب بھی جو بہت سے پختہ دینداروں پر دین کا اثر راسخ ہے، اسے چھڑا کر دنیا کا رنگ چڑھا دیا جائے۔ آج نصاب بدلنے کی اسکیمیں ہیں، اس میں کامیابی مل جائے گی تو تہذیب وتمدن میں خود بخود تبدیلی آجائے گی، آج مولویوں میں جو مسلمانوں کی شکل وصورت پائی جارہی ہے، کل کو صورت نہیں پہچانی جائے گی، نہ داڑھی سے، نہ لباس سے، نہ وضع قطع سے، یہ چیزیں رخصت ہوجائیں گی، تو پھر نمازوں کو کون پوچھے گا، قرآن سے کیا مطلب ہوگا، حدیث کے مطالعہ کی دردسری کون مول لے گا۔

اور یہ آثار ان حلقوں میں نمایاں ہوچکے ہیں اور ہوتے جارہے ہیں جن حلقوں نے دینی تعلیم کے دائرے میں دنیاوی تعلیم کو داخل کررکھا ہے، آنکھیں کھلی ہوں تو سب کچھ نظر آرہا ہے۔

اب محض دین کی تعلیم جو خالص دینی علوم پر مشتمل ہو، اجنبی معلوم ہوتی ہے، کچھ

لوگ اس اجنبیت کو دور کرنے کے لئے دنیاوی علوم کو دنیاوی علوم ہی کی حیثیت میں لانا چاہتے ہیں، تاکہ دین کے حاملین دنیا میں اجنبی نہ رہیں، اور بعض لوگ تو اس سے بڑھ کر یہ ستم کرتے ہیں کہ تحریف کرکے دنیاوی علوم کو دینی علم قرار دیتے ہیں، اور دینی علم کی حیثیت سے دنیاوی علوم کو نصابِ تعلیم میں داخل کرکے دین ہی کی اجنبیت کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔

حالانکہ حدیث کے مطابق دورِ آخر میں دین اور دینداروں کو اجنبی ہونا اور رہنا ہی مبارک ہے، چنانچہ مسلم شریف کتاب الایمان میں **باب بیان أن الاسلام بدأ غریباً وسیعود غریباً** کے تحت سیّدنا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد درج کیا گیا ہے کہ **بدأ الاسلام غریباً وسیعود غریباً کما بدأ غریباً فطوبیٰ للغرباء۔** اسلام اپنی ابتداء میں اجنبی تھا، اور جیسا ابتدا میں تھا بعد میں بھی اجنبی بن جائے گا، پس ان اجنبیوں کے لئے بشارت ہے۔

امام نووی شارح مسلم علیہ الرحمہ نے قاضی عیاض کے حوالے سے لکھا ہے کہ اسلام کا جب آغاز ہوا تھا، تو محض چند افراد اس کے ماننے والے تھے (جو زمانے کے رنگ ڈھنگ سے الگ تھے) پھر اس کے عروج وترقی کا دور آیا، اور عام طور پر لوگ اسلام کے حلقے میں داخل ہوگئے اور دین اسلام کا غلبہ ہوگیا (اب اس کی اجنبیت جاتی رہی) پھر آہستہ آہستہ اس میں گھٹاؤ آتا رہے گا، یہاں تک کہ دین اپنی پوری شکل وصورت میں کچھ ہی لوگوں میں رہ جائے گا، جیسا کہ پہلے تھا۔ یہ ''**الغرباء**'' کون ہیں؟ خود رسول کریم ﷺ کی زبانِ مبارک سے اس کا مصداق سنئے! یہ روایت مسند احمد، ترمذی اور ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ یہ غرباء کون ہیں؟ آپ نے فرمایا **النزاع من القبائل**، یعنی قبیلے کے وہ افراد جو قبیلے اور خاندان سے الگ ہوکر دور ہوگئے ہوں یعنی انھیں اپنے خاندان اور قبیلے کے طور طریقے سے مناسبت نہیں رہی، اس لئے ان سے الگ تھلگ اجنبی بن جاتے ہیں، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اجنبی بن کر خاندان سے دور ہوجاتے ہوں۔

آج کے ماحول میں دین اور دین کی تعلیم پر پختگی کے ساتھ عمل کرنے والے، دینی مدارس اور ان کے خالص دینی ماحول، زمانہ کے احوال اور رنگ وروپ سے الگ اجنبی بن چکے ہیں، ان کے لئے یہ اجنبیت ہی بجا ہے، اسی پر وہ بشارت کے مستحق ہو رہے ہیں، یہ اجنبیت ختم کر دی جائے اور دنیاداروں کے حلقے میں انھیں کے دستور اور طریقے کے مطابق ضم ہو جائیں تو دین کہاں باقی رہا، اس لئے جن کو مدارس اور ان کی خالص دینی تعلیم، ان کے اساتذۂ وطلبہ کی ہیئت اجنبی معلوم ہوتی ہے، تو انھیں اجنبی ہی رہنے دیں، وہ اللہ اور رسول کو محبوب ہیں، چاہے دنیا والوں کو ناپسند ہوں، ان کو دنیا والوں سے کیا لینا دینا ہے۔

☆☆☆☆☆

غیروں کی نقالی

یہود ونصاریٰ کی نقالی اور ان سے مرعوبیت کا یہ رنگ تو علم کے باب میں ہے، اس میں مزید اور بھی تفصیلات ہیں، لیکن اس کے لئے ہمیں عالم اسلام سعودی عرب، مصر، شام اور خلیجی ممالک اور ان کے تعلق سے امریکہ، یورپ اور اسرائیل کے تعلیمی احوال ونظریات کا جائزہ لینا ہوگا۔ یہ ایک دردناک جائزہ ہوگا، اور بہت تفصیل چاہتا ہے جس کی گنجائش اس مختصر اداریئے میں نہیں ہے، اس لئے ہم نے صرف ہندوستان کے مدارس اسلامی تک محدود رہ کر گفتگو کی ہے، علم اور تعلیم میں تو آپ یہود ونصاریٰ کی نقالی ملاحظہ فرما چکے۔ اب عمل اور کردار کی طرف آیئے، تو یہاں معاملہ اور بھی بڑھا ہوا ہے، ہمارے معاشرے کا بڑا حصہ عملاً یہود ونصاریٰ اور مجوس کے رنگ میں رنگین ہو چکا ہے، نہ اسلامی شکل وصورت، نہ اسلامی وضع قطع، نہ اسلامی کردار وعمل، ہر عمل کی سند یورپ میں، امریکہ میں، چہروں پر داڑھی نہیں، کیونکہ نصاریٰ داڑھی منڈاتے ہیں، اسلامی تہذیب میں لباس کی جو وضع ہے کہ چھپائے جانے والا حصہ خوب چھپا رہے اس کی وضع ظاہر نہ ہو، وہ ختم، ایسا چست اور اتنا چھوٹا لباس کہ ہر عضو کی ساخت نمایاں رہے، کیونکہ انگریزوں کی تہذیب میں اسی کا چلن ہے، مکانوں کی تعمیر کا وہی

انداز جو یہود و نصاریٰ کے یہاں رائج ہے، جس میں کسی کا کسی سے پردہ نہ ہو، خاندانی نظام اسی طرز کا جو یورپ کے عیسائیوں اور امریکہ کے یہودیوں سے درآمد کیا گیا ہے، ذرائع آمدنی اور کسب معاش کے وہی طریقے جن پر سود خوار قومیں کاربند ہیں، غرض اسلام کا نام لیا تو جاتا ہے، مگر اس لئے کہ اسے یہود و نصاریٰ کی تہذیب کے حق میں گواہ بنا کر لایا جائے۔ جن لوگوں نے انگریزی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی ہے، اور وہاں کے تربیت یافتہ ہیں ان کی غالب اکثریت تو اسی مذکورہ بالا رنگ میں ہے، بعض لوگ بڑھاپے میں کسی بزرگ اور اللہ والے کی صحبت میں کچھ اندر اپنے دینی رنگ کی تبدیلی کر بھی لیتے ہیں، تو زیادہ تر اپنی ذات تک محدود رہ کر! یہ دینی رنگ ان کی اولاد اور خاندان تک نہیں آنے پاتا۔

خیر یہ حضرات تو انگریزی تہذیب کے گھروندوں میں پلے بڑھے ہیں، ان سے اس کے علاوہ کیا امید رکھی جاسکتی ہے، شکایت تو ان حضرات سے ہے جنھوں نے خالص دینی اداروں میں تعلیم پائی ہے، تربیت حاصل کی ہے، جنھیں اس دورِ آخر میں اجنبی بن کر رہنا چاہئے تھا، یہ حضرات بھی انگریزی تہذیب کی نقالی میں انھیں کے طریقے اپنائے جارہے ہیں اور خوش ہیں کہ ہم کام کررہے ہیں، کارنامے انجام دے رہے ہیں، حالانکہ معاملہ برعکس ہے، کیونکہ یہود و نصاریٰ کا طریقہ اختیار کرنا خواہ وبظاہر کتنا ہی خوبصورت نظر آئے محمود نہیں ہے، ہمارے یہاں وہی چیزیں لائق تقلید ہیں جن سے ہم پہلے سے دین کے اندر واقف ہیں، چاہے وہ دوسروں کے نزدیک اجنبی ہوں، اور جو طریقے دین کے اندر نئے اختیار کئے جاتے ہیں وہ یہود و نصاریٰ کے یہاں چاہے جتنے معروف ہوں، ہم انھیں منکر سمجھیں گے۔

کوئی نیا طریقہ ہو، خواہ دین میں یا دنیا میں، اسے شریعت کی معروف تعلیمات پر پرکھا جائے گا، اگر شرعی اصولوں سے کوئی دنیاوی معاملہ ٹکرائے گا، تو اسے یا تو ترک کرنا ضروری ہوگا، یا اس کی اصلاح کی جائے گی، اور اگر دینی معاملہ ہوگا تو صرف اس کے مصالح اور فوائد پر نظر نہیں کی جائے گی، بلکہ دیکھا جائے گا کہ سلف میں یہ طریقہ تھا یا نہیں؟ اسلامی مزاج سے اسے مناسبت ہے یا نہیں؟ پھر یہ کہ وہ نیا طریقہ کہاں سے درآمد کیا گیا ہے؟ اگر

سلف میں باوجود ضرورت اور امکان کے اسے اختیار نہیں کیا گیا، یا اسلامی مزاج سے اسے مناسبت نہیں، یا وہ نیا طریقہ یہود و نصاریٰ اور غیر مسلموں سے درآمد کیا گیا ہے، تو وہ ہرگز قابل قبول نہ ہوگا۔

حضرت عبادہ بن صامت ﷛، امیر المومنین حضرت عثمان بن عفان ﷛ کو ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ کا ارشاد سنا رہے تھے کہ میں نے اللہ کے رسول ابوالقاسم حضرت محمد ﷺ سے سنا ہے، آپ فرما رہے تھے کہ میرے بعد کچھ لوگ تمہارے معاملات کے ذمہ دار ایسے ہوں گے، جو تم کو وہ چیزیں بتائیں گے جو تم نہیں جانتے، اور جن باتوں کو تم جانتے ہو، انھیں وہ نہ جانیں گے اور انکار کریں گے، تو جو کوئی اللہ کی نافرمانی کرے، اس کی اطاعت نہیں ہے، اس لئے اپنے رب کے کے ساتھ حیلہ سازی مت کرو۔ (مسند احمد، ج: ۵، ص: ۳۲۵)

مطلب یہ ہے کہ جو چیزیں منکر ہیں، انھیں اگر کوئی صاحب اختیار شخص بھی مسلط کرنا چاہے تو کوئی حیلہ بہانہ کر کے اسے قبول کر لینا درست نہیں ہے، ایسے منکر اور غلط امور میں کسی بھی مخلوق کی پیروی نہیں کی جائے گی۔

ایک طرف ہم اپنے ہادی و رہبر، اللہ کے آخری پیغمبر ﷺ کے یہ ارشادات پڑھتے ہیں، اور اس کی روشنی میں اسلاف کرام کے تعامل کو دیکھتے ہیں کہ وہ کسی بھی نئی چیز اور نئے طریقۂ کار کا احتساب کر کے شریعت کے دائرے میں رد و قبول کرتے تھے، پھر اپنے زمانے میں عوام کو نہیں خواص کو، عامیوں کو نہیں عالموں کو، کالجوں اور یونیورسٹیوں کو نہیں دینی مدارس کو دیکھتے ہیں کہ اپنے حلقوں میں یعنی دینی حلقوں میں وہ طریقۂ کار بے تکلف اختیار کرتے ہیں جو یورپ سے یہود و نصاریٰ کی تقلید و پیروی میں درآمد کیا ہوا ہے، ہماری معروف چیز درس و تدریس کے حلقے ہیں اساتذہ و طلبہ کی باوقار مجلسیں ہیں، وعظ و ارشاد کے مجامع ہیں، بزرگوں کی صحبتیں ہیں، مشائخ کی خانقاہیں ہیں، ذکر کے حلقے ہیں، علمی مجالس ہیں، افادہ اور استفادہ کے لئے درسگاہیں ہیں۔ طالب علم اپنے استاذ کی خدمت میں اور مرید اپنے شیخ کی صحبت میں عرصۂ دراز تک کسب فیض کرتا ہے، علمی اور دینی مزاج بناتا ہے، پھر اس سے

استفادے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

اب لوگوں نے رنگ بدلے۔ پرانی باتیں قدامت کے الزام میں قابل ترک ہوگئیں، اب جو تحفے یورپ سے آئے، ان میں کانفرنسیں، سیمینار، سمپوزیم، توسیعی خطبات، لکچرز، استاذ زائر (وزیٹنگ پروفیسر) اور اللہ جانے کیا کیا طریقے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے ہمارے بعض بزرگوں نے فقہی موضوعات پر سیمینار شروع کئے، تو یہ لفظ نامانوس ہونے کے باوجود قدرے مانوس ہوا، لیکن بار بار کے سمیناروں سے تجربہ ہوا کہ یہ فقہی اور دینی مزاج کے خلاف ہے، کسی فقہی موضوع پر سوالات وضع کئے جاتے ہیں، اور کچے پکے لوگوں سے ان کے جواب طلب کئے جاتے ہیں، لوگ اپنے اپنے خیالات کا مجموعہ تیار کرکے جواب کے نام پر بھیج دیتے ہیں، پھر وہ لوگ سیمینار کی تہذیب ولوازم کے ساتھ اکٹھا ہوتے ہیں، بیٹھتے ہیں، جہاں اور جس طریقے سے بیٹھتے ہیں، وہ مجلس علماء سے زیادہ اسمبلی یا پارلیمنٹ کا ہاؤس معلوم ہوتا ہے، کچھ، مباحثے ہوتے ہیں، کچھ مناقشے ہوتے ہیں، پھر کمیٹیاں بنتی ہیں، پھر تجویزیں لکھی جاتی ہیں، کچھ پر اتفاق رائے ہوتا ہے، زیادہ تر اختلافی تجویزیں ہوتی ہیں، ان کا اعلان کردیا جاتا ہے۔ علمی مسائل ومعاملات جو علماء کے درمیان رہ کر متوازن ہوتے ہیں، عوام انھیں اپنے نزدیک قابل اعتماد علماء سے فتویٰ لے کر حاصل کرتے ہیں، اوران پر عمل درآمد کرتے ہیں، اب یہ مختلف المزاج علماء کے مباحث وخیالات، اہل علم کے حلقہ سے عوام الناس اور اخبارات کے عوامی اور طوفانی ماحول میں آجاتے ہیں، اور رنگ کچھ کا کچھ ہوجاتا ہے، خاص اہل علم کے مسائل ومباحث عوام کے درمیان اور اخبارات کے صفحات پر آکر کچھ سے کچھ ہوجاتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ سیمیناروں کو خواہ جتنے خوبصورت انداز میں پیش کیا جائے، لیکن ہے یہ لتتبعن سنن من کان قبلکم کا مظہر!

اس طریقے کے جلسے اور مجمع اب سے پہلے مدارس دینیہ اور علماء کے حلقوں میں متعارف نہ تھے، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں رہے ہوں تو رہے ہوں، مگر اب وباء کی طرح سیمیناروں کا سیلاب علماء کے دائروں اور مدارس کے حصار میں گھسا جارہا ہے، اور اس پر

حال یہ ہے ؎ ہر کہ آمد عمارت نو ساخت

سیمینار خاص خاص موضوعات پر ہوتے ہیں، یہ عوامی چیز نہیں ہے، لیکن اربابِ مدارس نے اسے ایک عوامی مجمع بنادیا ہے، بڑے بڑے اشتہارات چھپنے لگے ہیں، ممبرانِ استقبالیہ، ارکانِ استقبالیہ اور نہ جانے کن کن عنوانات سے درجنوں نام چھاپے جاتے ہیں، سڑکوں پر بڑے بڑے مصنوعی گیٹ بنائے گئے، لمبے لمبے اخراجات کی تفصیل شائع کی گئی، پنڈال کو سجانے کا مسرفانہ اہتمام کیا گیا۔ کیا شریعت میں اس اسرافِ بے جا کی گنجائش ہے؟ اسلام میں جو سادگی ہے، وہ کہاں گئی؟ پھر مزید یہ کہ ان پروگراموں کی بسا اوقات تصویر سازی ہوتی ہے جو حکم شریعت کے قطعاً منافی ہے۔

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے

یہود و نصاریٰ کی نقالی نے عام مسلمانوں کو تو جہاں پہونچایا تھا، پہونچایا، علماء اس پر روک لگاتے، اس کی قباحت و شناعت بیان کرتے، اللہ و رسول کی تعلیمات کو عملاً اور علماً پھیلاتے، مگر یہ کیا ہوا کہ روک لگا سکنے والے خود نقالی کی رَو میں بہنے لگ گئے، سیمیناروں کی کثرت کو دیکھ کر یہ احساس ہونے لگا کہ شاید مدرسوں کا قبلہ ہی بدل جائے گا، دیکھ دیکھ کر ہر ایک کو شوق چرّانے لگتا ہے۔

اور یہ تو مشاہدہ ہے کہ ان تقریبات کی تیاریوں میں تعلیم کا سخت نقصان ہوتا ہے، لیکن جیسے یہ طے ہو چکا ہے کہ تعلیم کا خواہ کتنا ہی کباڑا ہو، یہ نقالیاں ضرور جاری رہیں گی۔ مختلف عنوانوں سے دینی مدارس کی تعلیم، ان کی افادیت مجروح کرنے کا جیسے کوئی منظّم منصوبہ چل رہا ہو، مختلف قسم کے مسابقات، الگ الگ ناموں سے جلسے اور اجتماعات، مدارس سے فارغ ہونے والے طلبہ کو متعدد حسین و جمیل ناموں اور پروگراموں کے ذریعے ایسی ترغیبات کہ علمی استعداد کو تو کوئی خاص نفع نہ ہو، لیکن زندگی کا معیار بلند کرنے کی ہوس بڑھ جائے، پھر وہ تنگی ترشی برداشت کر کے دینی خدمت انجام دینے کے اہل نہ رہ جائیں۔

مدارس کے کرنے کا کام یہ ہے کہ جو طلبہ انھیں اللہ کی طرف سے مل رہے ہیں،

ان کی علمی استعداد پختہ کریں، اساتذہ ان پر محنت کریں، ان کی صحیح تربیت کریں، زہد وقناعت، توکل وعزیمت، حق تعالیٰ کی رضاجوئی کا جذبہ پیدا کریں، دنیوی مال ومتاع کو موضوعِ زندگی بنانے سے انھیں دور رکھیں۔ شہرت وریاکاری اور نام ونمود کی ہوس سے ان کے قلوب کو پاک رکھنے کی کوشش کریں۔ اس کے لئے بڑی یکسوئی کی ضرورت ہے، اور اگر یہ طلبہ اور یہ اساتذہ انھیں وقتی اور ہنگامی تقریبات میں مبتلا رہیں گے، آج فلاں مدرسے میں سیمینار ہے، کل فلاں مدرسے میں جلسہ ہے، پرسوں فلاں مدرسے میں کانفرنس ہے، اور ہر جگہ آنے کی، کھانے کی دعوت ہے، بہترین انتظامات ہیں، تو ان مدرسوں اور ان طلبہ واساتذہ کا اللہ ہی حافظ ہے۔

یہود ونصاریٰ کی تقلید کس حد تک مذموم ہے؟ اور اس کی قباحت کس درجہ ہے؟ اس کا اندازہ ایک حدیث سے ہوتا ہے، جس کو حافظ ابن حجر نے فتح الباری ''کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ'' میں حدیث **لتتبعن سنن من كان قبلكم**، کی شرح کے ذیل میں نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کب ترک کیا جاسکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: **إذا ظهر فيكم ما ظهر في بني اسرائيل إذا ظهر الادهان في خياركم والفحش في شراركم والملك في صغاركم والفقه في رذالكم**، جب تم میں وہ حالات ظاہر ہوجائیں، جو بنی اسرائیل میں ظاہر ہوئے تھے، جب اچھے لوگوں میں مداہنت ظاہر ہو، اور برے لوگوں میں بے حیائی، اور چھوٹوں میں حکومت اور کم ظرفوں میں فقہ ظاہر ہو۔ (تب امر بالمعروف چھوڑا جاسکتا ہے، اور نہی عن المنکر بھی)

اس حدیث میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل میں جن خاص برائیوں کا ظہور عام ہوگیا تھا، وہ یہ ہیں، کہ اچھے اور نیک لوگ مداہنت برتنے لگیں۔ یعنی بری چیزوں کو دیکھیں تو نہ صرف چشم پوشی کریں، بلکہ باتوں کی صنعت اور بناوٹ سے اور برتاؤ کے طرز سے گویا ان کی حوصلہ افزائی کرنے کا رُجحان ہوجائے، اور جو برے ہیں وہ عام برائیوں سے

آگے بڑھ کر بے حیائی اور فحاشی میں جا پڑیں، اور حکومت کی باگ ڈور ایسے معمولی اور ناکارہ لوگوں کے ہاتھ میں آ جائے، جو منصب حکومت کی عصمت و آبرو کو مجروح کر دیں، اور دینی علوم ایسے کم ظرفوں کے حصے میں آ جائے، جو نہ دین کی قدر جانیں اور نہ علم کی، ان کے لئے دین اور علم ایک دنیوی کاروبار بن کر رہ جائے۔ جب یہ صورت حال ہو، تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ترک کرنے میں آدمی معذور ہے۔

صاحب فتح الباری نے ایک اور حدیث نقل کی ہے، اور یہ روایت امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ہے، کہ دین کی خرابی اس وقت ہوگی جب علم چھوٹوں کی جانب سے آئے، تو بڑے لوگ اسے تسلیم کرنے سے انکار کریں گے، اور لوگوں کی بھلائی اس وقت ہے جب علم بڑوں کی طرف سے آئے، اور چھوٹے اس کی پیروی کریں۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ مشہور امام لغت ابوعبید نے فرمایا کہ چھوٹے ہونے سے مراد مرتبے کا چھوٹا ہونا ہے، عمر کا نہیں، مطلب ہے کہ علم اور دین کی عظمت و بلندی سے جن لوگوں کی طبیعتوں کی پستی میل نہیں کھاتی، اور وہ خود علم کی وجہ سے بلند ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے، علم ہی کو نیچے اتار دیتے ہیں۔ یہ چھوٹی طبیعت اور مرتبہ کے لوگ جب علم کی باتیں کریں گے، اور اسے نیچے اتار کر کریں گے، تو بڑے لوگ اسے قبول نہ کریں گے، اور اس میں کشمکش کی صورت پیدا ہوگی۔

آج حقیقت یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ سے درآمد کئے ہوئے سیمیناروں سے بنی اسرائیل کی یہ خرابی خوب پھل پھول رہی ہے، اچھے لوگ مداہنت کا رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں، ان سیمیناروں میں جو موضوعات چھیڑے جاتے ہیں، اور جس جس طرح اظہارِ خیال ہوتا ہے وہ تو بجائے خود ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ اس کے علاوہ بے تحاشا اسراف، تصویر سازی، ویڈیو گرافی، نام و نمود کی شورشیں اور اللہ جانے کتنے کتنے منکرات ظاہر ہوتے رہتے ہیں، لیکن یہ اچھے حضرات منکرات کی ان تجارت گاہوں سے نہ احتراز کرتے، اور نہ وہاں رہ کر مؤثر طریقے پر ٹوکتے۔ اور بروں کی بے حیائی کا اس دور میں جو عالم ہو گیا ہے، وہ تو ایک

طویل داستانِ درد ہے کہ قلم کا جگر اس کے تذکرے سے شق ہوتا ہے۔ انتظام کی اور حکومت کی باگ ڈور جن ہاتھوں میں ہے ان کی کمینگی اور پستی کا یہ عالم ہے کہ سوائے دولت بٹورنے اور اپنے خویش و اقارب اور اپنی قوم کی جائز و ناجائز ترقی و عروج کے ان کا اور کوئی مقصد ہی نہیں معلوم ہوتا۔ اور علم دین کی نسبت سے جو لوگ منسوب ہیں، وہ بھی دنیا و دولت اور شہرت و نمود، نیز خود غرضی و ریاکاری کی دوڑ میں کسی دنیادار سے پیچھے نہیں رہ جانا چاہتے **الا ماشاء اللہ**۔ پس اللہ ہی سے مدد کی طلبگاری ہے۔

یہ باتیں تلخ ضرور معلوم ہوں گی، مگر ان تقریبات کا ضرر کھلی آنکھوں دکھائی دے رہا ہے، اس لئے عرض کر دیا۔

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

(مئی ۲۰۰۷ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تصویر سازی! ایک عام گناہ

پچھلے شمارے میں ہم نے اپنا اور اپنے معاشرے کا ایک احتساب تحریر کیا تھا کہ یہود ونصاریٰ کی تقلید میں ہمارے معاشرے میں ایسی نئی نئی باتیں گھس آئی ہیں، جن سے ہمارے اسلاف واقف نہ تھے، اسلاف تو کیا واقف ہوتے ہم اخلاف بھی ان سے ناآشنا تھے، اس طرح کی نئی باتیں جب ابتداءً داخل ہوتی ہیں تو لوگ چونکتے ہیں، لیکن جب وہ چیزیں بار بار نگاہوں کے سامنے آتی ہیں تو اذہان وقلوب ان کے دیکھتے رہنے کے عادی ہوجاتے ہیں اور وہ چیزیں مانوس ومالوف بن جاتی ہیں۔

پہلے وعظ کی مجلسیں ہوتی تھیں، ایک سادہ سی مجلس ہوتی، لوگ ادب سے بیٹھ جاتے، کوئی عالم سیدھے سادے انداز میں دین اور اللہ ورسول کی باتیں سنا دیتا، لیکن اب یہ مجلسیں، جلسوں، کانفرنسوں اور سیمیناروں کی شکل میں تبدیل ہوگئیں۔ شکل کی تبدیلی نے ان کے لوازم اور تقاضوں کو بھی بدل کر رکھ دیا ہے۔

اجتماعات کی دنیا میں آج کل ایک نئے لازمے کا اضافہ ہوا ہے، اس سے اب مشکل سے کوئی مجلس خالی ہوتی ہے، وہ ہے ''تصویر سازی'' چھوٹا بڑا کوئی اجتماع ہو، کیمرہ لے کر کچھ لوگ پہونچ جاتے ہیں، یا بلائے جاتے ہیں، تاکہ مقرر کی، صاحب صدر کی، اسٹیج والوں کی اور جلسہ میں شریک حضرات کی تصویریں اتاری جاسکیں۔ نکاح کی مجلس ہو، دعوت میں لوگ اکٹھا ہوں، یہ کام ضرور ہوگا۔ تصویر سازی گناہ ہے، حرام ہے، لیکن یہ گناہ اتنا پھیل چکا ہے اور یہ حرام اتنا عام ہوچکا ہے اور اس کی اتنی شکلیں وجود میں آچکی ہیں کہ اس کے حرام وناجائز ہونے کا تصور ذہنوں سے محو ہونے لگا ہے، اس طرح کے عام مجامع میں جہاں صرف

ناخواندہ اور دین سے غافل افراد نہیں ہوتے، علماء اور دیندار حضرات بھی ہوتے ہیں، برسر عام ہانکے پکارے یہ گناہ ہوتا ہے، اور لوگوں کی پیشانی تک شکن آلود نہیں ہوتی۔

حالانکہ ان تصویروں کے بنانے کی نہ کوئی ضرورت ہوتی، نہ کوئی مجبوری ہوتی، میں دنیاوالوں کی دنیادارانہ باتوں سے غرض نہیں رکھتا، دینداروں کا مجمع ہے، دینی وعظ ہورہا ہے، مدرسوں کے جلسے ہورہے ہیں، کسی دینی موضوع پر کانفرنس ہورہی ہے، یا سیمینار ہورہا ہے، علماء ومتدین حضرات تشریف فرما ہیں، اللہ ورسول کے ارشادات نقل کئے جارہے ہیں، تاکید کی جارہی ہے کہ دنیا وآخرت کی فلاح اللہ اور رسول کی اطاعت میں ہے، گناہوں سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں، گناہوں سے مصائب کی آگ برستی ہے، یہ سب مضامین بیان ہوتے ہیں، عین اسی بیان کے وقت کیمرے کی آنکھ چمکتی ہے، اور تصویریں بنائی جانے لگتی ہیں، گناہ کی مذمت اور عین اسی وقت دھڑلے سے گناہ کا ارتکاب! کیا غیرتِ الٰہی کو حرکت نہ ہوگی؟

اچھا یہ تصویریں لی گئیں تو اس کی کیا ضرورت تھی؟ کیا ان تصویروں سے دین کا کوئی فائدہ ہوا، اگر اخبار میں تصویر چھاپ دی گئی، یا ٹی۔وی کے اسکرین پر یہ تصویریں آگئیں اور بہت سے لوگوں نے دیکھ لیا، تو کیا ایمان تازہ ہوگیا؟ کیا کوئی ثواب مل گیا؟ کیا علم وعمل کا داعیہ پیدا ہوگیا؟ کچھ بھی نہیں، تو کیا دنیا کا کوئی فائدہ ہوگیا، ایک شہرت کی صورت بن گئی، تو اس سے دنیا کا کیا نفع حاصل ہوگیا؟ اگر کہئے کہ شہرت ہی دنیا کا نفع ہے، تو یہ سخت غلطی ہے، بہرحال یہ ایک ایسا گناہ ہے جسے دینی و دُنیوی کسی اعتبار سے فائدے کے خانے میں نہیں رکھا جاسکتا، ہاں لذت نفس ہے، ذہن ودماغ کی عیاشی ہے۔

فائدے کے اعتبار سے تو اس کا یہ حال ہے، اب ذرا اللہ ورسول کے نزدیک اور شریعت کی نگاہ میں بھی اس کی حیثیت دیکھ لینی چاہئے۔

آپ قرآن کریم کے بعد سب سے صحیح کتاب بخاری شریف کھول لیجئے، **کتاب اللباس** نکالئے، اس میں ایک باب ہے، **عذاب المصوّرین یوم القیامة**، اس میں

مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے واسطے سے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ: **إن أشد الناس عذاباً یوم القیامة المصورون۔**

یہ حدیث صحیح ہے، اس مضمون کی متعدد حدیثیں مختلف صحابہ سے منقول ہیں، اس حد تک کہ تصویر سازی کی حرمت کا ثبوت بطریق تواتر کے ثابت ہوتا ہے، جس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔

اسی باب میں دوسری روایت حضرت عبداللہ بن عمر سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ ارشادفرماتے ہیں: **إن الذین یصنعون هذه الصور یعذبون یوم القیامة یقال لهم أحیوا ما خلقتم**، جولوگ یہ تصویریں بناتے ہیں انھیں قیامت کے دن مبتلائے عذاب کیا جائے گا، ان سے کہا جائے گا کہ جس چیز کی تم نے تخلیق کی ہے، اس میں زندگی پیدا کرو۔

گویا جاندار کی تصویر بنانے والا اللہ تعالیٰ کی صفت خلق میں شرکت کی سعی کررہا ہے، یہ اس کی بڑی گستاخی ہے، اس کی سزا ملنی چاہئے۔

اور ملاحظہ فرمائیے بخاری شریف ہی کی روایت ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے شاگرد حضرت ابوزرعہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مدینہ میں ایک گھر میں داخل ہوا، انھوں نے مکان کی بلندی پر دیکھا کہ ایک مصور تصویر بنا رہا ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے سنا رسول اللہ ﷺ فرمارہے تھے: **ومن أظلم ممن ذهب یخلق کخلقي فلیخلقوا حبة ولیخلقوا ذرة**، اس سے بڑا ظالم کون ہوگا، جو اس طرح پیدا کرنا چاہتا ہے جیسے میں پیدا کرتا ہوں، اچھا تو ایک دانہ ہی پیدا کردے، اور ایک ذرہ ہی پیدا کردے۔

آدمی صرف صورت بنا سکتا ہے، جس انداز میں اللہ تعالیٰ پیدا کرتے ہیں وہ کسی چیز کو پیدا نہیں کرسکتا، لیکن صرف اس صورت گری کو بھی اللہ تعالیٰ نے گستاخی قرار دیا۔ آدمی بندہ ہے، بندہ کو بندگی اور غلامی کی حد میں ہی رہنا چاہئے، خالقیت و مالکیت کی حدود میں گھسنا

داخل گستاخی ہے۔

جاندار کی تصویر سے فرشتوں کو نفرت ہے، اللہ کے رسول ﷺ کو نفرت ہے، اور اس درجہ نفرت ہے کہ گھر کے اندر تصویر نظر آجاتی، تو آپ اس میں داخل نہیں ہوتے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے حجرۂ شریفہ کے لئے ایک گاؤتکیہ خریدا............جس پر تصویریں بنی ہوئی تھیں، رسول اللہ ﷺ باہر سے تشریف لائے ....تو آپ نے دروازے ہی پر سے وہ تصاویر دیکھ لیں آپ اندر تشریف نہیں لائے، دروازے پر ہی کھڑے ہوگئے۔ ام المومنین گھبرا گئیں، کہنے لگیں کہ میں نے جو بھی گناہ کیا ہو، اس سے اللہ کے حضور توبہ کرتی ہوں، آپ نے فرمایا یہ گاؤتکیہ کیا چیز ہے؟ انھوں نے عرض کیا، اسے اس لئے لیا ہے کہ آپ اس پر بیٹھیں اور ٹیک لگائیں، فرمایا کہ **أن أصحاب هٰذه الصور يعذبون يوم القيامة يقال لهم أحيوا ماخلقتم إن الملائكة لاتدخل بيتاً فيه الصور**، ان تصویروں والوں کو قیامت کے دن عذاب ہوگا، ان سے کہا جائے گا کہ جس کو تم نے پیدا کیا ہے، اسے زندہ کرو، اور فرشتے اس گھر میں نہیں جاتے جس میں تصویریں ہوں۔ (بخاری شریف)

ایک اور حدیث ملاحظہ کیجئے، جسے اجمالاً وتفصیلاً محدثین نے اپنی اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ فرشتوں کو تصویروں سے کس درجہ تنفر ہے؟

حضرت عبداللہ بن عباس ؓ اپنی خالہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک روز صبح کے وقت رنجیدہ وافسردہ خاطر تھے، حضرت میمونہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آج آپ کی طبیعت متغیر ہے، کیا بات ہے؟ فرمایا آج جبرئیل علیہ السلام نے ملاقات کا وعدہ کیا تھا، مگر وہ نہیں آئے، بخدا وہ وعدہ خلافی نہیں کرتے، معلوم نہیں کیا بات ہے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اسی سلسلے میں فرماتی ہیں کہ جب یہ بات رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے تو آپ کے ہاتھ میں عصا تھا، آپ نے عصا کو زمین پر ڈال دیا، اور فرمایا نہ اللہ تعالیٰ وعدہ کے خلاف کرتے، نہ ان کے بھیجے ہوئے قاصد!

حضرت میمونہؓ فرماتی ہیں کہ اس دن، دن بھر آپ افسردہ و بے چین رہے، پھر آپ کا ذہن اس طرف گیا کہ گھر میں ایک کتے کا پلا (بچہ) ہے، اسے بھگایا، اور اس کی جگہ پر پانی چھڑکا، شام کو حضرت جبرئیل ؑ تشریف لائے، آپ نے وعدہ یاد دلایا، انھوں نے کہا بے شک وعدہ یاد تھا، لیکن جس گھر میں کتا یا تصویر ہو، اس میں ہم لوگ نہیں جاتے، یہ روایت مسلم شریف کی ہے۔

ابوداؤد شریف میں حضرت ابو ہریرہ ؓ سے مزید تفصیل منقول ہے، اس میں ہے کہ جبرئیل ؑ نے فرمایا کہ میں شب گزشتہ آیا تھا، لیکن دیکھا کہ دروازے پر تصویر ہے، گھر میں ایک پردہ تھا اس پر تصویر بنی ہوئی تھی، اور حجرے میں ایک کتا تھا، اس تصویر کے بارے میں جو دروازے پر ہے حکم دیجئے کہ اس کا سر کاٹ دیا جائے، پس وہ درخت کے مثل ہو جائے، اور جو پردے پر ہے اس کے متعلق حکم دیجئے کہ اسے کاٹ کر دو ٹکڑے کر کے تکیے بنا لئے جائیں، اور کتے کو نکلوا دیجئے۔ (ابوداؤد شریف، کتاب اللباس، باب فی الصور)

اس حدیث سے اندازہ ہوتا ہے کہ فرشتوں کے نزدیک تصویر کتنی مبغوض اور قابل نفرت چیز ہے، کہ اس کی وجہ سے وعدہ جو حضور ﷺ سے کیا تھا، پورا نہ ہو سکا۔ غور کرنے والے اگر واقعۃً غور کریں تو یہ بات واضح ہے کہ ایمانی غیرت کبھی تصویر کو گوارا نہیں کر سکتی۔

اتنی سخت وعید اور اتنی صراحت کے بعد کیا تصویروں کے بارے میں کیا کسی مصلحت، کسی تاویل، کسی استحسان کی گنجائش رہ جاتی ہے؟ تصویر سازی کا آلہ خواہ کوئی ہو، تصویر بنانے والا خواہ کتنا ہی مختصر عمل کرتا ہو، خواہ ویڈیو کیسٹ میں تصویر دکھائی نہ دیتی ہو، لیکن اس پر برقی شعاع ڈالی جاتی، تو وہ پورے طور پر دکھائی دیتی ہے، خواہ کچھ بھی ہو، مگر ہے، وہ تصویر!

رسول اللہ ﷺ کی بیان کردہ وعیدیں دیکھئے، اور ہر طرح کی تصویروں کی قیامت خیزیاں دیکھئے، حضرت ابراہیم ؑ نے انسانی ہاتھوں کی بنائی ہوئی مورتیوں اور مجسموں کے بارے میں دعا کرتے ہوئے فرمایا تھا: **واجنبنی وبنی أن نعبد الاصنام، رب إنهن أضللن كثيرا من الناس** (سورۂ ابراہیم) اے پروردگار! مجھ کو اور میری اولاد کو اس

بات سے دور رکھئے کہ ہم مورتیوں کی پوجا کریں، اے میرے پروردگار! ان بتوں نے بہتوں کو گمراہ کیا ہے۔

واقعی بتوں اور مورتیوں کی گمراہی عام ہے، اور اسی زمرے میں آج کی تصویریں بھی شامل ہیں، اللہ ہی جانتا ہے ان تصویروں کی وجہ سے کتنی برائیاں، بے حیائیاں، فحاشیاں بلکہ چوریاں، ڈکیتیاں پھیلتی جارہی ہیں۔ ٹی۔ وی اور انٹرنیٹ کی تصویروں اور سینما کی متحرک اور زندہ نما مورتیوں نے ماحول ومعاشرے میں برائیوں کا کتنا طوفان اٹھا رکھا ہے، اس طوفان کے بدترین جھونکوں اور جھکڑوں کو دیکھنے کے بعد بھی بعض لوگ جو علم اور دین سے نسبت رکھتے ہیں، تعجب ہے، کیونکر اس موضوع پر نرمی اختیار کرتے ہیں، اور گمراہی کا دروازہ کھولتے ہیں۔

عام لوگوں سے کیا عرض کروں، علماء وار بابِ مدارس سے عرض کرتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کے کلام میں تو کوئی شبہ نہیں، اور علماء ومدارس آپ ہی کے کلام اور آپ ہی کے کام کی نمائندگی کا فریضہ انجام دینے کے لئے مقرر ومتعین ہیں، پھر کیا بات ہے کہ وہ آپ ہی کے ارشادات سے آنکھ بند کر کے ایسی مجالس ومحافل میں شریک ہوتے ہیں، جن میں کھلم کھلا فسق اور حرمت کا ارتکاب ہوتا ہے، یہ حضرات واقعہ یہ ہے کہ ایسی مجالس میں شریک ہوکر اس معصیت کو بند کراسکیں، ذرا مشکل ہے، طریقہ یہی ہے کہ ان مجالس سے احتراز ہی کیا جائے، علماء عوام کے لئے نمونہ ہیں، جب یہ اس سے اجتناب کریں گے تو بہت سے لوگوں کو تنبہ ہوگا، ورنہ عوام تو چھوٹے پڑے ہی ہیں۔

اللہ تعالیٰ ولی وکارساز ہیں۔

(جون ۲۰۰۷ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بدعت اور اہل بدعت

نحمدالله ونصلی علیٰ رسوله الکریم وعلیٰ آله وأصحابه الذین هم نصروا الدین القویم، أما بعد!

رسول امین، سیدنا محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں، اور جو شریعت آپ کو عطا ہوئی ہے، وہ ایک کامل اور مکمل شریعت ہے، جس میں نہ کسی چیز کے کم کرنے کی اجازت ہے، نہ اس میں کسی حکم کے اضافہ کی گنجائش ہے، اگر کوئی حکم کم کر دیا جائے تو اس میں نقص پیدا ہوگا، اور وہ کامل دین نہ ہوگا، اور اگر کسی بات کا اضافہ کر دیا جائے، تو وہ در پردہ اللہ و رسول کی تکذیب ہے کہ دین کامل نہ تھا، اس میں فلاں بات کی کمی تھی، لیکن اس کے باوجود اسے اللہ نے کامل کہا، اور رسول نے اسے تسلیم کرکے اپنی امت کو اس سے بے خبر رکھا، یہ تکذیب کتنا سنگین جرم ہے، بیان کی حاجت نہیں ہے، یہ اضافہ شریعت کی اصطلاح میں ''بدعت'' کہلاتا ہے، گویا بدعت کا مرتکب اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب کرتا ہے اور ایک ایسی بات کا انتساب اللہ کی طرف، اور اس کے رسول کی طرف کرتا ہے جس کا دین اور شریعت کا حکم ہونا اللہ و رسول نے ظاہر نہیں کیا، اور اضافہ کو دین سمجھنے والا اسے بطور حکم شریعت پیش کرتا ہے۔

بدعت کی یہ معصیت ایک بدترین معصیت ہے، آدمی شریعت کی نافرمانی کرتا ہے، تو اسے گناہ سمجھتا ہے، لیکن ''بدعت'' کو آدمی دین و شریعت سمجھتا ہے۔ گناہ پر تنبہ ہو جاتا ہے اور پھر توبہ کی توفیق مل جاتی ہے، مگر جسے گناہ نہیں، شریعت سمجھتا ہو، اس کے گناہ ہونے پر تنبہ مشکل سے ہوتا ہے، اسلئے امت کے اجتماعی مزاج نے ''بدعت'' کو کبھی قبول نہیں کیا ہے، ورنہ دین و شریعت مسخ ہو کر رہ جائے۔

عام گناہ براہ راست شریعت سے ٹکراتا ہے، وہ حکم شریعت کے بالمقابل سامنے سے آتا ہے، اس کا دین وشریعت کے خلاف ہونا بالکل نمایاں ہوتا ہے، اسے کوئی گناہ کہے، دین سے بغاوت کہے، شریعت سے انحراف کہے تو کسی کو نہ استعجاب ہوگا، نہ اعتراض! لیکن ''بدعت'' کبھی سامنے سے کھلم کھلا نہیں آتی ہے، یہ کوئی ایسا دروازہ تلاش کرتی ہے جس کے خلاف شریعت ہونے کا وہم نہیں ہوتا، بظاہر اس دروازے سے داخل ہونے میں کوئی قباحت نہیں معلوم ہوتی، بلکہ یہ دروازہ اور اس میں داخل ہونا نظر بظاہر مستحسن معلوم ہوتا ہے، لیکن اس میں داخل ہو جانے کے بعد جو صورت حال پیدا ہوتی ہے، اسے ''بدعت'' کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جاسکتا، اس کی چند ایک مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) رسول اکرم ﷺ کی محبت فرض ہے، اس فرض کی ادائیگی کے لئے جو بھی شرعاً جائز اسباب ہوں گے انھیں اختیار کیا جاسکتا ہے، آپ کی اطاعت، آپ کا تذکرہ، درود شریف کی کثرت، آپ کی سیرت طیبہ کا مطالعہ، آپ کی شان میں نعتوں کا پڑھنا اور سننا، یہ وہ اسباب ہیں جن سے آپ کی عظمت ومحبت پیدا بھی ہوتی ہے اور بڑھتی بھی ہے! یہ سب امور اگر شریعت کے احکام کے مطابق عمل میں لائے جائیں، تو کسی کو ان پر نکیر کرنے کا حق نہیں ہے، پھر دیکھئے کہ اسی راہ سے ایک چیز داخل ہوئی، جس کا نام ''محفل میلاد'' ہے، یہ محفل حضور اکرم ﷺ کی محبت میں اور آپ کی محبت کی تحصیل واضافہ کے لئے منعقد کی گئی، یہ محفل اپنی سادہ شکل میں بالکل جائز تھی، اس سے ایک افضل بلکہ فرض مقصود ادا ہوتا تھا، اس لئے یہ بالکل قابل اعتراض نہ تھی، مگر آہستہ آہستہ اس محفل کی ایک خاص شکل متعین ہوتی چلی گئی، اس کے کچھ لوازم وآداب مقرر کئے گئے، کچھ خاص خاص مضامین کی پابندی کی گئی، کئی ایک رسمیں اس کے ساتھ التزاماً جوڑی گئیں، اور پھر یہ خاص شکل وہیئت انھیں لوازم وآداب اور مضامین ورسوم کے ساتھ مقصود بن گئی یہاں تک کہ ان کے بغیر محفل میلاد یا ذکر رسول کا خیال ہی کالعدم ہونے لگا، اور اسی کو ایک درجہ میں محبت رسول کا معیار قرار دے دیا گیا، اور شریعت میں اسے مقاصد کے درجہ میں پہونچا دیا گیا، تو علماء حق نے اس کے بدعت ہونے کا فتویٰ

دیا، پھر بہت ہنگامہ ہوا، یہاں تک کہ اس قول حق کی پاداش میں علماء حق کو توہین رسالت کا مجرم گردانا گیا، اور ڈیڑھ دوصدی بیت جانے کے بعد بھی اب تک یہ شور وغوغا قائم ہے۔ حضرت مولانا محمد اسمٰعیل شہید سے حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ تک اور پھر اس کے بعد علماء دیوبند کا پورا طبقہ کفر کے فتاویٰ کی زد میں ہے، لیکن حق یہی ہے کہ محفل میلاد جس ہیئت والتزام کے ساتھ رائج ہے وہ دین میں ایک نئی اختراع ہے، اور بدعت ہے۔

(۲) حضور اکرم ﷺ کی آل واولاد اور آپ کے اقرباء جنھوں نے آپ کی دعوت قبول کی اور آپ کی نصرت کی، ان کی محبت عین ایمان ہے، امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ، سیدنا حضرت حسن وسیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہما، اور ان دونوں بزرگوں کی مقدس ماں فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی محبت سے کس کو انکار ہوسکتا ہے؟ ایک فرقہ نے ان حضرات کی محبت کو محبت کی حد سے نکال کر اتنا غلو کیا کہ اس فرقہ کو مسلمانوں کے زمرے میں شمار کرنا مشکل ہوگیا، حالانکہ محبت کا یہ مدعی فرقہ اپنے کو مومن ہی کہتا ہے، اور باقی تمام مسلمانوں کو کافر سمجھتا ہے، ابتدائی مرحلہ بہت خوشنما ہے، مگر جب اسے تخصیصات کی قیدوں میں جکڑا گیا تو کتنا بھیانک بن گیا۔ بدعت کی ابتداء اور انتہاء کی عموماً یہی شکل ہوتی ہے۔

(۳) ایک ایسا شہر جہاں احناف کے ساتھ غیر مقلدین کا مقابلہ اور مجادلہ چلتا رہتا ہے، بسلسلہ وعظ میرا وہاں جانا ہوتا رہتا ہے، اور بسا اوقات ہفتہ عشرہ وہاں قیام ہوتا ہے، وہاں میرے طالب علموں کی تعداد بہت ہے، اور ان کے واسطے سے اس شہر کے لوگ ایک تعلق محبت کا رکھتے ہیں، غیر مقلدین بھی میرے وعظ میں شریک ہوتے ہیں، لیکن وہ اپنی مساجد میں وعظ کے لئے مجھے دعوت نہیں دیتے۔ ایک بار ایک صاحب نے جمعہ میں مجھے دعوت دی کہ چل کر ہماری مسجد میں وعظ کہئے، میں نے یونہی رواروی میں پوچھ لیا کہ کس موضوع پر وعظ کہنا مناسب ہوگا، فرمانے لگے ''بدعت'' کے موضوع پر، میں نے عرض کیا، آپ کی مسجد میں چونکہ صرف اہل حدیث طبقہ ہوگا، اس لئے میں وہاں اس بدعت پر وعظ کہوں گا، جس میں آپ کا طبقہ مبتلا ہے، تو وہ چونکے اور کہنے لگے، ہم تو بدعت میں بحمد اللہ مبتلا نہیں ہیں، میں

نے عرض کیا، بدعت کہتے ہیں دین میں نئی بات کا اضافہ کرنے کو، اور معلوم ہے کہ شریعت میں فروعی اختلافی مسائل مثلاً قرأۃ خلف الامام، آمین بالجہر، وضع یدین تحت السرہ، جلسۂ استراحت، رفع یدین کا معاملہ دورِ صحابہ بلکہ دورِ نبوت سے رہا ہے، اور لوگ مختلف طریقوں سے عمل کرتے رہے ہیں، کسی نے کسی کے خلاف اصرار نہیں کیا، نہ کسی مسئلہ کو خلافِ سنت کہا، نہ کسی کی تضلیل وتفسیق کی، اب آپ لوگوں نے دین میں ایک نئی بات نکالی، حدیث کے کسی ایک پہلو کو لے کر اَڑ گئے، اور اس کے علاوہ کو خلافِ سنت کہنے لگے، اور اسی کو آپ نے اپنا دین ومذہب بنالیا، یہی آپ کے نزدیک معیارِ حق وباطل بن گیا، اسی کی روشنی میں عقائد ڈھلنے لگے، جبکہ اس غلو، اصرار اور تنگ نظری کا دین میں ......اس دین میں جس پر رسول اللہ ﷺ حضرات صحابہ کو چھوڑ کر گئے تھے...... پتہ اور نشان نہیں ہے، اور آپ کے دین کے لئے یہی مابہ الامتیاز بنا ہوا ہے، پس یہ بدعت ہے، اس پر وعظ کہہ دوں؟ تو وہ ٹھنڈے ہوگئے پھر دوبارہ انھوں نے دعوت نہیں دی، خاموشی سے چلے گئے۔

اس موضوع پر غور کیجئے تو بدعت اور غلو کا وجود خلافِ شریعت کسی معاملہ سے نہیں ہوا ہے، بلکہ ایسے مسائل واحکام کی بنیاد پر ہوا ہے جن کا ثبوت صحیح حدیثوں سے ہے، اور ظاہر ہے کہ جب حدیث صحیح پیش کی جائے گی، جو صحیح ہونے کے ساتھ صریح بھی ہو، تو کس کی جرأت ہے کہ اس پر نکیر کرے، مگر اس کو اتنا بڑھایا گیا کہ بالآخر اس کا انجام بدعت کی حد میں داخل ہونے کی صورت میں ظاہر ہوا، اور اصل دین کا حلیہ بگڑ گیا۔

(۴) ایک ذی استعداد عالم اور مفتی، جماعت اسلامی کے ایک بڑے ادارے میں استاذ اور صاحب افتاء تھے، جماعت اسلامی کا ایک خاص مزاج اور رنگ ہے، جو انگریزی کی تہذیب اور اسلامی احکام دونوں کو ایک ساتھ آمیز کر دینے بلکہ باہم گوندھ دینے سے تیار ہوا ہے، اس لئے اسے **ما أنا علیه و أصحابی** (رسول اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہوجائے گی، جس میں ایک جماعت ناجی (نجات پانے والی) ہوگی، صحابہ کرام نے دریافت کیا کہ وہ کون سی جماعت ہوگی، فرمایا کہ وہ لوگ اس طریقے پر ہوں گے جس پر میں اور میرے

اصحاب ہیں (ما أنا علیه و أصحابی) اس کی مزید تشریح دیکھنی ہو تو اس خاکسار کا رسالہ ’’اہل حق و اہل باطل کی شناخت‘‘ کا مطالعہ کریں۔) سے مناسبت کم ہے، کیونکہ نبی ﷺ ہوں یا اصحاب نبی، کسی کے یہاں بجز خالص اسلامی احکام و تہذیب کے کسی اور چیز کا گزر نہ تھا، حتیٰ کہ ان لوگوں نے اسلامی تہذیب کے اختیار کرنے کے بعد اپنی قدیم آبائی تہذیب کو بھی یکسر ترک کر دیا تھا۔

اسی جماعت اسلامی کے ایک بڑے ادارے میں وہ مفتی صاحب فتویٰ نویسی کا کام کرتے تھے، وہ بذات خود جماعت اسلامی سے منسلک نہ تھے، مگر اسی مجمع میں رہتے تھے، اور وہیں سے ان کی معاش کا ظاہری انتظام تھا، ایک دن کسی دینی موضوع پر بات کرتے ہوئے، انھوں نے فرمایا کہ مجھے بدعتیوں سے سخت نفرت ہے، اور اس بات پر اتنا زور دیا کہ بس حد کر دی، میں نے ادب سے عرض کیا کہ آپ کی یہ بات کلیۃً درست نہیں معلوم ہوتی، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بدعتیوں کا ایک طبقہ جسے بریلوی کہا جاتا ہے، اس سے آپ کو نفرت ہے، ورنہ جو بھی بدعتی ہو اس سے آپ نفرت کرتے ہوں، یہ بات مشکوک معلوم ہوتی ہے، انھوں نے اس کی وضاحت چاہی، میں نے عرض کیا، بدعت ہر اس بات کو کہتے ہیں، جو مجموعۂ دین میں اضافہ کی حیثیت رکھتی ہو، انھوں نے تصویب کی، میں نے کہا خواہ وہ بات از قبیل عقائد ہو یا از قبیل اعمال ہو، یا از قبیل اقوال ہو، فرمایا بیشک! میں نے کہا جماعت اسلامی کا دستور دیکھئے، اس میں لکھا ہے کہ ’’رسولِ خدا کے علاوہ کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے، اور نہ کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہو‘‘ اس دفعہ کو انھوں نے اپنی دینی جماعت کی اساس بنایا ہے، یہ قول اللہ و رسول کے یہاں کہاں ہے؟ پھر اس قول کا اضافہ بدعت ہے یا نہیں؟ اور یہ لوگ جو اپنے دین و مذہب کی اسے بنیاد بنائے ہوئے ہیں بدعتی ہیں یا نہیں؟ تو کیا ان سے آپ کو اتنی ہی نفرت ہے، جتنی آپ نے ذکر کی ہے؟ پھر مان گئے اور کہنے لگے کہ میرے ذہن میں یہ بات نہ تھی۔

دیکھئے بظاہر یہ ایک معصوم سا جملہ ہے، اگر اس کے پیچھے عقائد و افکار اور تنقید و اعتراض کا ایک جلوس نہ چلا ہوتا، تو شاید کسی کو توجہ بھی نہ ہوتی، مگر جب اس معصوم جملے کی

تفصیلات کے برگ و بار نکلنے شروع ہوئے، اور ان میں وسعت اور استحکام پیدا ہوا، تو سب چونکے، مخصوص اہل بصیرت تو ابتداء میں ہی چونکنے ہوگئے تھے، اور انھوں نے تنبیہ بھی کردی تھی، مگر عام لوگوں نے اسے تنگ نظری پر محمول کیا اور سمجھے کہ یہ جملہ معصوم ہے، مگر بعد میں سب کو احساس ہوگیا کہ ؎

قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید

بدعت اپنی ابتداء میں کیا ہوتی ہے؟ اور بعد والے اس میں کیا الجھن ڈال دیتے ہیں؟ اس کی طرف اشارہ بلکہ قدرے وضاحت حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں خود فرمادی ہے، بدعات پر غور کرنے کے لئے وہ آیت رہنما ہے، سورۂ حدید میں عیسائیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً وَّرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَاكَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَآتَيْنَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُوْنَ (سورۃ الحدید: ۳۸) اور ہم نے ان کے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) پیچھے چلنے والوں کے دل میں نرمی اور مہربانی رکھ دی اور رہبانیت بھی رکھی، جس کو انھوں نے خود ہی اختراع کیا، ہم نے ان پر اسے نہیں لکھا تھا، یہ اختراع انھوں نے محض اللہ کی رضامندی کے لئے کیا تھا، لیکن جیسا اسے رہنا چاہئے تھا، نباہ نہ سکے، پھر ہم نے ان لوگوں کو جو ایمان دار تھے، ان کا بدلہ دیا، اور بہت ان میں نافرمان تھے۔

اس آیت پر غور کرنے سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں:

(۱) اوّل یہ کہ بعض اوقات امت کے علماء و صلحاء محض اللہ کی خوشنودی و رضا جوئی اور اپنے دین کی حفاظت کی خاطر بعض ایسے ذرائع اختیار کرتے ہیں، جن کا انھیں حکم نہیں ہوتا، یعنی وہ شرعی احکام میں داخل نہیں ہوتے، لیکن دینی مصلحت سے انھیں اختیار کرلیتے ہیں، یہ ہوتی تو ایک نئی بات ہے، لیکن بذات خود دین میں مقصود و مطلوب نہیں ہوتی، صرف کسی مقصد دینی کے حصول کے لئے بطور ذریعہ کے ہوتی ہے، اور اسی نسبت سے محمود ہوتی ہے،

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں فرمایا: **ابْتَدَعُوهَا** انھوں نے نئی بات نکالی۔ **مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ**، ہم نے اسے مقرر نہیں کیا تھا۔ **إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللهِ**، ان کا مقصد محض اللہ کی رضا جوئی تھی، اس طریقہ پر اللہ نے نکیر نہیں کی، اس سے معلوم ہوا کہ یہ وہ بدعت نہیں ہے جو شریعت کی اصطلاح ہے، اور حق تعالیٰ نے اسے رد نہیں کیا، یہ ابتدائی حالت ہے، اسی حالت پر یہ اختراع قائم رہے، تو کچھ مضائقہ نہیں۔

عیسائی علماء وصلحاء نے اپنے دین کی حفاظت کے لئے رہبانیت اختیار کی تھی، رہبانیت کا تعارف اور اس کے اختیار کرنے کی ضرورت تفسیر معارف القرآن مؤلفہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع علیہ الرحمہ میں ملاحظہ فرمائیے، لکھتے ہیں:

> ”رہبانیت، رہبان کی طرف منسوب ہے، راہب اور رہبان کے معنی ڈرنے والا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد جب بنی اسرائیل میں فسق وفجور عام ہوگیا، خصوصاً ملوک اور رؤسا نے احکام انجیل سے کھلی بغاوت شروع کر دی، تو ان میں کچھ علماء وصلحاء تھے، انھوں نے اس بدعملی سے روکا تو انھیں قتل کر دیا گیا، جو کچھ بچ رہے، انھوں نے دیکھا کہ اب منع کرنے اور مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے، اگر ہم ان لوگوں میں مل جل کر رہیں، تو ہمارا دین برباد ہوگا، اس لئے ان لوگوں نے اپنے اوپر یہ بات لازم کر لی کہ اب دنیا کی سب جائز لذتیں اور آرام بھی چھوڑ دیں، نکاح نہ کریں، کھانے پینے کے سامان جمع کرنے کی فکر نہ کریں، رہنے سہنے کے لئے مکان اور گھر کا اہتمام نہ کریں، لوگوں سے دور کسی جنگل، پہاڑ میں بسر کریں، یا پھر خانہ بدوشوں کی سی زندگی سیاحت میں گزار دیں، تاکہ دین کے احکام پر آزادی سے پورا پورا عمل کر سکیں، ان کا یہ عمل چونکہ خدا کے خوف سے تھا، اس لئے ایسے لوگوں کو راہب یا رہبان کہا جانے لگا، ان کی طرف نسبت کر کے ان کے طریقہ کو رہبانیت کہا جانے لگا۔
>
> (معارف القرآن، جلد:۸، سورۃ الحدید)

(۲) دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ایک کام جو کسی دینی مصلحت کے لئے اختیار کیا گیا،

اس کے حدود کی رعایت کا اہتمام نہیں کیا گیا، حدود کی رعایت یہ تھی کہ وہ جس درجہ کا کام تھا، اسے اسی درجہ میں رکھا جاتا، وہ ایک وسیلہ اور ذریعہ کے طور پر اختیار کیا گیا، تو وسیلہ اور ذریعہ ہی رہتا، اسے مقصودِ دینی نہ قرار دیا جاتا، اور نہ اس کے ساتھ مقصودِ دینی جیسا طرزِ عمل اختیار کیا جاتا، پھر جس مقصد سے اختیار کیا گیا تھا، وہی مقصود پیش نظر رہتا، اس کو کسی اور مقصد ذریعہ نہ بنایا جاتا، عیسائیوں نے ان دونوں باتوں میں کوتاہی کی، رہبانیت کو مقاصد دینی میں شامل کردیا، اس کی اہمیت اس درجہ بڑھادی کہ رہبانیت اختیار کرنے والے افراد عیسائی دنیا میں نہ صرف امتیازی اوصاف سے متصف کئے گئے، بلکہ ان میں خدائی اختیارات بھی تسلیم کئے گئے، ایک ایسا عمل جسے اللہ نے مقرر نہیں کیا تھا، ازخود لوگوں نے اختیار کیا تھا، اس کو بجالانے والا بزرگی اور ولایت کے اتنے بلند منصب پر فائز مان لیا جائے کہ خدائی اور بندگی کی حدیں گڈمڈ ہوجائیں، غلو کا آخری درجہ ہے، انھوں نے رہبانیت کو اس کی حد پر نہیں رہنے دیا، بلکہ عام احکام شرع سے اس کا درجہ بہت بڑھادیا۔ **فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا** کی ایک صورت یہ ہے۔

دوسری صورت حق رعایت کی یہ تھی کہ جس مقصد کے لئے اسے اختیار کیا، وہی مقصد پیش نظر رہتا، مگر راہبوں نے یہاں بھی حدود کی رعایت توڑی اور رہبانیت کو عزت وجاہ اور دولت وحشمت کا ذریعہ بنالیا، وہ اس کی آڑ میں فواحش ومنکرات کا ارتکاب کرتے تھے، کلیسا کی تاریخ ان دونوں قسموں سے گناہوں سے لبریز ہے۔

(۳) تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اس طرزِ عمل میں جو لوگ صاحب ایمان ہوں گے، اور حدودِ شرعیہ کی رعایت کے پابند ہوں گے، وہ تو اجر وثواب کے مستحق ہوں گے، اور جو لوگ اس کے برخلاف غلو اور خلاف مقصد راہیں اختیار کریں گے وہ فاسق قرار پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا ایمان بھی غیر معتبر ہوگا۔

(۴) چوتھی بات یہ معلوم ہوئی کہ اس طریقۂ عمل میں جو لوگ غلو اور تعدی حدود اللہ کی وجہ سے فاسق ہوئے ہیں، زیادہ تعداد انھیں کی ہوتی ہے۔

معلوم ہوا کہ دین کی حفاظت ہی کے لئے سہی، لیکن دینی رنگ میں کوئی نیا طریقہ اختیار کرنا ایک پُرخطر راستہ ہے، ابتداء میں تو وہ قابل قبول ہوگا، مگر حدود کی رعایت نہ ہوگی، تو اسے غلو اور اس کے نتیجے میں بدعت بنتے دیر نہ لگے گی۔

اس طرح کی بدعات غالباً غیر شرعی قیاسات کی بنا پر وجود میں آتی ہیں، شاید عیسائیوں نے سوچا ہو کہ سیّدنا عیسیٰ علیہ السلام زندگی بھر مجرد رہے، بیوی بچوں کی الجھن سے آزاد رہے، نہ کوئی گھر بنایا نہ کسی دَر کے پابند رہے، حضرت کے یہاں صبح کہیں، شام کہیں کا سماں ہوتا، سیاحت فرماتے، لوگوں کو دینی احکام ومواعظ تلقین فرماتے، اسی طرح ان کی والدہ محترمہ مقدسہ بھی نکاح کی قید سے آزاد رہیں، اللہ نے ایک برگزیدہ نشانِ قدرت انھیں بنایا تھا، وہ ہمہ تن اور ہمہ دم مصروفِ عبادت رہتیں، اور غیب سے ان کے لئے رزق آیا کرتا، شاید اسی خیال سے یہ سوچ کر کہ اپنے پیشوا کے طریقۂ زندگی کی پیروی بھی ہوگی، اور دین کی حفاظت بھی ہوگی، رہبانیت اختیار کی ہوگی، لیکن برا ہو "غلو" کا، یہ کسی چیز کو اپنی حد پر نہیں چھوڑتا، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے اس پر امکانی حد تک بندش لگادی ہے۔ بدعات کی دنیا میں اس طرح کی مثالیں بہت ملیں گی کہ کسی دینی جذبہ سے کوئی غیر منصوص کام شروع کیا گیا، اور وہ رفتہ رفتہ غلو اور پھر بدعت ہونے تک جا پہونچا۔ ہم نے الگ الگ طبقوں سے ایک ایک عام فہم مثال تحریر کردی، ورنہ بریلویت اور اہل بدعت کے تصوف کا پورا گلزار اسی طرح کی خوبصورت بدعات سے لہلہا رہا ہے۔ نذر ونیاز، تیجہ فاتحہ، عرس وسماع، قبروں پر اذان اور بہت سی رسوم کی ابتداء کسی دینی جذبہ اور دینی رنگ میں ہوئی، ان میں متعدد دینی مصلحتوں کا لحاظ رکھا گیا تھا، مگر کیا ہوا؟ بدیر یا جلد یہ سب رسمیں بدعت کے چہ بچہ میں جا گریں۔

بدعت کا دستور یہی ہے کہ وہ شریعت کے مدمقابل بن کر نہیں آتی، وہ عموماً دین کی کسی مصلحت اور کسی دینی مسئلے کی حمایت میں ظاہر ہوتی ہے، اور بہت ایسا ہوتا ہے کہ کسی مسلم بزرگ شخصیت کے ساتھ منسوب ہوجاتی ہے، اس میں دینی مصلحت وحمایت اور اس بزرگ کی نسبت کی وجہ سے تقدس کا رنگ جم جاتا ہے، پھر بدعت ظاہر ہونے تک اس میں ایسا

استحکام ہوجاتا ہے کہ لوگ اسے سنت قائمہ سمجھنے لگ جاتے ہیں، پھر جب اس کی تردید کی جاتی ہے، تو شور ہوتا ہے کہ سنت کی مخالفت ہورہی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد مسند دارمی میں نقل کیا گیا ہے کہ ’’تمہارا اس وقت کیا حال ہوگا، جب تم پر فتنہ چھا جائے گا، ایسا طویل و مدید فتنہ کہ بڑی عمر کا آدمی اس میں انتہائی بوڑھا ہوجائے گا، اور چھوٹی عمر کا بچہ جوان ہوجائے گا، اور لوگ اسی فتنہ کو سنت قرار دے لیں گے، کہ اگر اس میں تبدیلی کی جائے گی، تو لوگ کہیں کہ سنت بدل دی گئی۔‘‘

(مسند دارمی، جلد۱، ص:۲۷۸، باب تغیر الزمان ومایحدث فیھا)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اہل بدعت کے قلب و دماغ میں بدعت کا ایسا رسوخ اور استحکام ہوجاتا ہے کہ اس کے خلاف وہ سننے اور سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہوتے، اور اگر اس بدعت کا خاتمہ کیا جاتا ہے، تو بدعت نہیں، اسے سنت سمجھ کر واویلا کرتے ہیں کہ سنت بدل دی گئی۔ چنانچہ تجربہ ہے کہ اہل بدعت کو سنت اور فرض کے سلسلے میں تو نہیں، البتہ بدعت کے سلسلے میں بہت تشدد ہوتا ہے، اہل سنت اور اہل حق کے مزاج میں تشدد نہیں ہوتا، حق کے وسیع دائرے میں اچھی خاصی لچک اور وسعت ہوتی ہے، البتہ فرائض وسنن کو مضبوطی کے ساتھ تھامتے ہیں، مگر اہل بدعت کا شعار یہ ہے کہ چاہے فرائض ترک ہوجائیں، حرام میں مبتلا ہوجائیں، سنتیں سرے سے متروک ہوجائیں، لیکن بدعت والا عمل ترک نہ ہونے پائے۔

اللہ کے رسول ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: **ماضل قوم بعد هدى كانوا عليه إلا اوتوا الجدل ثم قرأ رسول الله ﷺ مَاضَرَبُوْهُ لَکَ إِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ[احمد، ترمذی ، ابن ماجة](مشکوٰة شریف: باب الاعتصام بالکتاب والسنة)**

جب بھی کوئی قوم ہدایت پر ہونے کے بعد گمراہ ہوتی ہے، تو عناد اور جھگڑے میں مبتلا کردی جاتی ہے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: **مَاضَرَبُوْهُ لَکَ إِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْن**، (سورة الزخرف: ۸۵) انھوں نے یہ مثال محض جھگڑنے کیلئے بیان کی ہے، بلکہ یہ جھگڑالو قوم ہی ہے۔

جو قوم گمراہی اختیار کرتی ہے، تجربہ ہے، اور خود قرآن شاہد ہے کہ اس کے مزاج میں تشدد اور جھگڑے کا جذبہ پیدا ہوجاتا ہے، کفار بھی جھگڑالو تھے، ان کی بحث حق کے اثبات کے لئے نہیں جھگڑنے کے لئے ہوتی تھی، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: **إِنَّكُمْ وَمَاتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ** (سورۃ الانبیاء: ٩٨) تم لوگ اور جن کی تم اللہ کے علاوہ عبادت کرتے ہو، جہنم کے ایندھن ہیں۔ اس آیت میں بتایا کہ مشرکین بھی اور ان کے معبودانِ باطلہ یعنی پتھر کے بت اور شیاطین بھی جہنم میں گرنے والے ہیں، اس پر مشرکین نے حضرت نبی کریم ﷺ سے کٹ حجتی کی کہ اچھا ہمارے بت بہتر ہیں یا عیسیٰ؟ (علیہ السلام) آخر عبادت تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بھی کی جاتی ہے، تو اگر وہ بھی جہنم میں جائیں تو کچھ مضائقہ نہیں کہ ہم اور ہمارے بت بھی ان کے ساتھ جہنم میں جائیں، اس پر فرمایا: **وَقَالُوْا أَآلِهَتُنَا خَيْرٌ أَمْ هُوَ مَاضَرَبُوْهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ**، ان کی اس بات کو حق تعالیٰ نے کٹ حجتی قرار دیا، کیونکہ اس سلسلۂ بیان میں جہاں اللہ تعالیٰ نے بتوں کو جہنم کا ایندھن قرار دیا ہے، ایک اور بات ارشاد فرمائی ہے، اسے یہ گول کر گئے، فرمایا کہ: **إِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنٰى أُوْلٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ** (سورۃ الانبیاء: ١٠١) وہ لوگ جن کے واسطے ہماری جانب سے خیر اور بہتری پہلے سے متعین ہوچکی ہے، وہ جہنم سے دور رکھے جائیں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں حق تعالیٰ کی اطلاع اور گواہی ہے کہ وہ ان لوگوں میں ہیں، جن کے حق میں خیر اور بھلائی کا اعلیٰ مرتبہ یعنی نبوت کی برگزیدگی پہلے سے متعین ہے، پھر جہنم کے قریب کیونکر ہوں گے، یہ بات سامنے کی ہے، مگر جھگڑنے والے اپنے خلاف مطلب باتوں کو نظر انداز کر کے کٹ حجتی کرتے ہیں۔

اہل بدعت کا بھی یہی خاصہ ہے، وہ تلاش حق کے لئے نہیں، محض جھگڑنے کے لئے شوشے نکالتے ہیں، پھر اسی شوشے کی بنیاد پر لڑتے ہیں، بدعت اور گمراہی کس طرح رگ و ریشے میں سرایت کرتی ہے، پھر وہ پوری طرح اہل بدعت کو اپنی گرفت میں لیتی ہے، اسے بھی رسول اللہ ﷺ کی زبانِ حق ترجمان سے سنئے! فرمایا: **وإنه سيخرج في امتي اقوام**

تتجاری بهم تلک الأهواء کما یتجاری الکلب بصاحبه لایبقیٰ منه عرق ولا مفصل إلا دخله [احمد وابوداؤد] (مشکوٰۃ شریف: باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ) میری امت میں ایسے لوگ نکلیں گے جن میں بدعتیں اس طرح سرایت کریں گی جیسے کتنا کاٹنے کی ہڑک بدن کے اندر سرایت کر جاتی ہے، ہر ہر رگ اور ہر ہر جوڑ میں داخل ہو کر رہتی ہے۔

کتا جب کاٹتا ہے تو اس سے ایک شدید قسم کی بیماری جسم میں پیدا ہو جاتی ہے، جو آدمی کے رگ وریشے میں پھیل جاتی ہے، پھر آدمی کتے کی طرح بھونکنے لگتا ہے، اور پیاس سے تڑپتا ہے، اور بڑی سخت موت مرتا ہے، یہ مثال رسول اللہ ﷺ نے اہل بدعت کی دی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بدعت کتنی سخت معصیت اور بیماری ہے، اور واقعی یہ تجربہ ہے کہ بدعتی کو اپنی بدعت میں اتنا انہماک اور غلو ہوتا ہے کہ اس کے سامنے شریعت کے دوسرے احکام ماند پڑ جاتے ہیں، وہ اسی معیار پر ہر ایک کو جانچتا ہے، اسی کو حق وناحق کی بنیاد بناتا ہے، پھر اس میں تشدد اور جارحیت کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ نمازوں کی فکر نہیں ہے، لیکن بدعت کے عمل پر مارا ماری ہے، مالِ حرام کا خوف نہیں ہے، مگر عمل بدعی کے فوت ہو جانے سے دل لرزتا ہے، تلاوت قرآن کا اہتمام نہیں، مگر بدعی وظائف ترک نہ ہوں۔ بدعت کے جس ماحول پر نظر ڈالئے یہ تماشا جابجا ملے گا، اس طرح دین میں تحریف ہوتی ہے، دینی اور شرعی اصطلاحوں کے معانی بدل جاتے ہیں، ہر ایک بدعت اپنی ایک اصطلاح رکھتی ہے، الفاظ اصطلاح کے وہی ہوتے ہیں، جو شریعت میں رائج ہیں، لیکن معانی میں بہت فرق آجاتا ہے، اس سے تحریف راہ پاتی ہے، اس لئے بدعت کی معصیت، دیگر معاصی سے شدید تر ہے، بدعت سے عمل بھی بگڑتا ہے، اور عقیدہ میں بھی خرابی پڑتی ہے، ہمارے اکابر رحمہم اللہ (علماء دیوبند) کو بدعات سے بغایت نفرت تھی۔

مضمون کے خاتمہ پر مناسب سمجھتا ہوں کہ علماء دیوبند کے حلقے کی ایک بزرگ ترین شخصیت حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری نوراللہ مرقدہ کے دو ملفوظ تذکرۃ الخلیل

سے نقل کروں، حضرت رائے پوری پر زُہد وتقویٰ اور بزرگی ومشیخت کا غلبہ تھا، اس لئے علم وفضل کے کمال کے لحاظ سے زیادہ معروف نہیں ہوئے، ورنہ ان کا علمی پایہ بھی بہت بلند تھا، حضرت اقدس مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کے اخص خلفاء میں تھے۔

تذکرۃ الخلیل کے مصنف مولانا عاشق الٰہی میرٹھی علیہ الرحمہ، انھیں حضرت رائے پوری کے تذکرے میں لکھتے ہیں:

> ’’ہر چند کہ آپ خلق مجسم تھے، مگر خلافِ سنت عقیدہ والوں سے آپ کو کمالِ نفرت تھی، ایک مرتبہ آپ کے کسی مرید نے ضلع .... کے ایک عالم کی صفائی پیش کرتے ہوئے یوں کہا کہ حضرت! وہ تو حضور کے رشتہ دار ہیں، اور بالکل ہمارے ہم خیال ہیں، صرف بعض عقائد میں کچھ یوں ہی سا جزوی اختلاف ہے، جیسا باہم ائمہ میں ہے، وہ صاحب اپنی تقریر ختم نہ کر پائے تھے، کہ آپ کے چہرے پر ناگواری کے آثار پیدا ہوگئے، اور آپ نے تعجب کے ساتھ فرمایا کہ ہائیں عقائد میں اور اختلاف؟ یہ تو جزوی ہونا آپ کو خود تسلیم ہے، میرا تجربہ تو یہ ہے کہ عقائد میں جز تو جز اگر بالکل بھی اختلاف نہ ہو، مگر شک اور شبہ کا درجہ ہو، تو وہ بھی برباد اور گمراہ ہوئے بغیر نہیں بچتا، پھر اس کو ائمہ کے اختلاف سے تشبیہ دینا بڑی ہی دلیری کی بات ہے، پس چاہئے کہ عمل میں کتنی کمزوری ہو، مگر خدا نہ کرے کہ کوئی مسلمان بدعت کو سنت سمجھے، یا سنت کے سنت ہونے میں شک لاوے کہ یہ بلائے بے درماں مہلک اور قاتل ہے (تذکرۃ الخلیل: ۲۵۵)

بدعت کے سلسلے میں ہمارے اکابر کا یہ رویہ رہا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو بدعات کا جتنا پھیلاؤ ہو رہا ہے، سنت کا نور گم ہو جاتا، لیکن ان حضرات کی بصیرت، فہم خداداد، علمی رسوخ، تقویٰ وطہارت، پاکیزگیٔ قلب اور نورانیت روح ووجدان کی وجہ سے بدعت کا بدعت ہونا نمایاں ہے، اس سلسلے میں حکیم الامت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ اور حضرت اقدس مولانا

رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کی مراسلت جو تذکرۃ الرشید میں من وعن درج ہے، قابل مطالعہ ہے۔ اس سے بدعت کی حقیقت اور اس کی قباحت وشناعت خوب واضح ہوتی ہے۔

تذکرۃ الخلیل میں حضرت مولانا شاہ عبد الرحیم صاحب رائے پوری قدس سرہٗ کا ایک اور ارشاد مفصل نقل کیا گیا ہے، جس سے حق وباطل اور سنت وبدعت کی شناخت آسان ہوجاتی ہے، وہ قابل ملاحظہ ہے، اس کا مکمل متن نقل کرتا ہوں، مصنف تذکرۃ الخلیل لکھتے ہیں:

> ”ایک دن آپ کی مجلس میں بدعت وسنت کے مسائل اختلافیہ کی بحث ہونے لگی، آپ دیر تک سنتے رہے، اور آخر میں فرمایا کہ میرے نزدیک علاوہ دلائل علمیہ کے حق وباطل پہچاننے کا ایک معیار اور بھی ہے، وہ یہ کہ قدرت نے ہر چیز میں اس کے ہم جنس کی طرف کشش کا مادہ رکھا ہے۔
>
> کبوتر با کبوتر باز با باز
>
> اور یہ قدرت کا عطیہ جس کو فطرت کہنا چاہئے، اجسام ہوں یا اعراض، سب ہی میں جاری وساری ہے، پس جس فعل کے متعلق یہ شبہ ہو کہ نہ معلوم حق ہے یا باطل؟ اس میں یہ دیکھنا چاہئے کہ اس کی طرف میلان کن قلوب کا ہوا، اور کشش کس قسم کے لوگوں کی ہے؟ اگر دیکھو کہ بددین فساق وفجار کو ابتداءً اس کی طرف حرکت ہوئی ہو، اور وہی قلوب جوش وخروش کے ساتھ اس کی طرف لپکتے ہیں، تو سمجھ لو کہ اس فعل میں ضرور ظلمت ہے، اگر چہ ظاہری صورت نورانی اور دینی معلوم ہوتی ہو، کیونکہ اس میں نور ہوتا، تو ظلمانی قلوب کو جذب نہ کرتا، بلکہ وہ اس سے بھاگتے اور نورانی قلوب اولیاء وصلحاء کے اس کی جانب کھنچتے، اور اگر کسی فعل کو دیکھو کہ دیندار اہل اللہ اس کی طرف جاتے، اور عوام وبازاری اس سے بھاگتے ہیں، تو سمجھ لو کہ ضرور اس فعل میں نورانیت ہے کہ اہل نور کے قلوب کو اس کی طرف کشش ہوئی،

اور ظلمانی قلوب نے اسی سے وحشت کھائی۔ (تذکرۃ الخلیل: ۲۵۰)

بدعت بھی ایک عجیب تماشا ہے، جب یہ آتی ہے، تو چور دروازہ سے آتی ہے، دینی لبادہ اوڑھ کر آتی ہے، علماء وفقہاء سے ڈرتی ہے، وہ کہیں اسے پہچان کر حلقۂ دین سے باہر نہ کردیں، لیکن جب یہ استحکام پکڑتی ہے تو، ناواقفوں کے ذہن ودماغ پر قدم جمالیتی ہے اور جو جان اور سمجھ سکتے ہیں، انھیں بھی کسی طرح فریب دینے میں کامیاب ہوجاتی ہے، پھر جب یہ اپنی رگ اور ریشے پھیلالیتی ہے، تو سینہ تان کر ان علماء کے سامنے کھڑی ہوجاتی ہے، جو اسے بدعت کہتے ہیں، یا کہنا چاہتے ہیں، انھیں مطعون کرتی ہے، علماء کی حقانیت کیلئے معیار بن جاتی ہے، اور معاملہ الٹ جاتا ہے، ہونا تو یہ چاہئے کہ علماء ربانی کے معیار پر کسی عقیدۂ وعمل کو پرکھا جائے، لیکن ہونے یہ لگتا ہے کہ اس عقیدۂ وعمل کے معیار پر اہل حق علماء کو جانچا جانے لگتا ہے۔ **إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون**

(جون ۲۰۰۷ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فکر اور سوچ کی دو راہیں: فکر دنیاوی اور فکر ایمانی

نحمده و نصلي علىٰ رسوله الكريم ،أمابعد!

ہماری یہ دنیا، جس میں ایک عارضی زندگی دنیا والوں کو بخشی گئی ہے، اور عمل کی ایک عارضی مہلت انھیں ملی ہوئی ہے، اس میں ان کے ساتھ ایسی ضروری بات اور ایسی مجبوریاں لگا دی گئی ہیں کہ انھیں سعی و عمل سے چارہ نہیں، شعوری اور غیر شعوری طور پر ہمہ دم انھیں کد و کاوش کی الجھنیں گردش میں رکھتی ہیں، پیدائش سے موت تک حرکت ہی حرکت ہے، عمل ہی عمل ہے، عمل اور ردِ عمل کا ایک سلسلہ ہے، جو مسلسل سامنے آتا رہتا ہے، دنیا کی زندگی کا نظام اسی بنیاد پر قائم ہے، تو کیا صرف یہی نظام ہے، جو ہماری نگاہوں میں آتا رہتا ہے، ہماری عقل اس کا ادراک کرتی رہتی ہے، اس کی گتھیاں کبھی سلجھتی ہیں، کبھی الجھتی ہیں۔ کبھی آدمی خوش ہوتا ہے کبھی رنج و تکلیف کے دریا میں ڈوبنے لگتا ہے؟ کیا یہ سب اسی نظام عالم کا کرشمہ ہے؟

اس سوال کا ایک جواب تو وہ ہے، جسے مادی دنیا دیتی ہے، یہ جواب مادہ پرستوں کے دماغ میں آتا ہے، جن کے نزدیک کائنات از اول تا آخر یہی سامنے کی کائنات ہے، جن کو نہ خدا سے مطلب ہے، نہ عقیدہ آخرت سے اور نہ غیبی حقائق سے! لیکن یہ جواب بہت ناقص، ناقابل تسلی، اور غیر اطمینان بخش ہے، اس جواب سے فطرت انسانی کو اطمینان تو کیا ہوتا، بے شمار سوالات اور سر ابھارنے لگتے ہیں۔

اس سوال کا ایک جواب وہ ہے جو خود خالق کائنات نے دیا ہے، خالق کائنات کے فرستادہ رسولوں نے اسے سمجھایا ہے، یہی جواب عین حق ہے، اسی سے انسانی فطرت تسلی اور سکون پاتی ہے، اس جواب کے بعد کوئی سوال باقی نہیں رہتا بلکہ جہد وعمل اور سعی وکاوش کا صحیح رخ متعین ہوجاتا ہے اور اس پر چل پڑنے کا حوصلہ بھی بیدار ہوجاتا ہے۔

اس سوال کے جواب کے لیے جب ہم قرآن وحدیث کی جانب رجوع کرتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سارے نظام کا آغاز کارعالم غیب میں ہے، وہیں احکام صادر ہوتے ہیں، وہیں انتظام مرتب ہوتا ہے، اور وہیں سے وقت وقت پر ان انتظامات کا نزول ہوتا ہے، اور ان سارے انتظامات پر اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک برگزیدہ مخلوق یعنی فرشتوں کو مقرر کر رکھا ہے، جو منشاء الٰہی سے ایک سر مو انحراف نہیں کرتے: **لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَا أَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُوْمَرُوْنَ۔**

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: **اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَہٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّھِمْ وَ یُوْمِنُوْنَ بِہٖ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ آمَنُوْا رَبَّنَا وَسِعْتَ کُلَّ شَیْئٍ رَحْمَۃً وَّعِلْماً فَاغْفِرْ لِلَّذِیْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِیْلَکَ وَقِھِمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ. رَبَّنَا وَأَدْخِلْھُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ نِ الَّتِیْ وَعَدْتَّھُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِھِمْ وَاَزْوَاجِھِمْ وَذُرِّیَّاتِھِمْ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ وَقِھُمُ السَّیِّئَاتِ وَمَنْ تَقِ السَّیِّئَاتِ یَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَہٗ وَذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ** (سورہ مومن ۷-۹) اور جو لوگ اٹھا رہے ہیں عرش، اور جو اس کے گرد ہیں، پاکی بولتے ہیں اپنے رب کی خوبیوں کے ساتھ، اور اس پر یقین رکھتے ہیں، اور گناہ بخشواتے ہیں، ایمان والوں کے، کہ اے ہمارے رب! آپ کی رحمت اور آپ کا علم ہر شئے کو وسیع ہے، پس ان لوگوں کی مغفرت فرمادیجئے، جنھوں نے توبہ کی، اور آپ کی راہ پر چلے اور انھیں جہنم کے عذاب سے بچالیجئے، اور داخل کیجئے ان کو بسنے کے باغوں میں، جن کا آپ نے ان سے وعدہ کیا ہے، اور جو کوئی نیک ہو ان کے باپوں میں اور عورتوں میں اور اولاد میں، بے شک آپ ہی ہے زبردست، حکمت والے ہیں، اور

بچائیے ان کو برائیوں سے، اور جن کو آپ بچادیں برائیوں سے اس دن، اس پر مہربانی کی آپ نے، اور یہ جو ہے، یہی ہے مراد پانی۔

آیت کریمہ بتارہی ہے کہ زمین میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کا تعلق صرف یہیں سے نہیں ہے، بلکہ فرشتوں کی ایک برگزیدہ جماعت ہے، جو عرش الٰہی کو تھامے ہوئے ہے، اور بہت سے فرشتے اس کے اردگرد مصروف طواف ہیں، یہ سب اللہ کی حمد وثنا کے ساتھ زمینی مخلوقات پر نگاہ جمائے ہوئے ہیں، اور ان میں جو صاحب ایمان ہیں، ان کے لئے مسلسل استغفار، دعائے رحمت اور دفع بلا کی درخواست کرتے رہتے ہیں، ظاہر ہے کہ فرشتے وہی کرتے ہیں، جس کا انھیں حکم ہوتا ہے، پس یہ سب کچھ وہ حکم خداوندی سے کرتے ہیں، ان کی دعاؤں کا اثر زمین پر اترتا رہتا ہے۔

ایسے ہی جو لوگ سرکش اور باغی ہیں، ان پر فرشتوں کی لعنت آتی ہے، فرماتے ہیں: إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللهِ وَالْمَلَا ئِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ (سورۂ بقرہ: ۱۶۱)۔ جو لوگ کافر ہوئے، اور کفر پر ہی مرگئے، ان پر لعنت اللہ کی ہے، فرشتوں کی، اور لوگوں کی، سب کی۔

معلوم ہوا کہ زمین پر جو کچھ ہو رہا ہے، اس کا سرا آسمان سے جڑا ہوا ہے، زمین تو ظہور کی جگہ ہے۔ ورنہ حقائق وہاں ہیں، جہاں انسان کی نگاہ نہیں پہونچ پاتی، چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ (سورۃ الذاریات: ۲۲) اور آسمان میں تمھاری روزی ہے، اور جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے، اس آیت میں مجاز نہیں ہے، حقیقت ہے، وہ یہ کہ روزی عالم غیب میں ہے، وہیں سے تدبیر اور انتظام سے اترتی رہتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ جب کسی امر کا فیصلہ کرتے ہیں تو عرش کو تھامنے والے فرشتے اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں، پھر اس آسمان والے فرشتے، جو ان سے متصل ہیں تسبیح پڑھتے ہیں، یہاں تک کہ یہ تسبیح آسمان دنیا کے فرشتوں تک آپہنچتی ہے، اور پوری

آسمانی دنیا تسبیح وتہلیل میں مشغول ہوجاتی ہے، پھر حاملین عرش سے ان کے قریب ترین فرشتے دریافت کرتے ہیں کہ پروردگار کا کیا حکم ہے؟ تب وہ انھیں بتاتے ہیں، اور اسی طرح آسمان والے فرشتے ایک دوسرے سے معلوم کرتے ہیں۔ (ترمذی شریف ج۲ص۱۵۴)

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ رات میں اٹھا اور اللہ نے جس قدر مقدر فرمایا تھا، میں نے نماز پڑھی، پھر مجھے اونگھ سی آگئی، اور نیند کی وجہ سے سر بوجھل ہوگیا، تو میں نے اپنے رب تبارک وتعالیٰ کو ایک اچھی صورت میں دیکھا، مجھ سے فرمایا: اے محمد! میں نے عرض کیا لبیک اے میرے رب، فرمایا کہ ملأ اعلی کس سلسلے میں بحث کررہے ہیں؟ میں نے عرض کی: مجھے معلوم نہیں، یہ بات تین مرتبہ فرمائی۔ فرمایا کہ پھر میں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا ہاتھ میرے دونوں مونڈھوں کے درمیان رکھا، اور میں نے انگلیوں کی ٹھنڈک اپنے سینے میں محسوس کی، پھر میرے سامنے ہر چیز روشن ہوگئی، اور میں نے بخوبی پہچان لیا پھر فرمایا اے محمد! میں نے عرض کی لبیک ربی! فرمایا ملأ اعلی کس مسئلے میں بحث کررہے ہیں؟ میں نے عرض کی: کفارات کے مسئلے میں، فرمایا وہ کیا ہیں، میں نے کہا، جماعت کی نماز کے لئے قدموں سے چلنا، نمازوں کے بعد مسجد میں بیٹھے رہنا، اور ناگواری کے اوقات میں پورا وضو کرنا، فرمایا اور کس چیز میں؟ میں نے کہا درجات کے بارے میں، فرمایا وہ کیا ہیں؟ میں نے کہا کھانا کھلانا، نرم کلام کرنا، اور رات میں نماز پڑھنی جب کہ لوگ سورہے ہوں۔ (احمد وترمذی تفسیر سورۂ ص)

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت فرماتے ہیں، تو جبرئیل کو بلاتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ میں فلاں بندے سے محبت رکھتا ہوں، تم بھی اس سے محبت کرو، پس تمام آسمان والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر اس کی مقبولیت زمین پر اترتی ہے، اور جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو ناپسند کرتے ہیں، تو جبرئیل کو بلاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میں فلاں سے نفرت کرتا ہوں، تم بھی اس سے نفرت کرو، پس وہ لوگ بھی اس سے متنفر ہوجاتے ہیں، پھر یہ نفرت اور یہ بغض زمین پر اترتا ہے، (مسلم شریف: کتاب

البر، باب اذا احب اللہ عبدہ)

ایک حدیث اور ملاحظہ ہو، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر روز جب صبح ہوتی ہے، تو دو فرشتے اترتے ہیں، ایک کہتا ہے **اللّٰھم اعط منفقاً خلفاً**، اے اللہ دینے والے کو عوض عطا فرمائیے، اور دوسرا کہتا ہے **اللّٰھم اعط ممسکاً تلفاً**۔ اے اللہ بخیل کے مال میں بربادی ڈال دیجئے (بخاری شریف: **الزکوٰۃ باب قول اللہ تعالیٰ ما من**)

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ حضرت نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ایک شخص کسی صحرائی زمین میں تھا، اس نے اوپر ایک بدلی کے اندر ایک آواز سنی کہ فلاں کے باغیچہ کو سیراب کرو، پھر وہ بدلی ایک طرف چلی، اور ایک پتھریلی زمین پر برس گئی، وہ سارا پانی ایک نالے میں جمع ہوا، اور بہہ پڑا۔ یہ شخص اس پانی کے پیچھے چلا کہ کہاں جاتا ہے؟ دیکھا کہ ایک آدمی اپنے کھیت میں بیلچے سے پانی پہونچا رہا ہے، اس نے پوچھا کہ بندۂ خدا! آپ کا کیا نام ہے؟ اس نے وہی نام بتایا جو اس نے بادل کی آواز سے سنا تھا، پھر اس نے پوچھا، اللہ کے بندے میرا نام کیوں پوچھتے ہو؟ کہا کہ میں نے اس بادل میں جس کا یہ پانی ہے، ایک آواز سنی تھی کہ فلاں کا باغ سیراب کرو، اس میں آپ کا ہی نام تھا، تمھارا اس کھیتی میں کیا عمل ہے؟ اس نے کہا کہ جب تم نے پوچھ ہی دیا ہے، تو سنو! میں اس کی پیداوار کو دیکھتا ہوں، اور ایک تہائی صدقہ کر دیتا ہوں، ایک تہائی اپنے اہل وعیال کے لئے رکھتا ہوں، اور ایک تہائی اس باغ میں واپس کر دیتا ہوں۔ (مسلم شریف **الزھد باب الصدقة علی المساکین**)

قرآن کی آیت کریمہ اور ان تمام حدیثوں سے یہ بات وضاحت سے سمجھ میں آتی ہے کہ عالم میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کا ابتدائی سرا یہاں نہیں، عالم غیب میں ہے جس طرح برقی قمقمے جلتے کہیں ہیں، اور بجلی آتی کہیں اور سے ہے، اگر قمقمہ بجھ جائے، تو اس پر کوئی توجہ نہیں کرتا، بجلی کی جانب رخ کیا جاتا ہے، اسی مثال پر سمجھئے، کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے، یہ ایک وجود ظاہر ہے، اسے ظاہر کرنے والا کوئی اور ہے، اور اس کا مرکز ظہور کہیں اور ہے۔

یہاں سے اہل دنیا، اور اہل ایمان الگ الگ ہوتے ہیں، اہل دنیا صرف ظاہر کو

دیکھتے ہیں، اور اسی میں الجھے رہتے ہیں، حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غَافِلُوْن (سورۃ الروم:۷) یہ لوگ دنیوی زندگی کے صرف ظاہر کو دیکھتے ہیں، اور آخرت سے یکسر غافل ہیں، یعنی یہ لوگ دنیا کو، اس کے کمانے کے طریقوں کو، اس کے حالات کو تو خوب جانتے ہیں، اور اس سلسلے میں مہارت رکھتے ہیں، لیکن دین کے معاملے میں، اور آخرت میں کیا چیز نافع ہے، اس سے بالکلیہ جاہل اور مغفل ہیں، نہ انھیں اس کی ذہانت حاصل ہے، اور نہ کچھ فکر ہے۔

لیکن ایمان والوں کا حال یہ نہیں ہے، وہ اس دنیا کے حجابات ظواہر سے گزر کر عالم غیب پر نگاہ جماتے ہیں، اور اس پر ایمان رکھتے ہیں، وہ دنیا کے ضرر کو اور یہاں کے نقصان کو سمجھتے ہیں، لیکن ساتھ ہی یہ بھی دیکھتے ہیں کہ آخرت میں اس کا عوض بہت بڑے نفع کی شکل میں ملنے والا ہے، تو وہ چھوٹے نقصان کو بڑے نفع کے یقین پر بآسانی گوارا کر لیتے ہیں، اسی طرح وہ دنیا کے مصائب، تکالیف، دنیا والوں کے ظلم وستم کو دیکھتے ہیں، قحط سالی، بے روزگاری، کاروبار میں گھاٹا، روزی کی تنگی، اور طرح طرح کے امراض سب دیکھتے ہیں، مگر یہ جانتے ہیں کہ ان سب کے نزول کا سرچشمہ کہیں اور ہے، پھر وہ دنیا کی ان الجھنوں میں گرفتار ہونے کے بجائے اسی مرکز ظہور کا رخ کرتے ہیں، اور اس رخ کرنے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اپنا ایمان تازہ کرتے ہیں، اپنے اعمال واخلاق کا جائزہ لیتے ہیں، نامناسب چیزیں اپنے سے دور کرتے ہیں، بدن پر مکھی بار بار بیٹھتی ہے، تو عقل مند مکھی کو الزام نہیں دیتا، وہ دیکھتا ہے کہ جہاں مکھی بیٹھ رہی ہے، وہاں کوئی گندگی تو نہیں ہے، پھر اسے گندگی نظر آجاتی ہے، تو اسے صاف کر دیتا ہے، اور مکھی اڑ جاتی ہے، اسی طرح مومن کسی نامناسب چیز کی یلغار دیکھتا ہے، تو اس الجھن میں نہیں پڑتا کہ یہ نامناسب کیا ہے؟ اسے الزام نہیں دیتا، وہ اس چیز کو دیکھتا ہے، جس پر یہ نامناسب چیز ٹوٹی پڑ رہی ہے، پھر وہ اسے دور کرتا ہے، توبہ کرتا ہے، معافی چاہتا ہے، اپنے احوال کو بدل لیتا ہے۔ پھر اس نامناسب چیز سے نجات بھی پالیتا ہے، اور جتنا جھیل چکا ہے، اس پر بے اندازہ اجر وثواب کا بھی مستحق ہوجاتا ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد

فرماتے ہیں کہ: **الا من تاب وعمل صالحاً فاولئک یبدل اللہ سیئاتھم حسنات وکان اللہ غفوراً رحیماً** (سورۃ الفرقان: ۷۰) مگر جو اللہ کے حضور رجوع کرے، اور اچھا عمل کرے، تو اللہ تعالیٰ اس کی برائیوں کو اچھائیوں سے بدل دیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ مغفرت کرنے والے رحم کرنے والے ہیں۔

دنیا والوں، اور اہل ایمان کے نظریے اور عمل میں کتنا فرق ہے؟ اس پر غور کیجئے، ظاہر کو پکڑ کر اس کی الجھن میں گرفتار ہونا سرے سے غلط، بلکہ حماقت ہے۔ ایسے لوگوں سے زیادہ سمجھدار تو وہ کتا ہے، جسے لاٹھی، یا پتھر سے مارا گیا، وہ دیکھ رہا ہے کہ بدن پر چوٹ لاٹھی سے یا پتھر سے لگی ہے، لیکن جذبۂ انتقام میں نہ وہ لاٹھی پر حملہ کرتا اور نہ پتھر کو کاٹتا، وہ لاٹھی مارنے والے کی طرف دوڑتا ہے، یا اس سے بھاگتا ہے، ظاہری مصائب کی الجھن میں گرفتار ہونا اور اس کی تحقیقات میں مبتلا ہونا، محض لغو ہے، یہ طریقہ کفار کا ہے، اور اہل دنیا کا ہے، کافر ہی مطلق اہل دنیا ہوتا ہے۔

اہل دنیا کافران مطلق اند　　　روز وشب در زق زق ودر بق بق اند

کافر مطلق اہل دنیا ہیں، یہ رات دن زق زق اور بق بق میں ہیں۔

اہل ایمان ایسے نہیں ہوتے، ان کی سوچ، ان کا عقیدہ، ان کا عمل اور ان کی نظر، حجابات دنیا سے بلند اور بہت بلند ہوتی ہے، مومن دیکھتا ہے کہ عالم غیب میں ایک مکمل انتظام ہے، حکم الٰہی فرشتوں پر اترتا ہے، پھر اللہ کی یہ فوج اس حکم کی تعمیل ونفاذ میں اپنی اپنی استعداد کے مطابق لگ جاتی ہے۔ کوئی دعاء واستغفار کرتا ہے، کوئی مجرموں پر لعنت کرتا ہے، کوئی اس کی خبر آسمانوں کو پہنچاتا ہے، کوئی اسے زمین پر لے کر آتا ہے۔

مومن قرآن وحدیث کی خبر کے مطابق اپنے دید ومشاہدہ سے بڑھ کر اس حقیقت کا یقین کرتا ہے، پھر وہ مصائب کی بوچھار میں صبر ورضا کے ساتھ حق تعالیٰ کی جناب میں تضرع وزاری کرتا ہے اور استغفار اور اصلاح اعمال میں لگ جاتا ہے، یہاں تک کہ مصائب کی یہ بدلیاں چھٹ جاتی ہیں، اور اس کا دل توبۂ واستغفار کے آب زلال سے غسل کرکے تازہ دم

اور طاقت ور ہوجاتا ہے، پھر وہ دم بدم نعمتوں کا مشاہدہ کرتا ہے، اوراس کے قلب وزبان سے حمد وشکر کے زمزمے بلند ہوتے ہیں جب تک حمد وشکر میں وہ اوراس کے اخلاف مشغول رہتے ہیں، نعمتوں کا سلسلہ رکتا نہیں بڑھتا اور پھیلتا رہتا ہے: **لئن شکرتم لازیدنکم** (سوہ ابراہیم: ۷)، اگرتم شکرادا کروگے تو ہم بڑھاتے رہیں گے، اوراس سے پہلے وہ صبر کرکے اجر بے حساب حاصل کرچکا ہے، **انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب** (سورہ الزمر: ۱۰) صبر کرنے والوں کوان کا اجر بغیر حساب کے پورا پورا ادا کیا جاتا ہے۔

غرض مومن کی سوچ الگ ہے، اوراس کی بنیاد پراس کا عمل اوراس کے دل کا حال الگ ہے، خدانہ کرے کوئی مومن، اہل دنیا کے طرز پرسوچنے لگے پھرالجھنوں کا کوئی علاج نہیں ہوگا۔ ظاہری دنیا میں الجھنیں ہی الجھنیں ہیں، مسائل ہی مسائل ہیں، مال ہے تواس کی حفاظت اوراس میں اضافہ کی فکرایک دردسر ہے، مال نہیں ہے، توغربت وافلاس کی بےبسی ہے، پھرعزت وذلت کا مسئلہ ہے، صحت ومرض کی الجھن ہے، دوست ودشمن کا چکر ہے، اللہ ہی جانتا ہے کیا کیا مسائل ہیں۔ مگرمومن ان ساری الجھنوں اورفکروں کوسمیٹ کر بلکہ ان سے قطع نظر کرکے ان کے سرچشمہ تک جاپہونچتا ہے، جوایک ہی بارگاہ ہے، وہاں تمام الجھنیں اسے چھوڑکرالگ ہوجاتی ہیں، اور وہ خوش وخرم اور مطمئن ہوجاتا ہے، اور اگر خدانخواستہ وہ کافرانہ اوردنیادارانہ طرزفکر میں مبتلا ہوکران الجھنوں میں ہی تہ وبالا ہوتا رہا، تو اس کی زندگی، اوراس کا قلب بلکہ اس کا پورا وجود، نہیں بلکہ اس طرز کا پورا معاشرہ کنکھجورے کے ہزار پاؤں میں پھنسا اضطراب میں لوٹتے لوٹتے، دم توڑدیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں رکھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، ان کا روئے سخن خاص طور پر علماء کی طرف ہے، فرماتے ہیں: **سمعت نبیکم ﷺ یقول من جعل الھموم ھما واحدا ھم آخرته کفاہ اللہ دنیاہ ومن تشعبت به الھموم في احوال الدنیا لم یبال اللہ في اي اودیتھا ھلک** (ابن ماجہ مقدمہ: باب انتفاع بالعلم والعمل بہ)

کہ میں نے تمھارے نبی ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس نے اپنی تمام فکریں سمیٹ کر ایک فکر بنائی یعنی آخرت کی، تو اللہ تعالیٰ اس کی دنیا کے لئے کافی ہوتے ہیں، اور جس کے تفکرات نے دنیا کے احوال میں اسے منتشر رکھا، تو اللہ کو کوئی پرواہ نہیں کہ وہ کس کھڈ میں گر کر ہلاک ہوتا ہے۔

یہ علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ اہل ایمان کو دنیا کی حقیقت سے آگاہ کر کے، ان کی سوچ اور فکر کو اللہ کی طرف، عالم غیب کی طرف اور آخرت کی طرف موڑ دیں تاکہ قلب کو دنیاوی آہ و واویلا سے پناہ ملے، ورنہ نہ جانے ایمان رکھنے والے یہ بندے دوسروں کو دیکھ دیکھ کر کن کن وادیوں میں بھٹکتے پھریں گے۔

(جولائی ۲۰۰۷ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسوۂ نبوی کی جامعیت

> مولانا سیّد عزیز الرحمٰن صاحب پاکستان کے ایک جواں سال صاحب قلم عالم ہیں، انھوں نے ایک کتاب ''درس سیرت'' کے نام سے لکھی ہے، یہ اسوۂ حسنہ کے ایک موضوع اخلاق اور اس کے متعلق امور پر ایک جامع، پُر مغز اور مفید کتاب ہے، اس کتاب کے ہندوستانی ایڈیشن کیلئے یہ سطریں بطور تمہید کے لکھی گئیں، یہ کتاب اسلامک بک فاؤنڈیشن، حوض سوائیوان، دہلی سے شائع ہوگئی ہے۔

خالق کائنات نے انسان کو خلاصۂ کائنات بنایا، احسن تقویم میں اس کی تخلیق کی، دل دیا، دماغ دیا، عقل وشعور کا سرمایہ بخشا، احساسات وجذبات کی قوت عطا فرمائی، کائنات کی چیزوں پر تصرف کا اختیار دیا، پھر حیات وموت کو وجہ امتحان بنایا۔ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً، دیکھیں کردار وعمل کے لحاظ سے کون بہتر ہے، احسن ہے۔

کردار وعمل کی یہ بہتری، جو اللہ تعالیٰ کے یہاں مطلوب ہے، اس کا معیار کیا ہے؟ انسانیت کے فضل وشرف کی کسوٹی کیا ہے؟ اس سوال کا اصولی جواب یہ ہے کہ کردار وعمل، بہتر وہ ہے، جو حق تعالیٰ کو پسند آجائے، انسانیت کی معراج یہ ہے کہ بارگاہِ حق میں محبت وقبولیت سے سرفراز ہوجائے۔

پیا جس کو چاہے سہاگن وہی ہے

پیا کس کو چاہتا ہے؟ اللہ کی کتاب پڑھئے! آپ اوّل تا آخر پاتے چلے جائیں گے کہ اللہ تعالیٰ کسے چاہتے ہیں؟ ان کے پسندیدہ اور مقبول بندوں کے اوصاف واحوال، افکار واعمال کیا کیا ہیں؟ بندہ جب بندہ ہے، تو بندگی کے تقاضے کیا کیا ہیں؟ اور انھیں کس طرح بجالائے، اپنے خالق ومالک کے حق میں اس کے قلب کا کیا حال ہو؟ محبت ہو، تو آدابِ

محبت کیا ہوں؟ عبادت ہو، تو حق عبادت کیا ہو؟ اطاعت ہو، تو جذبۂ اطاعت کیا ہو؟ اخلاق ہو، تو حسن اخلاق کیا ہو؟ ان تمام سوالوں کا جواب قرآن کریم میں پانے والے پاتے ہیں، لیکن ان سب جوابوں کی عملی تشکیل کس طرح ہو، تا کہ علم کے ساتھ ڈھونڈھنے والا عملی صورت بھی پالے، پھر اسے ہمت وحوصلہ بھی اور حسن عمل کا راستہ بھی مل جائے، اور نمونہ دیکھ کر کام کرنے کا سلیقہ بھی آجائے۔

حق تعالیٰ نے اپنے بندوں پر مہربانی فرمائی۔ علم تو اتارا ہی، ساتھ میں عملی تشکیل کا نمونہ بھی بھیجا، اگر یہ نمونہ نہ ہوتا تو علمی احکام ومسائل، عمل کا پیکر جمیل نہ اختیار کر پاتے، یہ نمونہ خود حق تعالیٰ نے بنایا، سنوارا اور سجایا، پھر اسے پسند کیا، اس پر رضامندی کا اظہار فرمایا، پھر سب کو حکم دیا کہ اسی نمونہ پر اپنے کو ڈھالتے چلے جاؤ، انسانیت جس قدر اس نمونے کے قریب ہوگی، بارگاہِ حق میں اتنی ہی پسندیدہ ہوگی، حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ○ (سورۃ الاحزاب:) تمہارے لئے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے، اس شخص کیلئے جو اللہ (سے ملنے) کی اور آخرت کے دن کی امید رکھتا ہے، اور اللہ کو بہت یاد کرتا ہے۔

یعنی جس کسی کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی رہیں، آخرت میں کامیاب وسرخ رو ہو، اور زندگی کے ہر لمحے میں اللہ کو یاد رکھتا ہو، اس کے لئے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ایک بہترین نمونہ ہیں، اسی نمونہ پر اپنی صورت وسیرت، اخلاق وکردار، افکار وخیالات، عقائد ونظریات کو ڈھالتا چلا جائے، حسین سے حسین تر ہوتا چلا جائے گا، اس کے جمال سے دنیا چمک اٹھے گی۔

حق تعالیٰ کا ایک اور ارشاد ملاحظہ ہو: قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَحِيْمٌ (آل عمران:) اے رسول تم یہ بات لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم لوگ اللہ کی محبت رکھتے ہو، تو میرا اتباع کرو، پھر اللہ تعالیٰ تم

سے محبت فرمائیں گے، اور تمہاری غلطیوں کو معاف کردیں گے، اور اللہ تعالیٰ تو ہیں ہی مغفرت کرنے والے، رحم فرمانے والے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صراحۃً حکم دیا ہے کہ، اس نمونۂ کامل کے قدم بقدم چلے آؤ، اللہ تعالیٰ اپنی محبت وعنایت سے نوازیں گے، اور اس کے بعد اگر کمزوری کی وجہ سے کچھ غلطی ہو جائے گی تو اس سے درگزر فرمائیں گے۔

ان دونوں ارشاداتِ الٰہی سے معلوم ہوا کہ زندگی کے ہر نشیب وفراز میں اور ہر مرحلے میں رسول اکرم ﷺ انسانیت کے صلاح وفلاح کے لئے نمونۂ کامل ہیں، یہی چیز رضاء خداوندی، فلاحِ آخرت، تحصیل محبت الٰہی کیلئے براہ راست یقینی اور قطعی ذریعہ ہے۔

☆☆☆☆☆

کسی نمونہ پر ڈھلنے اور اس کی کامل پیروی کرنے کے لئے ضروری ہے، کہ وہ بتمام وکمال ہمہ وقت آدمی کے پیش نظر رہے۔ اگر ایسا نہ ہو، بلکہ نمونہ کا کچھ جز پیش نظر ہو اور کچھ غائب ہو تو اتباع ہرگز نہ ہو سکے گا، اللہ نے اپنے آخری رسول کو جب نمونۂ کامل بنایا، اور ان کی پیروی اور اتباع کا حکم دیا، تو اس کا انتظام بھی فرمایا، کہ تلاش کرنے والوں کے سامنے نمونے کے تمام اجزاء اپنی اصلی ہیئت میں موجود ہوں، آپ کی حیاتِ طیبہ میں، آپ کے اصحاب کے لئے آپ سے ہمہ وقتی استفادہ علماً بھی اور عملاً بھی بہت آسان تھا، لیکن بعد والوں کے لئے بھی حق تعالیٰ نے آپ کے اُسوۂ حسنہ کو اس جامعیت کے ساتھ محفوظ فرمادیا ہے، کہ زندگی کا کوئی مرحلہ، کردار وعمل کا کوئی موڑ، معاشرہ کی کوئی پیچیدگی، طبیعت انسانی کی کوئی الجھن، امید وبیم کی کوئی کشمکش، دوستی ودشمنی کی کوئی نزاکت اور خاندانی تعلقات کی کوئی گرہ ایسی نہیں ہے، جس کی رہنمائی آپ کے اُسوۂ حسنہ میں نہ ملتی ہو۔

مدرسہ کی تعلیم سے رسمی فراغت کے بعد جب دینی مدارس کے ماحول میں، اور اس کے ساتھ عامۃ الناس کے معاشرہ میں کام کرنے کا اس خاکسار کو موقع ملا، تو شدت سے احساس ہوا کہ زندگی کی ہر راہ اور راستے کے ہر موڑ پر، اسوۂ نبوی کو تلاش کرنا چاہئے۔ چنانچہ

متواتر تین چار سال تک اسے موضوع بنا کر مطالعہ کرتا رہا، اور کہیں بھی ناکامی کا سامنا نہیں پڑا، ہر راہ روشن تھی، ہر مرحلہ اجالا تھا، قلب و دماغ میں جو الجھن بھی آئی، اسوۂ حسنہ نے اسے بخوبی حل کیا، لکھنے لکھانے کا ذوق نہیں تھا، ورنہ اگر اس وقت حاصل مطالعہ ضبط کئے ہوتا، تو ایک کارآمد چیز وجود میں آجاتی، مگر کیا ہوا؟ لکھنے والوں نے بہت کچھ لکھا ہے، کوئی تلاش کرنے والا اور پڑھنے والا تو ہو۔

کسی کو اللہ کی رضا و خوشنودی کی فکر ہو، آخرت اس کے پیش نظر ہو، اللہ کی یاد اس کے دل میں بسی اور زبان اس سے تروتازہ ہو، اس کے سامنے اسوۂ حسنہ کا جلوہ تمام تفصیلات کے ساتھ موجود ہے۔

☆☆☆☆☆

حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں صاحب اسوۂ حسنہ رسول کریم ﷺ کو ایک حکم دیا ہے، اگر غور کیجئے، تو اسوۂ حسنۂ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی روح اسی حکم کی تعمیل ہے، حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ لَاشَرِيْكَ لَهُ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (سورۃ الانعام:) تم کہو کہ بلاشبہ میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ کے لئے ہے، جو سارے جہان کا پروردگار ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے، اور مجھے اسی بات کا حکم دیا گیا ہے، اور میں اسے اول تسلیم کرنے والا ہوں۔

عبادت ہو، معاشرت ہو، اخلاق و معاملات ہوں، ایفائے عہد ہو، صدق مقال ہو، رحمدلی و مہربانی ہو، سخاوت و فیاضی ہو، دوستی و دشمنی ہو، صلح ہو، جنگ ہو، جان لینی ہو، جان دینی ہو، ہتھیار اٹھانا ہو، ہتھیار ڈالنا ہو، محبت ہو، نفرت ہو، عمل ہو، ترکِ عمل ہو، حلم ہو، غضب ہو، غرض زندگی کی کوئی شان ہو، کوئی حرکت و عمل ہو، سب کا داعیہ اور سب کی علت غائیہ اللہ کی رضا کا حصول ہو۔

آدمی کبھی اپنے طبعی مزاج کے زیر اثر کوئی عمل کرتا ہے، اخلاق برتتا ہے، کبھی اپنے

حوصلے کی بلندی کے باعث اوچھی حرکتوں سے اجتناب کرتا ہے، کبھی سوسائٹی میں اپنے وقار وعزت کے لئے کوئی بڑا کام کرتا ہے، یہ سارے کام اپنے ظاہر اور اپنی صورت کے لحاظ سے خوبصورت اور قابل تعریف ہوتے ہیں، مگر روح نہ ہونے کی وجہ سے ان کا درجہ محض مزاج اور عادت کا ہوکر رہ جاتا ہے، بارگاہِ حق میں قبولیت کی لیاقت ان میں نہیں ہوتی، عادت اور طاعت وعبادت میں بہت فرق ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ مشہور برگزیدہ صحابی ہیں، فرماتے ہیں کہ **سئل رسول الله** ﷺ **عن الرجل يقاتل شجاعةً، ويقاتل حميةً، ويقاتل رياءً أى ذٰلک فی سبيل الله،** رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ ایک آدمی بہادری کے جذبے کی بنا پر لڑتا ہے، ایک آدمی خاندانی غیرت کی بنا پر لڑتا ہے، ایک آدمی دکھاوے کے جذبے سے لڑتا ہے، ان میں کون اللہ کی راہ میں ہے؟ فرمایا: **من قاتل لتكون كلمة الله هى العليا فهو في سبيل الله**، جو اس لئے لڑا کہ اللہ کی بات بلند ہو، وہ اللہ کی راہ میں ہے۔ (بخاری شریف: رقم الحدیث ۴۷۵۸، کتاب التوحید۔ مسلم شریف: رقم الحدیث ۱۹۰۴، **باب من قاتل لتكون كلمة الله هى العليا**)

جہاد وقتال بڑی عبادت ہے، اور بہت بلند مرتبہ عمل ہے، لیکن اگر رضائے الٰہی مقصد نہیں، تو اس کا ڈھانچہ ایک بے جان ڈھانچہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے ہر عمل، ہر ترک، ہر اخلاق، ہر سختی اور ہر نرمی کی روح یہی حصولِ رضائے الٰہی ہے۔

☆☆☆☆☆

جب رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا ہر لمحہ، ہر عبادت، ہر قربانی کا مقصد بلند رضائے الٰہی کا حصول ہے، تو جب آپ کی پیروی کا حکم امت کو دیا گیا، تو اس کی بنیاد اور روح بھی یہی مقصد ہے، چنانچہ اللہ کے اس ارشاد میں غور کیجئے کہ: **قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ**، اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو، تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت فرمائیں

گے۔ اس آیت کریمہ میں اللہ کی محبت کے حوالے سے اسوۂ حسنہ کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے، یہ اس باب میں صراحت ہے کہ پیروی کا داعیہ، محبت الٰہی ہے، اور یہی داعیہ خود اسوۂ حسنۂ نبوت کی بھی بنیاد ہے، پس اس داعیہ میں بھی اتباع مطلوب ہے، یعنی آپ کے نقش قدم پر چلیں تو اللہ کی محبت میں اور اس کی رضا کے حصول کیلئے چلیں۔

اسی طرح وہ آیت جس میں اللہ تعالیٰ نے آپ کے اسوۂ حسنہ کا تذکرہ کیا ہے، اس میں فرماتے ہیں کہ: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَاللّٰهَ كَثِيْراً ○ (سورۃ الاحزاب:) اس میں اس بات کی تصریح ہے کہ آپ کا اسوۂ حسنہ ان لوگوں کیلئے ہے، جو اللہ کی رضا کی اور اس سے ملنے کی امید رکھتے ہیں، اور جنھیں آخرت کی فکر ہے، اور جو لوگ اللہ کا بکثرت ذکر کرتے ہیں۔

یہ ایک بنیادی نکتہ ہے، جسے اسوۂ رسول کا مطالعہ کرنے والے بھی پیش نظر رکھیں، اسے بیان کرنے والے اور اس پر مضامین لکھنے والے بھی فراموش نہ کریں، اور پیروی کرنے والے بھی اس سے غافل نہ ہوں۔

یہی چیز نہ ہوگی، تو خواہ کوئی عمل ہو، نماز ہی کیوں نہ ہو، سخاوت ہی کیوں نہ ہو، اخلاقِ عالیہ ہی کیوں نہ ہوں، ایک عادت ہے، مزاج ہے، طبیعت ہے، رسول کا اسوۂ حسنہ نہیں ہے، اس کی صرف شکل ہے، اس لئے یہ بنیاد ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہئے۔

☆☆☆☆☆☆☆

مولانا سیّد عزیز الرحمٰن صاحب کی کتاب ''درس سیرت'' اسوۂ حسنہ کے ایک موضوع اخلاق اور اس کے متعلق امور پر ایک جامع، پُر مغز اور مفید کتاب ہے، اخلاق سے متعلق مختلف عنوانات پر دروس ہیں، جو نہ اتنے مختصر ہیں کہ بات تشنہ رہ جائے، اور نہ اتنے مفصل ہیں کہ پڑھنے والا اکتا جائے، اطناب و ایجاز کے درمیان متوسط اور معتدل انداز کے اسباق ہیں، جو جامع بھی ہیں اور سہل بھی، اسوۂ حسنہ کی روشنی میں زمانہ کے حالات کا تجزیہ بھی ہے، اصلاحی امور کی نشاندہی بھی، اتباع سنت کی دعوت بھی ہے، اس کے مطالعہ سے

جہاں آپ کی تعلیمات کی گہرائی اور گیرائی کا سراغ ملتا ہے، وہیں آپ کی ذاتِ گرامی سے محبت اور اس کے نتیجے میں آپ کی اطاعت کا جذبہ بھی بیدار رہتا ہے۔ یہ کتاب اس لائق ہے کہ ہر گھر میں ہو، اور ہر روز اس کا ایک ایک درس پڑھا جائے، گھر والوں کو سنایا جائے، اور ہر روز تجدید عزم کی جائے کہ آپ کی ان تعلیمات کو بہ نیت رضاء الٰہی عمل میں لایا جائے گا۔

جو شخص آپ کی سیرت اور آپ کے اخلاق سے جس قدر مشابہت پیدا کرے گا، حق تعالیٰ کے اتنے ہی نزدیک ہوگا، اسے خالق کے یہاں بھی اور مخلوق کے نزدیک بھی محبوبیت حاصل ہوگی۔

کتاب کے اسباق کے مطالعے کے ساتھ ایسی زندہ شخصیتیں بھی تلاش کی جانی چاہئیں، جنھوں نے اپنی زندگی کا مقصد اتباع سنت اور اس کے طفیل رضائے الٰہی کو بنا رکھا ہو، کیونکہ آدمی مطالعۂ کتب سے کم اور عملی نمونوں سے زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے، ایسے بزرگوں کی صحبت میں اتباع سنت کا شوق بھی پیدا ہوتا ہے، اس کا سلیقہ بھی حاصل ہوتا ہے، اور اللہ و رسول کی محبت بھی زندہ ہوتی ہے۔

علامہ سیّد محمد انور شاہ محدث کشمیری کے تلامذہ قرآن و حدیث میں اسوۂ رسول جو کچھ پڑھتے تھے، اپنے استاذ کی زندگی میں ہو بہو وہی پاتے تھے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد صاحب مدنی کے تلامذہ اپنے استاذ و شیخ کے عمل سے احادیث کی شرح اور تفصیل و تشکیل پاتے تھے، پھر ان کے لئے اتباع سنت سہل بھی ہوتا تھا، اور اس کا سلیقہ بھی پیدا ہوتا تھا۔

اللہ تعالیٰ توفیق دیں، سہل فرمائیں، اور ان نمونوں کو عام کریں۔ آمین

(اگست ۲۰۰۷ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سیرت طیبہ کے دو اہم پہلو: ذکر اور حلم

الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام علىٰ رسوله خاتم النبيين وعلىٰ أصحابه الطيبين المهتدين أمابعد!

انسان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے خوب سے خوب تر کی تلاش ہوتی ہے، اسے ایک چیز ملتی ہے، وہ اسے پسند آتی ہے، پھر اسے دوسری چیز ملتی ہے جو پہلی سے بڑھ کر خوبصورت اور مفید ہوتی ہے، تو اسے لے لیتا ہے، اور پہلی چیز کو چھوڑ دیتا ہے، کیونکہ اس سے خوب تر چیز اسے مل گئی، اسی طرح ترک واختیار کا معاملہ چلتا رہتا ہے، عروج وترقی کی تمام عمارتیں اسی بنیاد پر قائم ہیں، وہ دیکھتا رہتا ہے، سراپا جستجو بنا رہتا ہے، پھر اسے کوئی بہتر چیز مل جاتی ہے، جھونپڑے میں رہنے والا آدمی محل تلاش کرتا ہے، چیتھڑے لپیٹنے والا فقیر لباسِ فاخرہ کی جستجو میں رہتا ہے، غربت، امارت کے پیچھے دوڑتی ہے، جہالت کو علم کی تلاش ہوتی ہے، کہا جاتا ہے کہ دنیا اسی طریقۂ عمل سے بامِ عروج پر پہونچتی جارہی ہے، دنیا نے کہاں سے کہاں تک ترقی کرلی، پاؤں سے چلنے والا انسان فضاؤں میں پرواز کررہا ہے، سطح دریا پر کشتی چلانے والا ملاح پانی کی تہوں میں اتر کر جہاز چلا رہا ہے، فضا میں منتشر ہوجانے والی آواز ہی کو نہیں دور دراز کی صورتوں کو بھی ایک چھوٹے سے ڈبے میں گرفتار کرکے تماشا دکھاتا ہے، بڑے بڑے کتب خانوں کو چھوٹی چھوٹی پلاسٹک جیسی تھیلیوں میں بھر لیتا ہے، غرض مادی دنیا کے ہر شعبے میں خوب سے خوب تر کی تلاش میں آدمی نہ جانے کہاں سے کہاں پہونچ گیا ہے۔

لیکن کیا دنیا صرف وہی ہے، جو انسان اپنے وجود کے باہر دیکھتا ہے، جس میں اس کا مادی وجود یعنی بدن جو گوشت وپوست اور ہڈی اور خون سے مرکب ہے، شامل ہے۔ کیا

دنیا اتنی ہی ہے، یا انسان کا کوئی ذہنی اور روحانی وجود بھی ہے، جس کے تقاضے مادی دنیا سے علیٰحدہ ہیں، اور جس کے نتائج وآثار کچھ دوسری طرح کے ہیں، انسان کا مادی وجود خوراک اورلباس چاہتا ہے، سر چھپانے کے لئے مکان چاہتا ہے، بقائے نسل کیلئے جوڑا چاہتا ہے، پھر اسی دائرے میں خوب سے خوب تر تلاش کرتا ہے، یہاں تک کہ اس دائرے کو وہ اتنا پھیلاتا ہے کہ کائنات اسے تنگ معلوم ہونے لگتی ہے، آج کے دور میں انسان کو جسمانی ضروریات کی تکمیل وتحسین میں اتنا غلو اور انہماک ہوگیا ہے کہ شاید وہ تھوڑی دیر کے لئے بھی یہ سوچنے کی مہلت نہیں پاتا کہ اس ظاہری اور مادی دنیا کے ماورا ایک اور دنیا اس کے باطن میں آباد ہے، جس کی وسعت کے سامنے یہ مادی دنیا ہیچ ہے، اس باطنی دنیا میں بھی اسے خوب سے خوب تر تلاش کرنا چاہیۓ، مگر ادھر سے صرف غافل ہی نہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسے اس سے انکار ہے، وہ لوگ جو خدا سے دور ہیں، مشرک ہیں، ان کا کیا ذکر، خود وہ جو اسلام وایمان والے ہیں، انکے احوال بھی بظاہر بصورت انکار ہی ہیں، یا کم ازکم غفلت کا شکار ضرور ہیں۔

دنیا والوں کے سامنے مادی ساز وسامان اور جسمانی تقاضوں کی فراہمی کا مسئلہ ہوتا ہے، تو ان کے مراکز تک پہونچتے ہیں، کسی بازار میں، کسی دکان میں، کسی کمپنی میں، کسی صاحب ثروت ودولت کے پاس، کسی کارخانے اور فیکٹری میں، اور دنیا میں ان چیزوں کی اتنی بہتات ہے کہ قدم قدم پر یہ مراکز ملتے جاتے ہیں، اور آدمی اپنی ضرورت پوری کرلیتا ہے، لیکن جس دنیا کا تذکرہ یہاں کیا جارہا ہے، روحانی دنیا، باطنی دنیا، اس کے تقاضے کیا ہیں؟ اس کا ساز وسامان کیا ہے؟ اس کا مرکز کہاں ہے؟ اس کی اہمیت کیا ہے؟ خود یہ دنیا کیا ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ خود انسان کیا ہے؟ کیا وہ عام جانداروں کی طرح ایک جاندار مخلوق ہے، جس کو آسودگی شکم، تکمیل شہوت، راحت رسانی جسم کے علاوہ اور کوئی کام نہیں؟ اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہے، تو روحانی دنیا اس کے لئے بے معنی چیز ہے؟ باطنی دنیا بغیر مفہوم اور حقیقت کے محض ایک لفظ ہے، لیکن ظاہر ہے انسان خواہ کتنا ہی

گر جائے، اس جواب کو کبھی تسلیم نہ کرے گا، وہ دوسری جاندار مخلوقات سے بالکل الگ ایک ایسی مخلوق ہے جس کو جسمانیت کے علاوہ اور بہت کچھ ملا ہوا ہے، جس کا وہ خوب احساس اور علم رکھتا ہے، اسی ”اور بہت کچھ“ کو ہم نے روحانی دنیا سے تعبیر کیا ہے، اس میں جب خوب سے خوب تر کی تلاش ہوگی، تو انسان کو انبیاء علیہم السلام کی بارگاہ میں حاضری دینی ہوگی، اور اب تمام انبیاء کی بارگاہوں کا ایک مرکز آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ خاتم النبیین کا دربار گہربار متعین ہو چکا ہے، روحانی دنیا کی بہتر سے بہتر چیز اور عمدہ سے عمدہ نمونہ اسی دربار میں ملے گا۔

انسان کیا ہے؟ زمین میں اللہ کا خلیفہ ہے، انسانِ اوّل آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے خلیفہ نامزد کر کے پیدا فرمایا تھا، ظاہر ہے کہ خلافت کا تعلق جسم و جسمانیت سے نہیں ہے، ورنہ انسانوں سے طاقتور اجسام اور بھی پائے جاتے ہیں، خلافت کا فریضہ عقل و فہم اور اندرونی طاقتوں سے تعلق رکھتا ہے، اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے اندر عجیب و غریب صلاحیتیں رکھی ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ انسان کے باہر کی دنیا، اندر کی دنیا کے تابع ہے، اگر اندر کی دنیا بگڑی ہوئی ہے تو باہر ہزاروں بناؤ کے باوجود بگاڑ اور سخت بگاڑ ہے، اور اس کے لئے کسی دلیل اور برہان کی حاجت نہیں، جس کا جی چاہے کھلی آنکھوں دیکھ لے کہ آج باہر کی دنیا کتنی روشن، تابناک، پُر بہار، سہولیات سے معمور اور اسباب و وسائل سے لبریز ہے، بظاہر راحت و آسائش کے سامان ایک سے بڑھ کر ایک ہیں، اور اتنے زیادہ ہیں کہ ہر طرف راحت ہی راحت ہونی چاہئے، لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ بالکل مطمئن ہے، اسے کوئی غم اور اندیشہ نہیں ہے، نہیں بلکہ جس سے پوچھئے اس کے دل میں اتر کر پوچھئے، تو بے ساختہ اس کے دل سے ایک دلدوز کراہ اور ہونٹ اور زبان سے ایک جاں گداز آہ نکلے گی، جیسے دنیا کا سارا سامانِ راحت اس کے لئے نہیں کسی اور کے لئے ہے۔

اندر کی اس دنیا کے بناؤ کیلئے اس مرکز پر پہونچنا ضروری ہوگا، جہاں بناؤ کا سب سے بڑا نمونہ موجود ہے، اور وہ مرکز ہے اللہ کے آخری نبی و رسول سیّدنا حضرت محمد ﷺ کی

سیرت طیبہ! یہ سیرت اتنی کامل ومکمل، اتنی حسین، اتنی طاقتور اور خوبیوں کے لحاظ سے اتنی ہمہ جہت ہے کہ اس کی نظیر کہیں اور نہیں ملے گی، آپ کو اللہ تعالیٰ نے ان تمام اوصافِ حمیدہ اور کمالاتِ علمیہ وعملیہ سے آراستہ کر کے بھیجا تھا، کہ اگر ان میں سے کوئی ایک فضیلت کسی کو حاصل ہو جائے تو وہ اعلیٰ درجہ کا انسان کہلائے گا۔

انسان جب زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے، تو اس کے لئے دو باتیں لازم ہیں، تاکہ خلافت کی ذمہ داریوں سے وہ عہدہ برآ ہو سکے۔ اوّل یہ کہ وہ جس کا خلیفہ ہے اس کے ساتھ اس کا تعلق سچا، مخلصانہ اور ہمہ وقتی ہو، تاکہ اس کی منشا کو ہمیشہ پورا کرتا رہے، اگر اسے خلیفہ بنانے والی ہستی سے سچا تعلق نہیں ہے، تو وہ ضرور خیانت کا مرتکب ہوگا۔ دوسرے یہ کہ خلافت کی اس ذمہ داری میں اس کے ساتھ جو لوگ شریک ہیں، ان کے ساتھ اس کے تعلقات صحیح اور منصفانہ ہو، اگر ایسا نہ ہوا تو وہ اپنے بھائیوں کے حق میں ظلم ڈھاتا رہے گا۔

سیرت انسانی کے یہ دو معیار ہیں، ان معیاروں کے درمیان درجات بہت ہیں، ان میں خوب سے خوب تر کی تلاش، انسان کو بہت بلند کرتی ہے، پھر اس ابتداء کے درمیان میں بہت سے مرتبے ہیں، اور آخر میں احسان کی کیفیت خود بہت بڑی وسعت رکھتی ہے، ان دونوں معیاروں پر جب ہم رسول اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ کو دیکھتے ہیں، تو ہر معیار اپنے درجۂ کمال پر نظر آتا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل بقدر ضرورت یہ ہے کہ روحانی بلکہ کہئے کہ انسانی کمالات کی بنیاد اللہ وحدہٗ لاشریک کی ذاتِ برحق پر سچا ایمان ہے، پھر خیر کے تمام برگ و بار اسی سے نکلتے ہیں، اسی کے واسطے سے حق تعالیٰ سے بندے کا ربط ہوتا ہے، اللہ کی عبادت و نیازمندی، اللہ کی رضا جوئی، اللہ پر توکل واعتماد، دنیا سے زُہد و استغنا اور عبودیت کے کمالات، یہ سب ایک شجرۂ ایمان کی شاخیں اور برگ و بار ہیں، اور ان سب کو ایک لفظ میں سمیٹا جائے، تو اسے ’’ذکرِ الٰہی‘‘ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، انسان کے قلب و دماغ میں اللہ کی یاد چھا جائے۔ ذکر اللہ کے دل میں چھا جانے کے بہت سے مراتب ہیں، ایمان سے اس کی ابتدا ہوتی ہے، اور

ترقی کرتے کرتے پھر یہ حال ہوتا ہے کہ زندگی کے کسی حال میں اس سے غفلت نہیں ہوتی، اٹھتے بیٹھتے، لیٹتے حتیٰ کہ سوتے وقت، غم میں، خوشی میں، تنگی میں، فراخی میں، کہیں بھی لحظہ بھر ذہول نہیں ہوتا، ہمہ وقت اس کے وجود پر اللہ کی یاد چھائی رہتی ہے، شاعر نے اپنی شاعرانہ زبان استعمال کی ہے، مگر ہے بالکل حقیقت!

میرا کمالِ عشق بس اتنا ہے اے جگر
وہ مجھ پہ چھا گئے میں زمانہ پہ چھا گیا

یاد کی یہ کیفیت جب راسخ ہوتی ہے، تو اسے مرتبۂ احسان کہتے ہیں، رسول اکرم ﷺ نے حضرت جبرئیل امین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جواب میں فرمایا تھا: **أن تعبد الله كأنك تراه فإن لم تكن تراه فإنه يراك** (مسلم شریف: ۱) احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، پس اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے، تو وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔

آنکھوں کی یہ کیفیت کہ دل کا تصور مشاہدہ میں آجائے، اسی وقت ہوتی ہے جبکہ قلب کسی کی یاد سے اتنا معمور اور آباد ہوگیا ہو کہ اب اس میں دوسرے کی سمائی نہ ہو، بغیر اس مقام کو حاصل کئے دل کا خیال آنکھوں میں پھرنے لگے، اور اس کو بقاء حاصل ہو نہیں ہوسکتا، یادِ الٰہی کی یہ کیفیت اور یہ رسوخ مطلوب ہے۔

رسول اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو جب دیکھتے ہیں، تو اس کا ہر لمحہ اور ہر آن اللہ کے ذکر سے معمور و منور ہے، نبی کی شان یہ ہے کہ جب خدا کی طرف سے کوئی حکم آجاتا ہے، تو اسے اہتمام اور کمالِ توجہ سے پورا کرتے ہیں، حق تعالیٰ کا حکم آیا کہ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللهَ ذِكْراً كَثِيراً**، اے ایمان والو! اللہ کا ذکر بہت زیادہ کرو، اس حکم کے بعد آپ کی زندگی کا کوئی لمحہ ذکرِ الٰہی سے کیونکر خالی رہ سکتا ہے، اسی لئے حدیث میں آیا ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: **كان يذكر الله علىٰ كل أحيانه** (مسلم شریف: **كتاب الطهارة**) رسول اللہ ﷺ ہر وقت اللہ کا ذکر کرتے تھے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے **اولوا الاباب** کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا ہے:

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰماً وَّقُعُوْداً وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتفکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلاً سُبْحٰنَکَ فَقِنَاعَذَابَ النَّار ، (سورۂ آل عمران:۱۹۱) وہ لوگ جو اللہ کو کھڑے، بیٹھے، لیٹے، ہر حال میں یاد کرتے ہیں، اور زمین وآسمان کی خلقت میں غور وتدبر کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! آپ نے ان کو بیکار نہیں بنایا ہے، آپ کی ذات پاک ہے، پس ہمیں جہنم کے عذاب سے بچا لیجئے۔

قرآن کریم میں جو کچھ تعلیم ہے، رسول اکرم ﷺ کی ذات میں اس کی ہو بہو تعمیل ہے، کان خلقه القرآن ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی سچی شہادت ہے، قرآن علم ہے، اور صاحب قرآن عمل ہیں، بس اللہ کی یاد، اللہ کا ذکر، اللہ کا نام، آپ کے وجود پر، آپ کے ماحول میں آپ کے دن میں، آپ کی رات میں چھایا ہوا ہے، زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں ہے، جس میں آپ اللہ کا نام نہ لیتے ہوں، چنانچہ آپ سے ہر ہر موقع کی دعائیں اور اَذکار منقول ہیں۔ محدثین کرام نے ان اوراد واذکار اور دعاؤں کو ضخیم ضخیم مجموعوں میں جمع کیا ہے، آپ کا وجودِ مبارک ذکرِ الٰہی کا مجسم نمونہ ہے، آپ نے اللہ کے ذکر میں خود کو اس طرح فنا کیا ہے کہ خود اللہ کے ذکر کا ایک حصہ اور مصداق بن گئے، قرآن کی آیات میں، اذان کے کلمات میں، درود وسلام کے صیغوں میں، دعاؤں کی ابتداء وانتہاء میں، کہاں کہاں اللہ کے ذکر کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا ذکر نہیں ہوتا، حق تعالیٰ نے فرمایا: وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ ، سیرت طیبہ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی یہ وہ خصوصیت ہے، جس سے ہر شخص واقف ہے، ذکرِ الٰہی ایک نور ہے، جس سے نہ صرف ذاکر بلکہ اسکے اِردگرد کا ماحول بھی نورانی بن جاتا ہے، ذکر الٰہی کے سامنے شیطان بھی نہیں ٹھہر سکتا، ذکرِ الٰہی سے حق تعالیٰ کی محبت دل میں راسخ ہوتی ہے، محبت جب راسخ ہوتی ہے، تو آدمی کو ہر ماسوی اللہ سے بے نیاز کردیتی ہے، انسان کی سعادت کی بنیاد ذکر الٰہی ہے، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتے ہیں۔ ذکرِ خداوندی فرض ہے، غفلت حرام ہے، خوب سے خوب تر کی تلاش کرنے والا انسان اس خوبی سے کیوں غافل ہے؟ قلب کا سکون اگر کہیں ہے، تو یادِ الٰہی ہی میں ہے، أَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ

تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ، دنیا کا کوئی گوشہ رنج وغم سے خالی نہیں، اگر کوئی جگہ اس سے پاک وصاف ہے، تو وہ ذکر الٰہی کی خلوت گاہ میں ہے۔

ہیچ گوشہ بے دد و بے دام نیست جز بخلوت گاہِ حق آرام نیست

جو بندہ ذاکر ہوتا ہے وہ بظاہر اگر پریشانیوں میں گھرا ہوا بھی ہے، تو صرف اس کا ظاہر، اس کا باطن اور اس کا قلب تو اللہ سے لو لگائے مطمئن ہے، ذکر کی حلاوت جب دل میں جاگزیں ہوتی ہے، تو دنیا ہی میں جنت کی لذت وراحت محسوس ہونے لگتی ہے، اس میں آدمی سے جس قدر ہو سکے ترقی کرے، اس کی ترقی کی انتہاء نہیں ہے، ترقی ہوتی ہے، تو مرتبۂ احسان بخشا جاتا ہے، پھر مرتبۂ احسان خود اس درجہ وسیع وبلند ہے کہ اس کی بلندیوں اور وسعتوں تک پہونچنے کا تصور بھی مشکل ہے۔

ذکر الٰہی سے اللہ کی معرفت کا دروازہ کھلتا ہے، اور جب انسان کو اللہ کی سچی معرفت حاصل ہوتی ہے، تو اس کا............ ایک مرکز پر ٹھہر جاتا ہے، اور اللہ کی محبت میں غرق ہو جاتا ہے، اس وقت انابت، عاجزی، تواضع، توکل، فنائے نفس، تفویض اور زہد وتقویٰ کی بیش قیمت دولتیں حاصل ہوتی ہیں، اور آدمی خاک کی پستی سے نکل کر قرب ورضائے الٰہی کی فضاؤں میں پرواز کرنے لگتا ہے۔

انسان نے مادی ترقیات بہت کرلیں، مگر اس کی روحانیت پیاس سے کراہ رہی ہے، بیرونی دنیا اپنی چمک دمک سے آنکھوں کو خیرہ کر رہی ہے، لیکن اندرونی دنیا میں گھپ اندھیرا چھایا ہوا ہے، بدن زندہ ہے مگر روح مردہ ہے، بدن کے امراض کا مکمل علاج تلاش کیا جا رہا ہے، اور علاج کی سائنس نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ عقلیں حیران ہیں، لیکن روحانی امراض کا علاج ناپید ہوتا جا رہا ہے، بلکہ فرض کرلیا گیا ہے کہ روح بیمار ہے ہی نہیں، بلکہ شاید یہ کہ روح موجود ہی نہیں ہے، لیکن عالم یہ ہے کہ سکون ناپید ہے، ہر آدمی گھبرایا ہوا ہے، امن عالم کا نظام درہم برہم ہے، اسبابِ راحت بہت ہیں، مگر راحت کا نشان نہیں ملتا، کیونکہ راحت تو ذکرِ الٰہی میں ہے، نسبت مع اللہ میں ہے، توکل علی اللہ میں ہے، اور یہی چیز غائب

ہے، اسبابِ دنیا میں خوب سے خوب تر ڈھونڈھنے والا یہاں غافل اور بے حس پڑا ہوا ہے، انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نے جو سوغات امتوں میں تقسیم کی تھی، امتوں نے اسے پس پشت ڈال دیا ہے۔

اے دنیا! تو پلٹ، اے دنیا والو! تم لوٹو، اے اللہ کے بندو! تم بھاگو! اللہ کی طرف، اللہ کے رسول کی طرف! فَفِرُّوْا إِلَى اللهِ، سنو! کون کہہ رہا ہے؟ کون کہلوا رہا ہے؟ اللہ کہلوا رہا ہے، رسول کہہ رہے ہیں، لوگو! تم اللہ کی طرف بھاگو، إِنِّي لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ، میں تمہارے لئے خدا کی جانب سے صاف صاف ڈر کی بات سنانے والا ہوں، تمہیں کہیں پناہ نہ ملے گی، نہ دنیا میں، نہ قبر میں، نہ آخرت میں، سوائے اس عظیم پنا گاہ کے جسے اللہ نے تعمیر کیا ہے، اور رسول اس کی جانب تمہیں دعوت دے رہے ہیں، سنو! ایک اور ڈر سنانے والا کہتا ہے، اور سب رسولوں کی اور ان کے نائبوں کی ایک ہی بات ہے، اللہ تعالیٰ نے اس جوانمرد کی بات قرآن کریم میں تفصیل سے نقل کی ہے، گو کہ وہ نبی نہ تھا، مگر کفر وطغیان کے ہجوم میں اکیلا کھڑا ہو کر پکار رہا تھا، وَيٰقَوْمِ مَالِيْ أَدْعُوْكُمْ إِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِيْ إِلَى النَّارِ (سورۂ قصص) اے قوم! یہ کیا بات ہے کہ میں تمہیں نجات کی طرف دعوت دے رہا ہوں اور تم مجھے آگ کی طرف بلا رہے ہو۔

لوگو! یہی ایک حصار ہے، یہی ایک قلعہ ہے، دوسری اور کوئی جگہ نہیں ہے، جہاں پناہ مل سکے، سنو! مزید فرماتے ہیں: وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللهِ إِلٰهاً آخَرَ إِنِّي لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (سورۃ الذاریات:) اور اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ بناؤ، میں تمہیں اللہ کی جانب سے کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ جی ہاں! اور کوئی معبود ہے اللہ کے علاوہ، جس کی عبادت کی گئی، وہ اس سے بیزار ہے، وہ اپنے عبادت گزاروں سے بری ہے، جب ادھر سے انکار ہے، تو عبادت کرنے والے اپنی عبادت پر چاہے جتنا اصرار کریں کیا حاصل؟ پس یہ ایمان، یہ ذکرِ الٰہی جس کی پناہ میں خود رسول رہے، اور رب کو اس کی طرف بلایا۔ لوگو! اسی کی جانب پلٹو اور دوڑو! رسول کی سیرت طیبہ کے دائرے میں آجاؤ، کہنے والوں نے کہا، اور وہ بہت عقلمند لوگ

ہیں، حق تعالیٰ نے ان کہنے والوں کی بات ہم تک پہونچائی، اور رضا مندی کا اظہار فرمایا:

﴿رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیاً یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ آمِنُوْا بِرَبِّکُمْ فَاٰمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَیِّآتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ﴾

اے ہمارے رب! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا، وہ ایمان کی صدا لگا رہا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ، تو ہم ایمان لائے، اے ہمارے رب تو ہمارے لئے ہمارے گناہوں کی مغفرت فرما دیجئے، اور ہم سے ہماری برائیوں کو محو کر دیجئے اور نیکوں کی معیت میں ہمیں وفات دیجئے۔

یہ تفصیل تو حیاتِ انسانی کے اس پہلو کی تھی کہ خلافت ارضی کا منصب پانے والا، اپنے خلیفہ بنانے والے سے سچا، اور ہمہ وقتی تعلق رکھے، اور اس کا اونچے سے اونچا جو معیار ہوسکتا تھا، اس کا مشاہدہ حضرت ختم المرسلین ﷺ کی سیرۃ طیبہ میں ہوتا ہے۔

اس صحیح اور سچے تعلق کو اگر ایک لفظ میں سمیٹا جائے تو اسے ’’اخلاقِ حسنہ‘‘ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، اور اخلاق حسنہ کی بنیاد ڈھونڈھی جائے تو وہ حلم ہوگی، حلم کا مطلب یہ ہے کہ غصہ اور انتقام کے اسباب و محرکات ہوں، انتقام لینے کی قدرت بھی ہو، لیکن اس کے باوجود آدمی نہ طیش میں آئے، نہ غصہ میں تلملائے، بلکہ سکون و وقار کی حالت بنی رہے، یہ بات اس وقت حاصل ہوتی ہے جب آدمی کا حوصلہ بہت بلند ہو، قلب میں بہت وسعت ہو، ورنہ عموماً خلافِ طبع اور خلافِ مزاج باتوں پر آدمی از جارفتہ ہوجاتا ہے، اور طیش کی حالت میں خفیف الحرکاتی میں مبتلا ہوجاتا ہے، انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور بالخصوص رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مقدسہ میں ’’حلم و بُردباری‘‘ ایک ایسا روشن اور تابناک و منور عنوان ہے کہ بندوں کے باہمی تعلقات و روابط میں اس عنوان کی تابنا کی ہر ہر جگہ جلوہ گر نظر آتی ہے، اور نازک سے نازک موقع پر بھی کہیں ایسا نہیں ہوتا کہ آپ کو طیش آگیا ہو، جوشِ انتقام میں آپ نے کوئی ناروا کلمہ بول دیا ہو، یا غصے میں آپ شعلہ بداماں ہوگئے ہیں، موقع خواہ کتنا ہی نازک ہو، مگر آپ کوہِ وقار رہتے۔

اللہ نے آپ کا مزاج ایسا ہی بنایا تھا، پھر آپ کو اس کی تعلیم دی تھی، اور اسی انداز پر آپ کی تربیت فرمائی تھی، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: **خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ** (الاعراف: ١٩٩) عفو ودرگزر کو اختیار کرو، اور اچھی بات کا حکم کرو۔ صاحب شفاء قاضی عیاض علیہ الرحمہ نے لکھا ہے کہ جب یہ آیت رسول اکرم ﷺ پر نازل ہوئی تو آپ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے اس کا موقع اور اس کی تشریح دریافت کی، انھوں نے عرض کیا کہ علیم وخبیر سے پوچھ لوں تو بتاؤں، یہ کہہ کر چلے گئے، پھر آئے تو بتایا **یا محمد إن اللہ یامرک أن تصل من قطعک وتعطی من حرمک وتعفو عمن ظلمک**، اللہ تعالیٰ آپ کو حکم دیتے ہیں کہ جو تم سے قطع تعلق کرے، اس سے تعلق جوڑو، جو تمہیں محروم کرے اسے تم بخشش میں حصہ دار بناؤ، اور جو تم پر ظلم کرے اسے معاف کردو۔ (ص: ٧٤)

اس مبارک تعلیم کے آثار آپ کی پوری زندگی پر چھائے ہوئے ہیں، اور حلم وعفو کا جو بلند سے بلند نمونہ ہوسکتا ہے، وہ آپ کی سیرۃ طیبہ میں موجود ہے، امیر المومنین سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ آپ کی خدمت مبارکہ میں عرض کیا .... ان کا یہ کلام حضرت قاضی عیاض علیہ الرحمہ نے کتاب الشفاء میں نقل کیا ہے .... یا رسول اللہ! حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم پر بددعا کی، **رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا** (نوح :٢٦) اے میرے پروردگار! زمین پر کسی کافر کو بسنے والا نہ چھوڑیئے۔ اگر اسی طرح کی بددعا آپ ہمارے اوپر فرمادیئے ہوتے، تو ہم بھی تمام تر ہلاک ہوجاتے، آپ کی پشت مبارک کو روندا گیا، آپ کا چہرۂ اقدس لہولہان کیا گیا، آپ کے دندانِ مبارک شہید کئے گئے، مگر آپ نے خیر کے علاوہ کوئی اور بات کبھی منظور نہیں کی، آپ نے تو یہ کہا: **اللھم اغفر لقومی فإنھم لایعلمون**، اے اللہ میری قوم کو بخش دیجئے، یہ ناواقف ہیں۔

ملاحظہ ہو! سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کس بلیغ انداز میں رسول اکرم ﷺ کے فضائل ومحامد، درجاتِ احسان، کرم نفس اور انتہائی صبر وحلم کو جمع فرمادیا ہے، کہ آپ نے ستانے والوں کی ایذارسانی پر محض سکوت ہی نہیں فرمایا، یہ بھی ہوتا تو کمالِ اخلاق کا مظہر عظیم ہوتا، مگر

اتنے ہی پر بس نہیں کیا، بلکہ انھیں معاف فرما دیا، پھر مزید شفقت فرمائی کہ رحم وکرم کا برتاؤ فرمایا، ان کے لئے دعا فرمائی، ان کی سفارش کی، اور فرمایا انھیں بخش دیجئے اور ہدایت دیجئے، پھر شفقت وترحم کی وجہ بھی اللہ کی رحمت کو متوجہ کرنے کے لئے ذکر کی، اور فرمایا **لقومی**، یہ لوگ میری قوم کے ہیں، مجھ سے انھیں قومیت اور قرابت کی نسبت حاصل ہے، پھر ان کی طرف سے معذرت بھی پیش فرما رہے ہیں کہ یہ لوگ واقف نہیں ہیں، اس لئے ایسی حرکت کر رہے ہیں۔

اسی طرح ایک بار فتح مکہ کے دور میں جبکہ آپ کو ہوازن وغیرہ سے کثیر تعداد میں مال غنیمت حاصل ہوا تھا، آپ مالِ غنیمت تقسیم کر رہے تھے، تو ایک بد بخت نے، جو خود کو مسلمانوں کے زمرے میں شامل کئے ہوئے تھا، آپ سے کہا اور بڑی دریدہ ذہنی سے کہا، انصاف کرو، یہ تقسیم ایسی ہے کہ اس میں اللہ کی رضامندی کی نیت نہیں کی گئی ہے۔

نبی کریم ﷺ پر یہ ایک شدید قسم کا ناروا حملہ تھا، جس کا تعلق دیانت سے تھا، آپ نے خود ارشاد فرمایا ہے: **لادین لمن لا أمانة له**، جس میں امانت کا اہتمام نہیں، اس کے پاس دین نہیں۔ پھر آپ کی امانت ودیانت ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے، اس وقت جب آپ کے اوپر وحی کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا، تب بھی آپ کی صداقت وامانت مشہور ومعروف تھی، پھر نبوت ملنے کے بعد، وہ بھی زندگی کے آخری دور میں اگر کوئی شخص آپ پر الزام لگائے کہ مال کی تقسیم میں رضاء الٰہی کا ارادہ نہیں نفسانیت کا داغ لگا ہوا ہے، تو آپ کو کس قدر روحانی تکلیف پہونچے گی۔

مگر یہاں آپ کا حلم، آپ کی بردباری، آپ کا حوصلہ برداشت کی کن بلندیوں پر ہے، اسے آپ کے جواب میں ملاحظہ فرمائیے، فرمایا: **ویحک فمن یعدل إن لم أعدل؟ خبت وخسرت إن لم أعدل**، افسوس، اگر میں عدل نہ کروں گا، تو کون عدل کرے گا؟ اگر میں عدل نہ کروں، تو میں خائب وخاسر ہوں۔ اس کے جواب میں آپ نے صرف اتنا ہی کہا جس سے وہ شخص ناواقف تھا، یا ناواقف بن رہا تھا، اسے بتا دیا اور اسے

نصیحت فرمائی، اتنا نہیں، اصحاب رسول اللہ ﷺ کو اس کے اس گستاخانہ جملے پر جس قدر غیض وغضب ہوا ہو، بجا تھا، چنانچہ کچھ حضرات نے اسے اس کی سزا دینی چاہی، تو آپ نے انھیں منع فرما دیا، انسانی اخلاق کی تاریخ میں اس کے نظائر کہاں کوئی پا سکتا ہے؟ بجز آپ کی سیرت اور آپ کے سچے متبعین کے احوال کے!

یہاں تو عالم یہ ہے کہ ایک یہودی عورت جان بوجھ کر آپ کے کھانے میں زہر ملا دیتی ہے، اس نے آپ کی دعوت کی تھی، اور از راہِ کرم آپ نے قبول فرمائی تھی، لیکن وحی الٰہی نے آپ کو بتایا کہ یہاں زہر قاتل داخل طعام ہے، پھر اس عورت نے اقبالِ جرم بھی کر لیا تھا، مگر آپ کا حلم وعفو دیکھئے کہ اسے بھی معاف کر دیا۔ لبید بن اعصم یہودی نے آپ پر جادو کیا، آپ کو معلوم بھی ہوا، مگر آپ نے درگزر فرما دی، عبد اللہ بن اُبی رئیس المنافقین کی طرف سے بار بار ایذا رسانیوں کا چکر چلتا رہتا تھا، جنگ کا موقع ہوا، امن کے اوقات ہوں، سفر ہو، سفر سے واپسی ہو، گھر میں ہو، بازار میں ہو، آپ کی ذات کا مسئلہ ہو، آپ کے حرم (ازواج مطہرات) کا مسئلہ ہو، ہر جگہ یہ شخص تکلیف پہونچانے کا شوشہ تلاش کر لیا کرتا تھا، کہیں کوئی رو رعایت نہیں کرتا تھا، حضور اکرم ﷺ اس کی اور اس کے رفقاء کی ایذا رسانیوں کو ٹھنڈے دل سے برداشت کر لیا کرتے تھے، ایک مرتبہ کسی منافق کے بارے میں آپ سے اجازت چاہی گئی کہ اس کا کام تمام کر دیا جائے، تو آپ نے منع فرمایا، اور فرمایا کہ لوگوں میں مشہور ہوگا کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرا دیتے ہیں۔

اور ملاحظہ فرمائیے! حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ایک بار رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں تھا، آپ کے جسم مبارک پر ایک چادر تھی، جس کا حاشیہ سخت اور موٹا تھا، ایک بدو آیا اور اس نے زور سے جھٹک کر آپ کی چادر کھینچی، اور اس طرح کھینچی کہ آپ کی گردن اور کندھے پر اس کے نشانات ابھر آئے، اس نے کہا اے محمد! میرے ان دونوں اونٹوں پر اللہ کا وہ مال لاد کر دیجئے، جو آپ کے پاس ہے، کیونکہ مجھے آپ نہ اپنا مال دیں گے، اور نہ اپنے باپ کا مال دیں گے (یہ تو اللہ کا مال ہے) نبی ﷺ خاموش رہے، نہ غصہ ہوئے، نہ ڈانٹا جھڑکا

،سکوت کے بعد فرمایا، تو یہ فرمایا کہ **المال مال الله و أنا عبده** مال تو اللہ کا مال ہے، میں تو اس کا غلام ہوں، پھر فرمایا: **ویقاد منک یا أعرابی مافعلت بی** ، جو کام تم نے میرے ساتھ کیا ہے، کیا اس کا تم سے قصاص لیا جائے؟ اس نے کہا نہیں، فرمایا کیوں؟ کہا اس لئے کہ آپ برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے، اس پر نبی کریم ﷺ ہنس پڑے، پھر آپ نے حکم دیا کہ ایک اونٹ جو لاد دو، اور ایک اونٹ پر کھجور!

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو خلوت وجلوت کی انیس و رفیق ہیں، فرماتی ہیں کہ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ آپ نے ظلم کا بدلہ لیا ہو، ہاں اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کی حرمت کسی نے توڑی ہو، تو اس کا بدلہ لیتے تھے، اور نہ اپنے ہاتھ سے آپ نے کسی کو کبھی مارا ہو، الاّ یہ کہ جہاد فی سبیل اللہ میں آپ رہے ہوں، اسی طرح آپ نے کبھی نہ اپنے کسی خادم کو مارا نہ کسی عورت کو مارا، ایک آدمی آپ کی خدمت میں پکڑ کر لایا گیا، کہ یہ آپ کو قتل کرنے کے ارادے سے آیا ہے، آپ نے فرمایا **لن تراع لن تراع** ،تم پر کچھ خوف نہیں، تم پر کچھ خوف نہیں، اگر تم میرے قتل کا ارادہ کرتے، تب بھی تم کو میرے اوپر قابو نہ ملتا۔

ایک مالدار یہودی تھا زید بن سعنہ ، بڑا صاحب ثروت بھی تھا، اور مذہب یہود کا بڑا عالم بھی تھا، اس نے آپ کی خدمت میں پیش کش کی تھی کہ قرض کی ضرورت ہو تو مجھ سے لے لیا کیجئے، آپ نے قرض وہاں سے منگوایا، اس نے ایک مرتبہ قرض کا آپ سے نہایت بد خلقی اور گستاخی کے ساتھ تقاضا کیا، اس نے آپ کا کپڑا پکڑ کر کھینچا، اور بڑی سختی سے کہا کہ عبد المطلب کی اولاد! تم لوگ نادہند ہو، قرض لے کر ادائیگی میں ٹال مٹول کرتے ہو، سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ وہاں موجود تھے، انھوں نے جھڑکا اور سخت الفاظ اس سے کہے، لیکن نبی کریم ﷺ کے چہرۂ اقدس پر کوئی تغیر نہ تھا، آپ مسکرا رہے تھے، آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا، کہ جو کچھ تم نے کہا میں اور یہ، دونوں اس کے علاوہ دوسری بات کے ضرورت مند تھے، تم کو چاہئے تھا کہ مجھے قرض کی بخوبی ادائیگی کی تلقین کرتے، اور اس کو حسن تقاضا کا حکم دیتے۔

پھر فرمایا کہ ادائیگی کی جو مدت مقرر کی گئی ہے، اس میں تین دن باقی ہیں،

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اس کا قرض ادا کردو، اور مزید بیس صاع اور زائد دو، کیونکہ تم نے ایک صاحب حق کے دل کو دکھا دیا ہے، آپ کے اس معاملہ کو دیکھ کر زید بن سعنہ مسلمان ہوگئے۔ وہ فرماتے ہیں کہ نبوت کی سب علامتیں میں نے آپ کے اندر دیکھ لی تھیں، صرف دو چیزیں باقی رہ گئی تھیں، ایک یہ کہ ان کا حلم ان کے جہل پر غالب اور سابق ہوگا، دوسری یہ کہ جتنی شدید جہالت کا ان سے برتاؤ کیا جائے گا اتنا ہی ان کا حلم بڑھے گا، میں انھیں دونوں کا امتحان کرنا چاہتا تھا، الحمد للہ بات مکمل ہوگئی۔

اور آخری بات یہ ہے کہ مکی دور میں کفار نے آپ پر اور آپ کے اصحاب پر ظلم وستم کے کتنے پہاڑ توڑے تھے، یہ تو تاریخ کی متواتر شہادت ہے، جس میں کسی دشمن کو بھی شبہ نہیں ہوسکتا، پھر مدنی زندگی میں ان کے حملوں، ناروا کارروائیوں کا سلسلہ چلتا رہا، مگر حلم ومروت کی جلوہ گری دیکھئے کہ فتح مکہ کے موقع پر یہ لوگ آپ کی خدمت میں گرفتارانہ پیش کئے گئے، تو تاریخ کے صفحات سے دریافت کیجئے کہ آپ کا رویہ کیا رہا؟ کیا معافی اور درگزر کے علاوہ کوئی بات آپ کی زبان مبارک سے صادر ہوئی، آپ نے انھیں سے پوچھا **ماتقولون إني فاعل بكم** ؟ تم لوگ کیا سوچتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کروں گا؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم خیر کی امید رکھتے ہیں، آپ شریف بھائی ہیں، شریف بھائی کے بیٹے ہیں، آپ نے فرمایا کہ میں وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف علیہ السلام نے کہی تھی: **لاتثريب عليكم اليوم** (سورۂ یوسف:۹۲) تم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے، سب کچھ معاف! **إذهبوا أنتم الطلقاء**، جاؤ تم سب آزاد ہو۔

ابوسفیان سے ان کے کفر کی حالت میں جب آپ کی آخری ملاقات ہوئی، تو آپ نے ان سے صرف اتنا فرمایا، سنئے! یہ ابوسفیان وہی ہیں، جنھوں نے غزوہ بدر کے بعد فتح مکہ تک آپ کے ساتھ جنگ چھیڑ رکھی تھی، اور آپ کی ایذا رسانی میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا تھا، آپ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے میں انھیں کا ہاتھ تھا، ان کا مثلہ کیا گیا، شہادت کے بعد ان کا حلیہ بگاڑا گیا، اس میں بھی انھیں کا دخل تھا، غزوہ خندق کی بلائے عظیم

جس سے سارا مدینہ تھرا اٹھا تھا، انھیں کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ تھی، لیکن جب آپ سے فتح مکہ کے موقع پر ملاقات ہوئی، تو آپ نے یہ فرمایا: **ویحک یا أبا سفیان ألم یان لک أن تعلم أن لا إله إلا الله**، افسوس تم پر اے ابوسفیان! کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ تم یقین سے جان لو کہ اللہ کے علاوہ اور کوئی معبود نہیں ہے، ابوسفیان نے عرض کیا: **بأبی أنت و أمی ما أحلمک و أوصلک و أکرمک**، میرے ماں باپ آپ پر قربان! آپ کتنے صاحب حلم ہیں، کتنے قرابت نواز اور کتنے صاحب کرم ہیں

یہ آپ کے سب سے بڑے دشمن کی شہادت ہے، جس کے بعد وہ دشمنی کی آگ سے نجات پا کر دوستی اور محبت کی آرام گاہ میں داخل ہو گئے۔

رسول اللہ ﷺ کی سیرۃ مبارکہ کا یہ وہ جوہر ہے، جو آپ کی پوری زندگی، تمام معاملات اور ہر ایک برتاؤ میں جگمگا رہا ہے، اس جلوے سے اگر کوئی آنکھ بھی بند کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا ہے۔

امت کے لئے یہ ایک ایسا سبق ہے کہ امت کو لازم ہے کہ ہر دور میں، ہر جگہ، ہر معاشرہ میں، ہر برتاؤ میں، انفراداً اور اجتماعاً اسے دہراتی اور یاد کرتی رہے۔(۱)

حلم و کرم کی یہ تمام روایات و نقول حدیث کے صحیح مجموعوں میں موجود ہیں، ہم نے حضرت علامہ قاضی عیاض علیہ الرحمہ کی "کتاب الشفاء بتعریف حقوق سیدنا المصطفی" کو پیش نظر رکھا ہے۔

(اپریل ۲۰۰۷ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انسان کو کیا چاہئے

دل کا سکون یا طبیعت کا اضطراب؟

ناظرین باتمکین! یہ سوال آپ کو عجیب سا معلوم ہوگا، بھلا کوئی آدمی ایسا بھی ہوگا جسے بے چینی پسند ہو، وہ طبیعت کے اضطراب کو چاہتا ہو، اسے بے اطمینانی اور بے سکونی کی تلاش ہو؟ ہر شخص راحت کی جستجو میں ہے، سب کو اطمینان وسکون کی آرزو ہے۔

لیکن یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جس چیز کی تلاش سب کو ہے، جس کا آرزومند ہر شخص ہے، سب سے زیادہ وہی چیز کمیاب یا یہ کہہ لیجئے کہ نایاب ہے، ہر طرف اضطراب کی فراوانی ہے، بے چینی اور بے اطمینانی کی طغیانی ہے، اگر آپ اخبار پڑھتے ہیں یا ذرائع ابلاغ سے اشتغال رکھتے ہیں، تو ہر خبر ایک بے چینی کی داستان سناتی ہے، ہر سرخی کسی نہ کسی مصیبت کی ترجمانی کرتی ہے، الجھنیں ہیں جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتیں۔

ماہر القادری مرحوم نے اخباری خبروں کا تجزیہ کتنے اچھے انداز میں کیا ہے، لکھتے ہیں:

> پھر صبح سویرے اخبار پڑھتے ہی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ساری دنیا حادثوں کی زد میں ہے…… موٹر بس الٹ گئی…… فلاں جگہ ڈاکہ پڑ گیا……جیل خانہ میں باغی قیدیوں پر فائرنگ…… کمپنی کا خزانچی دولاکھ روپیہ لے کر غائب ہوگیا…… بیوی نے شوہر کی ناک کاٹ لی…… امریکہ اور روس کے تعلقات کشیدہ ہوگئے…… ۱۹۵۶ء میں جنگ ہوکر رہے گی……فرانس کے ایک مشہور نجومی کی پیشین گوئی……رکشا والوں کا جلوس……مردہ باد کے نعرے…… ہیڈ کلرک رشوت لیتے پکڑا گیا……ایک لڑکی کا کالج جاتے ہوئے اغوا……میونسپلٹی پر دولاکھ

> ہر جانے کا دعویٰ …… آئندہ ہفتے آٹے میں اور کمی کا امکان …… اسمبلی میں پریسیڈنٹ اور ایک ممبر میں جھڑپ …… آسام میں سیلاب کی تباہ کاریاں …… بندرگاہ پر روئی کی دس ہزار گانٹھیں جل کر تباہ ہوگئیں …… ایک عورت کے عجیب الخلقت بچہ پیدا ہوا …… سینما ہاؤس کے ٹکٹ گھر پر تماشائیوں نے ہلہ بول دیا، دس آدمی شدید زخمی، ایک آدمی زخموں کی تاب نہ لاکر چل بسا …… فلاں جگہ زلزلہ تین سکنڈ تک رہا …… بے روزگاری سے تنگ آکر خودکشی کرلی …… حوالات سے قتل کے ملزم کا فرار ……

یہ خبریں اور سرخیاں ایک روز کی نہیں، روزانہ کی ہیں، عنوان بدل بدل کر، پھر اخبار کی دنیا سے نکل کر آبادیوں میں آیئے، گھروں میں جھانکئے، افراد کو ٹٹولئے، ہر طرف پریشانی ہی پریشانی ہے، بے اطمینانی ہی بے اطمینانی ہے، باپ بیٹے میں الجھن ہے، زمین جائداد پر لڑائی ہے، فلاں بیمار ہے، اور پورا گھرانا پریشانی میں ہے، اس کی تفصیل لکھنے والے سے زیادہ پڑھنے والوں کو معلوم ہے۔

پھر کیا اس پریشانی اور حواس باختگی کا کوئی علاج بھی ہے؟ یا یہ لاعلاج مرض ہے؟ جی نہیں، یہ مرض لاعلاج نہیں ہے، اس کا علاج ہے، اور بہت شفا بخش علاج ہے، لیکن انسان کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ علاج کو مرض سمجھتا ہے، اور اس سے بھاگتا ہے، اور بیماریوں کو علاج گردانتا ہے، اور اس میں گھستا ہے۔

اس بے چینی اور اضطراب کا علاج انسانی افکار ونظریات میں نہیں، انسانوں کا حال یہ ہے کہ بیماری کا علاج بیماری سے کرتے ہیں، اور مرض کو مزید بڑھا لیتے ہیں، خوب تجربہ ہے، کہتے ہیں کہ ایک دیہاتی نے ڈاکٹر سے شکایت کی کہ پیٹ خراب ہے، ڈاکٹر نے ایک دوا دی کہ کھالو، کہنے لگا کہ اتنی گنجائش ہوتی تو ایک لقمہ اور نہ کھالیتا، عجیب بات ہے کہ کھانے کا علاج کھانے سے کیا جائے۔

یہ کہنے کو ایک لطیفہ ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ انسانی معاشرہ کی یہ ایک عبرتناک تصویر ہے، نفس انسانی جو لذتوں کا جویا ہے وہ انھیں چیزوں کی طرف دوڑتا ہے، جن میں اسے

لذت ملتی ہے، چاہے اس لذت کا اختتام کسی ہولناک تلخی پر ہو، اب اگر کسی سے کہا جائے کہ لذتوں پر قابو پاؤ، ان کے پیچھے نہ دوڑو، تو زبان سے چاہے اس کی تائید کردے، مگر جب کرنے کا موقع آئے گا تو آدمی آنکھ بند کر کے لذت نفس میں کود پڑتا ہے، طبیعت انسانی عجب پیچیدہ ترکیب رکھتی ہے، بولنے کا فلسفہ اس کا کچھ اور ہے، اور کرنے کا کچھ اور! اسی کچھ اور، کچھ اور میں پوری کائنات انسانی درہم وبرہم ہورہی ہے، ہر آدمی باوجودیکہ وہ سکون واطمینان کو تلاش کرتا ہے، مگر بیشتر اوقات پریشانی میں گھرا ہوا رہتا ہے، اس پریشانی اور بے سکونی کا علاج قرآن کریم میں ہے، مگر کیا کیجئے کہ آج کی دنیا قرآن کی تعلیم اور اس کے موضوع سے اتنی دور ہے کہ محض قرآن کا نام سننے ہی سے پیشانیاں شکن آلود ہونے لگتی ہیں، اور جب اس کی تعلیم کا ذکر کیا جاتا ہے تو اسے اس طرح سنا جاتا ہے جیسے کائنات سے ماوراء کوئی چیز ہو، جس کو صرف خاص خاص لوگ ہی اختیار کر سکتے ہیں، عام لوگ تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے، حالانکہ معاملہ ایسا نہیں، قرآن کی تعلیم سب کے لئے ہے، اور سب استعداد والوں کے لئے ہے جو جتنا اسے اختیار کرے گا، اس کے لئے اتنا ہی راستہ کھلتا جائے گا، حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کو پیدا کیا ہے، وہی ساری کائنات کی اور خود انسانوں کی نفسیات سے بخوبی واقف ہیں اور وہی الجھی ہوئی طبیعتوں کو سلجھانے پر قدرت رکھتے ہیں، آدمی اول تو انسانی نفسیات کے تمام پیچ وخم سے واقف نہیں ہوتا، اور اگر واقف بھی ہو تو اس کا صحیح علاج تجویز کرنے کی معلومات نہیں رکھتا، اور اگر قدرے معلومات اسے حاصل بھی ہوں تو بیماریوں کو شفا بخشنے کی قدرت نہیں رکھتا، علم وقدرت کی اتنی الجھنوں کے بعد بھلا انسانی تدبیروں سے کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ ان سے انسانوں کی پریشانیوں کا کوئی مسئلہ حل ہو سکے گا، پس ذہنی وقلبی بیماریوں کا مداوا آدمیوں کی وضع کردہ تدبیروں میں نہیں، اس درد کی ایک ہی دوا ہے کہ اسی ذات کی جانب رجوع کیا جائے جو علیم وخبیر ہے اور قوی وقدیر بھی۔

اس تمہید کے بعد ہم قرآن کریم کی طرف رجوع کرتے ہیں، اطمینان وسکون کا سوال ہم اسی بارگاہ سے کرتے ہیں دیکھئے ادھر سے کیا جواب ملتا ہے؟ غور سے ملاحظہ

فرمایئے، حق تعالیٰ جواب عنایت فرماتے ہیں:

مَنْ عَمِلَ صَالِحاً مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (سورۃ النحل: ۹۷)

ترجمہ: -جس نے اچھا کام کیا، خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان رکھتا ہے، تو اسے ہم ایک پاکیزہ اور صاف ستھری زندگی عطا فرماتے ہیں، اور ہم انھیں اچھے اعمال کے عوض میں بہترین اجر عنایت فرمائیں گے۔

مشہور مفسر قرآن حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ حیاۃ طیبہ وہ ہے جو راحت و آرام کے وجوہ وطرق پر مشتمل ہو، دنیا میں راحت اور آخرت میں اجر عظیم! معلوم ہوا کہ سکون و راحت کا سر چشمہ نہ مال ہے، نہ دولت، نہ طاقت، نہ شوکت بلکہ اللہ و رسول پر ایمان اور ان کی اطاعت و فرمانبرداری میں بہتر سے بہتر اعمال کو بجالانا، ظاہراً بھی اور باطناً بھی۔

دوسری جگہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَنْ لَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِىْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ، نَحْنُ اَوْلِيَاءُ كُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ وَلَكُمْ فِيْهَا مَاتَشْتَهِىْ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَاتَدَّعُوْنَ. نُزُلاً مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ. (سورہ حم السجدۃ: ۳۰، ۳۱، ۳۲)

بیشک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر اپنے اس قول پر مضبوط رہے، ان پر فرشتے مسلسل اُترتے ہیں کہ نہ کچھ اندیشہ کرو، نہ افسوس میں پڑو اور جنت کی خوش خبری حاصل کرو، جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا ہم تمہارے دوست ہیں دنیاوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی، اور تمہارے لئے اس میں ہر وہ چیز ہے جو تمہارا جی چاہے، اور تمہارے لئے اس میں ہر وہ چیز ہے جو تم مانگو، یہ سب سامان مہمانی ہے، مغفرت کرنے والے رحم و کرم کرنے والے کی جانب سے۔

اللہ کو رب ماناپھر اس پر جمے رہے کا مطلب یہ ہے کہ پھر کسی اور طرف التفات نہ کیا،

بلکہ اخلاص ویکسوئی کے ساتھ حق تعالیٰ کی اطاعت میں لگے رہے، امام زہری فرماتے ہیں کہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے منبر پر اس آیت کی تلاوت فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ **استقاموا واللہ بطاعته ولم يروغوا روغان الثعالب** (تفسیر ابن کثیر) اللہ کے لئے اس کی طاعت پر ثابت قدم رہے اور لومڑی کی طرح حیلہ سازی کے ساتھ ادھر اُدھر انحراف نہیں کیا۔

مومن کا جب یہ حال قائم ہوجاتا ہے تو مرتے دم اس پر فرشتے دمبدم اترتے ہیں، اور اس گھبراہٹ کے وقت اسے تسلی دیتے ہیں، اس وقت جن الفاظ میں وہ دنیا چھوٹنے پر مومن کو اطمینان دلاتے ہیں، ان میں ایک بات یہ بھی کہتے ہیں کہ **نحن اولياء كم فى الحيٰوةِ الدنيا**. ہم تمہارے دوست، ہمدرد اور ہر بگڑی میں ساتھ دینے والے دنیا میں بھی ہیں اور آخرت میں بھی۔

یہ جملہ بہت قابل غور ہے، فرشتوں کا گروہ اہل ایمان کے لئے سرمایۂ تسکین واطمینان ہے، یہ جب مومن کا ساتھ دیتے ہیں تو اس سے زیادہ اطمینان کی بات کیا ہوسکتی ہے، پھر اس مقدس اور پاکیزہ گروہ کے ساتھ ہونے کے بعد آدمی کو کیا گھبراہٹ ہوسکتی ہے، اس سرمایۂ سکون کا حصول کس چیز سے ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ بتاتے ہیں کہ اللہ کو رب ماننا اور پھر اس پر مضبوطی کے ساتھ جم جانا۔

یہ اللہ کا فرمان ہے مگر مادیت اور اسباب کی ماری ہوئی دنیا کو یہ بات کب سمجھ میں آئے گی، مگر واقعہ یہی ہے کہ راحت اور اطمینان کا خزانہ ایمان واستقامت ہی میں ہے، اسباب کا جتنا تجربہ ہوتا ہے، نتیجہ برعکس ہی نکلتا ہے، اللہ کا فرمان تو یوں ہی قابل اذعان ہے، لیکن جب اس کے ساتھ صدیوں اور صدہا آدمیوں کے تجربات بھی شامل ہوں تب تو شرح صدر ہوجانا چاہئے۔

ایک اور آیت ملاحظہ ہو:

اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا

یَتَّقُوْنَ. لَھُمُ الْبُشْریٰ فِیْ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِیْ الْاٰخِرَۃِ لَاتَبْدِیْلَ لِکَلِمَاتِ اللّٰہِ. ذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ. (سورہ یونس: ۶۲، ۶۴)

ترجمہ:- سنو! بے شک جو اللہ کے ولی ہیں ان پر نہ کچھ خوف ہے اور نہ وہ افسوس میں مبتلا ہوں گے، ان کے لئے بشارت ہے، دنیاوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی اللہ کی باتوں میں کوئی ردّ و بدل نہیں ہے، بڑی کامیابی یہی ہے۔

اس آیت میں غور کیجئے، چند باتیں بوضاحت ثابت ہوتی ہیں:

(۱) جو اللہ کا ولی ہوگا، اس کا دل خوف اور رنج کے حوادث سے بالاتر ہوگا، وہ سراپا اطمینان وسکون ہوگا۔

(۲) اللہ کا ولی وہی ہے جو اللہ پر سچا ایمان رکھتا ہو، اور تقویٰ کی صفت سے متصف ہو۔

(۳) ایسا شخص جو اللہ کا ولی ہو، مخلصانہ ایمان اور ظاہر و باطن میں تقویٰ رکھتا ہو، اس کے لئے دنیا کی زندگی میں بھی بشارت اور خوشی کی خبریں ہیں، اور آخرت میں بھی بشارت واطمینان ہے۔

(۴) یہ اللہ کا اٹل اور ناقابل تبدیل قانون اور دستور ہے، اسے کوئی طاقت تبدیل نہیں کرسکتی۔

(۵) اور دراصل یہی بڑی کامیابی ہے۔

دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اطمینان وراحت کے حصول کے لئے خالق کائنات نے جو اٹل اور ناقابل تبدیل دستور بنایا ہے، وہ یہی ہے کہ آدمی صاحب ایمان ہو اور صاحب تقویٰ ہو، یہ دونوں باتیں حاصل ہوں تو قلبی راحت اور سچا اطمینان آدمی سے دور نہیں ہے، حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَہٗ مَخْرَجاً وَیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَایَحْتَسِبُ ۔(الطلاق: ۲، ۳)

ترجمہ:- جو اللہ سے ڈرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لئے ہر مشکل سے نکلنے کا راستہ دیتے ہیں، اور ایسی جگہ سے روزی دیتے ہیں، جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوتا۔

تقویٰ کیا ہے؟ ظاہر و باطن سے، جسم سے اور قلب سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنا، اور اللہ کی نافرمانی سے بچنا، اس کا اہتمام کرنا، دل میں اسی کی فکر اور دھن کا مسلط ہوجانا، یہی تقویٰ ہے، تقویٰ کی جزئیات بہت ہیں، مگر کلی طور پر جب آدمی کو فکر ہوجاتی ہے، تو اللہ تعالیٰ تقویٰ کی راہ بھی آسان فرمادیتے ہیں، اس سے انسان کو اپنے خالق و مالک کے ساتھ ایسا ربط پیدا ہوجاتا ہے کہ وہ کہیں بھی ہو اپنے کو اکیلا اور بے سہارا نہیں محسوس کرتا، اس کے سامنے کہیں اندھیرا نہیں ہوتا، مشکل سے مشکل مرحلہ اس کے لئے روشن اور سہل ہوتا ہے، اور جس قدر وہ تقویٰ میں ترقی کرتا ہے، راستہ آسان ہوتا جاتا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

فَاَمَّا مَنۡ اَعۡطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالۡحُسۡنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلۡيُسۡرٰى (سورۃ واللیل: ۷) تو جس کسی نے دیا، اور تقویٰ اختیار کیا اور اچھے کلمہ کی تصدیق کی، ہم اسے سہج سہج آسانی میں پہنچادیں گے۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے تین چیزیں ذکر فرمائی ہیں، دینا یعنی دوسروں کو اپنے مال میں سے دیتے رہنا، یہ علامت ہے اس بات کی کہ دینے والا اللہ پر بھروسہ رکھتا ہے، اس لئے اپنا مال دے دینے میں اسے ہچکچاہٹ نہیں ہوتی، دوسری چیز تقویٰ، تیسرے ایمان، جس میں یہ تینوں باتیں موجود ہوں گی، وہ آسانی کی راہ پر لیجایا جارہا ہے، وہ ہر قدم آسانی اور راحت میں رکھتا ہے، کیوں کہ اللہ نے ان اعمال وصفات میں یہی خاصیت رکھی ہے۔

تقویٰ اور توکل ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں، یہی وجہ ہے، جہاں حق تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ جو تقویٰ اختیار کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کے لئے آسانی کی راہ نکالیں گے اور ایسی جگہ سے روزی عطا فرمائیں گے جہاں سے اسے گمان بھی نہ ہوگا، وہیں یہ بھی فرمایا ہے کہ:

وَمَنۡ يَّتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسۡبُهٗ. (سورۃ الطلاق: ۳) اور جو کوئی اللہ پر بھروسہ رکھے، تو وہ اس کو کافی ہے۔

اور یہ بالکل سامنے کی بات ہے ہر معاملہ میں اللہ پر جو بھروسہ رکھے گا، اسے

دشواری کا احساس کہیں نہ ہوگا، کیوں جس شخص کے ساتھ کوئی بڑی طاقت ہوتی ہے، اسے کوئی مسئلہ پریشان نہیں کرتا، اور اللہ سے بڑھ کر کون صاحب طاقت وقوت ہے؟

اس تفصیل کے بعد کوئی بتائے کہ دنیا جن راہوں سے اطمینان اور راحت تلاش کر رہی ہے، کیا ان راہوں سے یہ دولت حاصل ہوسکتی ہے، جو لوگ سرے سے صاحب ایمان نہیں ہیں، ان کی شکایت کوئی کیا کرے، جو لوگ ایمان رکھتے ہیں، جنھیں یقین ہے کہ قرآن کریم اللہ کی کتاب ہے، اور ہدایت کی راہ وہی ہے جو قرآن کریم کی روشنی میں دکھائی گئی ہے۔ وہ اپنے گھر کی دولت سے منھ موڑ کر دنیا پرستوں کے پیچھے دوڑ رہے ہیں، اور پریشان ہو رہے ہیں۔

اے ایمان والو! دنیاداروں، دنیا پرستوں، مادیت کے ماروں کی راہ چھوڑو، اور اللہ ورسول کی اطاعت کی راہ پر چلو، اطمینان یہیں ہے، راحت یہیں ہے، فلاح اسی راہ میں ہے، یہ دنیا کی بھی بھلائی ہے، اور آخرت کی بھی بھلائی ہے، اس کے خلاف جو کچھ ہے، گمراہی ہے، ضلالت ہے، سرگشتگی وحیرانی ہے۔ سنو! پکارنے والا صدا لگاتا ہے۔ **فَفِرُّوْا اِلَى اللّٰهِ اِنِّىْ لَكُمْ مِنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ**۔ ’’پس اللہ کی طرف بھاگو، میں تمہارے لئے اس کی طرف سے کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں‘‘۔

(نومبر، دسمبر ۲۰۰۷ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آدمیوں کا ہجوم معیارِ کامیابی نہیں

دسمبر ۲۰۰۷ء کے اخیر ایام میں سرائمیر، ضلع اعظم گڈھ میں ایک عالمی اجتماع تبلیغی جماعت کا ہوا۔ اس میں بعض امور دینی مزاج کے خلاف سامنے آئے، اس کا احتساب کیا گیا۔

الحمدللہ الذی ھدانا لھٰذا وما کنا لنھتدی لولا أن ھدانااللہ، لقد جاء ت رسل ربنا بالحق والصلوٰۃ والسلام علی سیّدنا ومولانا محمد رسول اللہ وعلیٰ آلہ وصحبہ أجمعین، أمابعد! فأعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم، بسم اللہ الرحمن الرحیم: لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِیْ مَوَاطِنَ كَثِیْرَةٍ وَّیَوْمَ حُنَیْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَیْئًا وَّضَاقَتْ عَلَیْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّیْتُمْ مُدْبِرِیْنَ (التوبة:۲۵)

اللہ تعالیٰ بہت سے میدانوں میں تمہاری مدد کر چکے ہیں، اور حنین کے دن بھی، جبکہ تم اپنی کثرت تعداد پر خوش ہوئے تھے، لیکن وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی، اور زمین تم پر اپنی کشادگی کے باوجود تنگ ہوئی۔

یہ بیان کسی آدمی کا نہیں ہے، حق تعالیٰ ایک واقعہ کے ضمن میں ایک خاص تنبیہ فرمارہے ہیں، اور کسی عام آدمی کو نہیں، انبیاء کے بعد اس کائنات کی سب سے برگزیدہ جماعت کو! جس کی خوبی اور جس کے حسن اخلاص اور مرتبۂ کمال کو خود حق تعالیٰ نے بیان کیا ہے، اور اس مقدس ترین جماعت کو ایک بات کی تنبیہ فرمارہے ہیں، اور مہربانی کا انداز یہ ہے کہ اپنے خاص احسان وکرم کے ضمن میں اس تنبیہ کو لارہے ہیں، وہ تنبیہ آپ نے آیت کریمہ میں اور اس کے ترجمے میں پڑھ لی، اب واقعہ کی تھوڑی سی تفصیل بھی ملاحظہ کرلیجئے۔

مکہ مکرمہ ۸ھ میں رسول اللہ ﷺ نے فتح کیا، اور وہاں آپ کا قبضہ مکمل ہوگیا، کعبۂ مطہرہ سے بتوں کی نجاست دور کردی گئی، کفر وشرک کی گندگی سے وہ ہمیشہ کے لئے پاک ہوگیا، اس کے فوراً بعد آپ کو طلاع ملی کہ قبیلہ ہوازن اور بنی ثقیف وغیرہ بہت سے قبائل عرب نے ایک لشکر جرار تیار کر کے بڑے ساز وسامان کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا ہے، یہ خبر پاتے ہی آپ نے دس ہزار مہاجرین وانصار کی فوجِ گراں لے کر، جو مکہ فتح کرنے کے لئے مدینہ سے آئی تھی، طائف کی طرف کوچ کردیا، دو ہزار طلقاء بھی جو فتح مکہ کے وقت مسلمان ہوئے تھے، آپ کے ہمراہ تھے، یہ پہلا موقع تھا کہ بارہ ہزار کی عظیم الشان جمعیت کیل کانٹے سے لیس ہوکر میدانِ جہاد میں نکلی، یہ منظر دیکھ کر بعض صحابہ سے رہا نہ گیا اور بے ساختہ بول اٹھے کہ (جب ہم بہت تھوڑے تھے، اس وقت ہمیشہ غالب رہے تو) آج ہماری بڑی تعداد کسی سے مغلوب ہونے والی نہیں، یہ جملہ مردانِ توحید کی زبان سے نکلنا بارگاہِ احدیت میں ناپسند ہوا، ابھی مکہ سے تھوڑی دور نکلے تھے کہ دونوں لشکر مقابل ہوگئے، فریق مخالف کی جمعیت چار ہزار تھی، جو سر سے کفن باندھ کر نکلی تھی، ابتداء میں مسلمانوں کو غلبہ ہوا، اور کفار کے قدم اکھڑ گئے، اب لشکر اسلام ان سے بے فکر ہورہا تھا کہ قبیلہ ہوازن جو تیر اندازی میں مشہور تھا، گھات سے نکل آیا، انھوں نے آنِ واحد میں چاروں طرف سے اتنے تیر برسائے کہ مسلمانوں کو قدم جمانا مشکل ہوگیا، اوّل طلقاء میں بھاگ پڑی، آخر سب کے پاؤں اکھڑ گئے، زمین باوجود فراخی کے تنگ ہوگئی کہ کہیں پناہ نہیں ملتی تھی، بس ایک حضور اکرم ﷺ کا دم تھا، اور آپ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ سو رفقاء تھے، جو اپنی جگہ ثابت قدم تھے، بلکہ دشمنوں کے نرغے میں آگے بڑھ رہے تھے، اسی حالت میں آپ نے صحابہ کو پکارا، اور آپ کے حکم سے آپ کے چچا حضرت عباس ؓ نے ایک بلند آواز لگائی، اس پر تمام صحابہ ایک دم پلٹ پڑے، اور از سرِ نو جنگ شروع ہوئی، اور دم کے دم میں لڑائی کا پانسہ پھر صحابہ کے حق میں پلٹ گیا، اور انھیں بے نظیر کامیابی ہوئی، سیرت کی کتابوں میں اس کی تفصیل پڑھی جا سکتی ہے۔

مقصد یہ ہے کہ کثرت تعداد اور ہجوم افراد پر نازاں ہونا، اور اس کی بنیاد پر کسی طرح کا دعویٰ کرنا حق تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ کام نہیں، رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی موجود ہے، صحابہ خود انتہائی بزرگ اور مقرب بندے ہیں، لیکن کثرت تعداد پر ناز کا ایک جملہ بعض حضرات سے صادر ہوا، تو پوری فوج آزمائش میں پڑ گئی، اور اللہ نے اس پر تنبیہ فرمائی، اب قیامت تک کے لئے اہل اسلام کے لئے یہ واقعہ اور یہ ارشاد اُسوہ ہے کہ یہاں مدارِ کار نصرتِ الٰہی پر ہے، افراد کم ہوں یا زیادہ ہوں۔ **كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللهِ** (البقرة:۲۴۹) بار بار تھوڑی سی جمعیت بڑی جمعیت پر اللہ کے حکم سے غالب آئی ہے۔

لیکن یہ ایک بشری کمزوری ہے جس کی اصلاح ضروری ہے، کہ جب کسی مقصد پر بڑی تعداد جمع ہو جاتی ہے، اور کسی کام کے لئے کافی سرمایہ اکٹھا ہو جاتا ہے، تو لوگوں میں ایک ناز سا ہونے لگتا ہے، لیکن یہ بات سیاسی پارٹیوں کے لئے، دنیاوی مقاصد کے لئے، حکومت اور ریاست کے لئے خوش آئند ہو تو ہو، مگر دینی مقاصد کے لئے، دینی جماعتوں کے لئے، اور دین کے خادموں کے لئے یہ بات نہ طریقۂ کار کے لحاظ سے پسندیدہ ہے اور نہ نتائج کے اعتبار سے! اگر تعداد ہی بڑھانی مقصود ہوتی، تو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کفار نے مال کی، عورت کی، حکومت کی پیشکش کی تھی، بشرطیکہ آپ اپنے مقصد میں کچھ نرم ہو جائیں، اگر ان کی اس پیشکش کو آپ کسی درجے میں دنیاوی مصلحت کے لحاظ سے منظور فرما لیتے، اور اس طرح اپنی تعداد بڑھا لیتے، تو ہو سکتا تھا، مگر آپ نے اس پر سرے سے توجہ ہی نہیں دی، آپ نے اپنے لوگوں کی قلیل تعداد پر اکتفا کرتے ہوئے، حکم الٰہی کے مطابق جد وجہد جاری رکھی، تکلیفیں سہیں، شدائد برداشت کئے، لیکن تعداد کی طرف التفات نہ کیا۔

مگر اب دنیا کے غلبے نے کثرت تعداد کے نظریے کو اتنا عام کر دیا ہے کہ دینداروں، دین کے خدمت گاروں اور دینی جماعتوں کی نظر میں نہ صرف یہ کہ کثرت تعداد بہت اہمیت اختیار کر گئی ہے، بلکہ اس پر فخر و ناز کا ایک مزاج بن گیا ہے۔

کچھ مدت گزری، دار العلوم دیوبند کے اربابِ حل وعقد نے، اس کے سو سال

پورے ہونے پر ایک صد سالہ جشن کا فیصلہ کیا تھا، اس پر بعض اکابر نے ٹوکا تھا، اور وہ کچھ دنوں کے لئے مؤخر ہو گیا تھا، مگر پھر وہ جشن ہوا، بہت بڑا جشن ہوا۔ دار العلوم دیوبند سے مسلمانانِ ہند و پاک اور بنگلہ دیش کو جو جذباتی تعلق ہے، ظاہر ہے کہ بہت بڑا مجمع اکٹھا ہونا ہی تھا، ہوا۔ تین دن جلسہ ہوا۔ زبانوں پر بہت دنوں تک یہی چرچا رہا کہ بہت بڑا مجمع تھا، اتنے لوگ تھے، پھر اس کے جو اثرات پورے ملک میں، اور خود دار العلوم میں ظاہر ہوئے، وہ بڑی سخت آزمائش تھی، أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ کے نتیجے میں حسد اور عناد کی بڑی سخت نگاہیں امت مسلمہ پر اور خود مدارس پر پڑیں۔ بہت دنوں تک اس آزمائش میں اہل اسلام مبتلا رہے۔ میں ان تفصیلات کو دہرانا نہیں چاہتا، صرف اشارے کر رہا ہوں، ادھر ماضی قریب میں بعض مسلمان خطیبوں نے اپنی ساحرانہ خطابت سے بڑا مجمع اکٹھا کیا، ان کا امتیاز یہی بن گیا کہ اتنا اتنا مجمع ہوا، فلاں جلسے میں اتنی گاڑیاں آئیں، مگر نتیجہ کیا رہا؟ سر پھٹول ہوئی، باہم دشمنیوں کو بڑھاوا ملا، فرقہ پرستوں میں ہیجان ہوا، بابری مسجد شہید ہوئی، کتنے خون خرابے ہوئے، ان مصیبتوں کے جہاں اور اسباب تھے، أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ کی بھی غلطی تھی۔

ابھی پچھلے دنوں، ضلع اعظم گڈھ کے ایک قصبہ سرائمیر میں تبلیغی اجتماع ہوا، بہت بڑا اجتماع ہوا۔ ایک سال سے اس کا شہرہ چل رہا تھا، ہر طرف یہی چرچا تھا کہ اتنے لاکھ مجمع ہوگا، اتنے لاکھ ہوگا، اجتماع ہوا۔ اس وقت یہ خاکسار بسلسلۂ حج مکہ مکرمہ میں تھا، وہاں بھی ہمارے علاقے کے حاجیوں کی زبان پر یہی تذکرہ تھا کہ اتنے لاکھ مجمع ہوا ہے، کوئی ٹی۔ وی پر دیکھ کر بتا رہا ہے، کوئی سن سن کر کہہ رہا ہے، مگر سب کی زبان پر ایک ہی بات تھی کہ بہت بڑا مجمع ہے، تبلیغی جماعت سے تعلق رکھنے والے لوگ اس کو خاص فخر کے انداز سے کہتے تھے، اتنی تعداد ہے، ایسے انتظامات ہیں، اتنے رقبے میں اجتماع ہے وغیرہ، اس کے علاوہ اور کوئی ذکر نہیں۔

میری واپسی اجتماع سے تقریباً ایک ماہ بعد ہوئی، تب بھی حاصل اجتماع یہی سننے میں آیا، اور اب تک یہ چرچا ہو رہا ہے کہ اتنے آدمی تھے، اتنے رقبے میں تھا، اتنی بلّیاں تھیں،

اتنی صفیں تھیں، اس کے علاوہ اور کوئی بات سننے کو نہیں ملی۔ یہ وہی أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ والا حال ہے، تین دن کے اجتماع میں جس کے انتظامات ایک سال سے ہو رہے تھے، لاکھوں لاکھ روپئے خرچ ہوئے، اگر اس کا حاصل یہی فخر و ناز ہے، تب کچھ اچھا حاصل نہیں ہے!

واقعہ یہ ہے کہ اتنے بڑے جلسے ہندوستان جیسے ملک میں بالخصوص نہیں ہونے چاہئیں۔ ان کے فوائد کم اور نقصانات زیادہ ہوتے ہیں، دینی اعتبار سے یہ نقصان ہوتا ہے کہ بڑے جلسے میلے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، سیر و تفریح، خرید و فروخت، تجارت وغیرہ کے مرکز بن جاتے ہیں، یہی مزاج لے کر لوگ آتے ہیں اور یہی مزاج لے کر واپس ہو جاتے ہیں، بس تعداد کی کثرت، بھیڑ بھاڑ، کھانے پینے کے انتظامات یاد رہ جاتے ہیں، ان اثرات کے ہجوم میں دینی نفع دب جاتا ہے۔ اور دنیاوی نقصان یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد کو فرقہ پرست مخالفین دیکھتے ہیں، تو ان کے سینوں پر سانپ لوٹ جاتا ہے، پھر یہ سانپ انھیں زہریلی سازشوں کی طرف لے جاتا ہے، حکومت بھی چونکتی ہے، حکومتوں کا مزاج یہ ہے کہ وہ بڑے مجامع سے گھبراتی ہیں، انھیں ان مجامع میں اپنا زوال دکھائی دینے لگتا ہے، پھر ان کا تشدد بڑھ جاتا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کے ایک بڑے خلیفہ حضرت سیّد آدم بنوری علیہ الرحمہ تھے۔ ایک مرتبہ شاہ جہاں جیسے دینی مزاج کے بادشاہ نے ان کے ساتھ بہت بڑا مجمع دیکھا، تو اسے کھٹک پیدا ہوگئی، اس نے لطائف الحیل سے حضرت کو حج کے لئے سرزمین پاک بھیجوا دیا۔ اور پھر وہیں مدینہ طیبہ میں ان کا وصال ہو گیا۔ ہمارے ملک کی موجودہ حکومت گو جمہوریت کے طرز کی ہے، مگر مزاج وہی ہے۔ قارئین کو معلوم ہوگا کہ سیاسی بساط پر اگر کوئی شخص تیزی سے ابھرتا ہے، اور اقتدار کو اس سے خطرہ محسوس ہوتا ہے، تو وہ خواہ گھر ہی کا آدمی ہو، خواہ بیٹا ہی ہو، اسے راہ سے ہٹا دیتا ہے۔ اس ملک میں بغیر نمائش اور پروپیگنڈہ کے کام ہونا چاہئے، تاکہ کام بھی ہو جائے اور کسی کی نگاہ بد بھی نہ پڑے۔ نمائش اور پروپیگنڈا تو اسلام میں کبھی مستحسن نہیں رہا ہے، اپنی اعمال کسی نمائش اور پروپیگنڈے سے بے نیاز بھی

ہیں اور بیزار بھی! ان اعمال کی افادیت، نمائش کے نتیجے میں باطل ہوکر رہ جاتی ہے۔

۱۹۷۰ء میں تبلیغی جماعت میں، میں نے ایک چلہ وقت لگایا، اس جماعت کے جو امیر تھے وہ ایک بزرگ شخص تھے، حضرت منشی اللہ دتا علیہ الرحمہ کے خلیفہ اور مرکز کے اکابر کے قریب تر! وہ اکثر فرمایا کرتے تھے: اور مجھے خوب یاد ہے کہ حضرت جی مولانا محمد یوسف صاحب نوراللہ مرقدہٗ بڑے اجتماعات کی اجازت نہیں دیتے تھے، وہ فرماتے تھے کہ چھوٹے اجتماع ایک روز کے کرلیا کرو، اس کا نفع زیادہ ہے، ہندوستان کی حدتک بڑے اجتماع کی اجازت صرف بھوپال کے لئے مرحمت فرمائی تھی۔ اگر یہ بات صحیح ہے، تو مرکز کے موجودہ اکابر کو اس پر غور کرنا چاہئے۔

عوام کا طرزِ عمل تو قابو سے باہر ہے، اکابر اس کے پیچھے نہ چلیں، بلکہ شریعت وسنت کے مزاج اور حالات کی دینی مصلحتوں کے مطابق فیصلے صادر فرمائیں، یہی درخواست اربابِ مدارس سے بھی ہے کہ خاموش جدوجہد کریں، پروپیگنڈے کی طرف توجہ نہ دیں، لوگوں کا مزاج بھیڑ بھاڑ کا نہیں دینی واخلاقی بنانے کی سعی کریں۔ مسجدیں خالی ہیں، اگر کسی عارض کی وجہ سے کچھ نمازی بڑھتے بھی ہیں تو دیر نہیں لگتی کہ گھٹ جاتے ہیں، جلسوں کی ہنگامی بھیڑ بھاڑ کا کچھ اعتبار نہیں، پائیدار کام کی تدبیر کرنی چاہئے۔

ممکن ہے میری یہ معروضات بعض دلوں پر گراں گزرے، مگر یہ بات ضروری تھی، عرض کردی۔ اللہ تعالیٰ خیر کی توفیق بخشیں۔

(فروری، مارچ ۲۰۰۸ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سیاست کی ساحری

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو   جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

موجودہ ہندوستان میں جمہوری تماشا ہے، کبھی یہاں جلالِ پادشاہی تھا، مگر مزاجِ حکومت میں کوئی تبدیلی نہیں ہے، حکومت کا ایک مزاج ہے، جو ملوکیت ہو یا جمہوریت سب میں مشترک ہے، وہ یہ کہ تخت وتاج پر حکمرانی جس کی ہو چکی ہے، ہزار تدبیریں وہ کرتا ہے کہ اس کی حکمرانی باقی رہے، اسے کوئی چیلنج نہ کرے، اگر کسی نے یہ ہمت کر لی تو اس ہمت کو توڑنا ضروری ہے، خواہ اس کے لئے کوئی بھی تدبیر کرنی ہو۔ حکومت کے منہ میں اگر کوئی مضبوط لگام لگائی جاسکتی ہے، تو وہ دین وشریعت ہے، مخلص دیندار شخص حکومت کی کرسی پر بیٹھتا ہے تو وہ خود بھی قانونِ الٰہی کے ساتھ سر جھکاتا ہے، اور رعایا کو بھی اسی پر قائم رکھنا چاہتا ہے، وہ اپنی حکومت کو برقرار رکھنے کی فکر اس لئے کرتا ہے کہ اللہ کا قانون نافذ ہو، اس کی حکومت خدمت دین واہل دین کے لئے ہوتی ہے، حکومت مقصد نہیں ہوتی، اقامت دین کے لئے سب جتن کرنے پڑتے ہیں، لیکن اگر یہ مقصد نکل جائے، تو سیاست وحکومت چنگیزی ہو کر رہ جاتی ہے، خواہ وہ ملوکیت ہو یا جمہوریت، مطلب یہ ہے کہ پھر وہ ایک من مانی حکومت ہوتی ہے، اور جس شخص اور جس گھرانے اور جس پارٹی میں وہ ہے، سیاست کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اسی شخص، اسی گھرانے اور اسی پارٹی میں رہے، باہر نہ نکلے، خواہ اس کے لئے جس ناکردنی کو کردنی بنانا پڑے۔

ساٹھ سال سے ہندوستان میں، ہم جمہوری حکومت کا یہی تماشا دیکھ رہے ہیں، جہاں کسی نے ابھرنے کی کوشش کی اقتدار نے اسے دبا دیا، اگر ان حکمرانوں کا بس چلتا، تو

اپنی ذات، اپنی پارٹی اور اپنے خاندان کے علاوہ کسی اور حلقے میں حکومت کو جانے ہی نہ دیتے، لیکن وہ قدرتِ الٰہی کے سامنے بے بس ہیں، قدرت جسے چاہتی ہے حکومت دیتی ہے، جس سے چاہتی ہے چھین لیتی ہے، اَللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ (سورۂ آل عمران:) اے اللہ! اے ملک کے مالک! آپ جسے چاہیں حکومت دیں، اور جس سے چاہیں چھین لیں۔

ایک مدت تک یہاں مسلمانوں کی حکومت رہی، پھر انگریزوں کو ملی، انگریزوں سے حکومت چھینی گئی، تو ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا، اس تقسیم کے بعد جن ہاتھوں میں حکومت پہونچی، ادل بدل کر ابھی تک انھیں ہاتھوں میں ہے، اس حکومت میں مسلمان اقلیت میں ہیں، کسی بھی جمہوریت میں اقلیت ایک جرم ہے، اکثریت جس کے ہاتھ میں حکومت ہوگی، وہ ہر ممکن کوشش کرے گی کہ اقلیت بڑھنے اور پھیلنے نہ پائے، وہ اس حیثیت میں کبھی نہ آئے کہ اقلیت اس کے مدمقابل کھڑی ہو جائے۔

جموری مزاج یہی ہے کہ اقلیت، اقلیت ہی میں رہے، جب جب اقلیت نے اقلیت میں ہونے کے باوجود اپنی تعداد کی کثرت دکھائی ہے، تو جمہوری حکومت نے اس میں قطع و برید کا عمل جاری کیا ہے، الیکشن میں اس قطع و برید کا تماشا مسلسل دیکھنے میں آتا ہے، جہاں کسی اقلیت کی تعداد کسی حلقے میں بڑھی، وہیں اسے مختلف حلقوں میں تقسیم کر کے اقلیت کی جانب لوٹا دیا جاتا ہے۔

اور اگر کسی نے اپنی کثرت تعداد کی نمائش کی تو تمام ذہانتیں اس پر مرکوز ہو جاتی ہیں، کہ اس تعداد اور اس اتحاد کو کسی ایسے طریقے سے توڑ دیا جائے کہ الزام اقلیت ہی کے سر جائے، اور اکثریت کا دامن پاک ہی رہے۔

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ   تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

تقسیم ملک کے بعد جب ایک ہی ملت کے خلاف جارحانہ فسادات، بلکہ نسل کشی کا سلسلہ شروع ہوا، تو مسلمان قائدین کو ایک جوش پیدا ہوا، ایک نیا ولولہ پیدا ہوا، اور متعدد

بزرگوں نے مل کر ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک منتشر اکائیوں کو مربوط کرنے کی کوشش کی، اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر عظیم پیمانے پر اتحاد کی صورت نمایاں ہوئی، اس وقت مسلمانوں کی بڑی تعداد بھی میدان میں دکھائی دی، اور ان کے اتحاد کا بھی غلغلہ ملک بھر میں گونجا، مجلس مشاورت وجود میں آئی، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ جتنی تیزی سے یہ اتحاد ابھرا تھا، اتنی ہی تیزی سے بیٹھ بھی گیا۔ جمہوری حکومت کو یہ کیونکر گوارا ہوتا کہ یہ اتحاد اس کے سر پر مصیبت بنے، یہ اتحاد بکھرا، مگر اس طور پر بکھرا کہ جمہوریت کے دامن پر کوئی دھبہ نہیں آیا۔

اس کے بعد جب کوئی صورت مسلمانوں کے اتحاد واجتماع کی ظاہر ہوئی، دیر نہیں گزری کہ اس میں رخنے پڑنے لگے، اور بالآخر وہ صورت پارہ پارہ ہوکر رہ گئی، دارالعلوم دیوبند نے اجلاسِ صد سالہ کیا، سرزمین دیوبند نے نہیں، سرزمین ہند نے مسلمانوں کا اتنا بڑا اجتماع اور ہجوم کبھی نہ دیکھا تھا، مگر جب اجلاس صد سالہ سے فراغت ہوئی، تو دارالعلوم کے افتراق کی بنیاد پڑ گئی، اس اجتماع سے مسلمانوں کو جو کچھ فائدہ پہونچ سکتا تھا، تو وہ ہوا ہو گیا، اور نقصان کی متعدد راہیں کھل گئیں، پھر دارالعلوم کے دو ٹکڑے ہوئے، کچھ دنوں کے بعد مظاہر علوم کے دو ٹکڑے ہوئے، جمعیۃ علماء ہند کے دو ٹکڑے ہوئے، نقصان ہی نقصان، افتراق ہی افتراق!

پھر اتنا ہی نہیں، اجلاس صد سالہ کے بعد مرادآباد میں عین عید کے دن فساد عظیم ہوا، پھر میرٹھ، علی گڈھ، الہ آباد، کہاں کہاں نہیں اس کی آگ پھیلی، آپ کیا سمجھتے ہیں کہ ان حادثات میں جمہوری حکومت کی سازش نہیں ہے؟ ممکن ہے نہ ہو، مگر ایک ہی قسم کے حادثات کا تسلسل کیا بتا رہا ہے؟

اور آگے بڑھئے، مسلم پرسنل لاء بورڈ نے، مسلمانوں کے مسائل پر غور کرنے اور ان کے تحفظ کے لئے مختلف الخیال علماء وقائدین کو ایک اسٹیج پر جمع کیا، اور اس میں شبہ نہیں کہ اس کے بہت اچھے نتائج برآمد ہوئے، لیکن کیا یہ بھی سچ نہیں ہے کہ اس کے بعد مسلسل

مسلمانوں پر مختلف جہتوں سے مسلم پرسنل لاء کے متعلق، اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ کے ذریعے بے سروپا اعتراضات اور الٹے پلٹے سوالات اٹھائے جانے لگے، کہ خود مسلمانوں کا اعتماد مسلم عائلی احکام پر باقی نہ رہے، کہیں شاہ بانو کیس، کبھی متبنیٰ بل، کبھی عمرانہ کیس، کبھی کچھ اور، آپ کا کیا خیال ہے کہ اختلاف وافتراق کے یہ پودے خود بخود اُگ آتے ہیں، یا ان کا بیج کہیں اور سے آتا ہے؟

ابھی تازہ واقعہ دسمبر ۲۰۰۷ء کی آخری تاریخوں میں ضلع اعظم گڈھ کے قصبہ سرائمیر میں عظیم الشان تبلیغی اجتماع ہوا، اجتماع کے پہلے سے اس کی تشہیر ہورہی تھی، کیا اس تشہیر سے جمہوریت کے کان بہرے تھے، پھر ہندوستان کے مختلف خطوں سے آدمیوں کا سیلاب امنڈا، اور بہت بڑا اجتماع ہوا، یہ اجتماع کیا نگاہوں سے اوجھل تھا، پھر نہایت خاموشی سے اجتماع سے پہلے ہی، اس کے ایک فعال نوجوان عالم حکیم محمد طارق کو اٹھالیا گیا، اجتماع ہوا، اور بہت بڑا ہوا، مگر سارا مسلمان اس میں الجھ گیا کہ طارق کو کیوں اٹھایا گیا، اور پھر مختلف علاقوں سے لوگوں کے اٹھانے کا سلسلہ قائم ہوگیا، تاکہ ایک ہی پر نگاہ مرکوز نہ ہوجائے، اور پھر وہی ہوا، جو حکومتیں چاہا کرتی ہیں، کہ اجتماع بے اثر ہوگیا، مسلمان دوسرے مسئلے میں الجھ کر رہ گیا، اور اجتماع پس پشت چلا گیا۔

پھر دارالعلوم دیوبند میں ایک نیا کام ہوا، وہ یہ کہ مسلمانوں کو اور خصوصاً علماء اور مدارس کو جو بدنام کیا جارہا ہے کہ ”دہشت گرد“ ہیں، اور یہ الزام لگا کر نوجوان علماء کو جیل خانوں میں ٹھونسا جارہا ہے، یہ حکومت کی بدنیتی ہے، اور حکومت چونکہ جمہوری ہے، اس لئے کثرت تعداد کا مظاہرہ کرکے اس کو اس مذموم حرکت سے باز رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے، جمہوریت کی نگاہ کرم نے، ملک میں کم ہی تنظیموں کو چھوڑا ہے، جو بڑی تعداد کو جمع کرسکیں، ہاں دارالعلوم دیوبند کی آواز پر بہت بڑی تعداد اکٹھا ہوسکتی ہے، چنانچہ ہوئی، اور مختلف مکتب خیال کے لوگ شریک ہوئے، میڈیا نے اسے خوب پھیلایا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب مدارس اور مسلمانوں کو دہشت گردی کے الزام سے نجات مل جائے گی، لیکن ابھی اس اجلاس کی

تجویزوں کی روشنائی بھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ ایک بڑے حادثے نے علماء ومدارس کی بڑی تعداد کو اپنی لپیٹ میں لے کر ان کے ذہن ودماغ اور ان کی قوت کار کو کہیں سے کہیں پہونچادیا۔ وہ یہ کہ جمعیۃ علماء ہند کے صدر کو، جو دارالعلوم دیوبند کے مذکورہ اجلاس کے روح رواں تھے، معزول کر کے دارالعلوم ہی کے ایک دوسرے استاذ کو جو صدر صاحب کے قریبی رشتہ دار بھی ہیں، عبوری صدر بنادیا گیا، اب یہ تنازعہ نہ صرف جمعیۃ کو بلکہ دارالعلوم جیسے موقر ومحترم ادارے کو بھی اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے، اجلاس کی روح تو فنا ہو ہی گئی، خود جمعیۃ اور دارالعلوم کے لالے پڑ گئے ہیں۔

عجیب شے ہیں آپ بھی جہاں بھی سایہ پڑ گیا کہیں بہار لٹ گئی کہیں چمن اجڑ گیا
جو سینۂ ودماغ پر پڑی نگاہِ فتنہ گر تو گھٹ گئے دل وجگر خرد سے ہوش لڑ گیا

میں نے اسے نیا کام کہا، وہ اس لئے کہ اس طرح کی تحریکات ......جن کا تصادم براہ راست حکومت سے ہو...... سے دارالعلوم کو ہمیشہ دور رکھا گیا ہے، دارالعلوم دیوبند اپنے روزِ اول سے انگریزی حکومت کے خلاف رہا ہے، دارالعلوم دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی، ان کے خاص شاگرد شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی، پھر ان کے خصوصی تلمیذ شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی علیہم الرحمہ نے براہ راست انگریزی حکومت سے ٹکر لی تھی، مگر اس ٹکراؤ اور تصادم میں دارالعلوم کو شریک نہ کیا، اس کا میدان دارالعلوم سے باہر بنایا، چنانچہ کوئی تاریخ بتا نہیں سکتی کہ دارالعلوم دیوبند کی جانب سے انگریزی حکومت کے خلاف کوئی تحریک چلائی گئی ہو، یا کوئی جلسہ اس مد میں کیا گیا ہو۔ انگریزوں کے چلے جانے کے دس سال بعد تک حضرت مدنی قدس سرہٗ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس بلکہ روح کل رہے، اور حالات بھی بہت آئے، یہاں تک کہ حکومت نے ایک مرتبہ دارالعلوم کی تلاشی بھی لی، مگر دارالعلوم دیوبند میں حکومت کے اقدامات کے خلاف کوئی عام جلسہ نہیں کیا گیا، اب اللہ جانے انھیں کے اخلاف کو کیا سوجھی کہ دارالعلوم دیوبند کی طرف سے دہشت گردی کے خلاف اجلاس بلا ڈالا۔ اس اجلاس کی

تحریک سے پہلے ایک اور اسی طرح کے موضوع پر سیمینار یا اجلاس کا پروگرام بنایا گیا تھا، جس کا موضوع تھا ’’ملک کی آزادی میں علماء دیوبند کا کردار‘‘۔ مجھے اسی پر اشکال تھا، اور سوچا تھا کہ ادب سے اربابِ انتظام کی خدمت میں عرض کروں گا کہ یہ کام دارالعلوم سے باہر دوسری تنظیموں کے کرنے کا ہے، دارالعلوم کو اس سے بچایئے، مگر وہ تو معرض التواء میں چلا گیا، اور خدا کرے کہ منسوخ ہی ہو جائے، لیکن اس سے بڑھ کر یہ مذکورہ اجلاس ہو گیا، اور اس کی خطرناکیاں بھی ظاہر ہو گئیں۔ اس تفصیل سے قارئین نے سمجھ لیا ہو گا کہ میں نے اسے نیا کام کیوں کہا؟

اخیر میں، یہ عرض ہے کہ میں بہت چھوٹا ہوں، میری گزارش اگر درخور اعتنا نہ ہو تو بجا ہے، تاہم عرض تو کر ہی دوں کہ جمہوری تقاضوں پر دارالعلوم دیوبند کو نہ دوڑایئے، دارالعلوم اپنے اندر علماء کی تربیت کرتا رہے، انھیں علماء سے دین کی بقاء اور تحفظ کا انتظام ہوگا۔ دارالعلوم دیوبند کو میدانِ کارزار نہ بنائیں، تعلیم جتنی پختہ ہوگی، علم میں جتنا رسوخ ہوگا، علوم نبوت سے جتنا تعلق ہوگا، علماء میں اتنی ہی پختگی ہوگی، اور ان کے واسطے سے عام مسلمانوں میں پختگی آئے گی۔ قوم کے ان کچے نونہالوں کو سیاست کی نذر نہ کریں، ورنہ نہ دین رہے گا، اور نہ سیاست! دارالعلوم کا موضوع علم اور دین کی پختگی ہی ہے، یہاں سے پختہ ہو کر نکلیں گے، تو جس میدان میں اتریں گے، عزیمت وحوصلہ مندی ان کے ہمراہ ہوگی، اربابِ انتظام کوئی کام اس کے موضوع کے خلاف نہ کریں، اور دنیا والوں کی نقالی تو بالکل نہ کریں، وہ مجوزہ سیمینار جس کے دعوت نامے، اور مقالات کی فرمائشیں ملک بھر میں پھیل چکی ہیں، اچھا یہ ہے کہ انھیں سرے سے ختم کر دیں۔ **اقول قولی هٰذا وأستغفر الله لی ولسائر المسلمین، آمین یارب العالمین۔**

(اپریل ۲۰۰۸ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مروجہ جلسے

بے اعتدالیاں اور ان کی اصلاح

الحمدللہ الذی ھدانا لھٰذا وما کنا لنھتدی لو لا أن ھدانااللہ، وصلی اللہ علیٰ سیدنا ونبینا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم ، أمابعد!

کسی معاشرہ میں جب کوئی چیز بے تکلف اور بغیر کسی ردوانکار کے رواج عام پا جاتی ہے، تو وہ بطور اصول مسلمہ کے، سب کے دلوں میں جاگزیں ہوجاتی ہے، بالخصوص جب کہ اس کا تعلق کسی دینی معاملے سے ہو، دین کی نسبت سے اس میں تقدس کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے، اگر کبھی کوئی اس رواج عام میں ترمیم یا اصلاح کرنا چاہتا ہے تو ملامت اور طعن کا نشانہ بن جاتا ہے، اس مجلس میں ایسے ہی ایک رواج عام کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

مسلمانوں میں ایک عرصے سے ایک خاص طرح کے دینی جلسوں کا رواج ہے، یہ جلسے مدارس اسلامیہ میں بھی ہوتے ہیں، عوام کے حلقوں میں بھی ہوتے ہیں، کبھی انھیں جلسہ کہا جاتا ہے، کبھی اجلاس لکھا جاتا ہے، کبھی کانفرنس کے نام سے ہوتے ہیں، لیکن نام خواہ کوئی ہو، جلسہ کی ہیئت، اس کا پروگرام یکساں ہی ہوتا ہے، اس ہیئت کے جلسے کب سے رائج ہیں، مجھے تاریخ معلوم نہیں، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس کے ابتدائی رواج پر سوسال کا عرصہ ضرور ہوا ہوگا۔ اس رواج سے پہلے جو کچھ ملتا ہے وہ یہ کہ علماء حق مسجدوں میں وعظ ونصیحت کیا کرتے تھے، یا کسی جگہ مدرسہ میں، خانقاہ میں کوئی عالم، کوئی بزرگ ہفتہ میں کسی ایک دن

تقریر کردیتے، لوگ وہاں حاضر ہوتے، اور ضرورت اور وقت کے مطابق ان کے وعظ ہوتے، بعض مرتبہ وعظ سے پہلے کوئی قاری قرآن کچھ آیتیں پڑھتا، پھر وہ بزرگ انھیں آیات کا ترجمہ کرتے، تشریح کرتے، عموماً وعظ کا یہی دستور تھا، ان دنوں خانقاہیں آباد اور معمور تھیں، لوگ ان خانقاہوں اور تربیت گاہوں میں حاضری دیتے اور دینی و دنیوی منافع سے مالا مال اور نہال ہوکر لوٹتے۔

پھر جب مسلمانوں کی حکومت یہاں سے گئی، اور انگریزوں نے قدم جمائے، تو پچھلی قدریں آہستہ آہستہ بدلتی گئیں، حقیقت کی جگہ نمائشیں ابھرنے لگیں، ہر چیز کے طور میں تبدیلی آنے لگی، تو وعظوں کا دستور بھی متاثر ہوا، اور اب جو صورت حال عرصہ سے ہمارے سامنے ہے، وہ یہ ہے کہ ایک رات یا دو رات کا جلسہ ہوتا ہے، ایک ایک جلسہ میں متعدد مقررین کو دعوت دی جاتی ہے، خوش گلو نظم خواں بلائے جاتے ہیں، اشتہار شائع کئے جاتے ہیں، اکثر جگہوں پر جلسہ کے باضابطہ آغاز سے پہلے چھوٹے بڑے متعدد نعت خواں اپنے جوہر آزما چکے ہوتے ہیں، پھر جلسہ کا باضابطہ آغاز ہوتا ہے، لوگ ادھر ادھر منتشر ہوتے ہیں، تحریک صدارت ہوتی ہے، تائید ہوتی ہے، ادھر چند برسوں سے تائید کا سلسلہ کم رہ گیا ہے، اناؤنسر اعلان کے نام پر اچھی خاصی تقریر کرلیتا ہے، بعض اناؤنسر اشعار سے اپنی تقریر سجاتے ہیں، پہلے ایک یا دو قرأت ہوتی ہے، پھر نعت خواں طلب کئے جاتے ہیں، وہ کافی وقت لے لیتے ہیں، کبھی کبھی دو دو تین تین نعت خواں ہوتے ہیں۔ بریلویوں کا جلسہ ہوا، تو اس پر مجلس وعظ سے زیادہ محفل مشاعرہ کا گمان ہوتا ہے، اتنی دیر تک مجمع ادھر ادھر رہتا ہے، اناؤنسر آدابِ مجلس کا حوالہ دے کر لوگوں کو پنڈال میں سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن بکھرا ہوا ہر آدمی سمجھتا ہے کہ میں اس کا مخاطب نہیں ہوں، دوسرے لوگ ہیں، پھر جب تقریر شروع ہوتی ہے، تو تقریر کے انداز اور تقریر کرنے والے وزن کے اعتبار سے لوگ بیٹھنے لگتے ہیں، جلسوں میں دستور ہے کہ پہلے ہلکے پھلکے مقررین بلائے جاتے ہیں، پھر اصل مقرر کو دعوت دی جاتی ہے، لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ نعت خوانی اور ہلکی پھلکی تقریریں اتنا وقت لے لیتی ہیں کہ مجمع اُکتا

جاتا ہے، سونے لگتا ہے، اور اصل مقرر کے حصے میں بچا کھچا مجمع اور وہ بھی ایک حصہ سوتا ہوا نصیب ہوتا ہے، اب یہ اس کی طاقت کا کرشمہ ہوتا ہے کہ سوتوں کو جگالے اور بھاگتوں کو بلالے۔ اس طرح رات کا بڑا حصہ گزر جاتا ہے، اور سامعین کے پلے زیادہ تر یہی بات پڑتی ہے کہ فلاں صاحب تو بالکل بے مزہ تھے، یا فلاں صاحب غنیمت تھے، البتہ فلاں صاحب کی تقریر اچھی ہوئی، قلوب پر کیا اثرات ہوئے، ایمان کتنا جاگا، عمل کا ذوق ابھرا یا نہیں؟ اللہ کی محبت، رسول کی محبت، شریعت کی عظمت، آخرت کی رغبت، جنت کا شوق، جہنم کا خوف، دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ دل میں کتنا جما، عموماً مجمع ان سب چیزوں سے برکنار رہتا ہے، مقررین کے درمیان موازنہ ہی اصل موضوع کی جگہ لے لیتا ہے، اکثر جلسوں کا یہی حال دیکھنے میں آتا ہے۔

گرمی کا موسم جلسوں کے لئے موسم بہار ہے، اس موسم میں بکثرت جلسے ہوتے ہیں، ان جلسوں میں عوام الناس کی تعداد جتنی بھی ہوتی ہو، آس پاس کے مدارس کے طلبہ بکثرت جاتے ہیں اور اپنی تعلیم کا بڑا نقصان کرتے ہیں۔

میں بہت دنوں سے سوچا کرتا ہوں کہ جلسوں کے اس مروجہ دستور کو بدلنا چاہئے، اس دستور میں فائدے ضرور ہیں، مگر نقصان زیادہ معلوم ہوتا ہے، بعض لوگوں نے کچھ بدلا بھی ہے، مثلاً یہ کہ یہ جلسے بالعموم عشاء کے بعد شروع ہوتے ہیں، لیکن بعض جگہوں میں یہ تبدیلی کی گئی کہ مغرب کے بعد ہی سے جلسے شروع کئے جانے لگے، اور گیارہ بجے کے قریب ختم کئے جاتے ہیں، پھر عشاء کی نماز پڑھی جاتی ہے، اس کے بعد کھانے پینے کی مشغولیت رہتی ہے۔ اس تبدیلی کا یہ عذر بیان کیا جاتا ہے کہ دیر رات تک جلسہ ہوتا ہے اور صبح کو فجر کی نماز قضا ہوجاتی ہے، یہ بات تو درست ہے کہ دین کے لئے جاگتے ہیں، اور دین ہی کا اہم فریضہ غائب کردیتے ہیں، لیکن یہ خرابی مغرب بعد شروع ہونے والے جلسوں میں اتنی ہی ہے، بلکہ اس سے زائد جو عشاء کے بعد جلسوں میں ہے، گیارہ بجے جلسہ ختم ہوا، اچھا خاصا وقت عشاء کی نماز میں لگ جاتا ہے، پھر کھانے پینے کی مشغولیت رہتی ہے، نتیجہ کے اعتبار

سے رات وہیں تک پہونچ جاتی ہے، جہاں تک عشاء کے بعد جلسوں میں پہونچتی ہے، مزید یہ کہ انسانی کلام کی وجہ سے عشاء کی نماز وقت معہود سے موخر کرنی پڑتی ہے، یہ خود ایک نامناسب چیز ہے، پھر جلسوں میں لوگ آخر تک بیٹھنے کے عادی نہیں ہوتے، کتنے لوگ درمیان میں اٹھتے رہتے ہیں، کتنے لوگ واپس چلے جاتے ہیں، ان کی یا تو جماعت چھوٹتی ہے، یا سرے سے نماز ہی ترک ہوجاتی ہے، کیونکہ سستی اس وقت تک خوب غلبہ پالیتی ہے، اس سلسلے میں مناسب یہی ہے کہ جلسہ عشاء کے بعد ہی ہو، دیر رات ہونے کا دوسرا علاج کرنا چاہئے۔

اس کی اصلاح کا طریقہ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جلسے کے آغاز کی بے ضابطہ کارروائیاں بالکل بند کردی جائیں، جلسہ عشاء کی نماز کے بعد فوراً شروع کردیا جائے، اور اس میں نعت کا خانہ بند کردیا جائے، نظم میں رسول اللہ ﷺ کی تعریف کرنے سے بہتر نثر میں ہے، اور وعظ میں جو کچھ بیان کیا جاتا ہے، وہ اللہ کی کبریائی اور نبی ﷺ کی محبت وعظمت اور عقیدت کے علاوہ اور کیا ہوتا ہے، پس یہی نعت کافی ہے اور اصل ہے، باقی نعت خوانیاں گلے کا زور اور حظ نفس ہے۔ بس ابتداء میں قرآن کی تلاوت کرادی جائے، اس کے بعد اصل وعظ شروع ہوجائے، نہ مجمع کو پکارا جائے، نہ اس کا انتظار کیا جائے۔ تجربہ یہ ہے کہ تقریر شروع ہوتے ہیں مجمع آجاتا ہے، ایک گاؤں میں ہلکا پھلکا ایک جلسہ تھا، اناؤنسر صاحب مسلسل پکار رہے تھے کہ جہاں تک میری آواز جاتی ہو، لوگ جلسہ گاہ میں حاضر ہوں، میں سنتے سنتے اکتا گیا، میں جلسہ گاہ سے کچھ دور منتظمین کے ہجوم ضیافت میں محصور تھا، میں عجلت میں اسٹیج پر پہونچ گیا، دیکھا تو مجمع نام کی کوئی چیز نہ تھی، اناؤنسر اکیلا گھگھیا رہا تھا، میں نے کہا کہ یہ گزارش بند کیجئے، اور جلسہ شروع کیجئے، قرأت ہوئی، ایک نعت ہوئی، اور میں نے تقریر شروع کردی، دم کے دم میں مجمع جم گیا۔

اناؤنسر صاحب، اناؤنسری کے مد میں جو تقریر کرتے ہیں، وہ بھی موقوف کریں، اس طرح وقت بہت سا بچ جائے گا۔ اب وہ بات کہنا چاہتا ہوں جو اصل ہے، وہ یہ کہ ایک

رات میں کئی مقرر جمع نہ کئے جائیں، ایک ہی مقرر کو جو صاحب علم ہوں، دعوت دی جائے، وہ وعظ فرمائیں، اور اسی پر جلسہ ختم کر دیا جائے، مناسب وقت پر جلسہ ختم ہو جائے گا، واعظ کو بھی آسانی ہوگی، یہ کھٹکا نہ ہوگا کہ میرے بعد ایک اور صاحب آنے والے ہیں، مجھے جلدی کرنی چاہئے، کہیں ختم کرنے کا پرچہ نہ آجائے، کہیں سامعین کو شکایت نہ ہو، وغیرہ۔

سامعین کو بھی آسانی ہوگی کہ موازنہ کے مخمصے سے نجات پا جائیں گے، ایک ہی شخص کی طرف سے وعظ و نصیحت کی باتیں ہوئیں، وہ دل میں اتر گئیں، کئی تقریریں ہوتی ہیں تو کسی کا نقش نہیں جمتا، یہ جلسہ آسان بھی ہے، مفید بھی ہے، اور شب و روز کے نظام الاوقات میں خلل بھی نہیں ڈالے گا، اس طریقۂ کار میں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ شاید ''مقرر واحد'' تشریف نہ لائیں تب کیا ہوگا، اس کا جواب یہ ہے کہ موعود مقرر کے نہ آنے کی صورت میں جلسہ موقوف کر دیا جائے، یا مقامی کسی واعظ و مقرر کی خدمت حاصل کر لی جائے، کام جب اللہ کے لئے ہوگا، تو کوئی اچھی شکل نکل آئے گی، اول تو انشاء اللہ ایسی نوبت نہ آئے گی، اور اگر خدانخواستہ ایک جلسہ موقوف کر دیا جائے تو آئندہ احتیاط ہوگی۔

بہر حال وعظ کا سلسلہ تو باقی رہنا چاہئے، اس سے مسلمانوں میں ایمان و اخلاص کی روح دوڑتی ہے، مگر یہ کام اللہ کے لئے ہے، اس کو اسی طریقہ پر انجام دینا چاہئے، جیسا کہ اللہ کے واسطے ہونا چاہئے، نمود و نمائش، شہرت طلبی و ریاکاری، خلاف عقل و شرع کوئی کام نہ ہو۔

یہ گزارشیں تو جلسے کے منتظمین سے ہیں، کچھ باتیں حضرات مقررین سے بھی عرض کرنی ہیں، میری یہ حیثیت تو نہیں ہے کہ ان اصحاب ذی شان کی خدمت میں کچھ گزارش کرسکوں، تاہم چھوٹا ہی سہی، چھوٹے کی بات بڑے حضرات سن لیں، تو چھوٹے کی سعادت ہوگی۔ (مئی ۲۰۰۸ء)

☆☆☆☆☆

مقررین سے گزارش:

اوپر کی سطروں میں مَیں نے عرض کیا تھا کہ میں چھوٹا آدمی ہوں اور جو بات کہنا

چاہتا ہوں وہ بڑی ہے، پس ''چھوٹا منہ بڑی بات'' کی مثل کہی جاسکتی ہے، لیکن بڑے لوگوں سے توقع ہوتی ہے کہ وہ چھوٹوں کی بات بھی سن لیتے ہیں، خدا کرے اچھی بات، اچھے انداز میں کہنے کی توفیق ہو۔

ہمارے یہ دینی جلسے وعظ نصیحت اور تذکیر واحتساب کے لئے منعقد کئے جاتے ہیں، یہی چیزیں ان جلسوں کا موضوع ہیں، عقائد کا بگاڑ ہو، رسوم بد کا رواج ہو، فرائض سے غفلت ہو، حقوق اللہ سے لاپروائی ہو، حقوق العباد کی پامالی ہو، یا گناہوں میں ابتلاء ہو، ان سب پر روک ٹوک، شریعت پر عمل کرنے کی تلقین، اللہ ورسول کی محبت وعظمت، عبادات کی ترغیب، صحیح اسلامی زندگی گزارنے کی فہمائش، آخرت، قیامت، جنت ودوزخ کی تذکیر! یہی وہ عناصر ہیں جن سے ہمارے یہ جلسے ترکیب پاتے ہیں، یہ سب کام اللہ کے حکم سے انبیاء کرام علیہم السلام نے کئے ہیں، ان کے جانے کے بعد ان کے وارثین یعنی علماء ربانیین کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ یہ خدمت انجام دیں۔ اسی لئے جلسوں میں حضرات علماء کرام کو مدعو کیا جاتا ہے کہ یہ حضرات اللہ ورسول کے حوالے سے عوام الناس کو دین کی باتیں سمجھائیں، ان وعظوں کے اثر سے قلوب متاثر ہوتے ہیں، عبادت کی رغبت بڑھتی ہے، گناہوں سے خوف ہوتا ہے، جنت کا شوق اور جہنم سے ڈر پیدا ہوتا ہے، دنیا کی محبت کم ہوتی ہے۔

پچھلے دور میں حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب شہید اور حضرت مولانا عبد الحی صاحب نمونہ کے واعظین میں تھے، ان کے وعظوں سے قلوب کی کایا پلٹ ہوجاتی تھی، یہ حضرات بہت بڑے عالم، صاحب نسبت اور صاحب تقویٰ بزرگ تھے، اور بڑے بڑے بزرگوں کے صحبت یافتہ تھے، ان دونوں حضرات کے وعظ نمونے کے ہوتے تھے، ان کے وصال کے بعد بانی دار العلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ انھیں کے نمونے کے واعظ تھے، مولانا بہت کم وعظ کہتے تھے، اگر کوئی زیادہ اصرار کرتا، تو کہہ دیتے۔ ایک مرتبہ کسی کے اصرار پر فرمایا:

> ''وعظ ہم لوگوں کا کام نہیں، اور نہ ہمارا وعظ کچھ موثر ہوسکتا ہے، وعظ کام تھا،

> مولانا محمد اسماعیل صاحب شہید کا، اور انھیں کا وعظ موثر ہوسکتا تھا، دیکھو اگر کسی کو پاخانہ پیشاب کی حاجت ہو تو اس کے قلب میں اس وقت تک بے چینی رہتی ہے جب تک وہ ان سے فراغت نہ حاصل کرلے، اور اگر وہ کسی سے باتوں میں بھی مشغول ہوتا ہے، یا کسی ضروری کام میں لگا ہوتا ہے، تو اس وقت بھی اس کے قلب میں پاخانہ پیشاب ہی کا تقاضا ہوتا ہے، اور طبیعت اس کی اسی طرف متوجہ ہوتی ہے، اور وہ چاہتا ہے کہ جلد سے جلد اس کام سے فراغت پاکر قضائے حاجت کے لئے جاؤں، سو واعظ اور اس کے وعظ کی تاثیر کے لئے کم از کم اتنا تقاضائے ہدایت تو ضرور ہونا چاہئے جتنا کہ پاخانہ پیشاب کا، اگر اتنا بھی نہ ہو تو نہ واعظ وعظ کا اہل ہے، اور نہ اس کا وعظ موثر ہوسکتا ہے، ہم لوگوں کے قلوب میں ہدایت کا اتنا تقاضا ہی نہیں، جتنا کہ پاخانہ پیشاب کا، اس لئے نہ ہم وعظ کے اہل ہیں، اور نہ ہمارا وعظ موثر ہوسکتا، ہاں یہ تقاضا مولوی اسمٰعیل صاحب کے دل میں پورے طور سے موجود تھا، اور جب تک وہ ہدایت نہ کرلیتے ان کو چین نہ آتا تھا۔''

واقعہ یہ ہے کہ وعظ کا موضوع ہدایت خلق اور تذکیر اہل ایمان ہے، حق تعالیٰ نے فرمایا: وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ، اور یاددہانی کراتے رہو، یہ یاددہانی اہل ایمان کے لئے نافع ہے، تو جب وعظ کا موضوع ومقصود یہ ٹھہرا، تو واعظ کو اس کا اہتمام کرنا ضروری ہے، کہ

(۱) وعظ محض اللہ کے لئے ہو، اس سے کوئی دنیاوی غرض، خواہ مال ہو یا جاہ ومرتبہ، وابستہ نہ ہو۔

(۲) وعظ کے لئے صحیح معلومات اور صحیح علوم کا انتخاب کیا گیا ہو، واعظ درحقیقت اللہ ورسول کا ترجمان ہوتا ہے، اور ترجمان کے لئے ضروری ہے کہ جس کی ترجمانی کرنی ہے، اس کی منشا معلوم ہو، پھر اسے پوری دیانت داری کے ساتھ ادا کرتا ہو، بے علمی یا کم فہمی یا بدفہمی کے ساتھ جو وعظ ہوگا، وہ گمراہی کا ذریعہ بنے گا۔ جو لوگ ناقص علم اور غلط معلومات لے کر

کرسئ وعظ پر بیٹھ جاتے ہیں، پھر الٹی سیدھی باتیں، اللہ ورسول کا نام لے لے کر بیان کرنے لگتے ہیں، وہ سخت خطرناک راہ پر چل رہے ہیں، بعض تو بالکل ہی بے علم ہوتے ہیں، مگر بے دھڑک بیان کرتے ہیں، اور اگر اس پر ٹوکا جاتا ہے، تو کہتے ہیں کہ ہم وعظ وتقریر نہیں کرتے، ہم تو بات چیت کرتے ہیں، اللہ جانے مجمع عام کے سامنے کھڑے ہوکر یا بیٹھ کر کچھ کہتے رہنے کو دو خانوں میں کیسے تقسیم کیا جاسکتا ہے کہ یہ بات چیت ہے، یہ سب کے لئے روا ہے، اور جو کچھ کہیں سب جائز ہے، اور کب وہی وعظ وتقریر ہوجاتی ہے، کہ اس کے لئے صاحب علم ہونا ضروری ہے۔

یہ محض فریب نفس ہے، ایسے لوگوں کو بیان کرنا جائز ہی نہیں ہے، جو صحیح اور قدرے معتد بہ معلومات نہ رکھتے ہوں۔ وعظ وبیان ایک عبادت ہے، اور بہت سی عبادات کے زندہ ہونے کا ذریعہ ہے، لیکن بے علمی اور جہل کے ساتھ یہ عبادت فاسد ہوجاتی ہے۔ حضرت عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم ﷺ سے سنا ہے، آپ فرمارہے تھے: **لایقص إلا أمیر أو مامور أو مختال** (رواہ ابوداؤد فی کتاب العلم)

وعظ وبیان تین ہی آدمی کرتے ہیں، امیر، یا مامور، یا متکبر۔

مشہور تابعی حضرت شریح سے منقول ہے کہ یہ حدیث وعظ وتقریر سے متعلق ہے، یعنی امراء وسلاطین خطبۂ وتقریر کے ذمہ دار ہوتے تھے، لوگوں کو نصیحت کرتے تھے، اور انھیں تنبیہ وتذکیر کیا کرتے تھے۔ اور مامور، وہ ہے جسے امام وعظ وتقریر کے لئے متعین کرے، پس وہ لوگوں کو نصیحت کرے اور ان کے سامنے بیان کرے۔ اور مختال وہ ہے جو از خود اپنے آپ کو واعظ ومذکر بنا کر پیش کرے، اور جاہ ومرتبہ کے حصول کے لئے اسٹیج پر بیان کرے، وہ نمائش اور کبر کے اندر مبتلا ہو۔ (بذل المجهود، ج:۱۱، ص:۳۹۷)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ وعظ اسے کہنا چاہئے جو مامور وماذون ہو، یہ امر اور اجازت اصلاً تو حکومت اسلامی کی طرف سے ہونی چاہئے، لیکن ہمیں اسلامی حکومت کہاں نصیب؟ تو کم از کم معتبر علماء ومشائخ کی طرف سے اجازت ہو، بلکہ حکم ہو، ورنہ یہ کام نمود

ونمائش اور کسب معاش کا ایک ذریعہ بن کر رہ جاتا ہے۔

علماء اور واعظین کی ذمہ داریاں بہت بڑی ہیں، ان کے اقوال وارشادات کی طرح ان کے اعمال واحوال بھی لوگوں پر اثر کرتے ہیں، بات تو بہت اچھی ہو، لیکن حال اچھا نہ ہو، یا عمل کچا ہو، تو بات کی تاثیر تو جاتی ہی ہے، عالم کا وقار بھی ختم ہوتا ہے، اور جب عالم کا وقار اور واعظ کی عظمت قلب میں نہ ہو تو نہ وعظ موثر ہوتا، اور نہ دین کی محبت ہی دل میں پیدا ہوتی، اور عوام کے دلوں میں سب سے زیادہ بے وقعتی جس چیز سے پیدا ہوتی ہے وہ مال کی حرص اور اس کا سوال ہے، بلکہ اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں عالم کے قلب میں مال کی عظمت ہے، تو صرف اتنے سے وہ نگاہوں سے گر جاتا ہے، حدیث کی مشہور کتاب مشکوٰۃ شریف میں حضرت سفیان ثوری علیہ الرحمہ سے نقل کیا گیا ہے کہ امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ مشہور اہل کتاب تابعی حضرت کعب احبار علیہ الرحمہ سے پوچھا کہ: اصحاب علم کون لوگ ہیں؟ عرض کیا کہ وہ لوگ جو اپنے علم کے مطابق عمل کرتے ہیں، فرمایا کہ وہ کیا چیز ہے جو علماء کے قلوب سے علم کو نکال باہر کرتی ہے؟ عرض کیا کہ: طمع، یعنی حرص اور لالچ۔ (رواہ الدارمی)

انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا متفقہ اعلان ان کی قوموں میں یہ ہوتا تھا کہ لَا أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْراً إِنْ أَجْرِىَ إِلَّا عَلَى اللهِ ، میں اپنی اس خدمت پر جو ہدایت وارشاد کے متعلق کر رہا ہوں، تم سے کسی اجر اور معاوضہ کا طالب نہیں ہوں، میرا اجر تو محض اللہ پر ہے۔ اس اعلان نے تمام اقوام کو اس طرف سے مطمئن کر دیا کہ یہ جو کچھ ہم سے کہا جا رہا ہے اس کے نتیجے میں مال وجاہ کا کوئی سوال نہ ہوگا، اگر قوموں کو اس کا ذرا بھی خطرہ گزرتا، تو وہ سب سے زیادہ اسی پر شور مچاتیں، اور اگر کسی کا مقصد کسی درجہ میں حصول زر ہو، تو وہ اپنی مخاطب قوم کی مخالفت کبھی مول نہ لے گا، بلکہ وہ ان کی من پسند باتیں کرے گا، تا کہ اس کی جیب گرم ہوتی رہے۔

ایک عالم اور واعظ کی یہ بڑی تذلیل ہے کہ اسے حرص مال کی طرف منسوب کیا

جائے، اور اس کا وقار صد گونہ بڑھ جاتا ہے، اور اس کی عظمت ومحبوبیت المضاعف (کئی گنا) ہوجاتی ہے، جب اس کا قلب مال وجاہ کی حرص سے بے نیاز ہوتا ہے۔

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس نے عرض کی: **یا رسول الله ! دلنی علیٰ عمل إذا عملته أحبنی الله وأحبنی الناس** ۔ مجھے کوئی ایسا عمل بتائیے، کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ بھی مجھ سے محبت کریں اور لوگ بھی، آپ نے فرمایا: **إزهد فی الدنیا یحبک الله**، دنیا سے بے رغبت ہوکر رہو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت فرمائیں گے، اور **إزهد فی ما أیدی الناس یحبک الناس**، (ابن ماجہ) اور جو کچھ دوسروں کے ہاتھ میں ہے، اس سے بے رغبت ہوجاؤ، تو لوگ تم سے محبت کریں گے۔

حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا متفقہ اُسوہ اور رسول اکرم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی عام علماء کرام اور بالخصوص واعظین ذوی الاحترام کیلئے ایک بہترین رہبر ہے، لوگوں کو نفع پہونچائیے، مگر ان سے کسی حصول نفع کی آس مت رکھئے، حق تعالیٰ کی ذات اور خزانۂ غیب پر یقین اور اطمینان کیجئے۔

خالق تعالیٰ کے حضور نیازمندی اور مخلوق سے بے نیازی، علماء اور واعظین کی بہترین پناہ گاہ ہے، اللہ تعالیٰ نیک توفیق بخشیں۔ آمین (جون ۲۰۰۸ء)

☆☆☆☆☆

میں نے گزشتہ صفحات میں مروجہ جلسوں اور حضراتِ مقررین کے متعلق کچھ باتیں عرض کرنے کی ہمت کی تھی، چند اور گزارشیں کرنی تھیں، انھیں اب پیش کررہا ہوں، خدا کرے ان سے نفع ہو۔

(۱) پہلی گزارش آج کی مجلس میں یہ ہے کہ جلسوں کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے، دور دور تک اس کی اطلاعات پھیلائی جاتی ہیں، لوگ مقرر اور واعظ کی شخصیت اور اس کی تقریر کی کشش میں دور نزدیک سے آتے ہیں، جس قدر مقرر سے تعلق ہوتا ہے، عقیدت ومحبت ہوتی

ہے، اسی کے بقدر دلچسپی سے لوگ پہونچنے کا اہتمام کرتے ہیں، اس لئے مقرر حضرات کو چاہئے کہ جب کہیں پہونچنے کا وعدہ کریں، تو ہر ممکن جدوجہد کر کے وہاں پہونچیں۔ وعدہ کا پورا کرنا ایمان کے لوازم میں سے ہے، اور وعدہ کی پروانہ کرنا، معمولی اعذار کی وجہ سے اس کو ٹال جانا، نفاق کی علامت ہے، پس جب وعدہ کرلیا، تو شدید مجبوری ہوتو الگ بات ہے، ورنہ ضرور پہونچ جانا چاہئے، اور جب شدید مجبوری ہو، تو اس کی اطلاع منتظمین جلسہ کو ضرور کردیں، چاہے اس کے لئے آدمی بھیجنا پڑے، اور اس اطلاع میں غلط بیانی ہرگز نہ کی جائے، ورنہ بات کھل کر رہتی ہے پھر علماء اور دینداروں کا بھرم جاتا ہے، اور عوام میں بدگمانی پھیل جاتی ہے۔

کافی عرصہ کی بات ہے! ایک شہر میں جلسہ تھا، یہ جلسہ کسی ایک شخص نے اپنی ذمہ داری پر منعقد کیا تھا، ایک ہی مقرر کو مدعو کیا تھا، وہ صاحب ناموری کے اسٹیج پر ابھر رہے تھے، جلسے کے تمام انتظامات مکمل ہوگئے، اشتہارات چھپ گئے، عین جلسے کے دن عصر کے وقت ایک صاحب میرے پاس آئے کہ فلاں صاحب ایک جلسہ کرارہے ہیں، سب انتظامات ہوگئے ہیں، کچھ دیر پہلے مقرر صاحب کو فون کیا گیا، تو وہ بہت بیمار ہیں، صاحب فراش ہیں، انھوں نے معذرت کی ہے، اب منتظمین کے ہاتھ پاؤں پھول رہے ہیں، آپ چل کر جلسہ میں وعظ کہہ دیں۔ اس وقت مجھے جلسوں سے اور جلسے کی تقریروں سے بغایت وحشت تھی، میں نے بہت معذرت کی، مگر وہ نہ مانے، مجھے زبردستی کھینچ کر لے گئے، دوروز کے بعد معلوم ہوا کہ وہی مقرر، اسی دن، اسی وقت دوسری کسی جگہ جلسہ میں شریک تھے۔

اسی کے ساتھ اہل انتظام کو بھی لازم ہے کہ جب تک حضراتِ مقررین کی جانب سے وعدہ نہ ہو، اشتہار میں نام نہ شائع کریں، اس سلسلے میں اہل انتظام کی طرف سے بہت کمزوری دیکھنے میں آتی ہے، مقرر اور واعظ کو معلوم نہیں، اور شہرہ ہے کہ وہ فلاں جگہ جارہے ہیں۔ دیانت داری، راست بازی، ایفائے وعدہ دین کے بنیادی لوازم میں ہیں، پس جو لوگ دین کی خدمت انجام دینا چاہتے ہیں، انھیں ان باتوں کا خصوصی التزام ضروری ہے۔

(۲) حضراتِ مقررین وواعظین، کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ان کا مقصود محفل پر اپنا رنگ جمانا اور لوگوں کو اپنی قیادت وسیادت کی طرف دعوت دینی مقصود نہیں ہے، بندے سب بندے ہیں، انھیں بندہ ہی بنا رہنا زیب دیتا ہے، یہاں تو انبیاء تک کے بارے میں حکم ہے کہ: مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰهُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ کُوْنُوْا عِبَاداً لِیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰکِنْ کُوْنُوْا رَبَّانِیِّیْنَ بِمَا کُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْکِتَابَ وَبِمَا کُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۔ (آل عمران: ۷۹)

کسی بشر کا کام نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ تو اسے کتاب وحکمت اور نبوت عطا فرمائے، اور وہ لوگوں سے کہنے لگ جائے کہ تم لوگ میرے بندے بن جاؤ، لیکن وہ یہ کہتا ہے کہ تم اللہ والے بنو، کیونکہ تم کتاب کی تعلیم دیتے ہو اور اس کو پڑھتے ہو۔

جب نبی کو یہ حکم ہے، تو سمجھنا چاہئے کہ دوسرے تمام وہ لوگ جو لوگوں کو وعظ ونصیحت کرتے ہیں، ان کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے کو، اپنی شخصیت کو درمیان سے ہٹا کر محض اللہ کی طرف، اللہ کے دین کی طرف، اللہ کے بندوں کو دعوت دیں، کیونکہ کتاب اللہ پڑھنے پڑھانے کا تقاضا یہی ہے۔

بہرحال وعظ وتقریر کا کام تو کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے: وَذَکِّرْ فَاِنَّ الذِّکْرٰی تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِیْنَ (سورہ الذاریات:) تذکیر کرتے رہو، کیونکہ تذکیر اہل ایمان کو نفع دیتی ہے۔ لیکن تذکیر کس طرح ہو یہ مسئلہ خاصا اہم ہے، جس طرح اہل ایمان دوسرے اعمال میں آزاد نہیں ہیں، شریعت کے پابند ہیں، ایسے ہی وعظ وتقریر بالفاظ دیگر تذکیر بھی پابند ہیں، یہاں تذکیر کے لئے دو بنیادی چیزیں ہیں، ایک قرآن، دوسرے حدیث۔

مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی علیہ الرحمہ نے اصول تفسیر پر ایک مختصر رسالہ تحریر فرمایا ہے، جس کا نام ''الفوز الکبیر'' ہے۔ اس میں ذکر فرمایا ہے کہ قرآن کریم کے بنیادی علوم پانچ ہیں، ۱۔ علم احکام، ۲۔ علم مخاصمہ، ۳۔ علم تذکیر بآلاء اللہ، ۴۔ علم تذکیر بایام اللہ، ۵۔ علم تذکیر بالموت ومابعد الموت۔ احکام میں عبادات، معاملات، خاندانی

مسائل اور حکمرانی وسیاست کے احکام ہیں کہ کیا واجب ہے، کیا مستحب ہے، کیا مباح ہے، کیا حرام ہے، کیا مکروہ ہے وغیرہ، اس علم کا تعلق فقیہ سے ہے۔

علم مخاصمہ کا تعلق دنیا کے گمراہ فرقوں سے ہے، ان کی غلطیوں کی نشاندہی اور سچی اور حق بات کا بیان، اس علم کا تعلق ''متکلمین'' سے ہے۔ ان دونوں علوم کے بعد علم تذکیر ہے، یعنی وعظ ونصیحت، پھر اس کی تین شاخیں ہیں، ہر شاخ ایک مستقل علم ہے، اول اللہ تعالیٰ کے احسانات، نعمتوں، زمین وآسمان کے تکوینی انتظامات ومصالح اور حکمتوں کے ذریعے سے بندگان خدا کی تذکیر! دوسرے حق تعالیٰ کے تصرفات جو بندوں کے درمیان ان کے ایمان واطاعت یا کفر وسرکشی کے نتیجے میں واقع ہوئے ہیں، ان کا بیان، اور ان کے ذریعے نصیحت و یاددہانی! تیسرے موت اور موت کے بعد کے حالات کا بیان اور ان کے واسطے سے بندوں کی رہنمائی!

ان تینوں علوم کے بارے میں شاہ صاحب فرماتے ہیں:

> ''وحفظ تفاصیل ایں علوم والحاق احادیث وآثار مناسبہ آں، وظیفۂ واعظ ومذکر است۔'' ان علوم کی تفصیلات کو یاد رکھنا، اور ان کے مناسب احادیث وآثار کو شامل کرنا واعظ ومذکّر کا وظیفہ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید میں جو علوم ومعارف صراحۃً بیان کئے گئے ہیں، ان میں سے زیادہ تر کا تعلق واعظ ومذکّر سے ہے، پس واعظ اور خطیب کی ذمہ داری ہے کہ ان امور کو قرآن شریف ہی سے بیان کرے، کیونکہ ان سب مضامین کا ذکر قرآن کریم میں ہے، اور اللہ تعالیٰ جس مضمون کو بیان کریں گے تو ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ موثر اور عمدہ کس کا بیان ہوسکتا ہے، ہاں اس کی اجازت ہے کہ وہ ان قرآنی مضامین کی وضاحت کیلئے بطور تشریح کے احادیث وآثار سے کام لے۔

مقصد یہ ہے کہ مقرر حضرات قرآنی مضامین توحید، رسالت، عقیدۂ آخرت، اللہ کے احسانات، نیک وبد اعمال کے حق تعالیٰ کی طرف سے ثواب وعذاب کا تذکرہ قرآن کی

آیتوں کی روشنی میں کریں، ان کے مناسب احادیث بیان کریں، آثار صحابہ کے ذریعے شرح کریں، غرض وعظ ایسا ہو کہ ایمان میں اضافہ ہو، دنیا کی عظمت دل سے نکلے، مسلمان دین وایمان پر جمیں۔ ترغیب بھی دیں اور اعمال بد کے نتائج سے بھی ڈرائیں، واہی تباہی قصے نہ سنائیں، فحش اور بے حیائی کو ابھارنے والی باتوں سے احتراز کریں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سامعین کے دل کو موہنے والی ہنسی مذاق والی باتوں سے قطعاً اجتناب کیا جائے۔ بعض مقررین کا طرۂ امتیاز یہی بن جاتا ہے کہ وہ ہنسنے ہنسانے کی باتیں وعظ میں کرتے ہیں، ایسے انداز اختیار کرتے ہیں کہ سامعین میں قہقہہ برپا ہو جاتا ہے، یہ بات قطعاً نامناسب ہے، جن دلوں کو اللہ ورسول کے کلام سے متاثر ہونا تھا، وہ قہقہوں کے سیلاب میں بہہ جاتے ہیں۔ وہ جلسہ ہی کیا جس میں ایمان کی حرارت تیز ہونے کے بجائے ہنسی مذاق سے قلب ودماغ مردہ ہو جائے۔

حضرت ابو ہریرہ ؓ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ:

إن العبد ليقول الكلمة لايقولها إلا ليضحک به الناس، يهوى بها أبعد مابين السماء والارض وانه ليزل عن لسانه أشد مما يزل عن قدميه (رواه البيهقى فى شعب الايمان)

آدمی کوئی بات صرف لوگوں کو ہنسانے کے لئے بولتا ہے، اس کی وجہ سے وہ اتنے نیچے گر جاتا ہے جو زمین وآسمان کے درمیانی فاصلے سے بھی زیادہ ہے، اور بلاشبہ آدمی زبان سے اتنا زیادہ پھسلتا ہے کہ قدم سے اتنا نہیں پھسلتا۔ (مشکوۃ شریف، کتاب الآداب، باب حفظ اللسان)

یہ حدیث ہر وقت پیش نظر رکھنی چاہئے، ہنسنے ہنسانے کو مشغلہ بنانا خود گناہ ہے، اور اس سے سامعین کے قلوب برباد ہوتے ہیں، جلسہ کا جو مقصد ہوتا ہے، اور جس کا خاص اہتمام کرنا چاہئے، وہ نہ صرف فوت ہو جاتا ہے بلکہ آدمی اللہ کی ناراضگی کا شکار بن جاتا ہے۔

اسی طرح وعظ وتقریر میں گا کر اشعار پڑھنا، اور اسے محفل قوالی بنا دینا بھی ایک سنگین غلطی ہے، ٹھوس مضامین، سنجیدہ انداز میں بیان کرنا چاہئے، دوران وعظ مناسب شعر

یاد آجائے، تو پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں، مگر جب شعر خوانی میں ترنم ریزی شروع ہوجاتی ہے تو مجلس کا مزاج بدل جاتا ہے، اور بعض مقررین تو نثر کو بھی ترنم اور لحن کے ساتھ ادا کرنے لگتے ہیں۔ یہ چیزیں کبھی کبھی ہوں، تو بعض اوقات کچھ افادیت رکھتی ہیں، مگر پوری تقریر اسی رنگ میں ہونے لگ جائے، یا زیادہ تر، تو وہ ایک مذاق بن کر رہ جاتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ جلسہ میں سنجیدگی کا ماحول برقرار رکھنا چاہئے، قرآن وحدیث کے حوالوں سے مضامین بیان کئے جائیں، مضمون کے مناسب انبیاء کرام، صحابہؓ وبزرگانِ دین کے موثر واقعات ذکر کئے جائیں، لیکن تقریر لمبی کرنی ہوتی ہے، تو دوسری بہت سی باتیں بے سروپا کی لوگ شامل کردیتے ہیں، اس سے احتراز کرنا چاہئے۔

باتیں تو کچھ اور بھی ہیں، مگر اتنی بھی کافی ہیں، اگر ان کا خیال رکھ لیا جائے، اللہ توفیق عطا فرمائیں۔ آمین (جولائی ۲۰۰۸ء)

◉◉◉◉◉

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَلٰكِنَّهٗ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ (سورۃ الاعراف: ۱۷۶)

(مگر وہ پستی کی طرف جھکا اور ہوائے نفس کی پیروی کی)

ایک فاضل دیوبند نے ایک دُنیاوی امتحان آئی۔ ایس کا پاس کیا تھا، اب وہ کلکٹر بننے کے لائق ہوگیا تھا، اس پر خوشی اور فخر ومباحات کی دھوم مچ گئی تھی، اس کے احتساب میں یہ مضمون تحریر کیا گیا۔

دین اور علم دین اللہ تعالیٰ کا ایک بیش قیمت احسان ہے، اس کے واسطے سے حق تعالیٰ انسان کو دنیا وآخرت کی رفعتیں عطا فرماتے ہیں۔ علم دین کے کچھ تقاضے ہیں، کچھ حقوق ہیں، کچھ آداب ہیں، انھیں بجا لایا جائے، تو علم دین کے حاملین ایک لازوال درجہ اللہ کے نزدیک بھی اور کائنات کے نزدیک بھی پاتے ہیں، اور اگر اس کے تقاضوں کا، اس کے حقوق کا، اور اس کے آداب کا لحاظ نہ رکھا گیا، بلکہ ان سے اعراض اور روگردانی کی گئی، تو چاہے دنیا داروں میں اس کی قدرے واہ وائی ہوجائے، مگر نہ خالق کے نزدیک اس کا کوئی درجہ رہتا، نہ مخلوق کے یہاں اس کی کوئی قدر ہوتی۔

اس موضوع پر قرآن کریم میں حق تعالیٰ نے بہت وضاحت کے ساتھ رہنمائی فرمائی ہے۔ علمائے دین کے لئے بہت غور وفکر کا محل ہے، اور عامۃ الناس بھی خصوصیت کے ساتھ اسے سمجھیں، اور مسلمانوں کا وہ طبقہ بھی جس پر دنیا داری کا غلبہ ہے، اپنے ایمان کی شمع ذرا تیز کرکے اس کو دیکھیں، اور اپنی خواہش نفس اور دنیاوی نظریۂ وتاویل سے ہٹ کر اللہ کی دی ہوئی ہدایت پر غور کریں۔ حق تعالیٰ نے سورۃ الاعراف میں بنی اسرائیل جو پیغمبروں کی وارث اور صاحب کتاب قوم تھی، کو متنبہ کرتے ہوئے فرمایا:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِىْ آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِـنَ الْغَاوِيْنَ ، وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗ أَخْلَدَ إِلَى الأَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ إِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيَاتِنَا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۔ (سورۃ الاعراف ۱۷۶/۱۷۵)

اور (اے پیغمبر) ان لوگوں کو اس آدمی کا حال (کلام الٰہی میں) میں پڑھ کر سناؤ جسے ہم نے اپنی نشانیاں دی تھیں (یعنی دلائل حق کی سمجھ دی تھی) لیکن پھر ایسا ہوا کہ اس نے (دانش وفہم کا) وہ جامہ اتار دیا، پس شیطان اس کے پیچھے لگا، نتیجہ یہ نکلا کہ گم راہوں میں ہو گیا۔

اور اگر ہم چاہتے تو ان نشانیوں کے ذریعے اس کا مرتبہ بلند کرتے (یعنی دلائل حق کا جو علم ہم نے دیا تھا، وہ ایسا تھا کہ اگر وہ اس پر قائم رہتا اور ہماری مشیت ہوتی تو بڑا درجہ پاتا) مگر وہ پستی کی طرف جھکا اور ہوائے نفس کی پیروی کی تو اس کی مثال اس کتے کی سی ہے کہ مشقت میں ڈالو تب بھی ہانپے اور زبان لٹکائے، اور چھوڑ دو جب بھی ایسا ہی کرے، ایسی مثال ان لوگوں کی ہے جنھوں نے ہماری نشانیاں جھٹلائیں، تو (اے پیغمبر) یہ حکایتیں لوگوں کو سناؤ تا کہ ان میں غور وفکر کریں۔

غور وفکر کی دعوت قرآن کریم دے رہا ہے، اللہ تعالیٰ دے رہے ہیں۔ اربابِ عقل پر فرض ہے کہ ان دونوں آیتوں کے مضامین سے سرسری طور پر نہ گزریں۔ اللہ نے ایک صاحب عقل وشعور اور ذہین وذکی شخص کو اپنی آیتوں اور اپنی خاص خاص نشانیوں کا علم دیا تھا، یہ شخص اگر ان آیات کا اور ان کے علم کا حق ادا کرتا، تو بارگاہِ ربوبیت کی جانب پرواز کرتا، اور بلندیوں پر چڑھتا چلا جاتا، مگر اس نے اس علم کی قدر نہیں، وہ علم جو بلندیوں کے لئے اور اعلیٰ مقامات کے لئے موضوع تھا، اس ظالم نے اس کو اپنے اوپر سے اتار پھینکا اور پر پرواز کو کاٹ کر نیچے گرا دیا، اور اس کے نتیجے میں زمین کی طرف پستی میں جھک گیا، اور گرتا چلا گیا، دنیائے فانی کی طمع میں پڑ گیا، حطام دنیا کو منتہائے مقصود بنا لیا، دنیا کے جاہ ومرتبہ اور مال ومنال کو مقصودِ زندگی قرار دے لیا، پھر اس کا رُخ بارگاہِ الوہیت کے بلند مراتب سے پھر گیا۔

اب وہ عزت کی بلندی سے گرا اور ذلت کی پستی میں جا پڑا۔ اس حد تک کہ وہ اس ذلیل کتے کی طرح ہوگیا، جو ہر حال میں زبان باہر نکال کر ہانپتا رہتا ہے، شیطان نے اس کا پیچھا کیا اور گمراہی کے گہرے غاروں میں اسے ڈھکیل دیا۔

علم دین، آیاتِ الٰہی، شعائر اللہ کو حاصل کرنے کے بعد اگر کوئی ان سے منہ موڑ کر زمینی مال و دولت اور عزت و جاہ کے درپے ہوا، وہ خدا کی پھٹکار میں گرفتار ہوا، اور شیطان کا کھلونا بنا۔ یہی وجہ ہے کہ اکابر سلف اور بزرگانِ امت علم دین حاصل کرنے کے بعد کسی اور علم وفن میں جانے کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔

باندہ کے مسلّم بزرگ حضرت مولانا قاری سیّد صدیق احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ فرمارہے تھے کہ ایک شخص دس بارہ سال مدرسوں میں، خالص دینی ماحول میں، دینی علوم کو حاصل کرنے کے لئے وقت لگاتا ہے، پھر جب وہ پڑھ کر فارغ ہوجاتا ہے تو وہ دوسرے دنیاوی مشغلوں میں پڑ جاتا ہے، تو ضرور اس نے کوئی ایسی غلطی اور دناءت کی ہوگی، جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو اس معزز مقام سے نکال باہر کیا۔

ہم نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں ایک بزرگ عالم کو دیکھا کہ ایک شخص علم دین کی تحصیل کے بعد علم طب کے مشغلے میں جانا چاہتا تھا، انھوں نے فرمایا کہ گھوڑے پر سوار ہونے کے بعد گدھے کی سواری کیسی معلوم ہوتی ہے؟ وہ حضرات جنھوں نے علم دین سے پیمانِ وفا باندھا، اور پھر اسی میں اپنے کو فنا کردیا، دنیا نے ان کو جس قدر عظمت کی نگاہ سے دیکھا، وہ تاریخ اور تذکروں کے روشن صفحات پر تو مسلسل چمک دمک رہے رہے ہی ہیں، اس سے بڑھ کر حضور عالی ﷺ کا فرمان واجب الاذعان ملاحظہ ہو:

قال رسول اللہ ﷺ من جاء ہ الموت وھو یطلب العلم لیحیی بہ الاسلام فبینہ وبین النبیین درجة واحدة فی الجنة (رواہ الدارمی) مشکوٰۃ شریف: کتاب العلم، الفصل الثالث)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کی موت اس حال میں آئے آئی کہ وہ علم کی طلب

اوراس کے مشغلے میں اس لئے لگا ہوا ہے کہ اس سے اسلام کو نئی تازگی اور زندگی ملے، تو جنت میں اس کے اور انبیاء کے درجات میں صرف ایک درجے کا فرق ہوگا۔

یہ آدمی کی آخری خوش نصیبی ہے کہ انبیاء کی قدوسی جماعت کے بعد اسی کا شمار ہو، یہ علم دین کی فضیلت کی معراج اور اس کے مشغلے کا نقطۂ عروج ہے۔

موضوع بہت طویل ہے، قرآن کریم نے ایجاز وبلاغت کے ساتھ اسے چند کلمات وحروف میں پورے طور پر ادا کردیا ہے۔

قرآن کریم کی اس ہدایت وتنبیہ کے بعد کسی مسلمان کے دل میں یہ وسوسہ باقی نہیں رہنا چاہئے کہ علم دین کی تحصیل کے بعد، اس عالم کے لئے اس سے ہٹ کر کوئی اور وجہ فضیلت ہوسکتی ہے! اگر کوئی شخص ایسا سوچتا یا سمجھتا ہے، تو اسے اپنے ایمان کی خبر لینی چاہئے، اس کے دل میں روگ ہے، اس روگ کا علاج کرنا چاہئے۔

اس تمہید کے بعد سنئے! کچھ دنوں سے اخبارات میں، دنیاداروں کی مجلسوں میں، نیم دینداروں کی محفلوں میں خوشی کا شادیانہ بجایا جارہا ہے کہ فلاں مولوی قاسمی نے آئی۔ اے۔ ایس میں کامیابی حاصل کی ہے، اب وہ کلکٹر ہوسکتا ہے، اور اللہ جانے کیا ہوسکتا ہے، اس کے لئے استقبال کی مجلسیں سجتی ہیں، اور یہ مجلسیں سجانے والے محض دنیادار ہوں تو کچھ قابل حیرت بات نہیں ہے، افسوس اس کا ہے کہ بعض وہ لوگ اور وہ جماعتیں، جو دین کی نمائندگی کے دعووں میں مبتلا ہیں، وہ بھی یہ محفلیں سجاتی ہیں، جیسے اس قاسمی نے کوئی میدانِ کارزار فتح کرلیا ہو، کوئی بڑا کارنامہ انجام دے لیا ہو۔ انگریزی کے چند حروف، اور حساب کی چند گنتیاں یاد کرکے لوگ اس سے بڑے بڑے عہدے فتح کررہے ہیں، ایک قاسمی آئی۔ اے۔ ایس پاس کرکے، گرا یا اٹھا؟ مرا یا جیا؟ معزز ہوا یا ذلیل ہوا؟

اسے کیا ہونا چاہئے تھا، اور کیا ہوگیا۔ قرآن کریم کی مذکورہ بالا دونوں آیتوں کے آئینے میں اس کو دیکھئے، خوش نما ہو؟ یا بدنما! آپ کیا سمجھتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند اور اس طرز فکر کے مدارس میں قوم کے بہترین ذہن ودماغ نہیں رہتے؟ رہتے ہیں، اور کالجوں اور

یونیورسٹیوں سے بڑھ کر رہتے ہیں، مگر ان کا موضوع دوسرا ہے، ان کا میدان الگ ہے، ان کے ذہن ودماغ اور حوصلہ وعزیمت کا کوئی کیا اندازہ کرسکتا ہے، ساری دنیا اس وقت دین کے خلاف چل رہی ہے، بے دینی اور دنیا پرستی کی آندھیاں چل رہی ہیں، مگر یہ حضرات قدم جما کر اتنی فراست وذہانت سے کھڑے ہیں کہ تنہا خود نہیں ایک امت کو سنبھالے ہوتے ہیں، ان کے علم وحکمت اور عزم وحوصلہ کے سامنے کسی آئی۔ اے۔ ایس کی کیا حیثیت ہے؟

مگر نظریات الٹ گئے، خیالات پستی کی طرف جھک پڑے ہیں، قدریں بدل دی گئی ہیں، ہے تو پیش پا افتادہ شعر، مگر پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

بس کیا عرض کروں، جگر خون ہو رہا ہے، قلم شق ہو رہا ہے، سینے سے آہ نکل رہی ہے، اور تلخ نوائی کر رہا ہوں۔

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

إن علينا إلا البلاغ وما توفيقي إلا بالله عليه توكلت وإليه أنيب

(ستمبر ۲۰۰۸ء)

* * *

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایک خاص اور اہم دعا

یہ دنیا اور اس دنیا کی زندگی عارضی ہے اور مختلف حالات وحادثات کی آماجگاہ بھی! جو قومیں اسی دنیا کو زندگی کا محور ومقصد قرار دئے ہوئے ہیں، ان کے لحاظ سے اس دنیا کی راحت بھی اہم ہے اور اس کی تکلیف وجراحت بھی سنگین ہے، ان قوموں کی ناکامی یہ ہے کہ زندگی تکلیف ومصیبت میں گزرے، اور کامیابی یہ ہے کہ وہ دولت وثروت، عزت وحکومت کی راحت میں بسر ہو، لیکن یہ ان لوگوں کا حال ہے، جو آخرت کی زندگی سے غافل ہیں، اور دنیا کی زندگی ہی کو سب کچھ سمجھے بیٹھے ہیں۔ یَعۡلَمُوۡنَ ظَاھِراً مِّنَ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَھُمۡ عَنِ الۡاٰخِرَۃِ غٰفِلُوۡنَ ، (سورہ روم:) یہ لوگ دنیاوی زندگی کے صرف ظاہر کو جانتے ہیں، اور وہ آخرت سے یکسر غافل ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِیۡنَ لَایَرۡجُوۡنَ لِقَاءَ نَا وَرَضُوۡا بِالۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَاطۡمَاَنُّوۡا بِھَا وَالَّذِیۡنَ ھُمۡ عَنۡ آیَاتِنَا غٰفِلُوۡنَ ، (جو لوگ ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے، اور وہ دنیاوی زندگی ہی پر راضی اور مطمئن ہیں، اور وہ جو ہماری آیات سے غافل ہیں،) انسانوں کے اس طبقہ کا انجام کیا ہے؟ فرماتے ہیں: اُوۡلٰئِکَ مَاوَاھُمُ النَّارُ بِمَا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ (سورہ یونس: ۸/۷) یہی وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا ان کے عمل اور کسب کے نتیجے میں جہنم ہے۔

انسانوں کا یہ طبقہ عدد کے اعتبار سے ہمیشہ اکثریت میں رہا ہے، اور اسی کثرت کی وجہ سے کائنات انسانی اکثر دھوکے میں رہی ہے کہ شاید یہی لوگ کامیاب ہیں، لیکن جس کا انجام جہنم ہو اسے کامیاب کیونکر کہا جا سکتا ہے، ﴿ رَبَّنَا اِنَّکَ مَنۡ تُدۡخِلِ النَّارَ فَقَدۡ أَخۡزَیۡتَہٗ وَمَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ اَنۡصَارَ ﴾ اے ہمارے رب! جسے آپ نے جہنم میں

ڈالدیں، اسے آپ نے ذلت وخواری میں غرق کردیا، اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔

اب کائنات انسانی کے دوسرے طبقے کا تذکرہ کتاب الٰہی میں پڑھئے: **إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ، تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهَارُ فِىْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ دَعْوَاهُمْ فِيْهَا سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلَامٌ وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ**، (سورہ یونس: ۱۰/۹) بے شک جولوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کئے، ان کے کام کی بدولت ان کا رب راہ ہدایت پر انھیں چلاتا ہے، نعمتوں کی جنت میں ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اس میں ان کی پکار **سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ** ہے، اور ان کی مبارکباد سلام ہے، اور آخری پکار **اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ** ہوگی۔

ان دونوں طبقوں کے درمیان خط فاصل اور امتیازی نشان کفر اور ایمان ہے، یہیں سے دونوں کی راہیں الگ ہوتی ہیں، ایک راہ کی انتہا ابدالآباد کی جہنم ہے، اور دوسری راہ کی انتہا دائمی عیش وراحت کی جنت ہے۔

دنیا کے موافق اور ناموافق حالات سب پر آتے ہیں، خواہ وہ لوگ ہوں جو کفر وشرک کی راہ پر چل رہے ہوں اور خواہ وہ لوگ ہوں جو ایمان وعمل صالح کی شاہراہ پر گامزن ہوں۔ لیکن ایمان اور کفر کی بنیاد پر ان حالات کے آثار ونتائج الگ الگ ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں رسول اکرم ﷺ کا ایک فرمان والا شان ملاحظہ کیجئے، امام مسلم علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب **الجامع الصحیح** کی کتاب الزہد میں مشہور صحابیٔ رسول حضرت صہیب ؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ: **عجباً لامر المومن، إن أمره كله له خير وليس ذلك لأحد إلا للمومن إن أصابته سراء شكر فكان خيراً له وإن أصابته ضراء صبر فكان خيراً له**، مومن کا حال بھی عجیب ہے، اس کا سب حال اس کے لئے خیر ہے، اور یہ بات مومن کے علاوہ اور کسی کو حاصل نہیں ہے، اگر وہ خوشحال ہوتا ہے، تو شکر کرتا ہے، اور اس کے لئے خیر ہوتا ہے، اور اگر بدحالی میں گرفتار ہوتا ہے تو صبر کرتا ہے، پس یہ بھی اس کے حق میں خیر ہوتا ہے۔

حالات ہر دور میں اور ہر جگہ بنتے بگڑتے ہیں، لیکن مومن کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ وہ مومن ہے، حالات جیسے بھی ہوں، مومن کو ایمان کے تقاضے پر عمل کرنا ہے، وہ تقاضا شکر گزاری کا ہو یا صبر واستقلال کا، بہر حال دونوں اس کے حق میں خیر ہوں گے۔

آج کل حالات کی سنگینی میں اہل ایمان اپنے صاحب ایمان ہونے کو بھولنے لگتے ہیں، اور آفات ومصائب کی شکایت اس طرح کرنے لگتے ہیں، جیسے دنیا ہی کا نفع نقصان سب کچھ ہے، یہ حال اچھا نہیں ہے، مصائب خواہ انفرادی ہوں خواہ اجتماعی! اہل ایمان کے حق میں خیر کا پہلو رکھتے ہیں، ایسے وقت میں جب مصائب کی یلغار ہو، ایک مومن کا وظیفہ دو چیزیں ہیں، صبر اور تقویٰ! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئاً اِنَّ اللّٰهَ بِمَايَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ (سورہ آل عمران: ۱۲۰) اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو، تو دشمنوں کی کوئی سازش تمہیں مضر نہ ہوگی، یہ حقیقت ہے کہ دشمن جو کچھ کرتے ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کے احاطہ کی گرفت میں ہے۔ صبر کہتے ہیں طبیعت اور قلب کی مضبوطی اور جماؤ کو کہ مصائب کی آندھیاں اسے ہلا نہ سکیں، اور تقویٰ کہتے ہیں ہر اس کام سے بچ نکلنے کو جس سے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی آتی ہو۔ یہ دونوں چیزیں مومن کی زندگی میں بڑی اہم ہیں، انھیں مضبوطی سے تھام لیا جائے تو بڑا پختہ کارنامہ ہوگا۔ ایک اور آیت ملاحظہ ہو: لَتُبْلَوُنَّ فِیْ أَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ أَشْرَكُوا أَذىً كَثِيْراً ، وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (سورہ آل عمران: ۱۸۶)

(یاد رکھو!) ایسا ہونا ضروری ہے کہ تم جان ومال کی آزمائشوں میں ڈالے جاؤ، اور یہ بھی ضرور ہونا ہے کہ اہل کتاب اور مشرکوں سے تمہیں دکھ پہونچانے والی باتیں بہت کچھ سننی پڑیں، اور اگر تم نے صبر کیا (یعنی مصیبتوں پر ثابت قدم رہے) اور تقویٰ کا شیوہ اختیار کیا (یعنی احکام حق کی نافرمانی سے بچتے رہے) تو بلا شبہ بڑے کاموں کی راہ میں یہ بڑے عزم وہمت کی بات ہوگی۔

ان دونوں آیتوں پر غور کیجئے، مومن کے لئے نہ کہیں مایوسی ہے، اور نہ گھبراہٹ اور بے صبری ہے، یہ ایمان کی کمزوری ہے کہ آفات اور بلاؤں کی یورش میں آدمی گھبرا اٹھے، فریق مقابل کے بالمقابل طیش میں آکر خلاف عقل وشرع بات اور حرکت کرنے لگے، اس سے اجتماعی طور پر مایوسی کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے، سیاست کا ظلم جب بڑھتا ہے تو مظلوم کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹنے لگتا ہے اور شریعت سے انحراف پیدا ہونے لگتا ہے، اس سے ظالم کا ظلم مزید بڑھ جاتا ہے۔

ہر مسلمان تک انفراداً بھی اور اجتماعاً بھی یہ پیغام پہونچا دینا چاہئے کہ مومن نہ بزدل ہوتا، کہ ذرا ذرا سی بات سے ڈر جائے، اور اس کا دل کمزور ہو جائے، یا موت کا خوف اس پر اس طرح طاری ہو جائے، جیسے یہ کوئی ہولناک خطرہ ہو، مومن کو زندگی سے بڑھ کر موت پیاری ہوتی ہے، کہ وہ دائمی عیش وراحت میں داخل ہونے کا واحد دروازہ ہے، نہ وہ بے صبرا ہوتا ہے، کہ ہر تکلیف پر چیخ اٹھے، وہ ایک مضبوط چٹان ہے، جس پر سینکڑوں طوفان بلا گزر جائیں، آندھیوں کے جھکڑ اس سے ٹکرائیں، سیلاب کی طغیانی اس کے پاؤں سر پٹکے، مگر وہ از جارفتہ اور حواس باختہ نہیں ہوتا، پھر ایسا بھی نہیں ہے وہ بے سہارا ہو، اس کا کوئی یار ومددگار نہ ہو، سنئے! عرش کی بلندیوں سے بشارت نازل ہو رہی اور قرآن بن کر ہمیشہ کی تسلی بن رہی ہے، **ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ مَوْلَی الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَأَنَّ الْکَافِرِیْنَ لَامَوْلٰی لَھُمْ**، (سورہ محمد: ۱۱) یہ (اہل ایمان کی فتح ونصرت اور کفار کی شکست وریخت) اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے آقا ومولیٰ ہیں، اور اس لئے کہ کفار کا کوئی حامی وناصر نہیں ہے۔

مومن خود مضبوط ہوتا ہے، اور حق تعالیٰ کا سہارا اسے مضبوط تر بناتا ہے، اسے اس سہارے سے ایک لحظہ کے لئے غافل نہیں ہونا چاہئے: **اِنْ یَّنْصُرْکُمُ اللّٰہُ فَلَا غَالِبَ لَکُمْ وَاِنْ یَّخْذُلْکُمْ فَمَنْ ذَاالَّذِیْ یَنْصُرُکُمْ مِنْ بَعْدِہٖ وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ**، (سورہ آل عمران: ۱۶۰) (مسلمانو! اگر اللہ تمہاری مدد کرے، تو کوئی نہیں جو تم پر غالب آسکے، لیکن اگر وہی تمہیں چھوڑ دے، تو (بتلاؤ) کون ہے جو اس کے چھوڑ دینے کے

بعد تمہارا مددگار ہوسکتا ہے؟ (یقین کرو) صرف اللہ ہی کی ذات ہے، پس جو مومن ہیں وہ اسی پر بھروسہ رکھیں۔

پس جب اہل ایمان کے پاس اتنا مضبوط، اتنا پختہ سہارا موجود ہے، تو انھیں کس بات کا اندیشہ ہے؟ البتہ یہ فریضہ بجالانا ہوگا کہ اس سہارے تک پہونچیں اور اسے حاصل کریں، اس سہارے تک کیونکر رسائی ہوگی؟ اس مسئلے کو خود اسی مہربان پروردگار نے حل کردیا ہے، فرماتے ہیں: يَاأَيُّهَاالَّذِيْنَ اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِيْنَ (سورۃ البقرۃ: ۱۵۳) مسلمانو! صبر اور نماز کے ذریعہ سہارا پکڑو، یقین کرو! اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ صبر اور نماز کی قوتوں سے مدد لو، ان دونوں کی راہ سے تم طاقت اور سہارے کے سرچشمے تک پہونچ جاؤ گے، اور وہاں سے تم پر قوتوں کا فیضان ہونے لگے گا، صبر کی حقیقت یہ ہے کہ مشکلات ومصائب کے جھیلنے اور نفسانی خواہشوں سے مغلوب نہ ہونے کی قوت پیدا ہوجائے، اور نماز کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے ذکر وفکر سے روح کو تقویت ملتی رہے، جس جماعت میں یہ دونوں قوتیں پیدا ہوجائیں گی، وہ کبھی ناکام نہیں ہوسکتی۔

صبر اور نماز یہ دو راہیں وہ ہیں جن کا تعلق براہ راست فتح ونصرت اور امداد وسہارے سے ہے، ان دونوں سے روگردانی کے بعد سہارے کی توقع خام خیالی ہے۔

ایک تیسری چیز اور ہے، جس کے واسطے سے آدمی کو خدا کا سہارا ملنا آسان ہوجاتا ہے، اور قرآن وحدیث میں اسے بہت اہتمام کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اور وہ ہے حق تعالیٰ کی بارگاہ میں دعاء ومناجات! قرآن کریم کی پہلی ہی سورہ میں اللہ تعالیٰ نے دعا کی تعلیم فرمائی ہے: إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْم۔

دعاؤں کا اشارہ پاکر ربوبیت والوہیت کے سب سے بڑے رازداں نے (صلی اللہ علیہ وسلم) تمام حاجات انسانی کو دعا کے پیرایہ میں ڈھال دیا ہے، اور نہایت تضرع وزاری سے، حق تعالیٰ کی بارگاہ عالم پناہ میں انسانی ضروریات کو تفصیل کے ساتھ پیش کردیا ہے،

سنت نبوی کا یہ عظیم الشان باب ہے، ایک زبردست لازوال خزانہ ہے، جو ایک مومن کے لئے بیش قیمت سرمایہ ہے۔

اس وقت ملت اسلامیہ پر جن حالات کی یلغار ہے، حدیثوں کے خزانے میں ایک اہم دعا ہے، جسے ہر مومن کو حرزِ جان بنالینا چاہئے۔ یہ دعا رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے ادا ہوئی ہے، اس لئے اس کے بابرکت اور مقبول ہونے میں شبہ نہیں۔ امام ترمذیؒ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

’’بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ (درج ذیل) ان کلمات کے ذریعے اپنے اصحاب کے لئے دعا کئے بغیر اٹھ جاتے ہوں۔‘‘

اَللّٰهُمَّ اقْسِمْ لَنَامِنْ خَشْيَتِكَ مَاتَحُوْلُ بِهٖ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعَاصِيْكَ وَمِنْ طَاعَتِكَ مَا تُبَلِّغُنَا بِهٖ جَنَّتَكَ وَمِنَ الْيَقِيْنِ مَا تَهَوِّنُ عَلَيْنَا مُصِيْبَاتِ الدُّنْيَا وَمَتِّعْنَا بِأَسْمَاعِنَا وَأَبْصَارِنَا وَقُوَّتِنَا مَا أَحْيَيْتَنَاوَاجْعَلْهُ الْوَارِثَ مِنَّا وَاجْعَلْ ثَارَنَا عَلٰى مَنْ ظَلَمَنَا وَانْصُرْنَاعَلٰى مَنْ عَادَانَا وَلَاتَجْعَلْ مُصِيْبَتَنَا فِىْ دِيْنِنَا وَلَاتَجْعَلِ الدُّنْيَا أَكْبَرَ هَمِّنَا وَلَامَبْلَغَ عِلْمِنَا وَلَاتُسَلِّطْ عَلَيْنَا مَنْ لَّا يَرْحَمُنَا۔

ترجمہ: اے اللہ! ہمیں اپنا اتنا خوف نصیب فرمائیے، جس کی وجہ سے آپ ہمارے درمیان اور گناہوں کے درمیان حائل ہو جائیں، اور اپنی وہ طاعت نصیب فرمائیے، جس کی وجہ سے آپ ہمیں اپنی جنت میں پہونچا دیجئے، اور اتنا یقین بخشئے جس کی وجہ سے آپ دنیا کی مصیبتیں ہمارے اوپر سہل فرما دیجئے، اور ہم کو ہماری سماعت، ہماری بینائی اور ہماری طاقت سے اس وقت تک استفادہ کا موقع دیجئے، جب تک آپ کو ہم کو زندہ رکھیں، اور اس کے خیر کو ہمارے بعد باقی رکھئے، اور جو ہم پر ظلم کرے اس سے ہمارا انتقام لیجئے، اور دنیا کو ہمارا مقصود اعظم نہ بنائیے، نہ ہمارے علم کا منتہا بنائیے، اور ہم پر کسی ایسے شخص کو مسلط نہ فرمائیے

جو ہم پر رحم نہ کرے۔

دعا کے یہ الفاظ اور دعا کا یہ اُسلوب پیغمبرانہ معجزہ ہے، مختصر تشریح ملاحظہ فرمایئے، اور اس دعا کو یاد کر لیجئے، اور اسے دل سے اور زبان سے اللہ کے حضور پیش کرتے رہئے۔

اَللّٰھُمَّ اقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْیَتِکَ مَاتَحُوْلُ بِہٖ بَیْنَنَا وَبَیْنَ مَعَاصِیْکَ : خشیت اس خوف کو کہتے ہیں، جو عظمت اور محبت کے نتیجے میں انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے، اس خوف میں وحشت اور فرار نہیں ہے، بلکہ کشش اور محبت ہے، معرفت ہے، لیکن اس خشیت کا حاصل ہونا بھی اللہ ہی کی جناب سے ہوتا ہے، پس انھیں سے گزارش کی گئی ہے کہ اپنی خشیت کا اتنا حصہ عطا فرما دیں، جس کی بنیاد پر گناہوں سے رکاوٹ ہو جائے۔ اسلوب دیکھئے، یہ نہیں فرما رہے ہیں کہ وہ خشیت گناہوں سے روک دے، بلکہ یہ عرض کر رہے ہیں کہ یا اللہ! آپ ہمارے اور گناہوں کے درمیان حائل ہو جایئے، واقعہ یہی ہے کہ گناہوں سے بچانے والی ذات اللہ ہی کی ہے، پس ان کی طرف نسبت کرنا توحید کی کمالِ رعایت ہے، ہاں ظاہری سبب کے درجے میں خشیت کا دخل ضرور ہے، یہی اسلوب اس کے بعد دعائیہ جملوں میں بھی ہے۔

وَمِنْ طَاعَتِکَ مَا تُبَلِّغُنَا بِہٖ جَنَّتَکَ : کمال اطاعت وفرمانبرداری کا احاطہ کمزور انسان سے کیا ہو سکتا ہے، لیکن اتنی طاعت ضرور عطا فرما دیجئے، کہ اس کی بدولت، آپ ہمیں جنت میں پہونچا دیجئے، خشیت کے ذریعے جہنم سے بچاؤ ہوگا، اور طاعت کی برکت سے حق تعالیٰ جنت کا داخلہ عطا فرمائیں، یہی دونوں باتیں انتہائے مقصود ہیں۔ **فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ**، ۃ سورہ آل عمران: ۱۸۵) تو جو کوئی آتش دوزخ سے ہٹا دیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا، تو کامیابی تو اسی کی کامیابی ہوئی، اور دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ ایک کارخانۂ فریب ہے۔

وَمِنَ الْیَقِیْنِ مَا تُھَوِّنُ عَلَیْنَا مُصِیْبَاتِ الدُّنْیَا : اس کارخانۂ دنیا میں مصائب

وآلام کا نشانہ ہر شخص بنتا ہے، لیکن ان کی شدت وخفت کا تعلق انسان کے قلب و باطن کی کیفیات سے ہوتا ہے، اگر آدمی کو اللہ کی ذات پر یقین ہو، اس پر پختہ ایمان ہو، اللہ کی حکمت ورحمت پر اعتماد کرتا ہو، جن سب کا حاصل ''یقین'' ہے، تو اسے ہر مصیبت سہل ہوگی، اور اگر اس کے برخلاف ہو، تو معمولی سی تکلیف بھی ناقابل برداشت ہوگی، لیکن یقین کی یہ کیفیت عطیۂ خداوندی ہی ہے، اس لئے اس کا سوال اللہ تعالیٰ سے کیا گیا، یہ کیفیت دنیا میں راحت کی کنجی ہے۔ روایت میں مصیبات کے بجائے مصائب کا بھی لفظ آیا ہے۔

وَمَتِّعْنَا بِأَسْمَاعِنَا وَأَبْصَارِنَا وَقُوَّتِنَا مَا أَحْيَيْتَنَا : آدمی کو اللہ تعالیٰ نے بدن میں جو قوتیں عطا فرمائی ہیں، ان میں کان اور آنکھ کی طاقت خصوصی طور سے اہم ہے، لیکن یہی دونوں چیزیں جلد ساتھ چھوڑتی ہیں، سماعت کم ہونے لگتی ہے، تو آدمی آوازوں سے بے بہرہ ہوجاتا ہے، بصارت کمزور ہوجاتی ہے، تو آدمی مشاہدے سے محروم ہوجاتا ہے، اور ان دونوں کے نہ ہونے سے انسان کو جس محرومی سے دوچار ہونا پڑتا ہے، وہ کسی پر پوشیدہ نہیں ہے، لیکن دوسری قوتیں بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتیں، لیکن زندگی ہی میں یہ طاقتیں علیٰحدگی اختیار کرنے لگتی ہیں، اور آدمی مجبور اور بے بس ہوکر رہ جاتا ہے، اللہ سے مانگا گیا ہے کہ زندگی کے اخیر لمحات تک ان تمام قوتوں کو ہمارے لئے کارآمد بنائے رکھئے، انسانی مجبوریوں سے بچے رہنے کی کتنی عمدہ یہ تدبیر ہے۔

وَاجْعَلْهُ الْوَارِثَ مِنَّا : مشہور محدث امام نووی علیہ الرحمہ نے ''کتاب الاذکار'' میں تحریر فرمایا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان قوتوں سے استفادہ تادم مرگ قائم اور صحیح رکھئے، یعنی ہوش وحواس دم اخیر تک قائم رہیں، جبھی ان سے استفادہ صحیح طور سے ممکن ہوسکے گا، گویا خود یہ قوتیں بھی قائم اور باقی رہیں، اور عقل وہوش بھی باقی رہے، کہ ان سے استفادہ درست رہے۔

وَاجْعَلْ ثَارَنَا عَلٰى مَنْ ظَلَمَنَا : ثار کہتے ہیں ظلم کے انتقام کو، مظلوم کو اپنے ظلم کے انتقام لینے کی طاقت کہاں ہے؟ پھر کیوں نہ خدا ہی کے حوالے کرے، اور خود بیٹھا انتقام

کا تماشہ دیکھے، دست دعا دراز کر رہے ہیں کہ کسی نے ہم پر ظلم کیا تو اس پر ہمارا انتقام مسلط کر دیجئے۔

وَانْصُرْنَا عَلٰی مَنْ عَادَانَا :اور جس کسی کو ہم سے عداوت ہو، اس کیلئے مقابل میں ہماری مدد فرمایئے، ظلم اور دشمنی کا اس سے بہتر کیا علاج ہوگا؟

وَلَاتَجْعَلْ مُصِیْبَتَنَا فِیْ دِیْنِنَا :مصیبت تو آنی ہے، لیکن دین میں نہ آئے، دین میں مصیبت دین کو نقصان پہونچائے گی، دنیا کی مصیبت دنیا کو نقصان پہونچائے گی، دنیا کا نقصان گوارا ہے، کیونکہ اس میں اگر نقصان ہوگا، تو فائدے بھی بہت ہوں گے، مگر دین کی مصیبت وہ ہے جو اللہ کو ناراض کر دے گی، اس لئے اسے مصیبت سے محفوظ رکھئے، یہ ہے دنیا پر دین کی ترجیح!

وَلَاتَجْعَلِ الدُّنْیَا أَکْبَرَ هَمِّنَا وَلَامَبْلَغَ عِلْمِنَا :عموماً دیکھا جاتا ہے کہ آدمی کی تمام ہمت اور حوصلہ حصول دنیا میں صرف ہوتا ہے، انسان کو سارا اہتمام، ساری فکر، تمام سوچ دنیا ہی کے لئے ہوتی ہے، آدمی ہر پھر کر دنیا ہی کی فکر میں سرگرداں رہتا ہے، اس لئے اس کا تمام علم اور ساری معلومات دنیاوی چیزوں کے متعلق ہوتی ہے، دنیا وکسب دنیا کے متعلقات میں کمال درجہ کا علم رکھتا ہے، لیکن دین وایمان، معرفت ومحبت کی معلومات صفر ہوتی ہیں، حق تعالیٰ سے مانگا گیا کہ ہمارا سارا حوصلہ، ساری فکر دنیا ہی سے متعلق نہ ہو، اور نہ ہمارے علم کا کل تعلق دنیا ہی سے ہو۔

وَلَاتُسَلِّطْ عَلَیْنَا مَنْ لَّا یَرْحَمُنَا: ہم پر ایسی حکومت، ایسی طاقت، ایسے افراد نہ مسلط ہوں جو ہم پر رحم نہ کریں، ظالم اور بے رحم حکومت، بے مروت اور خود غرض ذمہ دار سے ہم کو بچایئے۔

یہ بہت جامع دعا ہے، اس دعا میں تمام انسانی مجبوریوں کا علاج ہے، اور درجات کمال کے حصول کا سبب ہے، جی چاہتا ہے کہ کوئی مسلمان اس دعا سے خالی نہ رہے۔ **واللہ الموفق**

☆☆☆☆☆

(نومبر، دسمبر ۲۰۰۸ء)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سفرِ حج (۱۴۲۹ھ)

الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام علىٰ سيد المرسلين
وعلىٰ آله وصحبه أجمعين ، أمابعد!

الحمد لله بنعمته تتم الصالحات ۱۴۲۹ھ (۲۰۰۸ء) کا حج بخیر وخوبی پورا ہوگیا۔ ہندوستان سے اس مبارک سفر کا آغاز ۳۰؍اکتوبر کو ہوا، کئی جگہ سے مدینہ شریف کے لئے پہلی پرواز ۳۰؍اکتوبر کو متعین ہوئی اور عازمین حج بصد شوق وذوق مدینہ شریف کے لئے مذکورہ تاریخ میں روانہ ہوئے، پچھلے حج سے واپسی میں بعض ایسی مشکلات سے حجاج کو سابقہ پڑا تھا جس کا پہلے سے تجربہ نہ تھا، اس سال حج کمیٹی نے اور دوسرے حضرات نے ان مشکلات پر قابو پانے کے انتظامات کئے، مگر انسان کا انتظام ہمیشہ ادھورا رہتا ہے، ایک سوراخ بند کیا جاتا ہے، تو دوسرے سوراخ کھل جاتے ہیں، چنانچہ اس سال روانگی کی ابتدائی تاریخ ہی سے مشکلات کا ایک نیا عنوان ظاہر ہونے لگا۔

حج کمیٹی کا حکم تھا کہ فلائٹ کی تاریخ سے ایک روز قبل، مرکز روانگی میں جا کر اپنے سفر کی رپورٹ درج کرادی جائے، چنانچہ جن لوگوں کو اطلاع تھی کہ پہلی فلائٹ سے ان کی روانگی ہے، انھوں نے ایک روز پہلے سفر کی رپورٹ درج کرادی۔ مدرسہ شیخ الاسلام، شیخوپور سے جانے والے حجاج کا قافلہ جو چھ افراد پر مشتمل تھا، اس نے بھی رپورٹ درج کرادی، اس کی رسید حج کمیٹی نے دیدی، اور حکم ہوا کہ ۲۹؍اکتوبر کی شام تک آجایئے اور پاسپورٹ اور سفر کے کاغذات حاصل کرلیجئے، ۳۰؍کی صبح ساڑھے گیارہ بجے فلائٹ ہے۔ یہ قافلہ ۲۹؍

اکتوبر کو مغرب کی نماز کے بعد حج آفس بنارس پہونچ گیا، کاؤنٹر پر حاضری ہوئی تو اطلاع بخشی گئی کہ قافلہ کے ایک فرد کے ویزے میں تصویر کے اندر کچھ نقص ہے، اس لئے وہ پاسپورٹ بمبئی مرکزی حج کمیٹی کے دفتر سے نہیں آیا ہے، کس ذوق وشوق سے یہ قافلہ بنارس گیا تھا کہ کل شام تک مدینہ منورہ کی پاک سرزمین کا دیکھنا نصیب ہوگا، اور اب حال یہ ہے کہ پوچھنے پر لاعلمی ظاہر کی جارہی ہے کہ معلوم نہیں کب وہ ویزا درست ہوگا، اور کب آئے گا۔ صبر تو کرنا ہی تھا۔ مگر سوچئے جس ذوق کے ساتھ لوگ گھر سے نکلے تھے اس کا کتنا کڑا امتحان تھا، صبر ہو تو کیسے ہو؟ بنارس سے بمبئی فون پر رابطہ کیا گیا، وہاں سے صبر کی تلقین کی گئی، پھر رات گزرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس آزمائش میں صرف ہمارا ہی قافلہ نہیں، بہت سے لوگ ہیں، بس

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے　　　اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

پھر معلوم ہوا کہ لکھنؤ سے پہلی فلائٹ سے جو لوگ جانے والے تھے، ان کے پاسپورٹ ہی سرے سے نہیں آئے ہیں، وہاں تو حجاج کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوکر چھلک گیا، شور شرابہ، گتھم گتھا، جس سے جو ہوسکا، اس نے کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کی پہلی فلائٹ جا ہی نہ سکی۔

خیر لکھنؤ میں جو ہوا، اس سے وہاں کی مشکلات میں کچھ کمی نہیں آئی، کچھ اضافہ ہی ہوا۔ ہم بنارس میں تھے، بنارس میں عارضی حج ہاؤس جو بنا تھا، وہ ناتمام حالت میں تھا، جو حجاج آگئے تھے اور ان کی روانگی میں کوئی رکاوٹ ہوگئی، انھیں خاصی مشکلات کا سامنا تھا، حاجیوں کے ساتھ ایرپورٹ تک پہونچانے والوں کی بھی ایک بڑی تعداد آتی ہے، اب ان سب کے ٹھہرنے کا، کھانے پینے اور اس کے اخراجات کا مسئلہ! اچھا خاصا دردسر! اور پھر یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ مشکل کب آسان ہوگی؟ حج ہاؤس میں کب تک رہنا ہوگا، لوگ پریشان تھے۔

ہمارا قافلہ تو بفضلہٖ تعالیٰ بنارس کے ایک دیندار اور مخیّر تاجر، ہمارے پرانے محبّ ومحبوب جناب الحاج منظور احمد صاحب ...... اللہ تعالیٰ انھیں رحمتوں اور برکتوں سے نوازے

رہے...... کا مہمان تھا، اور وہ اور ان کے سعید وصالح صاحبزادگان بہت خوش اسلوبی اور انشراح سے مہمان نوازی میں لگے رہے، خیر قدرے انتظار کے بعد ۳۱/ اکتوبر کو وہ پاسپورٹ ویزا کی سابقہ خرابی کے ساتھ ممبئی سے آ گیا، اور ہمارا قافلہ یکم/ نومبر کو مدینہ شریف کے لئے روانہ ہو گیا، اور کسی دشواری کے بغیر رسول اللہ ﷺ کے قدموں میں حاضر ہو گیا۔

آمدم برسر مطلب! اس سال بھی حجاج کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا، نوعیت بدلی ہوئی تھی، مگر پریشانی برقرار رہی، میں ان پریشانیوں کو تفصیل سے بیان نہیں کرنا چاہتا، بلکہ یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ ان پریشانیوں کا منبع کیا ہے؟ اور کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ حجاج کا یہ سفر عبادت ٹھیک ان کی خواہش کے مطابق ہو جائے؟

حج کے سفر میں دورِ حاضر میں پانچ ادارے مصروف عمل ہوتے ہیں۔ حج کمیٹی، حکومت ہند، معلمین، سعودی حکومت اور فلائٹوں کا ادارہ، اور ان تمام اداروں کی خدمات عازمین حج کے انتظامات سے متعلق ہوتی ہیں۔ یہ پانچوں ادارے عازمین حج کی خدمت میں لگے ہوتے ہیں۔

عازمین حج کی خدمت کے لئے ایک پرائیویٹ ادارہ بھی مصروفِ عمل ہوتا ہے، اور وہ ہے ٹور کارپوریشن۔ اس کے متعلق ہم آئندہ کبھی گفتگو کریں گے۔

اس سال جو پہلی دشواری عازمین حج کے سامنے آئی، وہ وقت پر پاسپورٹ نہ ملنے کی تھی، اس میں یا تو حج کمیٹی سے قصور ہوا ہے کہ اس نے جہازوں کی تاریخ کا اور بکنگ کا اعلان تو کر دیا، مگر ویزا وقت پر حاصل نہ کر سکی، یا سعودی قونصلیٹ کا قصور ہے کہ اس نے ویزا جاری کرنے میں سستی کی، حج کمیٹی تو یہی کہتی ہے، اب اللہ جانے کس کا قصور ہے۔ بنارس میں تو حجاج کی طرف سے بے صبری کا اظہار نہیں ہوا، یا ہوا تو کم ہوا۔ مگر لکھنؤ میں بہت ہوا، اور اس بے صبری نے معاملہ کو اس حد تک بگاڑ دیا کہ پریشانی کا سلسلہ حرمین شریفین تک دراز ہو گیا۔

حجاج کرام کی زبانی حج کمیٹی کی شکایتیں بہت سننے میں آتی ہیں، اس میں شبہ نہیں،

کہ کچھ کوتاہیاں ایسی ضرور ہوں گی جن کا الزام حج کمیٹی پر چسپاں ہوگا، مگر یہ سوچنا چاہئے کہ ایک لاکھ سے زیادہ عازمین حج کے سفر کی تمامتر کارروائی حج کمیٹی کرتی ہے، بیرون ملک سفر کی جو نزاکتیں ہیں، اسے وہی جانتے ہیں جنھیں اس طرح کے سفر کا سابقہ پڑتا ہے۔ حج کمیٹی ان تمام نزاکتوں سے عہدہ برآ ہوکر حاجیوں کو تمام دستاویزات مہیا کرتی ہے، تب یہ نہایت آسانی سے بغیر کسی تردد اور کاوش کے ہوائی جہاز پر بیٹھ جاتے ہیں، اور جدہ یا مدینہ شریف میں بسہولت اتر جاتے ہیں، ورنہ اگر یہ سارے کام خود عازمین حج کے ذمے کردئے جاتے تو صدہا مشکلات میں گرفتار ہوتے، اور بڑی تعداد میں لوگ سفر بھی نہیں کرسکتے، خود پاسپورٹ بنوانے کا مرحلہ ایک ہمالیہ طے کرنے سے کم نہ ہوتا، اللہ جانے کتنے اخراجات ہوتے، کتنی مشکلوں سے پاسپورٹ بنتا، پھر اس پر ویزے کا مسئلہ اور جانکاہ ہوتا۔ کتنا دوڑنا پڑتا، کتنے مصارف ہوتے، پھر یہ ہفت خواں طے ہوتا، تو ہوائی جہاز کی سیٹ بک کرانے کا قصہ درپیش آتا، پھر سفر، سفر سے واپسی! حج کمیٹی کے ذریعے سب مرحلے آسان ہوگئے۔ ایک فارم بھرا، متعینہ رقم ادا کی، منظوری ہوئی۔ اب پاسپورٹ بنوانا، ویزا حاصل کرنا، ہوائی جہاز کے آمدورفت کی سیٹ بک کروانا، پرواز کی جگہ متعین کرنا، اور حجاج کی مدد اور رہنمائی کے لئے خدمات کو پیش کرنا، یہ سب حج کمیٹی کی ذمہ داری! عازم حج نے پاسپورٹ حاصل کیا اور حرمین شریفین پہونچ گیا۔ وہاں مکان نہیں تلاش کرنا ہے، کرایہ نہیں طے کرنا ہے، یہ سب مرحلے حج کمیٹی اور دوسرے ادارے مل کر طے کرچکے ہوتے ہیں۔ حاجی نامزد بلڈنگ اور اس کے متعین شدہ کمرے میں جاکر بستر کھول دے، بلکہ بستر کھلا ہوا پا جائے۔

اتنے بڑے انتظام میں کچھ کوتاہی ہوجائے، کچھ کسی کے حق میں کمی رہ جائے، تو وہ قابل درگزر ہے۔ دیکھنا یہ چاہئے کہ مجموعی اعتبار سے اس کا کردار کیسا رہا؟ اگر ہر شخص اپنے ارادے اور خواہش کے پیمانے پر حج کمیٹی کے عمل کو پرکھنے لگے، تو حج کمیٹی جیسا ایک محدود ادارہ تو کیا بڑی بڑی حکومتیں فیل ہوجائیں گی۔

جس مسلمان پر حج فرض ہے، اس پر حج کے انتظامات بھی فرض ہیں، مسلمانوں کا

کوئی ادارہ اگر اس کے انتظامات کا کفیل ہوجاتا ہے تو عازمین حج کو اس کا شکرگزار ہونا چاہئے ، اور اگر کسی خاص شخص کو کوئی تکلیف پہونچ جائے ، تو درگزر کردے ، کیونکہ انتظام بڑا ہے ، اور اس کے بہت سے شعبے ایسے ہیں جو حج کمیٹی کے اختیار میں نہیں ہیں ، ان کے لئے اسے بہت سے اداروں اور دفتروں سے مدد لینی پڑتی ہے ، کسی ایک جگہ اگر گاڑی اٹک گئی ، تو ہر طرف کاموں کا چکہ جام ہوجاتا ہے ۔

مثلاً اس سال بعض وجوہ سے جن کی تفصیل بیان کرنی ضروری نہیں ، سعودی قونصل نے ویزا لگانے میں دیر بھی کی اور بے احتیاطی بھی ، اس میں حج کمیٹی مجبور ہوگئی ۔ اس نے وقت پر سارے انتظامات کردیئے ، مگر ویزا ہی ملنے میں تاخیر ہوئی ، تو کیا وہ قابل درگزر نہیں ۔

دوسرا ادارہ جس کی حجاج کرام کو بہت شکایت ہوتی ہے ، وہ معلمین کا ادارہ ہے ، جسے آج کی اصطلاح میں ''مکتب'' کہا جاتا ہے ، انھیں زیادہ ان کے نام سے نہیں مکتب نمبر کے ساتھ جانا جاتا ہے ۔

معلمین کی شکایت پرانی ہے ۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کا سفرنامہ پڑھئے ، اور معلمین کی تصویر دیکھئے ۔ لیکن اس دور میں حجاج کرام کی خدمت چونکہ متعدد اداروں میں تقسیم ہوگئی ہے ، اور اس کا ایک محدود حصہ معلمین کو ملا ہے ، اس لئے اب یہ ادارہ زیادہ محل شکایت نہیں رہ گیا ہے ۔ مجھے تفصیل سے معلوم نہیں کہ معلم کی خدمات کیا کیا ہیں ؟ اتنا جانتا ہوں کہ بسوں کا انتظام معلم سے متعلق ہے ، جدہ سے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ ، پھر مشاعر حج میں بسوں سے لے جانا اور لے آنا اور خیموں کا انتظام کرنا معلم کی ذمہ داری ہے ، اور وہ یہ ذمہ داری پوری کرتے ہیں ، ہاں وقت کے تعین اور اس کی تعمیل میں کچھ ادھر ادھر ہوتا ہے ، لیکن ظاہر ہے کہ حاجیوں کے اس ہجوم اور بسوں کی بھیڑ بھاڑ میں وقت کی پابندی مشکل ہے ۔

میں یہ نہیں کہتا کہ معلمین سے کوتاہی نہیں ہوتی ، بعض امور ضرور رُونما ہوجاتے ہیں جنھیں بجز معلم کی غلطی کے کچھ نہیں کہا جاسکتا ، مثلاً پچھلے سال کے حج میں منیٰ سے جب

عرفات کو روانگی ہو رہی تھی تو ایک معلم کے کارندوں نے رات کو ۱۲ر بجے کے بعد سے ہنگامہ شروع کیا کہ عرفات چلو، عرفات چلو، لوگ دوڑ دوڑ کر جانے لگے، بعض لوگوں نے بلکہ زیادہ تر حجاج نے سوچا کہ فجر کی نماز پڑھ کر روانہ ہوا جائے، فجر کی نماز کے بعد جب خیموں کے گیٹ کی جانب چلے تو معلوم ہوا کہ گیٹ بند ہے، گیٹ کیپر سے بہت خوشامد کی گئی، مگر اس نے نہیں کھولا، خیال ہوا کہ آفس میں کوئی ذمہ دار ہوگا، اس سے بات کی جائے، مگر آفس خالی تھا، گیٹ پر ایک بھیڑ تھی، مگر نہ بس آرہی تھی، نہ گیٹ کھل رہا تھا، یہاں تک کہ سروں پر تیز دھوپ آگئی، مگر بہرا گونگا گیٹ کیپر بے حس تھا۔ دھوپ میں کھڑے کھڑے دس بج گئے، معلم کی بس نہ آتی نہ آئے، مگر گیٹ تو کھلے کہ لوگ پرائیویٹ سواریوں سے، یا ہمت والے پیدل ہی نکل جائیں، مگر ساڑھے دس بجے تک گیٹ نہیں کھلا، ساڑھے دس بجے جب عرفات جانے کا وقت تنگ ہوگیا اور حجاج نے شور مچایا، تو اس نے یہ کہہ کر گیٹ کھولا کہ اب بس نہیں آئے گی۔ میں اور میرا بیٹا محمد عادل سلّمہٗ دونوں پیدل چل دئے، ایک کیلومیٹر چلنے کے بعد ایک پرائیویٹ گاڑی ملی، اس نے پچیس پچیس ریال مانگے، ہم عجلت میں اس پر بیٹھ گئے، اس نے عرفات میں پہونچایا۔ مگر قدرے تاخیر ہوچکی تھی، اس نے جہاں اتارا، وہاں کیا کریں، اپنے دوست مفتی عبدالرحمٰن سلّمہٗ کو فون کیا، وہ بھاگے ہوئے آئے اور اپنے خیمے میں لے گئے۔

یہ جو بحران پیش آیا، یہ یقیناً معلم کی بدانتظامی تھی، اور مزید یہ کہ وہ ایسے بے حس اور سر پھرے کارندوں کو متعین کر دیتے ہیں جو کوئی رعایت کرنا، یا عقل سے کام لینا جانتے ہی نہیں۔

اس سال ۱۲ر ذی الحجہ کو جب منیٰ سے مکہ مکرمہ کو روانگی تھی، ہمارے خیمے میں اعلان ہوا کہ بس مغرب بعد آئے گی، لوگ منتظر رہے، مگر بس نہیں آئی، آس پاس کے خیموں کے پاس بس آتی رہی اور لوگ روانہ ہوتے رہے، مگر ہمارے خیمے کے سامنے حجاج کی بھیڑ لگی رہی، مگر بس نہیں آئی۔ عشاء کا وقت ہوگیا، بہت سے لوگ پیدل اور کئی لوگ پرائیویٹ

سواریوں سے نکل گئے۔ ہمارا قافلہ چھ آدمیوں پر مشتمل تھا، ہمارے علاوہ اعظم گڈھ سے پانچ حاجی صاحبان اور تھے، جو معمر اور بزرگ تھے، خیمہ میں عشاء کی نماز ادا کی، اور پیدل نکل کھڑے ہوئے، تھوڑی دور جا کر اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال ہوئی، اور ایک نیک دل سعودی نے اپنی گاڑی پر بیٹھا لیا، ہجوم کی وجہ سے قدرے دیر تو ہوئی مگر نہایت آرام سے اپنی قیامگاہ پر پہونچ گئے، یہاں بھی معلم کی بدانتظامی تھی۔

اس کے علاوہ ایک بدانتظامی اور ہوتی ہے کہ منیٰ میں خیموں میں جتنی گنجائش ہوتی ہے، اس سے ڈیڑھ گنے آدمی بھر دئے جاتے ہیں، اس سے بعض اوقات بڑی پیچیدگی ہوتی ہے، ایسا کیوں کرتے ہیں؟ لوگ کہتے ہیں کہ اس طرح وہ اپنے خیموں میں جگہ بچا کر بڑی بڑی رقمیں دوسرے لوگوں سے وصول کرتے ہیں۔ **والعلم عند اللہ**

یہ شکایتیں تو بے شک بجا ہیں، تاہم ان کی وجہ سے حجاج کو بہت سی سہولتیں بھی ہوتی ہیں، منیٰ اور عرفات میں خیمہ لگانے کی ذمہ داری ان کی ہوتی ہے، لیجانا اور لے آنا ان کے فرائض میں ہے، کسی کسی وقت کھانے کا انتظام بھی کرتے ہیں۔

تیسرا ادارہ حکومت ہند کا ہے، ہم حاجیوں کی خدمت کے باب میں حکومت ہند کی ستائش کریں گے، حکومت حاجیوں کی خدمت بہت فراخدلی سے کرتی ہے، ہوائی جہاز کے رعایتی کرایہ سے لے کر حاجیوں کے دوا علاج اور ان کی مشکلات کے حل کے لئے مستقل محکمہ قائم کر رکھا ہے، ''انڈین حج مشن'' کے تحت سیکڑوں کارکن اور ڈاکٹر مصروف خدمت ہوتے ہیں، دوائیں مفت مہیا کی جاتی ہیں، حکومت کی ان رعایتوں کی وجہ سے اہل ہند کا حج دوسرے ممالک کے مقابلے میں کافی ارزاں ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ جس سے چاہے اپنے بندوں کی سہولت کا سامان کر دے۔

حجاج کی خدمت کے لئے چوتھا ادارہ سعودی حکومت کا ہے، اس حکومت نے حاجیوں کی سہولت کے جو انتظامات کئے، وہ بس اللہ کی خاص مہربانی ہے، ایسا انتظام ہے کہ شاید اس سے زیادہ سوچا نہ جا سکے، یہ حکومت اپنی پوری توانائی حج و عمرے کے عازمین کی

سہولت اور آسائش کے لئے صرف کرتی ہے، ایک مستقل وزارت اس خدمت کے لئے ہے، جو سال بھر اسی موضوع پر کام کرتی رہتی ہے۔

پانچواں ادارہ فلائٹوں کا ہے۔ حج کے لئے دو طرح کی فلائٹوں کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ ایر انڈیا اور سعودی ایرویز۔ سعودی ایرویز کی شکایتیں تو کم سننے میں آتی ہیں، پچھلے سال کچھ شکایات تھیں، مگر ایر انڈیا نے تو پچھلے سال اور اس سال ستم کی حد توڑ دی۔ ایر انڈیا سے حاجیوں کو بہت پریشانی ہوئی، پچھلے سال سامانوں کی پریشانی بہت رہی، اس سال فلائٹیں اتنی لیٹ تھیں کہ حاجیوں کا سارا نظام بگڑا رہا، اس پر حج کمیٹی اور حکومت ہند کو خاص توجہ دینی چاہئے۔

اب حاجی صاحبان کی خدمت میں کچھ معروضات پیش کرنی ہیں، اور اس مضمون کے اصل مخاطب وہی ہیں، کیونکہ دوسرے ادارے جو حجاج کی خدمت کے لئے وجود میں آئے ہیں، ان کے معاملات، ان کے مشکلات اور ان کے مسائل ہماری پہونچ سے ماوراء ہیں۔ ان کی اصلاح، ان کی درستگی اور ان کے مسائل کا حل اربابِ سیاست اور اصحابِ حل وعقد کر سکتے ہیں، ہم تو ان کی خدمات پر ممنونیت کا اظہار کر سکتے ہیں اور جو کچھ ان کی کوتاہیاں معلوم ہوتی ہیں ان کو صبر وضبط سے انگیز کر لیں گے، اور اسی کی تلقین دوسروں کو بھی کریں گے، اگر چہ جس نظریہ کا چلن ہے، وہ ہماری اس روش کو شاید پسند نہ کرے، مگر مجبوری ہے، ہم بھی اپنی خو کیوں بدلیں؟

عازمین حج کا سفر کسی سیر سپاٹے، تفریح ودل لگی یا تجارت وکسب معاش کیلئے نہیں ہوتا، وہ اللہ کی عبادت کے لئے نکلتے ہیں، یہ عبادت ایسی ہے جو اپنے گھر، اپنے وطن میں رہ کر کسی سے ادا نہیں ہوسکتی۔ یہ سفر محض عبادت کا، محض نیکی کا، محض اللہ کی رضا کیلئے ہوتا ہے، اللہ نے استطاعت دی ہے، وسائل مہیا ہیں، تو ان پر فرض ہے کہ یہ سفر کریں۔ یہ اسلام کی بنیادوں میں سے ایک بنیاد ہے، اس کا انتظام ہر شخص کو خود کرنا ہے، اور اس کا جو قدم بھی اس سفر میں اٹھے گا وہ نیکی اور عبادت ہوگا، حاجی جب گھر سے نکلتا ہے، اور جب تک واپس ہوتا

ہے، یہ سارا وقفہ مسلسل عبادت اور طاعت میں گزرتا ہے۔

حج اور سفر حج کے فضائل بہت ہیں، جن کا تذکرہ احادیث کے ذخیروں میں بکثرت کیا گیا، یہاں ہم ایک جامع حدیث کا ترجمہ لکھتے ہیں، جس سے حج اور سفر حج کی فضیلت نہایت عمدگی کے ساتھ واضح ہوتی ہے، یہ حدیث سیّدنا عبداللہ بن امیر المومنین سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، اور اسے صاحب ترغیب وترہیب نے طبرانی کی المعجم الکبیر اور بزار کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں منیٰ کی مسجد (خیف) میں حضور سرور عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا، اتنے میں دو آدمی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ایک انصاری اور ایک قبیلہ بنی ثقیف کا، انھوں نے سلام کے بعد عرض کیا، یا رسول اللہ! ہم آپ کے حضور کچھ پوچھنے کے لئے آئے ہیں، آپ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو میں خود بتاؤں کہ تم کیا پوچھنے آئے ہو؟ اور اگر چاہو، تو میں نہ کہوں تم خود ہی بتاؤ! ان دونوں نے عرض کی حضرت! آپ ہی ارشاد فرمائیں، پھر ثقفی نے انصاری سے کہا، آپ کہئے، انھوں نے درخواست کی، اے اللہ کے رسول! بتائیں، آپ نے فرمایا کہ تمہارا سوال یہ ہے کہ تم جو اپنے گھر سے بیت اللہ کے قصد سے نکلے ہو، اس میں تمہارے لئے کیا اجر ہے؟ اور طواف کے بعد جو دو رکعت پڑھو گے اس کا ثواب کیا ہے؟ اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کرو گے، اس میں تمھیں کیا ملے گا؟ اور وقوفِ عرفہ میں کیا حاصل ہوگا؟ اور جمرات کی رمی میں کیا ملے گا؟ اور قربانی کرو گے، تو اس کا اجر کیا ہوگا؟ اور طوافِ افاضہ کی کیا شان ہے؟

انھوں نے عرض کیا، قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، انھیں سوالات کے لئے میں حاضر خدمت ہوا ہوں۔ فرمایا:

(۱) جب تم بیت اللہ الحرام کے قصد سے گھر سے نکلے ہو، تو تمہاری اونٹنی نے جو بھی قدم زمین پر رکھا یا زمین سے اٹھایا، ہر ایک پر اللہ نے تمہارے لئے ایک نیکی لکھی، اور ایک خطا معاف فرمائی۔

(۲) اور طواف کے لئے جو دو رکعت تم نے پڑھی، تو یہ ایسا ہے، جیسے تم نے اولادِ اسماعیل علیہ السلام میں سے دو غلام آزاد کئے۔

(۳) اور تم نے صفا و مروہ کے درمیان جو سعی کی، وہ ایسا ہے جیسے تم نے ستر غلام آزاد کئے۔

(۴) اور وقوف عرفہ کی شان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانِ دنیا پر نزول فرماتے ہیں، اور فرشتوں کو مخاطب کر کے فخر سے فرماتے ہیں کہ میرے بندے، میرے حضور میں پراگندہ بال دور دراز اور گہرے راستوں سے چل کر آئے ہیں، اور جنت کی آس لگائے ہوئے ہیں، تو (اے بندو!) اگر تمہارے گناہ ریت کی تعداد کے برابر یا بارش کے قطروں کے مانند، یا سمندر کی جھاگ کے مثل بھی ہوں گے تب بھی ان کی مغفرت کر دوں گا۔ میرے بندو! تم بخشے بخشائے یہاں سے جاؤ، تمہاری بھی بخشش ہے، اور جن کی تم سفارش کرو گے ان کی بھی بخشش ہے۔

(۵) اور تمہاری رمی کا اجر یہ ہے کہ ہر کنکری جسے تم نے پھینکا ہے، اس سے ایک ایک مہلک گناہ کبیرہ کی معافی ہے۔

(۶) اور جو قربانی تم نے کی ہے، وہ تمہارے رب کے پاس ذخیرہ ہے۔

(۷) اور جو تم نے سر منڈوایا، تو سنو! ہر بال کے عوض ایک نیکی ہے، اور ایک خطا کی معافی ہے۔

(۸) اور اس کے بعد جو تم نے طواف (زیارت) کیا، تو اس طرح تم نے طواف کیا کہ تمہارے ذمے کوئی گناہ نہیں۔ ایک فرشتہ آتا ہے، اور تمہارے دونوں کندھوں کے درمیان ہاتھ رکھتا ہے، اور کہتا ہے، اب پھر سے از سرِ نو عمل شروع کرو، پچھلے سب گناہ معاف ہو چکے ہیں۔ (الترغیب والترھیب، ج:۲، ص:۷۷)

حج کی فضیلت رسول اکرم ﷺ نے نہایت جامعیت کے ساتھ بیان کر دی، یہ بیان محتاج تشریح نہیں ہے، البتہ یہ معلوم کر لینا چاہئے کہ جس حج کی یہ فضیلت بیان کی گئی ہے،

اس کی کیا شان ہونی چاہئے۔

حج کیسا ہو؟ قرآن کریم کا ارشاد:

حج کے متعلق قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے: ﴿اَلْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُومٰتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَارَفَثَ وَلَافُسُوْقَ وَلَاجِدَالَ فِي الْحَجِّ (سورۃ البقرۃ:۱۹۷) حج کے چند متعین مہینے ہیں، تو جس کسی نے ان مہینوں میں حج کا التزام کیا، تو اس میں نہ رفث ہے، نہ فسق ہے، اور نہ لڑائی جھگڑا ہے) رفث کے معنی بیوی سے صحبت کرنے کے ہیں، اسی حکم میں بیوی سے شہوت کی باتیں بھی ہیں، حالت احرام میں اس کی بالکل گنجائش نہیں ہے۔ فسوق کے معنی نافرمانی اور معصیت کے ہیں، حج کا التزام کر لینے کے بعد اور بالخصوص حرم میں حاضر ہونے کے بعد، معصیت اور حق تعالیٰ کی نافرمانی شدید تر ہو جاتی ہے، اور اس سے حج خراب ہو جاتا ہے۔ جدال کے معنی لڑنے جھگڑنے کے ہیں، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس ؓ سے منقول ہے کہ حج میں جدال یہ ہے کہ گالی گلوچ کرے، برا بھلا کہے، کسی سے ایسی بحث و تکرار کرے کہ اس کو غصہ آ جائے۔

حاجی ان تینوں چیزوں سے بچنے کا اہتمام کرے گا، تو اس کا حج، حج کہلائے گا، ورنہ سفر کی مشقت، مال کا صرفہ ہی ہاتھ آئے گا، اور حج مجروح ہو کر رہے گا، حضرت جابر بن عبداللہ ؓ نے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ:

من قضیٰ نسکه وسلم المسلمون من لسانه ویده غفر له ماتقدم من ذنبه۔ (تفسیر ابن کثیر بحوالہ عبد بن حمید) جس نے ارکان حج ادا کئے، اور مسلمان اس کی زبان اور ہاتھ سے محفوظ رہے، اس کے سب گناہ معاف ہیں۔

اس شان کا حج، حج مبرور کہلاتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من حج فلم یرفث ولم یفسق رجع من ذنوبهٖ کیومٍ ولدته امه (بخاری و مسلم)

جس نے حج کیا، اور رفث اور فسق کا ارتکاب نہیں کیا، وہ اس طرح گناہوں سے

پاک صاف ہوکر لوٹا، جیسے اس دن تھا، جس دن وہ ماں کے شکم سے پیدا ہوا تھا۔

آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

الحج المبرور ليس له جزاء إلا الجنة، رواه الطبرانی

حج مبرور کا تو بدلہ جنت سے کم نہیں ہے۔ (الترغیب والترھیب، ج:۲، ص:۷۲)

حج مبرور کہلانے کا مستحق وہی حج ہے، جس کا اوپر ذکر ہوا۔ حضرات صحابہ نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا تھا، کہ حج مبرور ہونا کس طور سے ہوگا، تو آپ نے جواب ارشاد فرمایا:

إطعام الطعام وطيب الكلام۔ کھانا کھلانا، اور پاکیزہ بات بولنا۔

امام احمد اور بیہقی کی ایک روایت میں ہے:

إطعام الطعام وإفشاء السلام۔ کھانا کھلانا، اور سلام کثرت سے کرنا۔

(الترغیب والترھیب، ج:۲، ص:۷۲)

قرآن مجید کی آیت کریمہ اور حضور اکرم ﷺ کے ان ارشادات سے حج مبرور کی شرح ہو جاتی ہے۔

سفر حج کی اہمیت:

ایک طرف حج کی اس فضیلت کو نظر میں رکھئے، پھر یہ غور کیجئے کہ سفر ایک مشکل عمل ہے، آدمی اپنے گھر میں ہوتا ہے تو ایک لگے بندھے معمول پر اس کی زندگی گزرتی ہے، اور وہ اس کا عادی ہو جاتا ہے، وقت پر کھانا پینا، وقت پر سونا جاگنا، متعین کام کو وقت پر بجالانا، لیکن سفر میں سب معمولات درہم برہم ہو جاتے ہیں، تاہم اگر سفر اپنے چند رفقاء کے ہمراہ ہو، اور انھیں کے ساتھ سارا نظام سفر ہو، تو پھر کچھ آسانی ہو جاتی ہے، لیکن اگر سفر ایسا ہو کہ مختلف احوال اور مختلف مزاج کے لوگوں سے اختلاط ہو، جیسا کہ حج کے سفر میں ہوتا ہے، جس کے نہ پروگرام اپنے اختیار میں، نہ ہمسفروں کا کچھ اندازہ کہ کس کس طرح کے لوگ ہوں گے، پھر سب کا ایک جگہ اکٹھا ہونا، پھر ان کے ساتھ بشری حاجات وضروریات بلکہ رجحانات اور خواہشوں

کا لگا رہنا، اس سے سفر کی دشواری اور بڑھ جاتی ہے، اس سفر میں آدمی جدال اور فسوق سے بچ نکلے، ایک بڑا مجاہدہ ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے سفرِ حج کو جہاد قرار دیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے عزیز نواسے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں، کہ ایک آدمی نبی ﷺ کی خدمت میں آیا، اور اس نے عرض کیا، میں ایک بزدل آدمی ہوں اور کمزور بھی ہوں، (پس جہاد کیسے کروں؟) آپ ﷺ نے فرمایا:

هلم إلىٰ جهاد لاشوكة فيه ـ الحج ـ (رواه الطبرانی الکبیر والاوسط ورواتہ ثقات)

تم ایسا جہاد کرو جس میں (دوسرے ہتھیار تو کیا) کانٹا بھی نہیں ہے، یعنی حج کرو۔

امام نسائی کی روایت میں ہے، حضرت ابو ہریرہ ؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

جهاد الكبير والضعيف والمرأة الحج والعمرة ـ

بوڑھے، کمزور اور عورت کا جہاد حج وعمرہ ہے۔ (الترغیب والترھیب، ج:۲، ص:۱۷)

پس جب حج وعمرہ جہاد ہے تو اس میں دشواریوں اور پریشانیوں کا ہونا لازم ہے، کوئی سفرِ حج یا سفرِ عمرہ مشقت اور الجھن سے خالی ہو، شاید ایسا نہ ملے۔ جتنے لوگوں نے سفرِ حج کی روداد یں لکھی ہیں، کم وبیش ان میں مشقتوں کا تذکرہ ہے، آج کے دور میں تو وسائل وذرائع اس قدر سہل اور تیز رفتار دستیاب ہیں کہ جس سفرِ حج میں پہلے سالوں، پھر مہینوں صرف ہوتے تھے، اب آدمی چاہے تو دور دراز سے آکر ہفتوں اور دنوں میں حج کی تکمیل کر کے واپس جا سکتا ہے۔

لیکن اس سہولت کے بعد بھی دشواریاں، پریشانیاں اور ناگواریاں اتنی پیش آتی ہیں کہ ناتجربہ کار آدمی بوکھلا کر رہ جاتا ہے، یہیں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ حق تعالیٰ نے فسوق اور جدال پر جو بندش لگائی ہے، اس کی جیسے پہلے ضرورت تھی آج بھی اتنی ہی ضرورت ہے، وسائل وذرائع تو ضرور بدل گئے، ان میں وسعت وسہولت پیدا ہوگئی ہے، مگر انسان ابھی وہی ہے اور انسانی طبائع بھی وہی ہیں بلکہ ان میں کچھ گراوٹ ہی آئی ہے، اس لئے جیسے

اور دینی مسائل ومعاملات میں یاد دہانی کی ضرورت ہوتی ہے، سفرِ حج کے سلسلے میں بھی تذکیر اور نصیحت کی ضرورت ہے۔

استحضارِ نیت:

سفرِ حج وعمرہ کے فضائل مختصراً آپ نے پڑھ لئے، سفر کے آغاز سے اس کے ختم ہونے تک حاجی صاحب اس بات کو مستحضر رکھیں کہ ان کا یہ سفر محض اللہ کی عبادت کے لئے ہے، اور اس کے واسطے سے یہ سفر خود عبادت ہے، اس راہ میں جو بھی تکلیف ہوگی، مشکل پڑے گی، ان سب کی اللہ کے نزدیک بڑی قیمت ہوگی، اور جو کچھ تکلیف ہو رہی ہے، اللہ کی راہ میں ہو رہی ہے، اور اللہ کے لئے ہو رہی ہے، اور مزید یہ خیال رہے کہ اللہ کی جانب سے ہے، تاکہ اجر وثواب میں اضافہ ہو، اس تصور سے تکلیف کا جھیل لینا آسان ہوگا۔ بلکہ تکلیف، تکلیف معلوم ہی نہ ہوگی، حاجی کو جب نیت مستحضر نہیں ہوتی، تو وہ پریشان ہوتا ہے، اور گھر جیسی راحت چاہتا ہے، اور نہیں ملتی تو شکایتوں میں مبتلا ہوتا ہے، اچھے خاصے سفر عبادت کو گناہ سے بدل لیتا ہے، مشقت اس شکایت اور غصہ سے تو ختم نہیں ہوگی، البتہ ثواب ختم ہو جاتا ہے، اور غیبت، شکایت، فضول تبصروں اور تنقیدوں کا گناہ سر پڑتا ہے، اور سفر بجائے نفع کے خسارے کا سودا ہو جاتا ہے۔

اس استحضار کے نہ ہونے کی وجہ سے بسا اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ حج میں آنے والے حضرات محض چند دنیاوی رسوم پورا کرنے کو حج کا خلاصہ سمجھتے ہیں۔

حجر اسود کا بوسہ:

مثلاً بہت سے حاجیوں کی کوشش ہوتی ہے، کہ خواہ کوئی صورت ہو، حجر اسود کا بوسہ لینا ضروری ہے، اس بوسہ کے شوق میں بلکہ جنونِ شوق میں آدمی نہ اپنی پرواہ کرتا ہے، نہ دوسروں کی، اور نہ خود بیت اللہ کی حرمت وعظمت کی! دھکم دھکا کر کے حجر اسود کا بوسہ لے لینے کو حج کی فتح عظیم سمجھتا ہے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہوئے سنے گئے، اگر حجر اسود کو بوسہ نہ دے سکے تو وطن کیا منہ لے کر جائیں گے، لوگ کہیں کہ یہ کیا حج کیا؟ بعض ملک کے لوگ شاید حجر

اسود کے بوسے کو حج کا رکن اعظم سمجھتے ہیں، ان کے مرد، ان کی عورتیں، ان کے بچے سب اس کے بوسے کے لئے جان کی بازی لگائے رہتے ہیں، بعض اوقات چیخم دھاڑ کی نوبت آجاتی ہے، یہ خاکسار ایک بار طواف کے ہجوم میں سر جھکائے اپنے کو سمیٹے محوطواف تھا کہ اچانک بڑے زور سے چیخ کی آواز بلند ہوئی۔ بے اختیار نگاہ اوپر اٹھ گئی، تو دیکھا ایک لڑکی لوگوں کے سروں پر اچھلتی اور پھسلتی جارہی ہے، اس کو کسی نے زور سے اچھال دیا تھا۔ میں نے إنا للّٰہ پڑھا اور آگے بڑھ گیا، اللہ جانے اس کا کیا حشر ہوا؟

حالانکہ حجر اسود کا بوسہ ایسا نہیں ہے کہ اس کے لئے جان جوکھم میں ڈالی جائے، بے تکلف میسر آجائے تو سبحان اللہ! ورنہ دور سے ہاتھوں کی ہتھیلی اس کی طرف متوجہ کرکے اسے چوم لیجئے، یہ استلام بوسے کا بدل ہے، اور یہی رسول اکرم ﷺ کی تعلیم ہے، اپنے کو بے موقع ایذا میں ڈالنا، اور دوسروں کو ایذا دینا دونوں حرام ہے، ہجوم میں حجر اسود کو بوسہ دینے کی کوشش میں دونوں غلطیوں کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے، ایک مستحب کے حصول کے لئے یہ بات خلاف عقل بھی ہے اور خلاف شرع بھی، بالخصوص جبکہ اس کا بدل بھی موجود ہے، اور وہ ہے دور سے ہاتھ اٹھا کر استلام! اس سے بھی وہی اجر حاصل ہوگا جو بوسہ دینے سے حاصل ہوتا ہے، اگر حاجی کو یہ استحضار ہوتا کہ مجھے اللہ کی عبادت کرنی اور اسے راضی کرنا ہے تو وہ ہرگز اس دھکا پیل میں نہ پڑتا، اصل تبرک تو رسول اللہ ﷺ کی تعلیم ہے، ان متبرک اشیاء کی برکت بھی جو ظاہر ہوئی ہے، اور جس کیلئے آدمی بے قرار رہتا ہے، یہ حضور اکرم ﷺ کے بتانے ہی سے ہے۔ لہٰذا سب برکتوں کی اصل آپ کی تعلیم ہے، اپنے نفس کے تقاضوں کو دبا کر، لوگوں کے طعن سے صرف نظر کرکے، کام وہی کرنا چاہئے جس کی تعلیم ہمیں رسول اکرم ﷺ سے ملی ہے۔

امام شافعیؒ اور امام احمدؒ نے عبدالرحمٰن بن حارث سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر ؓ سے فرمایا:

یا أبا حفص ! إنک رجل قوی ، فلاتزاحم علی الرکن فانک

تـوذی الـضـعیف ،ولکن إذا وجدت خلوة فاستلمه والا فکبر وامض ۔ اے ابوحفص! تم طاقتور آدمی ہو، اس لئے حجر اسود پر بھیڑ نہ لگانا، کہ کمزور آدمی کو تم سے تکلیف پہونچ جائے، ہاں جب خالی ملے تو استلام کرلینا ورنہ اللہ اکبر کہنا اور گزر جانا (الافصاح علیٰ مسائل الایضاح، ص:٢٠٦)

طواف میں بے اعتدالیاں:

عبادت کی نیت کے مستحضر نہ رہنے کی وجہ سے آدمی طواف میں بھی بہت بے اعتدالی کرتا ہے، طواف نام ہے ادب سے سر جھکا کر اللہ کی طرف متوجہ ہوکر خشوع خضوع سے بیت اللہ کے اردگرد چکر لگانے کا، عبادت سکون واطمینان کو چاہتی ہے بلکہ حدیث میں طواف کو نماز کہا گیا ہے، البتہ اس میں بات کرنے کی اجازت ہے، اور بات بھی صرف خیر کی۔

امام ترمذی علیہ الرحمہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

الـطـواف حول البیت صلوٰة إلا أنکم تتکلمون فیه ، فمن تکلم فیه فلا یتکلم إلا بخیر (الترغیب والترهیب،: ٢، ص: ٩٢)

بیت اللہ کا طواف نماز ہے، مگر یہ کہ تم اس میں بات کر سکتے ہو، تو جو کوئی طواف میں بات کرے، تو بجز خیر کے اور کوئی بات نہ کرے۔

بات کرنے کی اجازت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بات کرنا بہتر ہے، مجبوری میں بات کرلے، ورنہ خاموشی سے، اللہ کی طرف متوجہ رہے، اور اس سے مناجات کرتا رہے۔

طواف میں شوروغل:

طواف میں ایک بے اعتدالی یہ ہوتی ہے کہ بعض لوگ گروپ بنا کر طواف کرتے ہیں، اور ایک آدمی زور زور سے چلا کر دعائیں پڑھتا ہے، اور گروپ کے لوگ بآواز بلند انھیں دہراتے ہیں، اس سے دوسرے طواف کرنے والوں کو بیحد خلل ہوتا ہے، پھر جب وہ سب مل کر ساتھ چلنے کی کوشش کرتے ہیں تو لوگوں کو دھکا بھی خوب مارتے ہیں، کیونکہ کبھی

گروپ کے آدمی آگے بڑھ جاتے، اور کوئی شخص قدرے پیچھے رہ جائے تو وہ تیزی سے دوڑ کر گروپ میں شامل ہونا چاہتا ہے، اور بے تکلف دھکے مارتا چلا جاتا ہے، ان گروپوں نے تو طواف کی عبادت کو تباہ کر رکھا ہے، اتنا شور وغل کرتے ہیں کہ نہ ان کی عبادت محفوظ رہتی، نہ دوسروں کی۔

طواف کے آداب:

امام نووی علیہ الرحمہ نے طواف کے آداب میں لکھا ہے:

> ''طواف کے دوران خشوع وخضوع اور حضور قلب رہنا چاہئے، اپنے ظاہر وباطن ہر لحاظ سے ادب کی رعایت رکھے، اپنی رفتار، اپنی نگاہ اور اپنی ہیئت ہر ایک کو ادب کا پابند بنائے رکھے، کیونکہ طواف نماز ہے، اس لئے مناسب ہے کہ نماز کے آداب کا خیال رکھے، اور قلب میں اس ذات عالی کا استحضار رکھے، جس کے گھر کا طواف کر رہا ہے۔
>
> اور واجب ہے کہ اپنی نگاہ کو ناجائز محل پر جانے سے محفوظ رکھے، کسی عورت یا امرد لڑکے کو دیکھنے سے پرہیز کرے، کیونکہ خوبصورت امرد پر نظر ڈالنا بہر حال جائز نہیں ہے، الا یہ کہ کوئی شرعی ضرورت ہو۔ (کتاب الایضاح: ۲۴۲/۲۴۳)

عورتوں کا طواف:

حج اور اس کے تمام اعمال عبادت ہیں، طواف ایک عظیم عبادت ہے لیکن یہ حیثیت جب نگاہ سے اوجھل ہوتی ہے، تو آدمی اسے ایک رسم بنا کر جیسے بھی ہو اسے کرنا کافی سمجھتا ہے۔ طواف مرد کے لئے بھی عبادت ہے، اور عورتوں کے لئے بھی، مگر رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کو مردوں سے جدا احتیاط سے طواف کرنے کا حکم دیا ہے، تاکہ دورانِ طواف مردوں سے ان کا اختلاط نہ ہو، چنانچہ آپ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو حکم دیا تھا کہ لوگوں کے پیچھے سے طواف کریں۔ ہمارے زمانے میں بفضلہٖ تعالیٰ لوگ بڑی تعداد میں حج وعمرے کے لئے پہونچتے ہیں، اس لئے مطاف میں مردوں اور عورتوں کی علیٰحدگی کی گنجائش کم ہوتی ہے، لیکن یہ تو بہر حال جائز نہیں ہے، کہ مرد وعورت باہم ٹکراتے رہیں۔

مردوں اور عورتوں کا ایسا اختلاط کہ آپس میں بدنوں کا تصادم ہو، ہر جگہ برا ہے، اور خاص طور سے عبادت کی جگہ تو بہت ہی برا ہے، لیکن عجیب مصیبت ہے کہ حرم پاک سے مقدس عبادت کی جگہ اور کون سی ہوگی؟ مگر عورتوں کا حال یہ ہے کہ برقعہ اور پردہ پھینک کر مردوں کے ہجوم میں گھستی ہیں، اور مرد تو کچھ احتیاط کر لیتے ہیں، عورتیں تو بے محابا دھکا دیتی ہیں، بعض ممالک کی عورتیں تو مردوں کا ناطقہ بند کر دیتی ہیں۔ ہندوستان کی عورتوں میں کچھ کچھ لحاظ نظر آتا ہے، مگر دوسروں کی ریس میں یہ بھی آگے بڑھتی ہیں، ایک بڑی دیدہ دلیری یہ ہوتی ہے کہ جو عورتیں ہندوستان میں بغیر برقعہ اور نقاب کے کبھی نہیں دیکھی جاتیں، وہ حج کے سفر میں پردہ سے بالکل آزاد ہو جاتی ہیں، حالت احرام میں تو یہ مجبوری ہے کہ چہرہ سے کپڑا متصل نہیں ہونا چاہئے، اس کا حل اب سے پہلے لوگوں نے یہ نکالا تھا کہ ایک ہیٹ نما ٹوپی ملا کرتی تھی، اسے سر پر جما کر برقعہ اوڑھ لیتی تھیں، برقعہ کا پردہ چہرے سے دور لٹکتا رہتا تھا۔ پردہ بھی ہوتا تھا، اور کوئی جنایت بھی نہ ہوتی تھی، مگر اب تکلف بے جا سمجھ کر اتنا سا پردہ بھی ہٹا دیا گیا ہے۔ عورتیں بے حجاب مردوں کے درمیان، مردوں کی طرح پھرتی رہتی ہیں، احرام کی حالت میں چہرے کا کھلا رہنا خیر کسی درجہ میں ایک مجبوری ہو سکتی ہے، لیکن جب احرام نہیں ہے، تب کیا مجبوری ہے، کہ چہرہ کھول کر بازار میں، حرم میں، طواف میں دوڑتی پھرتی ہیں، صرف دوڑتی نہیں، چیختی چلاتی رہتی ہیں۔ پہلے زیادہ تر بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں حج کے لئے جایا کرتی تھیں، اور عورتوں کی تعداد سفر کی مشقتوں اور مال کی اور وسائل کی فراوانی نہ ہونے کی وجہ سے کم ہوتی تھی، اب سفر حج میں نوجوانوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے، مال اور وسائل کی فراوانی بھی بہت ہے، اس لئے ہر مرد کے ساتھ ایک بلکہ کئی عورتیں ہوتی ہیں، اگر کوئی مرد اکیلا ہوتا ہے، تو لوگ تعجب سے پوچھتے ہیں کہ آپ اکیلے ہیں؟ کیا آپ کی بیوی کا حق نہیں تھا؟ حتیٰ کہ یہ نوبت آگئی ہے کہ مرد پر حج فرض ہو چکا ہے، اور عورت کو لے جانے کا انتظام نہیں ہے، تو اس وقت تک حج کے لئے نہیں جائیں گے جب تک عورت کا انتظام نہ ہو جائے، ایک عورت جس پر حج فرض نہیں ہے، اس کا حج کرانے کے لئے کتنے

لوگ گنہگار ہوتے ہیں، نوجوان عورتوں کی بہتات میں فساد قلب ونظر سے بچنا کتنا مشکل ہے، محتاج بیان نہیں، مگر وہی بات ہے کہ عبادت کے خیال پر دوسری دنیاداری کی باتوں کا خیال غالب آگیا ہے، اس لئے جو کچھ کیا جارہا ہے اس پر عبادت اور رضائے الٰہی کے آثار کم اور دنیاداری کے آثار زیادہ نظر آتے ہیں، طواف کعبہ سے لے کر منیٰ، عرفات اور مزدلفہ تک عورتوں کے ہجوم اور ان کی نارو انقل وحرکت کی وجہ سے عبادت کا ماحول، میلہ اور تماشہ کا ماحول بن جاتا ہے۔ **نعوذ باللّٰہ من شرور الفتن۔**

اگر مرد اس پر کچھ قابو رکھیں، احرام کے علاوہ دوسرے اوقات میں عورتوں کو پردہ میں رکھیں، انھیں پابند کریں کہ وہ عبادت کے لئے آئی ہیں، عبادت کے آداب اختیار کریں تو معاملہ کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے، مسجد حرام میں اور مسجد نبوی میں عورتوں کی نماز کے لئے الگ الگ جگہیں متعین ہیں، مسجد نبوی میں تو خیر مردوں کے درمیان عورتوں کے آنے کی گنجائش نہیں ہوتی، مگر مسجد حرام میں طواف کے واسطے سے مردوں کے درمیان عورتیں خوب آتی ہیں، اور نماز باجماعت میں بھی مردوں کے درمیان بے تکلف گھسی رہتی ہیں، حالانکہ جماعت کی نماز میں مردوں کے برابر کھڑے ہونے سے دائیں، بائیں اور ٹھیک پیچھے کے مرد کی نماز برباد ہوجاتی ہے، مگر کسے پرواہ ہے، کتنے لوگ ہیں، جو اپنے پہلو میں عورتوں کو کھڑا کرلیتے ہیں، یہ جہالت بھی ہے، عبادت کی بے وقعتی بھی ہے، مسئلہ کی اہمیت سے بے پروائی بھی ہے، کاش مرد اس پر دھیان دیتے، اور کاش حرم کی تقریروں اور مواعظ میں اس مسئلہ کو بیان کیا جاتا۔ ائمہ حرم جہاں یہ کہتے ہیں **سووا صفوفکم واعتدلوا** (صفیں سیدھی کرلیں اور برابر کھڑے ہوں) اس طرح وہ یہ بھی کہہ دیا کریں کہ عورتیں پیچھے کھڑی ہوں، مردوں کی صف میں نہ کھڑی ہوں، مگر اس مسئلہ پر بالکل سناٹا ہے۔

حرم محترم ہو یا مسجد نبوی! یہ بات مسلم ہے کہ عورتوں کی نماز مسجد کے مقابلے میں گھر کے اندر افضل ہے، فرائض تو وہ گھر کے اندر ادا کرلیا کریں، ہاں دن یا رات کے کسی حصے میں مسجد میں جائیں، نوافل پڑھیں، تلاوت کریں، ذکر الٰہی میں مشغول رہیں، اور مردوں

سے الگ رہیں۔

طواف کا معاملہ یہ ہے کہ عمرہ کا طواف فرض ہے، اور حج میں طواف زیارت فرض ہے، آخر میں طواف وداع واجب ہے، یہ طواف تو بہر صورت کرنے ہیں، ان کے علاوہ ہر طواف نفل ہے، نفل کے لئے وقت، گنجائش، ناروا اختلاط سے اجتناب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، اس لئے مناسب یہ ہے کہ عورتیں نفلی طواف بہت زیادہ نہ کریں، جس وقت ہجوم قدرے کم ہو، تو پردے کی رعایت کے ساتھ آہستہ آہستہ حتی الامکان مردوں سے بچ بچ کر طواف کریں، مگر چہرے پر نقاب ضرور ہو، بارہا دیکھا گیا ہے کہ بعض سعودی عورتیں سر سے پاؤں تک برقعے میں ملبوس، پاؤں میں موزے، ہاتھ میں دستانے سمیت طواف کر رہی ہیں، نہ وہ خود دھکا دے رہی ہیں، نہ مردوں سے ٹکرا رہی ہیں، اور نہ انھیں ٹکر لگ رہی ہے، اس اہتمام سے طواف ہوگا، تو یہ عبادت کی شان ہے؟

یہ بات اوروں تک شاید نہ پہونچے، لیکن اپنے ہندوستانی حاجیوں سے ضرور کہتا ہوں کہ وہ ان آداب کا خیال رکھیں، اور عورتوں کو بھی پابند بنائیں، آدمی سفر کی اتنی مشقت جھیلے اور عبادت کے لئے جھیلے، اور ایسی عبادت کے لئے، جو اگر قابل قبول ہوجائے تو آدمی ایسا ہوجائے جیسے ابھی ماں کے شکم سے پیدا ہوا ہے، اور اس کے باوجود، اس سے فائدہ نہ اٹھائے اور عبادات میں دنیاداری کو شامل کردے تو بڑے گھاٹے کا سودا ہے۔

منیٰ، عرفات، مزدلفہ:

حج کے مہینے تو شوال، ذی قعدہ اور ذی الحجہ کے تیرہ روز ہیں، مگر حج کی ادائیگی کے اصل دن پانچ ہیں، اور حج کے ادا کرنے کے مقامات چار ہیں۔ مکہ مکرمہ، منیٰ، عرفات اور مزدلفہ۔ ۸؍ ذی الحجہ کو حج کا احرام باندھ کر منیٰ روانہ ہوتے ہیں، منیٰ میں ظہر سے فجر تک قیام ہوتا ہے، پھر صبح کو عرفات جاتے ہیں، وقوف عرفات ہی اصل حج ہے، اس کا وقت زوال شمس کے بعد ہے، غروب آفتاب کے بعد وہاں سے نکل کر مزدلفہ آتے ہیں، مزدلفہ میں رات گزار کر طلوع صبح صادق سے طلوع شمس تک وقوف مزدلفہ ہوتا ہے، پھر وہاں سے سویرے چل کر

منیٰ آتے ہیں، یہاں ایک جمرہ کی رمی ہے، پھر قربانی ہے، پھر سر منڈانا ہے، اس کے بعد طواف زیارت۔ ایک جمرہ کی رمی تو آج ہی متعین ہے، قربانی، سر منڈوانے اور طوافِ زیارت میں ۱۲؍ ذی الحجہ تک گنجائش ہے، ۱۱؍ اور ۱۲؍ کو زوال کے بعد تینوں جمرات کی رمی ہے، بس ۱۲؍ کی شام تک حج کے تمام اعمال پورے ہوئے، کوئی مزید ثواب حاصل کرنا چاہے، تو ۱۳؍ کو بھی زوال کے بعد رمی کرلے۔

یہ پانچ دن تو حج کے لئے لازم ہیں، چھٹا دن اختیاری ہے۔ آپ غور کریں، اگر یہ پانچ دن آدمی اس طرح گزار دے کہ ظاہر اور باطن سے محض اللہ کی طرف متوجہ ہو، اور حوائج ضروریہ کے علاوہ تمام اوقات کو ذکر وعبادت میں لگا دے تو کیا مشکل ہے؟ مگر ہوتا یہ ہے کہ لوگ فضول باتوں میں، گھومنے پھرنے میں، ارباب انتظام کی شکایتوں میں، کھانے پینے کی دقتوں کے بیان میں بہت سا وقت کھودیتے ہیں، منیٰ میں ۸؍ کو حج کا کوئی مستقل عمل نہیں ہے، اس کو یونہی لایعنی مشغلوں میں کاٹ دیتے ہیں، منیٰ سے عرفات جانا، اتنی بڑی تعداد کا وہاں منتقل ہونا، ایک بڑا کام ہے، مگر بہر حال سارا مجمع وہاں پہونچ جاتا ہے۔ وہاں یہ تماشہ دیکھنے میں آتا ہے کہ بہت سے لوگ ناواقفیت یا لاپروائی سے عرفات کے حدود کے باہر ہی پڑجاتے ہیں، پھر اللہ جانے وہ حدود عرفات میں کب داخل ہوتے ہیں؟ اور داخل بھی ہوتے یا وہیں رہ جاتے ہیں، اور جو لوگ معلموں کے خیموں میں ہوتے ہیں، وہ تو عرفات ہی میں ہیں، لیکن وہ جو وقوف کا وقت ہے، اور وہی اصل حج ہے، اور وہی کائنات کا سب سے بیش قیمت وقت ہے، اتفاق کہئے یا انتظام کی خامی کہئے دوپہر کو عرفات میں کھانا تقسیم ہوتا ہے، اور حاجیوں کا اچھا خاصا وقت اس میں کھپ جاتا ہے، پھر آدمی پیٹ بھر کر کھالیتا ہے تو نیند ستانے لگتی ہے۔ میں اپنے ساتھیوں سے عرض کرتا ہوں کہ صبح کو کچھ کھاپی لیں، دوپہر کا کھانا حذف کرکے دلجمعی سے ذکر وتلاوت اور دعا میں لگیں، بعض خیموں میں کچھ لوگوں کو تقریر کا جوش اٹھتا ہے، لاؤڈ اسپیکر لگا کر بعض اوقات لمبی لمبی تقریریں ہونے لگتی ہیں، حالانکہ اگر تذکیر مقصود ہے تو مختصر بات کے بعد سب کو کام پر لگادینا چاہئے، اتنے سے وقت میں بھی کچھ لوگ سو لیتے ہیں، ادھر ادھر ٹہل

لیتے ہیں، حالانکہ کرنے کے کام اور بھی ہیں۔

مغرب کے بعد جو مزدلفہ کو واپسی ہوتی ہے، تو پیدل چلنے والوں کی ایک خاصی تعداد مزدلفہ کے باہر ہی پڑاؤ ڈال دیتی ہے، اور سڑک کو اس طرح جام کر دیتے ہیں کہ ان کے بعد والوں کیلئے مزدلفہ میں داخل ہونا ممکن نہیں رہتا، اگر حکومت اس کا انتظام کرنا چاہے تو اس کے لئے کچھ مشکل نہیں ہے۔

وقوف مزدلفہ کا وقت صبح صادق سے ہوتا ہے، مگر دیکھنے والے دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ صبح صادق سے پہلے ہی فجر کی نماز ادا کر کے اپنی دانست میں وقوف مزدلفہ کر کے منیٰ کو روانہ ہو جاتے ہیں، عبادت کے سلسلے میں اتنی لاپرواہی کہ مسئلہ نہ پوچھتے ہیں اور نہ بتانے پر توجہ دیتے ہیں۔ یہ عام اکثریت کا حال نہیں ہے، لیکن پھر بھی اتنے لوگ صبح صادق سے پہلے فجر کی نماز ادا کرتے ہوئے، اور جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، کہ حیرت بھی ہوتی ہے، اور افسوس بھی!

منیٰ پہونچنے کے بعد جمرۂ عقبہ کی رمی کرنی ہوتی ہے، اب تو رمی کا معاملہ بہت سہل ہو گیا ہے، حکومت نے اس موضوع پر خاص توجہ کی ہے، اور جگہ میں بہت وسعت کر دی ہے، مگر ناواقفی کا یہ عالم ہے کہ ہم لوگ جمرۂ عقبہ کی رمی کر کے واپس لوٹ رہے تھے، تو ایک حاجی اور ان کی حجن صاحبہ بڑے اطمینان سے پہلے جمرہ کی رمی کر رہے تھے، بہت خوش ہوئے ہوں گے کہ جمرہ بالکل خالی ہے ہم نے بہت آسانی سے رمی کر لی۔

اس کے بعد قربانی کا مرحلہ ہے، اب لوگوں کو احرام سے آزاد ہونے کی جلدی ہوتی ہے، بقول حضرت مولانا مفتی عاشق الٰہی صاحب بلند شہری علیہ الرحمہ داڑھی منڈانے کی جلدی ہوتی ہے، کتنے مناسک حج میں ترتیب کا لحاظ کئے بغیر احرام اتار دیتے ہیں، احرام اتارنے کے لئے افضل عمل سر منڈوانا ہے، بال بڑے ہوں تو کتروا دینے سے بھی احرام اتر جاتا ہے، عموماً لوگ سر منڈواتے ہیں، مگر بعض ایسے بھی ہوتے ہیں، کہ بال چھوٹے ہونے کے بعد بھی منڈوانے کے بجائے کتروانے پر اکتفا کرتے ہیں، اس سے احرام سے

وہ آزاد نہیں ہوتے، مگر لاپرواہی کرتے ہیں، حالانکہ بندگی کا تقاضا یہی ہے کہ جس کے لئے سفر کی اتنی مشقت برداشت کی ہے، اتنا مال خرچ کیا ہے، اس کے لئے وہی کام کریں، جو اسے پسند ہے، آج کے روز سر منڈوا دینا ہی اللہ کو پسند ہے، رسول اللہ ﷺ دعا کر رہے تھے **رحم اللہ المحلقین**، اللہ سر منڈوانے والوں پر رحمت نازل فرمائیں، کسی نے کہا **والمقصرین**، اور بال کتروانے والے پر بھی، آپ نے اسے نہیں کہا، بلکہ **رحم اللہ المحلقین**، اسی طرح تین مرتبہ ہوا۔ تیسری مرتبہ میں آپ نے فرمایا **والمقصرین**، اور بال کتروانے والے پر بھی رحمت ہو۔ تو جب ان کو یہی پسند ہے، تو اس میں کیوں کوتاہی کی جائے، اور داڑھی منڈانا تو مطلقاً منع ہے، اسے تو ہاتھ بھی نہیں لگانا چاہئے، مگر کتنے ہیں جو سر منڈوائیں یا نہ منڈوائیں، داڑھی صاف کر دیتے ہیں، یہ ہے عبادت کو الٹ دینا۔ اللہ تعالیٰ سمجھ عطا فرمائیں۔

منیٰ میں ۱۱/اور ۱۲/ذی الحجہ کو تینوں جمرات کی رمی کرنی ہے، اور زوال شمس کے بعد اس کا وقت ہے، معلمین نے اپنی بلڈنگوں میں اعلان لگا رکھا ہے کہ ان دنوں میں چوبیس گھنٹے میں کسی وقت بھی کنکری مار سکتے ہیں، حالانکہ یہ مسئلہ کسی حدیث وفقہ سے ثابت نہیں ہے، اس سے سہولت پسندوں کو موقع مل گیا، وہ زوال سے پہلے ہی جا کر کنکری مار آتے ہیں، جبکہ وہ بالکل معتبر نہیں، عبادات میں احتیاط چاہئے۔

واپسی:

آخری رمی کے بعد حج کے تمام ارکان ومناسک مکمل ہو گئے، اب حجاج مکہ مکرمہ واپس آجاتے ہیں، باہر کے حجاج طواف وداع کر کے کچھ وطن لوٹتے ہیں اور کچھ مدینہ منورہ بھیجے جاتے ہیں، واپسی میں حجاج کے ساتھ ایک چیز ایسی لازمی ہو گئی ہے کہ اس کے بغیر حاجی کا گویا تصور ہی نہیں ہوتا، وہ ہے سامانوں کی خریداری! مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور جدہ میں تمام دنیا کی مصنوعات وافر مقدار میں موجود ہوتی ہیں، حجاج بالخصوص عورتوں کی آنکھ خیرہ ہو جاتی ہے، ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت چیزیں، چمک دمک والی! جب تک جیب اجازت

دیتی ہے، لوگ خریداری کرتے رہتے ہیں، بعض لوگ مقروض بھی ہوجاتے ہیں، ہوائی جہاز میں ایک محدود وزن کی اجازت ہوتی ہے، اس سے زیادہ پر اچھا خاصا محصول لگتا ہے، جب یہ سامان حاجی باندھ لیتا ہے، تو اس کی سانس پھولنے لگتی ہے، کیونکہ مقررہ وزن سے سامان بڑھ گیا ہے، اب رقم ختم ہوگئی ہے، محصول کیسے ادا ہوگا، اور اگر رقم ہوتی تو فلاں فلاں چیز رہ گئی ہے، اسے نہ خرید لیتے، اب پریشان ہیں، دعا کرتے ہٰں، دعا کراتے ہیں۔ بار بار اس کا تذکرہ کرتے ہیں۔

ایک بار مدینہ طیبہ سے واپسی تھی، حجاج الگ بس پر بیٹھے، سامان دوسری گاڑی پر لاد دیا گیا، سب کے سامان زیادہ تھے، ایرپورٹ پر بس رکی، اب حجاج کی سانس اٹک رہی ہے، خدا کرے سامان تولا ہی نہ جائے، ہاں ایسا ہی ہوتا ہے، سعودی فلائٹ والے اللہ کریم کہہ کر سب لے لیتے ہیں، لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تولنے لگ جائیں، ان کا موڈ ہے، پھر بغیر محصول کے ہرگز نہ جانے دیں گے، حاجیوں میں یہی کھچڑی پک رہی ہے، ایک دوسرے سے دعا کرا رہے ہیں، دیر کے بعد دیکھا گیا کہ سامان وزن کی جگہ سے آگے بڑھ رہا ہے، اب تول نہ ہوگی، حاجیوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، اور ایک دوسرے کو اس طرح مبارکباد دینے لگے جیسے اسی وقت حج ہوا ہو۔

اس سال ایک حاجی صاحب کو دیکھا کہ ہونٹ خشک ہیں، چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں، ادھر سے ادھر بھاگ رہے ہیں، کسی کو پہچان نہیں رہے ہیں، بات کیا ہے؟ سامان زیادہ ہے اور تولنے والا قبول نہیں کر رہا ہے، بہت خوشامد کے بعد اس نے قبول کرلیا، تب اطمینان ہوا۔

جو سامان یہ لوگ خریدتے ہیں، وہ اپنے ملک میں بھی ملتا ہے، مکہ مکرمہ کا ایک تحفہ ہے، آب زمزم، اور مدینہ شریف کا ایک تحفہ ہے، کھجوریں۔ ان کے علاوہ بکثرت فضولیات ہوتے ہیں، ان فضولیات میں لوگ از حد پریشان ہوتے ہیں، میں یہ نہیں کہتا کہ سامانوں کی خریداری غلط ہے، لیکن فلائٹ کا اصول اور اپنی اوقات تو دیکھنی چاہئے، پھر سفر حج سے ایک

عبادت اور تقدس کا جو تاثر ہوتا ہے، سامانوں کی کثرت سے وہ تاثر مجروح ہوجاتا ہے۔

حج کے اخراجات:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ان سے عمرہ کے متعلق نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

’’إن لک من الاجر علیٰ قدر نصبک ونفقتک۔

تمہیں تمہاری تکان اور اخراجات کے بقدر اجر ملے گا

(رواہ الحاکم وقال صحیح علیٰ شرطھا)

یعنی حج وعمرہ میں ظاہر ہے کہ بدن کو تکان بہت ہوتی ہے، بسا اوقات آدمی کا جسم چور چور ہوجاتا ہے، اسی طرح اس میں مالی اخراجات بھی بہت ہوتے ہیں، ان دونوں چیزوں سے آدمی گھبراتا ہے، آپ نے اس گھبراہٹ کو خوشی سے بدل دیا کہ جس قدر تکان ہوگی اور جتنا مال خرچ ہوگا، عبادت کا ثواب بڑھتا جائے گا۔

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

النفقة فی الحج کالنفقة فی سبیل الله الدرهم بسبعمائةٍ، رواه الطبرانی فی الاوسط۔ (الترغیب والترهیب، ج:۲، ص:۸۰) حج میں اخراجات کا ثواب، فی سبیل اللہ جہاد میں اخراجات کے برابر ہے، یعنی ایک درہم کا سات سو درہم۔

بعض اوقات حجاج کو خرچ کی زیادتی کی شکایت ہوتی ہے، یا حج کے دوران منیٰ، عرفات، مزدلفہ اور مکہ مکرمہ کی آمد ورفت میں چونکہ ازدحام بہت ہوتا ہے، ازدحام کی وجہ سے سڑکوں پر گاڑیاں دوڑتی اور چلتی نہیں، بلکہ رینگتی ہیں، کبھی کبھی دس منٹ کا راستہ طے کرنے میں گھنٹوں لگ جاتے ہیں، بارہا ایسا ہوا کہ عرفات سے مزدلفہ آنے میں پانچ پانچ چھ چھ گھنٹے لگ جاتے ہیں، اس بھیڑ میں معلم کی گاڑیاں بھی جہاں پھنس گئیں، پھنسی رہتی ہیں، سڑکیں بہت ہیں، کشادہ بھی بہت ہیں، مگر ہجوم اتنا زیادہ ہوتا ہے، اور محدود وقت میں سب کو ان چار جگہوں میں آنا جانا رہتا ہے، اس لئے جو صورتحال پیش آتی ہے وہ ناگزیر ہے، اس میں ظاہر

ہے کہ گاڑیوں کا کرایہ بھی بہت بڑھ جاتا ہے، حجاج چیں بجبیں ہوتے ہیں، بعض کہنے لگ جاتے ہیں کہ یہ لوگ حاجیوں کو لوٹتے ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے، ان کو بھی مجبوریاں ہوتی ہیں، پھر آپ جو کچھ خرچ کردیں گے، اسی حساب سے ثواب بڑھ جائے گا، تو ناروا گھبراہٹ ظاہر کرکے، بیجا تبصرہ کرکے اپنا ثواب کیوں کھوتے ہیں۔

بعض بزرگوں نے اپنے متوسلین کو ہدایت کررکھی ہے کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں مول بھاؤ نہ کریں، ہمارے ذمے حق ہے کہ ہم اللہ ورسول کے ان پڑوسیوں کی مدد کریں، انھیں اگر ہم صدقہ نہیں دے سکتے، تو خرید وفروخت اور گاڑیوں کے کرائے میں تو وسعت سے کام لیں، ان کی مدد ہوگی اور ہمیں ثواب حاصل ہوگا۔

کبھی کبھی معلمین اور حج کمیٹی پر گرجتے برستے لوگ کہہ جاتے ہیں کہ اتنا اتنا پیسہ دیا ہے، یہ مناسب نہیں ہے، آپ نے پیسہ دیا ہے، آپ پر واجب تھا کہ دیتے، ان چند پیسوں میں دنیا وآخرت کی کتنی بڑی دولت حاصل ہوگئی، کہ آپ اللہ رب العزت کے دربارِ خاص میں پہونچ گئے، اگر تکلیف ہورہی ہے، تو اس پر بھی اجر بڑھ رہا ہے، تو آپ کا تو نفع ہی نفع ہے، پھر ان طعنوں اور کوسنوں سے آپ نے کون سا ثواب کمایا؟

کبھی کبھی نیچے درجے کے بعض خدمت گار، مثلاً بوجھ ڈھونے والے مزدور، جو واقعی بہت محنت کرتے ہیں، حاجیوں کے بڑے بڑے وزنی سامان ادھر سے ادھر منتقل کرتے ہیں، کبھی وہ کچھ عطیے کے منتظر ہوتے ہیں، وہ مزدوری نہیں مانگتے، کیونکہ انھیں اجرت تو ان کے ذمہ داروں کی طرف سے ملتی ہے، حاجیوں کو راحت پہونچائی ہے تو بطور خوشی کے کچھ انعام، عطیہ، بخشش چاہتے ہیں، بعض لوگ انھیں سختی سے جھڑک دیتے ہیں، حالانکہ اگر وہ انھیں ہلکے سے ہلکا بھی انعام دیدیتے ہیں تو وہ بہت خوش ہوجاتے ہیں، اور کام میں مزید چستی پیدا ہوتی ہے، اور حاجی نے کچھ خوش ہوکر دے دیا، تو اسے ثوب ہوتا ہے، آپ پڑھ چکے ہیں کہ حج مبرور ہونے کا ایک سبب کھانا کھلانا بھی ہے، حج میں اس کا اہتمام کرنا چاہئے کہ رفقاء ہوں یا خدام انھیں کھانا کھلاتے رہیں، خواہ کھانا دے کر، خواہ رقم دے کر، اس سے

حج مبرور ہوتا ہے، اور یہ بھی کہ حج وعمرہ میں جو اخراجات ہوتے ہیں وہ آدمی کی تنگدستی کو دور کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ حج وعمرہ تنگدستی اور گناہوں کو اس طرح ختم کرتے ہیں جیسے بھٹی لوہے اور سونے چاندی کے میل کچیل کو دور کر دیتی ہے۔ (ترمذی شریف، حدیث: ۸۱۰)

صبر وتحمل اور میانہ روی:

حاجی اگر سفر شروع کرنے سے پہلے بطور خاص تین باتوں کا اہتمام کرلے، تو سفر کی مشقت آسان ہوجائے گی، اور ایک صاف ستھرا سفر ہوگا۔

اول یہ کہ اس سفر کا عبادت ہونا، اور عبادت کا ذریعہ ہونا خوب اچھی طرح مستحضر کرلے، اور ہر ہر جگہ اس استحضار کی تجدید کرتا رہے، اور ابتداء ہی سے دل میں یہ بات بٹھالے کہ جتنی بھی ناگواریاں، دشواریاں، اور تکلیفیں پیش آئیں گی، وہ سب گناہوں کو مٹاتی اور ثواب کو بڑھاتی رہیں گی، بھوک ہو، پیاس ہو، پروگرام کی بے ترتیبی ہو، تقدیم وتاخیر ہو، بدن کی تکان ہو، بے خوابی کا خمار ہو، کسی نے ناگوار بات کہہ دی ہو، غرض جو بات بھی ہو، وہ محض تکلیف نہیں ہے، بلکہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ خطائیں معاف کریں گے، آخرت کا درجہ بلند کریں گے، یہ سب ناگواریاں عبادت میں شامل ہوں گی، یہ عبادت اختیاری نہیں غیر اختیاری ہوگی، اور اس کا درجہ بہت بلند ہوگا۔

دوسرے یہ کہ گھر سے نکلنے کے وقت غصہ اور بے صبری کو اپنے پاس سے رخصت کردے، غصہ اور بے صبری ایک دوسرے کو لازم ہیں۔ ایک چلا جائے گا تو دوسرا بھی رخصت ہوجائے گا۔ طے کرلے کہ خواہ کتنی ہی خلاف طبیعت اور خلاف مزاج بات ہوگی غصہ نہیں کرنا ہے، سفر ہے اور وہ بھی بہت ہجوم کا، اس میں اپنے مزاج کے خلاف ہونا ناگزیر ہے، بس غصہ کی آگ سے اپنے آپ کو بچائے، جدال، جس کی حق تعالیٰ نے نفی فرمائی ہے، اس کی بنیاد بھی غصہ ہی ہے، اس کو حاجی اپنے سے جدا ہی رکھے، یہ نہ ہوگا تو صبر خود بخود ہوگا، صبر کا حاصل یہ ہے کہ ہمیں جو کام کرنا ہے، اس میں لگے رہیں گے، ناگواریوں کے ساتھ الجھنا

پھر حکایت وشکایت کا دفتر کھولنا، کسی کو برا بھلا کہنا، یہ سب بے صبری ہے، چند دن کا سفر ہے، چند دن کی تکلیف سہہ لینا کیا مشکل ہے، لوگ اپنی بلڈنگ کی، اپنے معلم کی، حج کمیٹی کی، حج خدام کی بہت شکایتیں کرتے پھرتے ہیں، یہ بے صبری ہے، جو اللہ کو پسند نہیں ہے، یہ نہیں دیکھتے کہ کیسی مقدس جگہ اللہ نے پہونچا دیا ہے، بہت بڑے احسان کا تصور ہوتا ہے، تو چھوٹی چھوٹی ناگواریاں فنا ہوجاتی ہیں۔

صبر وتحمل یہ دو بنیادی اوصاف ایسے ہیں کہ حق تعالیٰ کی مدد بھی ان پر آتی ہے، اور مشکلیں بھی آسان ہوجاتی ہیں، قرآن پاک اور حدیث میں صبر کے بہت فضائل ومحامد بیان کئے گئے ہیں: إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ (الزمر: ۱۰) صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر دیا جائے گا۔ اور غصہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اہل تقویٰ کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے: وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ ، (سورہ آل عمران) اہل تقویٰ کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ غصہ کو ضبط کرتے ہیں۔

تیسری چیز جسے حاجی کو اہتمام کے ساتھ اختیار کرنا چاہئے، وہ یہ ہے کہ جلد بازی کسی مرحلہ میں نہ کرے، عبادت میں جلد بازی کو رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے، نماز شروع ہوچکی ہو، تو دوڑ کر اس میں شامل ہونے سے منع فرمایا ہے، حج کے سفر میں بطور خاص اس کا اہتمام چاہئے کہ جلد بازی نہ ہو، یہ طریقہ اللہ کو پسند نہیں ہے، اس کے برخلاف اطمینان ووقار حق تعالیٰ کو پسند ہے۔

بخاری ومسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **إذا اقيمت الصلوٰة فلا تاتوها وانتم تسعون واتوها وانتم تمشون وعليكم السكينة فماأدركتم فصلوا وما فاتكم فأتموا۔**

جب نماز کی جماعت کھڑی ہوچکی، تو تم دوڑ کر اس میں مت شامل ہو، بلکہ سکون کے ساتھ چل کر شامل ہو، پھر جو مل جائے پڑھ لو، اور جو فوت ہوجائے اس کو بعد میں پورا کرلو۔

حجۃ الوداع کے موقع پر عرفات سے کوچ کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے پیچھے

سے ایک زوردار آواز سنی، کوئی صاحب اونٹ کو للکار کر تیز چلانا چاہ رہے تھے، اور اونٹ بلبلا رہا تھا، آپ نے اپنے کوڑے سے اشارہ کیا اور فرمایا:

أیھا الناس علیکم بالسکینة فان البر لیس بالایضاع ۔ (بخاری عن ابن عباس) اے لوگو! اطمینان اختیار کرو، دوڑانا کوئی نیکی نہیں ہے۔

اگر ان تینوں باتوں کا اہتمام کیا گیا، تو سفر کی شکایتیں معدوم ہو جائیں گی۔ اس کے ساتھ چوتھی اہم چیز ہر ہر مرحلہ کی دعائیں ہیں۔ جہاں کہیں دشواری محسوس ہو حق تعالیٰ کے حضور خلوص دل سے دعائیں کی جائیں۔ مذکورہ بالا امور حق وعبادت ہیں اور اللہ کو پسند ہیں، ان پر کار بند ہوتے ہوئے جب دعا کی جائے گی، تو ان شاء اللہ دم نقد قبول ہوگی۔

واللہ والموفق وھو المعین والمجیب

(جنوری ۲۰۰۹ء)

* * * * *

بسم اللہ الرحمن الرحیم

احتجاج ومظاہرہ کی سیاست

چندنوجوانوں نے نہایت شدید جذباتی نعروں کے ساتھ مسلمانوں کی ایک بھیڑ اکٹھا کرلی تھی ، اور اسے تحریک بنا کر ”علماء کونسل“ کا نام دیا، اور اسے پارلمنٹری سیاست میں اتار کر الیکشن میں حصہ لیا۔ اس سے مسلمانوں کو شدید نقصان پہونچا، اس کا احتساب کیا گیا۔ یہ اور یہ اس کے بعدوالا اداریہ اسی پس منظر میں لکھے گئے۔

علمائے دین فرماتے ہیں اور سچ فرماتے ہیں، کہ مذہب اسلام یعنی قرآن سنت کی تعلیمات ، انسانی زندگی کے تمام اطراف وجوانب کا احاطہ کئے ہوئے ہیں ، قدیم وجدید کوئی صورت حال ایسی نہیں ہے ، جس میں شریعت اسلامی کی کوئی رہنمائی موجود نہ ہو، قرآن وسنت میں اس کے متعلق کوئی ہدایت نہ ہو، رسول اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ میں اس کی صراحت یا اشارہ نہ ہو، یہ بات بالکل سچ ہے ، سو فیصد درست ہے ، جب بھی کوئی صورت حال پیدا ہوگی ، خواہ وہ کتنی ہی نئی ہو، تلاش کرنے والوں کو قرآن وسنت کی روشنی میں اس کی حیثیت ونوعیت مل جائے گی ، نہ صرف اس کی نوعیت اور اس کا حکم ، بلکہ یہ ہدایت بھی ملے گی کہ اس صورت میں اسلام کس عمل اور کس طریقۂ کار کو چاہتا ہے؟

علمی اور نظریاتی اعتبار سے یہ بات جتنی مسلم اور بالا جماع ہے، جب عمل کا موقع آتا ہے، تو اتنا ہی اس نظریہ سے اعراض ہوتا ہے ، بلکہ یوں لگتا ہے جیسے عملاً اس نظریہ کی تکذیب ہورہی ہو۔

انسانی زندگی کا ایک شعبہ عبادات کا ہے، اس حصۂ زندگی میں تو سنت وشریعت کا

خیال ہوتا ہے، اس سے رہنمائی حاصل کی جاتی ہے، اور اس پر عمل بھی کیا جاتا ہے، لیکن اس شعبہ کے علاوہ دوسرے شعبوں کا حال یہ ہے کہ ان میں دنیاوی اغراض ومقاصد اور نفسانی خواہشات وجذبات کا چونکہ براہ راست شمول ہوتا ہے، اس لئے شریعت سے یا تو کچھ پوچھا ہی نہیں جاتا کہ، کہیں اس کی رہنمائی ہمارے اغراض ومقاصد کے خلاف نہ ہوجائے، یا اگر کچھ پوچھنا ہی پڑتا ہے تو اس احتیاط وتحفظ کے ساتھ کہ اس کا جواب اپنے مزاج اور نفس وطبیعت کے خلاف نہ ہو، اخلاقیات ومالیات کا شعبہ بطور خاص اس سے متاثر ہے، اسی کے قدم بقدم معاشرات کا شعبہ ہے، لیکن اس معاملہ میں سب سے زیادہ جو شعبہ نظر انداز ہوا ہے ، ایسا جیسے اسلام اور شریعت سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو، وہ سیاسیات کا شعبہ ہے، خواہ وہ مسلمانوں کی حکومت وسیاست ہو، یا غیر مسلموں کے درمیان، ان کی حکومت میں مسلمانوں کے سیاسی مسائل ہوں، یا تو پوچھا ہی نہیں جاتا کہ جو سیاسی اور ملکی مسائل درپیش ہیں، ان میں شریعت اور سنت کی تعلیم کیا ہے؟ یا طرز وانداز سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کا تعلق عبادات اور نکاح وطلاق وغیرہ سے ہو تو ہو، سیاست میں مذہب خاموش ہے، جو سیاست رائج الوقت ہو، پس اسی کے تانے بانے میں الجھے رہو، یہاں شریعت کہاں؟ اور سنت کیا چیز ہے؟

اخلاقیات کا حال یہ ہے کہ عملاً اسے دنیوی اغراض سے جوڑ دیا گیا ہے، خواہ ان اغراض کا تعلق مال سے ہو، یا عزت وجاہ سے، یا خاندان وقبیلہ سے، یا پارٹی اور گروہ بندی سے، اخلاق کا شعبہ کسی نہ کسی غرض سے وابستہ ہے، اس لئے اخلاقی اقدار کے اصول یکساں نہیں ہیں، ایک چیز جو میری غرض کے خلاف ہے وہ خواہ معاشرہ اور ماحول کے لئے جتنی بھی بہتر ہو، ناپسند اور غلط ہے، اور میری پسند کی جو چیز ہے خواہ وہ دوسروں کے لئے کتنی ہی مضر ہو ، وہ بہر حال بہتر ہے، جب اخلاقیات کی بنیاد یہ چیزیں قرار پا جائیں گی، تو ان کے بروئے کار لانے کیلئے سنت وشریعت کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن شریعت کا دبدبہ بہر حال قلوب پر ہے، تو اصحاب غرض کھینچ تان کر اغراضی اخلاق پر سنت وشریعت کا رنگ چڑھانے کی کوشش

کرتے ہیں، مثلاً دو شخصوں میں اختلاف ہے بلکہ عداوت ہے، اور محض نفسانی اغراض کی بنیاد پر ہے، مگر وہ دونوں چاہتے ہیں کہ اس عداوت وعناد کو پبلک کے سامنے خوبصورت اور ضروری بنا کر پیش کریں، تو اس کی کوئی شرعی، دینی اور اصولی بنیاد اختراع کرتے ہیں، اور دین ومذہب کی راہ سے اپنے گرد مجمع اکٹھا کرتے ہیں۔

مالیات کا حال یہ ہے کہ عموماً آدمی مسلمان ہو یا غیر مسلم! ......اور غیر مسلم یہاں زیر بحث نہیں ہے...... مال ودولت کی جوع البقر میں مبتلا ہے، مال ہی مقصود بنا ہوا ہے، آدمی کی نقل وحرکت مال ہی کے محور پر ہوتی ہے، مال ہی آدمی کے ناپنے کا پیمانہ ہے، نہ دین نہ عقل، نہ خدمت نہ انسانیت! مالدار ہے تو وہ عقل مند ہے، خادم قوم وملت ہے، بڑا صاحب اخلاق ومروت ہے، اور اگر چند مذہبی رسوم کو بھی کبھی کبھی بجالاتا ہے، تو بڑا مذہبی بھی ہے، اور اگر مالدار نہیں ہے تو سب کچھ ہو کر بھی کچھ نہیں ہے، بیوقوف ہے احمق ہے۔

جب مال کی یہ حیثیت قرار پا گئی، تو اس کی آمد ہو، یا اس کا خرچ، سب کچھ اسی جوع البقر (بے تحاشا حرص مال) کے تحت ہوگا، کیونکہ شریعت سے کچھ پوچھنے جائیں، وہ تو حرص وہوس سے بالاتر ہو کر محض اللہ کی رضا کے تحت نفی واثبات کرے گی، پھر تو سینۂ آرزو پر بھاری پتھر رکھنا پڑے گا جو کب گوارا ہوگا؟ پس شریعت کی چھٹی کردی، اور جس راستے سے چاہا کمایا، اور جس راستے میں چاہا، بہایا، اس سے اپنی کوئی غرض نفسانی پوری ہونی چاہئے، ہاں جب مال میں کوئی بحرانی افتاد پڑتی ہے، اور نقصان کی کوئی تلافی دکھائی نہیں دیتی تو اس وقت اللہ والے یاد آتے ہیں، اللہ کی شریعت پھر بھی نہیں یاد آتی، صرف اللہ والے یاد آتے ہیں، کہ ان سے دعائیں کرائیں، ان سے کوئی وظیفہ حاصل کریں، یہ بھی نہ ہو سکے تو ان سے کوئی تعویذ لیں تاکہ اللہ تعالیٰ یہ بحران دور کردیں، یہ خیال نہیں ہوگا کہ شریعت کا مسئلہ دریافت کر کے اپنے مالی معاملات اور آمد وصرف کا طریقہ درست کرلیں، بس یہ ہے کہ ہم جس حال میں اور جس طریق پر ہیں، رہنے دو، اور دعا کر کے یہ مصیبت ٹلا دو، پانی میں جو نجاست ہے، وہ اسی میں رہنے دو، اور پھونک کر پانی پاک کردو۔ کہاں وہ دعویٰ کہ شریعتِ اسلامی کی تعلیم ہمہ گیر

اور ہمہ جہت محیط ہے، اور کہاں یہ بے دلی کہ قریب جانے کی بھی ہمت نہیں ہوتی۔

اور معاشرات یعنی خاندانی اور گھریلو مسائل میں بھی یہی حال ہے، پیدائش سے لے کر موت تک جتنے مسائل ہیں، شادی بیاہ سے تقسیم وراثت تک، ہر جگہ شریعت وسنت سے گریز وانحراف عام ہے، جس طرح نکاح کے سلسلے میں بے سروپا واہیات وخرافات رسوم اور بیجا اسراف کا چلن ہے، اس سے زیادہ وراثت کے معاملے میں شریعت کی حدود پامال کی جاتی ہیں، مشترک خاندان جس میں مال کی ملکیت ایک ہاتھ میں مرتکز ہوتی ہے، زندگی میں بھی اور خاندان کے کسی ایک ممبر کے مرنے کے بعد بھی جس طرح مال میں خلاف شرع بے انصافی کا رواج ہے، پوچھئے مت الامان والحفیظ۔ کیا صرف زبانی نعرہ کہ شریعت زندگی کے تمام مسائل کی کفیل ہے، کیا اس نعرہ اور اس طرز عمل میں کوئی مناسبت ہے؟

سیاسیات کا مسئلہ تو اور ناگفتہ بہ ہے، میں اس وقت ان مسلمانوں کی بات نہیں کرتا، جو خود تخت حکومت پر براجمان ہیں، اور کبھی شریعت کا نام لے کر اور کبھی اس کا نام لئے بغیر شرعی احکام کو پس پشت ڈالتے رہتے ہیں، میرے مخاطب اس وقت ملک ہندوستان کے مسلمان قائدین، لیڈر اور وہ علماء ہیں، جو میدان سیاست میں شہ سواری کر رہے ہیں، اور پوری ملت کی قیادت وزعامت کے دعویدار ہیں، ہمارے ملک میں حکومت نہ مسلمانوں کی ہے، نہ اسلام کی! قانونی اور دستوری اعتبار سے سیکولر حکومت ہے، یعنی کسی مذہب کی جانب داری نہیں ہے اور جمہوریت کے اصول پر کاربند ہے، حکومت کے لئے ذمہ دار افراد کے انتخاب میں تمام شہریوں کا حصہ ہے۔ دستوری طور پر تو یہی ہے لیکن افراد واشخاص کے لحاظ سے یہ ایک غیر مسلم حکومت ہے، کیونکہ وہی اکثریت میں ہیں، مسلمان اقلیت میں ہیں، اس لئے عملاً یہ محکوم ہیں، اس حکومت میں پارٹیوں اور افراد کے میلان ورجحان کے لحاظ سے اقلیتوں کے لئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں، جمہوری طرز حکومت میں یہ مسائل کیسے حل ہوں؟ خاص طور سے ہندوستان جن حالات کا شکار ہے، ان کی جڑیں بہت گہری اور پھیلی ہوئی ہیں۔ انگریزوں کے زمانے تک ہندوستان ایک ملک تھا، انگریزوں نے اپنے دور میں

خصوصیت کے ساتھ ہندو مسلم فرقہ واریت پھیلائی، آپس میں نفرت کا بیج بویا، جب فرقہ واریت خوب گرم ہوگئی، اور لوہا تیار ہوگیا تو اس ملک کے دو ٹکڑے کر دئے، بلکہ تین! پاکستان کے نام پر دو حصۂ زمین، اور دونوں کے درمیان ایک وسیع وعریض ملک ہندوستان!

پھر دونوں میں اتنی نفرت بھر دی کہ ساٹھ سال گزرنے کے بعد بھی دوستی اور باہمی اعتماد کی کوئی کرن نہیں پھوٹی، اور یہ منافرت مذہبی بنیاد پر پیدا کی گئی۔ ہندوستان کا ہندو پاکستان کے مسلمانوں کا دشمن، اور پاکستان کا مسلمان ہندوستان کے ہندوؤں کا دشمن! اب کشمکش بلکہ مصیبت میں ہندوستان کے مسلمان ہیں، یہ مذہباً مسلمان ہیں، اس لئے ان کو دنیا جہاں کے مسلمان سے لگاؤ ہے، اور وطناً ہندوستانی ہیں، اس لئے اپنے وطن سے انھیں محبت ہے، پاکستانی مسلمان ان سے بدک رہا ہے، کیونکہ یہ ہندوستانی ہیں، اور ہندوستان کا ہندو انھیں شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ مسلمان ہیں۔ پاکستان میں کچھ ہوتا ہے تو یہ موردِ الزام ٹھہرائے جاتے ہیں، اس کشمکش کا خمیازہ ہندوستانی مسلمانوں کو فرقہ وارانہ فسادات، مسلم نوجوانوں کے قتل ناحق اور گرفتاریٔ بے جا نیز بے تکے مقدمات میں ابتلاء اور جیل کی کال کوٹھریوں کی شکل میں بھگتنا پڑ رہا ہے۔

اس درد کا درماں کیا ہے؟ اور اس مرض کی دوا کیا ہونی چاہئے؟ جمہوری طرز حکومت میں لوگ کہتے ہیں کہ اس طرح کی صورت حال سے نمٹنے کے لئے احتجاج اور مظاہروں کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، چنانچہ مسائل صرف مسلمانوں کے ساتھ نہیں ہیں مختلف سیاسی پارٹیوں کے بھی اپنے اپنے مسائل ومفادات ہیں، اکثریت کے بھی کچھ مسائل ہیں، ہندوستان کی دوسری اقلیتوں کے ساتھ بھی پیچیدگیاں ہیں، اور اس جمہوری طرز کے ہنگاموں سے ہمارا ملک بیشتر اوقات بلبلاتا رہتا ہے۔

کیا ان مسائل میں اسلام کی کوئی تعلیم نہیں، ہمارے بیشتر قائدین نے وہ طرز عمل اختیار کیا ہے، جیسے ہمارے دین کی تعلیمات نے اس صورت حال سے کوئی تعرض کیا ہی نہیں ہے، جو کچھ ہے وہ بس دنیاوی طریقۂ جمہوریت ہے، حالانکہ احتجاج اور مظاہروں کی سیاست

سے اب تک زیادہ تر نقصان ہی ہوا ہے، ملی بھی، اجتماعی بھی، انفرادی بھی! ہر احتجاج اور ہر مظاہرہ کے بعد ملت کے مسائل میں کچھ گرہیں مزید پڑ جاتی ہیں، احتجاج اور مظاہرے کی سیاست دوسروں کے لئے چاہے مفید ہو، مگر مسلمانوں کے حق میں اس کی افادیت نہایت مشکوک ہے، یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ جو تدبیر ایک قوم کے لئے مفید ہو، وہ دوسری قوم کے لئے بھی مفید ہو، کیونکہ مزاج الگ ہیں، مقصد جدا ہے، طریقہ مختلف ہے، ہے تو لطیفہ مگر بات سمجھانے کے لئے بہت عمدہ ہے۔

کسی جگہ ایک آدمی تاڑ کے درخت پر چڑھ گیا، چڑھ تو گیا، مگر اترنا اس کے لئے مصیبت بن گیا، وہ چیخنے چلانے لگا۔ لوگ جمع ہوئے، حیران تھے کہ اسے کیونکر اتارا جائے، ایک صاحب ہر جگہ اپنی منطق لگانے والے! تشریف لائے، انھوں نے فرمایا کہ ایک رسہ لاؤ، لوگ موٹا سا رسہ لائے، ان کی ہدایت پر چند نوجوانوں نے اوپر اچھالا، اوپر والے کو ہدایت ملی کہ اسے پکڑ کر اپنی کمر میں باندھ لو، اس نے تعمیل کی، انھوں نے نوجوانوں کو حکم دیا کہ اسے نیچے کھینچو، زور سے جھٹکا دیا گیا، وہ شخص زمین پر گر کر چکنا چور ہو گیا، بدن تو نیچے آ گیا مگر روح اوپر چلی گئی۔ لوگوں نے پوچھا یہ کیا ہوا؟ فرمانے لگے اس کی قسمت! ورنہ میں نے اسی طریقے سے بہتوں کو کنویں سے نکالا ہے۔

کنویں میں گرے ہوئے کو بچانے کے لئے جو طریقہ اختیار کیا گیا تھا، وہی تاڑ پر چڑھے ہوئے آدمی پر آزمایا گیا، تو نتیجہ کچھ سے کچھ نکلا، امت مسلمہ کا مزاج وہ نہیں ہے جو دوسری اقوام کا ہے، پس ایک کو دوسرے پر قیاس کرنا، ایسا ہی ہے جیسے اوپر مذکور ہوا۔

عجیب بات ہے کہ جن چیزوں میں پڑ کر، ایمان اور ایمانی اخلاق و عمل خطرے میں پڑتا ہے، مشورہ دیا جاتا ہے کہ اپنی طاقت وقوت اور دفع مصائب کے لئے انھیں چیزوں کو اختیار کرو، قرار دیا گیا کہ اس زمانے میں ذرائع ابلاغ، یعنی پروپیگنڈہ کی مشینری میں بڑی طاقت ہے، اس لئے مسلمانوں کو چاہیئے کہ ٹی۔ وی، انٹرنیٹ اور اس طرح کی دوسری لغویات اختیار کریں، اور ستم یہ ہے کہ اسے **وأعدوا لهم ما استطعتم** (اور کفار کے لئے

جس طاقت وقوت کی استطاعت ہو، اسے تیار رکھو) کے ارشاد کی تعمیل قرار دیا جارہا ہے۔

اسلام کی تعلیم یہ نہیں ہے کہ آدمی کے باطن اور اندرون کو آزاد چھوڑ کر باہر کی چیزیں طاقت کے نام پر اس کے ہاتھ میں دیدی جائیں، اگر ایسا کیا گیا تو طاقت دوسروں پر استعمال ہونے کے بجائے اپنے ہی ایمان وعمل صالح کا گلا گھونٹ دے گی۔

نہ ظاہر پر اسلامی احکام وقوانین کا اثر، نہ باطن میں دینی وایمانی رنگ! پھر یہ طریقے اور ہتھیار کس قدر مفید ثابت ہوں گے؟ ان اجتماعی مسائل کے حل کے لئے قرآن اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات میں بہت کچھ ہے۔ مسلمان کے مسئلوں کا حل صرف ظاہری تدبیروں سے نہیں ہے، بلکہ اس کا زیادہ تر انحصار نصرت غیبی پر ہے، اور نصرت الٰہی گناہوں اور نافرمانیوں اور خودساختہ طریقوں اور نظریوں پر نہیں آتی، وہ اطاعت وفرمانبرداری ہی پر آتی ہے، جسے قرآن کریم نے صبر اور تقویٰ سے تعبیر کیا ہے۔ صبر کا مطلب یہ ہے کہ کیسے بھی سنگین حالات ہوں، آدمی اپنے طریقے پر مضبوطی سے جمارہے، یہ نہیں کہ حالات ذرا بدلے اور ہم نے بھی اپنا رخ بدل لیا۔ فریاد، مظاہرہ، احتجاج، شکوہ وشکایت! یہ بے صبری کے شاخسانے ہیں۔ اور تقویٰ یہ ہے کہ ان حالات میں قدم پھونک کر اٹھائے، حالات سے زیادہ خالق حالات پر نظر رکھے، کوئی کام ایسا سرزد نہ ہو جس سے حق تعالیٰ کی ناراضگی ہو۔

ان حالات میں جبکہ نابرابری اور ناانصافی حکومت کی طرف سے ہورہی ہو، اور شریعت کی طرف سے علم بغاوت بلند کرنے کی اجازت نہ ہو، کیونکہ اس سے بڑا شر پیدا ہوگا، کیا کرنا چاہئے؟ اسے حضور اکرم ﷺ کے ارشاد میں ملاحظہ فرمائیے:

حضرت عبد اللہ بن مسعود ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ میرے بعد مفاد پرستانہ ترجیحات ہوں گی، اور ایسے کام ہوں گے، جنھیں تم نہیں جانتے پہچانتے ہوگے، لوگوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! تب ہم کو آپ کیا حکم دیتے ہیں؟ فرمایا تم پر جو حقوق ہیں وہ تم ادا کرنا، اور تمہارا جو حق ہے اس کا سوال اللہ سے کرنا (بخاری شریف: باب علامات النبوۃ، حدیث: ۳۶۰۳، کتاب الفتن: ۷۰۵۲)

حدیث میں لفظ اثرۃ آیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ دنیاوی حقوق ومنافع میں صاحب حق پر دوسرے کو ترجیح دی جائے، اور وہ امور جنھیں حضرات صحابہ نہیں جانتے پہچانتے تھے، وہ ظاہر ہے کہ برے اور غلط امور ہی ہیں۔

اس حدیث کا تعلق حکمرانوں سے ہے، حکومت کی غلط اندیشی اور غلط روی یہ ہوگی، کہ جو لوگ کسی فائدے یا کسی حق کے مستحق ہوں گے، وہ تو نظر انداز کر دئے جائیں گے، اور نااہل لوگ بغیر کسی استحقاق کے وہ حقوق پا جائیں گے، اور غلط روی کا چلن ہوگا۔ ایسے وقت رعایا کو کیا کرنا چاہئے؟

طبرانی کی روایت میں ہے کہ ایک موقع پر صحابہ کرام نے عرض کیا، جب ہم پر جو حکام ہوں، وہ اپنا تو حق ہم سے وصول کرلیں، اور ہمارا جو حق ہے اسے نہ دیں، تو کیا ہم ان سے لڑ جائیں۔ فرمایا نہیں! ان پر جو ذمہ داری ہے، اس کے جواب دہ تو وہ ہیں، اور تم پر جو ذمہ داری ہے، اس کے جواب دہ تم ہو۔ (فتح الباری: کتاب الفتن)

صاحب فتح الباری نے ایک روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے پاس جبرئیل آئے اور کہا، آپ کی امت آپ کے بعد فتنے میں پڑے گی، میں نے کہا وہ کہاں سے؟ بولے کہ اپنے حکام اور علماء کی جانب سے، حکام ان کا حق انھیں نہیں دیں گے، پس وہ اپنے حقوق کا مطالبہ کریں گے، اور فتنے میں پڑیں گے، اور علماء ان حکام کی پیروی اور کاسہ لیسی کریں گے، تو فتنے میں پڑیں گے، میں نے پوچھا تب بچنے والا کیسے بچے؟ کہا، رک جانے اور صبر کرنے سے، اگر وہ حکام دیں تو لے لے، اور اگر نہ دیں تو چھوڑ دے۔ (حوالہ سابق)

اس حدیث سے حقوق طلبی، احتجاج اور مظاہروں کی شرعی حیثیت معلوم ہوتی ہے! واقعہ یہ ہے کہ حکومتوں سے ٹکرانے کا یہ صحیح راستہ نہیں ہے، اس کا شرعی طریقہ وہی ہے، جو حضرت عبد اللہ بن مسعود ؓ کی روایت میں ذکر کیا گیا ہے، یعنی ہر شخص اپنی ذمہ داری پہچانے اور جو حق اس کے اوپر دوسروں کا ہے، اور اس میں حکومت بھی داخل ہے، یعنی

ایماندارانہ طور سے جو حقوق حکومت کے ہمارے اوپر ہیں، ان کو ہم پوری ذمہ داری سے ادا کریں، حقوق طلبی کا آدھا راستہ تو اسی سے طے ہو جائے گا، آدمی نے اپنی ذمہ داری خوش اُسلوبی سے ادا کی تو اس نے اللہ کا حکم پورا کیا اور اللہ کی رضا اسے حاصل ہوئی، اور اللہ کی رضا ہر خیر کی بنیاد ہے، پھر اس کا فطری اثر یہ ہوتا ہے کہ جس کا ہم نے حق ادا کیا ہے، وہ منجاب اللہ اپنے دل میں نرمی اور محبت پاتا ہے، پھر اس کے دل میں داعیہ پیدا ہوتا ہے کہ جس نے میرا حق ادا کیا ہے، اس کا حق بھی ادا کر دینا چاہئے، یہ آدھا راستہ ہو گیا، باقی آدھے کے لئے اللہ تعالیٰ سے اپنے حق کی دعا کرے، حق تعالیٰ کی منظوری ہو جائے گی تو کوئی اس کے حق کو روک نہیں سکتا۔

میری اس تحریر کو پڑھ کر بعض لوگ مسکرائیں گے، کہ لکھنے والا کس زمانہ کی بات اس زمانے میں لکھ رہا ہے، جبکہ حکومتیں بہری اور گونگی ہو رہی ہیں، ان کے سامنے جب تک ہڑبونگ نہ مچائی جائے گی، چیخا چلایا نہ جائے گا، نہ اس کے کان کھلیں گے اور نہ زبان کھلے گی۔ میں عرض کروں گا، یہی غلط اندیشی ہے اور شریعت کے خلاف ہے، حکومت کی غلطی آپ نے دیکھ لی، کبھی اپنی غلطی بھی دیکھی، آپ کے اوپر جو حق ہے، وہ آپ نے کتنا ادا کیا، اور حکومت کو کتنا دھوکا دیا۔ لوگ حکومت کے حقوق جو ان پر ہیں چھپا اور بچا لے جاتے ہیں، اور اسے اپنی فنکاری اور ہنر قرار دیتے ہیں، اور حکومت جب ان پر طاقت استعمال کرتی ہے تو انھیں اپنے وہ سارے حقوق یاد آنے لگتے ہیں، جو حکومت کے اوپر ہیں، یہ لینے اور دینے کے دو پیمانے رعایا نے بنا رکھے ہیں، پھر حکومت سے مہربانی کی توقع رکھتے ہیں، پس سیدھا اور صحیح راستہ وہی ہے، جو لسانِ نبوت نے بیان کیا ہے کہ اپنی ذمہ داری کو ادا کرو، ہر ایک کا حق اسے دو، اور جو تمہارا حق دوسروں پر ہے اس سے لڑ کر مطالبہ کرنے کے بجائے، اللہ سے مانگو، اس طریقۂ عمل سے کتنے مسائل تو پیدا ہی نہ ہوں گے، اور جو پیدا ہوں گے، وہ بآسانی حل ہو جائیں گے۔

آج کا عام مزاج یہ ہو گیا ہے کہ اپنی کوئی خامی، کوئی کمی، اپنا کوئی ظلم، اپنی حق تلفی

آدمی کو نظر نہیں آتی ہے، سب عیب دوسروں میں ہی نظر آتا ہے، یہی حال فریق ثانی کا بھی ہے، وہ اپنا کوئی عیب نہیں دیکھتا، دوسرا ہی اسے سراپا عیب نظر آتا ہے، پس دونوں آپس میں دست وگریباں ہوتے رہتے ہیں اور امن وامان رخصت ہو جاتا ہے۔

حکومت سے اگر ٹکرانا ہے، تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہر پانچ سال پر الیکشن ہوتا ہے ، الیکشن میں اسے ووٹ نہ دیجئے ، مگر کس کو دیجئے گا ، یہ سوال بہت ٹیڑھا ہے، لیکن جو بھی حکومت قائم ہے، اس کے ایماندارانہ حقوق ادا کریں، اور ناانصافیاں اس طرح دور کریں کہ اپنے اندر جو ناانصافیاں ہیں، انھیں ختم کریں، اور اللہ سے دعا کریں، ان شاء اللہ وہ حالات باذن الٰہی پیدا ہو جائیں گے جنھیں گوارا کیا جاسکے، اور یہ بھی دعا کریں۔ **أَللّٰھُمَّ لَاتُسَلِّطْ عَلَیْنَا مَنْ لَایَرْحَمُنَا**، آمین ، اے اللہ! ہم پر ایسی کوئی حکومت مسلط نہ فرمایئے، جو ہم پر رحم نہ کرے۔

حکومت اللہ کے ہاتھ میں ہے، اسی دربار سے مانگئے جو کچھ مانگنا ہو، اور مانگنے کے شرائط پورا کیجئے۔

(فروری ۲۰۰۹ء)

◆ ◆ ◆ ◆ ◆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مسلمانانِ ہند اور جمہوری حکومت

الیکشن کا طوفان اتر چکا ہے، لوگوں کے اندازے غلط ثابت ہوئے، توقعات اور امیدوں کے خواب بکھر گئے، جو سوچا گیا تھا وہ نہیں ہوا، جو بات خیال میں نہ تھی وہ وجود میں آ گئی۔ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ کا نقشہ ایک بار پھر نظروں کے سامنے آ گیا، وہ عقل ودانائی جو قرآن وحدیث کے تعلیمات سے روشن ہے وہ مطمئن ہے، وہ حکومت کو نہیں، حکومت کے زمام اختیار کو دیکھ رہی ہے کہ وہ کس کے ہاتھ میں ہے، روزِ ازل سے اللہ کا فرمان یہی ہے جسے حق تعالیٰ نے قرآن میں نازل فرما کر قیامت تک اہل ایمان کی زبانوں پر جاری فرما دیا ہے، تاکہ ہر دور میں، ہر ملک میں، ہر ہر فرد یہاں تک کہ بچہ بچہ، اس فرمان کا منادی بن جائے، اور ساری دنیا میں اس کی گونج سنائی دے: قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِیَدِکَ الْخَیْرُ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَئٍ قَدِیْرٌ ○ (سورہ آل عمران: ۲۶) تم کہہ دو! اے اللہ! اے ملک کے مالک، آپ جسے چاہیں ملک بخشیں اور جس سے چاہیں ملک چھین لیں، جسے چاہیں غلبہ دیں اور جسے چاہیں بے سروسامان کر دیں، آپ ہی کے ہاتھ میں خیر ہے، بلاشبہ آپ ہر چیز پر قادر ہیں۔

پس حکومتوں کا ردوبدل یا اس کا قیام واستحکام سب اسی مالک الملک کے ہاتھ میں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے یہ تصرفات اسباب کے پردوں سے جلوہ گر ہوتے ہیں، اور یہ اسباب بظاہر بندوں کے ہاتھوں ظہور کرتے ہیں، اس لئے عام انسانی طبیعت اسباب کی تہوں میں جھانکتی اور غور کرتی ہے کہ وہ کیا اسباب ہیں جن کے پیچھے یہ نتائج نمودار ہوئے ہیں، اور ان اسباب کا کیا بہتر سے بہتر استعمال، انسانی اختیار وتصرف میں ہے، کہ اس کے

بہتر نتائج حاصل ہوسکیں۔

ہندوستان سے انگریزی سامراج نے جب سے اپنا خیمہ اکھاڑا ہے اور یہ ملک جب سے دو بلکہ تین حصوں میں تقسیم ہوا ہے، اس کے بعد سے ملک کا وہ حصہ جو ہندوستان کے نام سے نامزد ہے، جس میں تعداد کے لحاظ سے ہندو اکثریت میں ہیں، اوران کے بعد اقلیتوں میں سب سے بڑی اقلیت مسلمان ہیں، مسلمانوں کے بعد سکھ اور عیسائی قدرے قابل ذکر ہیں۔ ایک بہت مختصر تعداد یہودی، پارسی، جین اور بدھ مذہب کی ہے، اس اکثریت اور ان اقلیتوں پر مشتمل ملک میں جمہوریت کی حکمرانی ہے۔ جمہوریت میں کسی خاص مذہب، برادری یا طبقے کی حکومت نہیں ہوتی، بلکہ ملک کے تمامتر عوام اس کی تشکیل میں فرداً فرداً حصہ لیتے ہیں، اور جس پارٹی یا طبقے کے حق میں زیادہ رائے آجاتی ہے اس کی حکومت بنتی ہے، لیکن اس حکومت پر پابندی ہوتی ہے کہ ملک کے تمام باشندوں کے خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں، مفاد کا تحفظ کرے اور ملک کی ترقیات میں انھیں بھی شریک کرے۔ یہ حکومتیں پانچ سال کے لئے بنتی ہیں، پانچ سال میں اگر ان کی کارکردگی اطمینان بخش ہوئی تو دوبارہ عوام کی رائے ان کے حق میں آتی ہے ورنہ انھیں تخت حکومت سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔

ہم اپنے ملک میں ہر پانچ سال پر بلکہ نظام کی خرابی اور پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلی کے الیکشنوں میں توافق نہ ہونے کی صورت میں ہر دو تین سال کے وقفے سے الیکشن کے طوفانِ برق وباراں میں تہ وبالا ہوتے ہیں۔

جمہوریت کے اس تماشے میں اور الیکشنوں کے اس طوفان میں اوروں کا جو بھی حال ہو، میں بحیثیت ایک مسلمان اپنا یعنی مسلمانوں کا محاسبہ کرنا چاہتا ہوں، میں میدانِ سیاست کا آدمی نہیں ہوں، اور نہ عملاً اس سے کوئی دلچسپی رکھتا، اور نہ اب تک اس موضوع پر کچھ لکھا ہے، لیکن اب کی بار کے الیکشن کے بعض خاص حالات نے دل ودماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے، اس لئے بطور احتساب کے کچھ سوچتا ہوں اور کچھ لکھتا ہوں۔ میں دوسروں کو کچھ نہیں کہتا، ملت اسلامیہ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

کہنے کو تو ہندوستانی جمہوریت میں متعدد مذاہب ہیں، اور ہر ایک کے ماننے والے کم وبیش موجود ہیں، اور ہندو مذہب کی اکثریت کے بعد سب کا شمار اقلیت کے دائرے میں ہے، مگر اب تک جو کچھ تجربے میں آیا ہے، اور یہی انسان کی فطری کمزوریوں کا لازمی نتیجہ بھی ہے، کہ اس ملک میں دو ہی مذہب ہیں اور دو ہی گروہ ہیں، ایک مسلم اور دوسرے غیر مسلم! جب تک مسلمانوں سے کوئی ظاہری مقابلہ نہیں ہے، غیر مسلم متعدد گروپوں میں تقسیم ہوتے ہیں، اور جب کسی بھی مفاد میں مسلمانوں سے مقابلے اور ٹکراؤ کی صورت ہوتی ہے، تو سارا غیر مسلم ''فرقۂ واحدہ'' بن جاتا ہے، تو حاصل یہ ہے کہ اس ملک میں غیر مسلم اکثریت میں ہیں اور مسلمان اقلیت میں ہیں۔

ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے جب نجات ملی، تو یہاں کے باشندوں نے جمہوری حکومت بنائی، اور اکثریت میں ہونے کی بنا پر حکومت کی باگ ڈور غیر مسلموں کے ہاتھ میں آئی، گو کہ مسلمانوں کی بھی شرکت اس میں رہی، مگر عملاً وہ شریک مغلوب رہے، فرقہ واریت کا عفریت انگریزوں کے دور میں ہی ظاہر ہو چکا تھا، آزادی کے بعد یہ خوفناک دیو آہستہ آہستہ اپنے دست وبازو نکالتا رہا، کچھ حکمرانوں نے بھی اسے شہ دی، جمہوری حکومت کا شاید کوئی دور ایسا نہیں گزرا ہے جس میں فرقہ پروری اور جاہلانہ عصبیت کی پرورش نہ کی گئی ہو، اور اقلیت کے سامنے نئے نئے مسائل نہ کھڑے کئے گئے ہوں، فسادات کے ذریعہ نسل کشی ودل شکستگی، قید وبند کی بے رحمیاں، اسلامی احکام ونظریات پر حملے، مدارس اسلامیہ پر شکوک وشبہات کی نگاہیں، ان پر الزام تراشیاں، یہ حالات مسلسل آتے رہے، جمہوری حکمرانوں کا یہ تشدد اور ان کا یہ نازیبا سلوک صرف مسلم اقلیت کے ساتھ نہیں، ہندوستان میں بسنے والے اور بھی طبقات کے ساتھ بھی جاری رہا، جس کے ردعمل میں حکمراں پارٹی سے بددلی عام ہوئی، اس پر جو اعتماد کیا گیا تھا وہ جاتا رہا، چنانچہ حکمراں پارٹی کو متعدد بار دھکے لگے اورس کے پرزے اڑتے رہے، نئی نئی پارٹیاں وجود میں آئیں، فرقہ پرستی بھی بڑھی، اب ہمارا ملک مختلف چھوٹی بڑی پارٹیوں کا ملغوبہ بن گیا ہے، ہر پارٹی اپنی طرف لوگوں کو کھینچتی ہے، اس وقت ملک کی کوئی

پارٹی ایسی نہیں ہے جو تنہا اپنی حکومت بنا سکے، جب کوئی پارٹی اپنے اتحادیوں کے ساتھ مل کر ایک مجموعی محاذ بناتی تب وہ اس لائق ہوتی ہے کہ اپنی حکومت بنائے، ان مختلف چھوٹی بڑی سیاسی پارٹیوں کا فائدہ ملک کے مختلف طبقات کو پہونچا، مگر مسلم اقلیت کے مسائل جوں کے توں رہے، بلکہ بعض سنگین نئے مسائل کا اضافہ ہوگیا، مثلاً مدارس کو دہشت گردی کا اڈہ قرار دیا گیا، مسلم نوجوانوں کو ملک دشمن تحریکات کے ساتھ وابستہ ہونے کا الزام لگا کر قتل وقید میں مبتلا کیا گیا۔ یہ سلسلہ روز افزوں ہے، اس قتل وخونریزی اور قید وبند کے نشانے پر ملک کے متعدد علاقے آئے، لیکن خصوصیت کے ساتھ ضلع اعظم گڈھ اس مصیبت میں زیادہ مبتلا ہوا۔ اس سلسلے میں مسلمانوں میں بہت اضطراب پایا جاتا ہے۔ کتنی مسلم تنظیمیں ہیں جو اس موضوع پر کوشش کرسکتی ہیں مگر سب کے کچھ داخلی مسائل الجھے رہتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ کما حقہ توجہ نہیں دے پاتیں، اور واقعہ یہ ہے کہ یہ دور خودغرضی اور مفاد پرستی کا دور ہے، جس کو جس راستے سے اپنا مفاد دکھائی دیتا ہے اُدھر ہی وہ چل پڑتا ہے، اس لئے کب کون کیا تحریک لے کر کھڑا ہو، اور کب کون کس سے پہلوتہی کرجائے، کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ نیتیں مشتبہ ہیں، سامنے کچھ، پیچھے کچھ، ظاہر کچھ، باطن کچھ کا اتنا تماشہ ہوتا ہے کہ کون کس پر اعتماد کرے۔

اسی بے اطمینانی اور خوف وہراس کے سائے میں پارلیمنٹ کا حالیہ الیکشن قدم بڑھاتا آرہا تھا، ہر پارٹی الیکشن کی تیاری کے لئے اپنے اپنے پروگرام مرتب کررہی تھی۔ اسی دوران اعظم گڈھ میں مسلمانوں کے ایک خاص خطے میں نئی ہلچل شروع ہوئی اور دیکھا گیا کہ کچھ لوگ جن کا کوئی خاص سیاسی پس منظر نہیں ہے وہ یہ کہتے ہوئے اٹھے کہ یہاں کی کوئی پارٹی مسلمانوں کی ہمدرد نہیں ہے، اتنے اتنے فسادات ہوئے، گجرات میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا، مسلمان نوجوانوں کو جہاں تہاں سے ایک ہی طرح کے الزام میں گرفتار کیا گیا، لیکن کوئی پارٹی منظّم طور پر اس کا نوٹس نہیں لے رہی ہے، نوجوان جیلوں میں سڑ رہے ہیں، ان کی جوانیاں برباد ہورہی ہیں، ان کے ماں باپ تصویرِ غم اور ان کے گھر ماتم کدے بنے ہوئے، مگر کوئی ان کے آنسو پونچھنے والا نہیں، لہٰذا یہ سب پارٹیاں القط! اب خود ہمیں اپنی تنظیم بنانی

ہے، اور اپنی لڑائی خود لڑنی ہے، چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک تنظیم علماء کے نام پر وجود میں آگئی، یہ تنظیم مسلمان نوجوانوں کے قتل وقید کے مسئلے کو لے کر اٹھی اور چونکہ یہ جذباتی مسئلہ تھا، اس لئے مسلم نوجوانوں کا ایک طبقہ اس کے ساتھ ایک خاص جوش وخروش کے ساتھ وابستہ ہوگیا، اس نے مسلمان نوجوانوں کے قتل وقید کے مسئلے کو لے کر ابتداء ہی میں دہلی اور لکھنؤ پر ٹرین سے دھاوا بول دیا۔ اس سے مسلمانوں کو کیا فائدہ پہونچا؟ یہ تو محل غور ہے۔ کوئی مسلم نوجوان قید سے اور الزام سے رہائی تو پا نہ سکا، البتہ مسلم نوجوانوں کے اس شور شرابہ سے غیر مسلم عوام چونک پڑی، ابھی یہ ہو ہی رہا تھا کہ اس تنظیم نے پارلمنٹری الیکشن میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا، پھر اس تنظیم کی طرف سے اور اس کے لیڈروں کی طرف سے مسلسل اشتعال انگیز بیانات کا ایسا آتش فشاں دہانہ کھل گیا کہ ہر طرف ماحول گرم ہوگیا، سنجیدہ اور ہوش مند افراد تو متحیر ہوئے اور کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی کہ یہ آتش فشاں دہانہ کیونکر بند ہو۔ عوام کا مزاج اتنا جذباتی ہوگیا کہ جیسے مسلمانوں کی نجات دہندہ تنظیم وجود میں آگئی ہو، ماحول کی ہولناکی کا یہ عالم ہوگیا کہ یہ تنظیم مدار کفر وایمان بن گئی، اگر کسی نے اس کے متعلق کچھ کہنا چاہا، تو اس کی عزت وآبرو خطرے میں پڑ گئی، یہ تو ایک خاص حلقے کی مسلم عوام کا حال ہوا۔ اور اس حلقے کے غیر مسلموں کا حال یہ ہوا کہ وہ سمٹ سمٹ کر فرقہ وارانہ تنظیم کی طرف بڑھنے لگے، اور انھیں اطمینان ہوا کہ جو کام پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، اب ہو جائے گا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ مسلمانوں سے اگر تصادم کی راہ نکلی تو غیر مسلم ”ملۃ واحدۃ“ ہوگا، چنانچہ تمام دوسری پارٹیوں کے ووٹ سمٹ کر فرقہ پرور پارٹی بھاجپا کی جھولی میں گرنے لگے۔

پھر جب الیکشن ہوا، اور نتیجہ ظاہر ہوا تو پتہ چلا کہ مسلمانوں کی اس تنظیم کا کوئی امیدوار کامیاب نہیں ہوا، اتنا ہی نہیں مشرقی یوپی میں کوئی بھی مسلمان امیدوار کسی بھی پارٹی سے کامیاب نہیں ہوا، گویا پارلیمنٹ میں مشرقی یوپی کے مسلمانوں کا صفایا ہوگیا، اور اس تنظیمِ نو کا جو مرکزی مقام ہے یعنی اعظم گڈھ شہر کا حلقہ اس میں جن سنگھ یا بھاجپا کا کوئی امیدوار آزادی کے بعد سے کبھی نہیں کامیاب ہوا تھا، بھاجپا کی نظریں اس پر کافی عرصہ سے لگی ہوئی

تھیں، اس الیکشن میں اس تنظیم کی برکت بھاجپا کو ملی، اور پارلیمنٹ کا بھاجپائی ممبر کامیاب ہوگیا، اس تنظیم نے مسلمانوں کا ووٹ بڑی تعداد میں اپنی طرف پھیر لیا، حالانکہ اسے خوب معلوم تھا کہ غیر مسلم انھیں مطلقاً ووٹ نہ دے گا، اور صرف مسلمانوں کے اکثر ووٹ سے اس کے امیدواروں کا کامیاب ہونا ممکن نہیں، لیکن بہر حال اسے ضد تھی، مسلمانوں کے ہزاروں ہزار ووٹوں کو اس نے بے اثر کردیا۔

ان نادانوں نے مسلمانوں کو تو کوئی فائدہ پہونچایا نہیں، دوسروں کو ضرور متحد ومضبوط کردیا، یہ کہتے تھے کہ ہم اپنی طاقت دکھانا چاہتے ہیں، اللہ جانے کس کو دکھانا چاہتے تھے، اور طاقت تو دکھا نہیں سکے البتہ ملک کی تمامتر نگاہوں کے سامنے یہ منظر آگیا کہ بلند بانگ دعووں سمیت چاروں شانے چت ہیں، اور انھوں نے مسلمانوں کا مزاج اتنا بگاڑ دیا ہے کہ شاید اب کوئی سنجیدہ بات ان کے کان تک بھی نہ جاسکے۔

وہ تو اللہ تعالیٰ نے سیاست کے نقشے میں ایسا تصرف کیا کہ بھاجپا کے امیدوار ملک کے طول وعرض میں بکثرت ہار گئے اور جتنی تعداد کی انھیں پارلیمنٹ میں پہونچنے کی توقع تھی اتنے امیدوار نہ پہونچ سکے، اس لئے وہ پھیکی ہوگئی، ورنہ اعظم گڈھ کے حلقے کی کامیابی کو وہ فتح عظیم بنا کر پیش کرتی۔

واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان جیسے جمہوری ملک میں خواہ جتنی پارٹیاں ہوں، اور خواہ جتنی قومیں اور برادریاں ہوں، اقلیت اکثریت کا مدار یہاں ان ٹکڑیوں پر نہیں ہے بلکہ مذہب پر ہے، اور جہاں مذہب اسلام اپنے ماننے والوں کی بڑی تعداد کے ساتھ موجود ہو، وہاں گو عملاً واسماً بہت سے مذاہب ہوں مگر تقابل دو ہی مذہب کا ہوگا، ایک اسلام اور ایک کفر وشرک، کفر وشرک کی چاہے جتنی متحارب شکلیں ہوں، وہ سب اسلام کے مقابلے میں ایک ہیں، پس یہاں مسلمان عددی اعتبار سے اقلیت میں ہیں اور اہل کفر وشرک اکثریت میں ہیں، اس ماحول میں غیر مسلم اکثریت اپنے مفاد یا مجبوری کے تحت مسلمانوں کا کام کرسکتی ہے مگر اس کو کبھی مسلمانوں کے مفاد سے براہ راست کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی، لہٰذا ان سے کام لینے اور

انھیں اپنے حق میں مفید بنانے کا ایک ہی طریقہ ہے، اور وہ ہے اخلاق وانسانیت! اسلام نے اخلاق واحسان کو بہت اہمیت دی ہے، ہمارا پڑوسی ہمارے اخلاق کا بہترین موقع ہے۔ کسی غیر مسلم کی خوشامد نہیں، اسلامی تعلیم پر عمل کرنے کے جذبے سے، اللہ کی خوشنودی کے لئے اگر اخلاق کا برتاؤ کیا جائے، تو یہ امت مسلمہ کیلئے بڑا زبردست ہتھیار ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کی اس تعلیم کو چھوڑ دیا ہے اور دوسرے راستے سے اپنا غلبہ چاہتے ہیں۔

یہاں اگر مسلمانوں کی کوئی سیاسی پارٹی بنائی جائے اور اسی بنیاد پر دوسروں کو للکارا جائے گا تو ردعمل کے طور پر لازم ہے کہ کفر وشرک میں بھی اجتماعیت پیدا ہوجائے، جب تک مسلمانوں نے علیحدہ سیاسی پارٹی نہیں بنائی تھی تو پارلیمنٹ میں مسلمانوں کی خاصی تعداد دکھائی دیتی تھی، اس الیکشن میں ووٹ مسلم اور غیر مسلم میں تقسیم ہوا، تو پروانچل سے کوئی بھی مسلمان ممبر پارلیمنٹ نہ ہوسکا۔ اس موقع پر ہارنے کے بعد یہ تنظیم آئندہ اسمبلی کے الیکشن پر بھی نظر جمائے ہوئے ہے، یعنی اسمبلی سے بھی مسلمانوں کا صفایا کرائے گی۔ **لا فعل اللہ**

سچائی یہ ہے کہ موجودہ صورت حال میں مسلمانوں کی سیاسی پارٹی ان کے حق میں مضر ہی ہوگی، ہمارے اکابر علماء نے جو جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے ملک وملت کی خدمت کررہے تھے، آزادی کے بعد ایک فیصلہ کیا تھا، اور وہ فیصلہ بہت برحق اور درست تھا، اور جیسے وہ اس وقت برحق تھا آج بھی درست ہے، وہ یہ کہ جمعیۃ علماء ہند آئندہ پارلمنٹری سیاست میں حصہ نہ لے گی، اور نہ سیاسی پارٹی ہوگی۔ ان اکابر کی نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ اگر مسلمانوں کی کوئی سیاسی پارٹی بنی اور وہ الیکشن میں حصہ لیتی رہی تو ہندوستان کی جمہوریت ختم ہوکر رہ جائے گی اور یہ ملک ہندوراشٹر بن جائے گا، کیونکہ پاکستان بن جانے کے بعد دوایک علاقوں کے علاوہ کہیں بھی مسلم اکثریت نہیں ہے، اور جہاں ہے بھی الیکشن میں اسے بندر بانٹ کرکے مسلم اکثریت کو اقلیت میں لوٹا دیا جائے گا، پھر کہیں سے کوئی مسلمان کبھی کامیاب نہ ہوگا، اور پارلیمنٹ ہو یا اسمبلی صرف ہندو ہی ہندو ہوں گے، پھر اسے ہندوراشٹر بننے سے کون روک سکے گا۔

قاعدے کی بات یہ ہے کہ ملک بھر میں پھیلی ہوئی امت مسلمہ نہ کوئی سیاسی پارٹی بنائے اور نہ بھاجپا کو مضبوط کرے، اپنے گرد وپیش اس پارٹی اور اس امیدوار کو دیکھے جو فرقہ واریت کا مقابلہ کر سکے اور اس سلسلے میں اپنے حلقہ کے سنجیدہ اور باوقار ذمہ داروں سے رابطہ رکھے، اور وہ جس کی سفارش کریں اسے ووٹ دے، اور طاقت کی نمائش نہ کرے، اور نہ شور وغل کرے، خاموشی سے اپنی رائے دیدے۔

مسلمان ووٹ تو ایک ہی کو دیں، لیکن اخلاق وانسانیت کا برتاؤ سب کے ساتھ کریں، اصل فتح اخلاق وانسانیت کے ساتھ ہوتی ہے، بداخلاقی، لڑائی جھگڑا، جانبداری وکذب بیانی اور بے جا اعلان بے گناہی سے کسی کی نجات نہیں ہوتی، اور نہ ان سے کوئی غلبہ حاصل ہوتا۔ آدمی اللہ کا حق ادا کرے، پھر اللہ تعالیٰ اس کے لئے راستہ آسان کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا لَا یَضُرُّکُمْ کَیْدُھُمْ شَیْئاً اِنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ (سورہ آل عمران: ۱۲۰) اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو، تو ان کی سازش سے تمہارا کچھ نہ بگڑے گا، بے شک جو کچھ وہ کرتے ہیں سب اللہ کی قدرت میں ہے۔

اللہ کا حکم ہے تم دو کام اختیار کرو، **صبر اور تقویٰ**۔ صبر کا مطلب یہ ہے کہ ناگواریوں کے باوجود اپنے طریقے پر جمے رہنا، نہ گھبرانا، نہ طیش میں آنا، نہ میدان چھوڑ کر بھاگنا، نہ عمل کو ترک کرنا، صبر کا دوسرا نام استقلال ہے۔ دوسری بات تقویٰ ہے، تقویٰ کا مطلب یہ ہے کہ نقصان دہ چیزوں سے بچنا، اور یہ بچنا صرف اللہ کے احکام کی تعمیل وتکمیل اور معاصی سے اجتناب کے ذریعے ہوتا ہے۔ جس قدر اللہ کی فرمانبرداری ہوگی، اسی قدر اللہ کی رحمت آئے گی۔ کاش مسلمان اس پر کسی درجے میں عمل کر لیتے، تو بہت کچھ کام آسان ہو جاتا، اور دشمنوں کا کوئی داؤ فریب کارگر نہ ہوتا، جو کارروائیاں وہ کرتے ہیں سب خدا کے علم میں ہیں، اور ان کو ہر وقت قدرت حاصل ہے کہ ان کا تار پود بکھیر کر رکھ دیں، مسلمان اپنا معاملہ خدا سے صاف رکھیں، پھر ان کے راستے سے سب کانٹے صاف کر دئے جائیں گے۔ وما ذٰلک علی اللہ بعزیز

* * * * *

(جولائی ۲۰۰۹ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عقل مند کون؟

روز وشب کی گردش جاری ہے، سورج طلوع ہوتا ہے پھر غروب ہوتا ہے، لوگوں کی زندگی سے ہر روز ایک دن کم ہو جاتا ہے، ہر پیدا ہونے والا، مسلسل زندگی سے موت کی طرف رواں دواں ہے، وہ نہیں جانتا کہ وہ منزل جس کا نام موت ہے کب آئے گی، لیکن یہ یقین ہے، ایسا یقین جس میں شبہ کا کوئی کانٹا کبھی نہیں چبھتا کہ وہ منزل آئے گی، وہ قریب سے قریب تر ہوتی جارہی ہے۔ روز وشب اور ماہ وسال کی گردش آدمی پر مسلسل اثر انداز ہو رہی ہے، کل کا بچہ آج جوان ہے، آج کا جوان کل کو بوڑھا ہو جائے گا، ایسا بوڑھا کہ شکل نہ پہچانی جائے گی، یہ سلسلہ کل بھی تھا، آج بھی ہے اور کل بھی رہے گا۔ ہر آدمی اس الٹ پھیر میں تہ وبالا ہو رہا ہے، پیدا ہوا تو گمنام بلکہ بے نام تھا، روز وشب کے سفر نے اسے آگے بڑھایا تو نامی گرامی بادشاہ بنا، علم وفضل میں مشہور ہوا، طاقت وقوت میں اس نے شہرت پائی، زمانہ میں اس کا آوازہ گونجا، لیکن ایک دن سورج طلوع ہوا تو وہ خاک کا ڈھیر تھا، شہرت فسانۂ ماضی بن گئی، طاقت قصہ پارینہ بن گئی، تخت شاہی مٹی میں مل گیا، علم وفضل کی صرف یاد باقی رہ گئی۔

یہ گردش کیا ہے؟ یہ سفر کیسا ہے؟ کہ راستہ بھرا پُرا ہے، قافلہ مسافروں سے معمور ہے، مگر ہر روز کچھ مسافر اس قافلہ سے جدا ہو رہے ہیں اور کچھ نئے شامل ہو رہے ہیں، یہ کیا ہے؟ محض ایک سلسلہ ہے کہ لوگ اس میں جڑتے رہیں اور ٹوٹتے رہیں، یا اس میں کوئی حکمت ہے؟ اس کا کوئی کوشگوار یا ناگوار انجام ہے؟ اس میں کوئی خاص عبرت ہے؟ یہ سوال بہر حال پیدا ہوتا ہے، کچھ لوگ اسے اپنے زورِ عقل سے اسے حل کرنا چاہتے ہیں، لیکن جس عقل کا حال یہ ہے کہ اس کے علم کی روشنی نہ ماضی کو اجالا کر سکتی ہے اور نہ مستقبل میں کچھ

دکھا سکتی ہے، وہ غریب اس طویل سلسلۂ سفر کی حکمت کیا بتا سکتی ہے، اس کا حال تو یہ ہے کہ

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے، نہ انتہا معلوم

سنئے! انسان اپنے نا تمام علم اور اپنی نارسا عقل سے اس گتھی کو نہیں سلجھا سکتا، اس کو وہی بتا سکتا ہے جس کا علم اولین و آخرین کو محیط ہو، جس کی قدرت کامل ہو، جس نے زمین وآسمان کو پیدا کیا، جو اِن دونوں کی گردش پر حکمراں ہے، اس سے پوچھئے، وہ کیا فرماتے ہیں:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُوْلِی الْاَلْبَابِ ٥ اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰماً وَّقُعُوْداً وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْض رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلاً سُبْحٰنَکَ فَقِنَاعَذَابَ النَّارِ ٥ رَبَّنَا اِنَّکَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَہٗ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ٥ (سورہ آل عمران: ۱۹۰/۱۹۲)

بلاشبہ آسمان وزمین کی خلقت میں اور رات دن کے ایک کے بعد ایک کے آتے رہنے میں، اربابِ عقل وخرد کے لئے (معرفت حق کی) بڑی نشانیاں ہیں، وہ اربابِ عقل وخرد، جو کسی حال میں اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہوتے، کھڑے ہوں، بیٹھے ہوں، لیٹے ہوں (ہر حال میں اللہ کی یاد ان کے اندر بسی ہوتی ہے) جن کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ وہ آسمان وزمین کی خلقت میں غور وفکر کرتے ہیں (اس ذکر وفکر کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان پر معرفت حقیقت کا دروازہ کھل جاتا ہے وہ پکار اٹھتے ہیں) خدایا! یہ سب کچھ جو آپ نے پیدا کیا ہے، سو بلاشبہ بے کار وعبث نہیں پیدا کیا ہے (ضروری ہے کہ یہ کارخانۂ ہستی جو اس حکمت وخوبی کے ساتھ بنایا گیا ہے، کوئی نہ کوئی غایت ومقصد رکھتا ہو) یقیناً آپ کی ذات (اس سے) پاک ہے (کہ ایک بیکار کام اس سے صادر ہو) خدایا! ہمیں عذابِ آتش سے (جو کہ دوسری زندگی میں پیش آنے والا ہے) بچا لیجئے۔ خدایا! جس (بدبخت) کیلئے ایسا ہو کہ آپ اسے دوزخ میں ڈالیں تو بلاشبہ آپ نے بڑی ہی خواری میں ڈالا اور ظلم کرنیوالوں کیلئے کوئی مددگار نہ ہوگا۔ (ترجمان القرآن)

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ زمین وآسمان کی خلقت اور روز وشب کی

یہ گردش رہنمائی کرتی ہے، اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کی جانب کہ اس دنیا کا ایک آخری انجام ہے، وہ انجام یا تو سرمدی خوشی اور راحت ہے اس کا نام جنت ہے، یا لازوال رنج والم ہے جس کا محل آتش جہنم ہے، غور کرنے والے کی عقل وفہم جب جہنم کی جانب پہونچتی ہے تو وہ اس سے پناہ چاہنے لگتا ہے۔

پس عقلمند آدمی وہ ہے جس کی نگاہ اسی دنیا میں الجھ کر نہ رہ جائے، بلکہ اس کی الجھاؤ سے نکل کر زندگی کے اس آخری انجام تک پہونچے، اور پھر اس کی تیاری میں لگ جائے۔

اس آخری انجام کی تیاری کیا ہے؟ اور وہ کیونکر ہوگی؟ اس کو بھی اللہ جل شانہ نے اسی جگہ حل کر دیا ہے اور اس کے حل کیلئے دعا کا پیرایہ اختیار کیا ہے، تاکہ آدمی کو اپنی عقلمندی کا غرہ نہ ہو بلکہ وہ عبدیت کی تواضع میں جھکا رہے، فرماتے ہیں کہ ان عقل والوں کی صدا یہ ہوتی ہے کہ: **رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیاً یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ آمِنُوْا بِرَبِّکُمْ فَاٰمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ کَفِّرْ عَنَّا سَیِّآتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ٥ رَبَّنَا وَ آتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِکَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ٥** (سورہ آل عمران: ۱۹۳/۱۹۴)

خدایا! ہم نے ایک منادی کرنے والے کی ندا سنی جو ایمان کی طرف بلا رہا تھا، وہ کہہ رہا تھا کہ لوگو! اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ، تو ہم نے اس کی پکار سن لی اور ایمان لائے، پس خدایا! ہمارے گناہ بخش دے، ہماری برائیاں مٹا دے، اور (اپنے فضل وکرم سے) ایسا کر کہ ہماری موت نیک کرداروں کے ساتھ ہو۔ خدایا! ہمیں وہ سب کچھ عطا فرما جس کا تو نے اپنے رسولوں کی زبانی وعدہ فرمایا ہے، اور (اپنے لطف وکرم سے) ایسا کر کہ قیامت کے دن ہمیں ذلت وخواری نہ ہو، بلاشبہ تو وہی ہے کہ تیرا وعدہ کبھی خلاف نہیں ہوسکتا۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا؟ عقل والوں کو کس چیز کی فکر ہے؟ اور اس کے لئے وہ کہاں پہونچے؟ انھیں فکر ہے، تو عذاب جہنم کی، انھیں فکر ہے، اپنے گناہوں اور غلطیوں کی، انھیں فکر ہے، حق تعالیٰ کے عفو ودرگزر کی، انھیں فکر ہے، اللہ والوں کے کے ساتھ موت کی، انھیں اندیشہ ہے، قیامت کی رسوائی سے! اس کے لئے وہ کہاں پہونچے، اللہ کی رسولوں کی خدمت

میں! اوران سے جو کچھ سنا، اس کو دل وجان سے مانا۔ ماننے کے بعد یہ امید رکھی کہ جو کچھ اللہ نے رسولوں کی زبانی اس فکر واہتمام پر وعدہ فرمایا ہے، اس میں ان کا بھی حصہ ہو، اس امید پر ان وعدوں کے اپنے حق میں پورا ہونے کی دعا کرتے ہیں اور اپنے اس یقین وایمان کا اظہار کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا وعدہ خلاف نہیں ہوتا۔

جب یہ فکر پیدا ہوتی ہے، اور اللہ کی یاد اس طرح دل میں بس جاتی ہے، اور رسولوں کی اطاعت اس ایمان وایقان سے کرتے ہیں تب وہ اولوا الالباب (اربابِ عقل وخرد) ہوتے ہیں، پھر دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ انھیں کس طرح نوازتے ہیں۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اِنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰی بَعْضُكُمْ مِنْ بَّعْضٍ فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَ قٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ ثَوَابًا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ○ (سورہ آل عمران: ۱۹۵)

توان کے پروردگار نے ان کی دعائیں قبول کرلیں، (خدا نے فرمایا) بلاشبہ میں کبھی کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کرتا، مرد ہو، خواہ عورت، تم سب ایک دوسرے کی جنس ہو، پس جن لوگوں نے (راہ حق میں) ہجرت کی، اور اپنے گھروں سے نکالے گئے، میری راہ میں ستائے گئے، اور (راہِ حق میں) لڑے اور قتل ہوئے، تو یقینی ہے کہ میں ان کی خطائیں محو کردوں اور انھیں ان باغوں میں پہونچادوں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، اور یہ اللہ کی طرف سے ان کے اعمال کا ثواب ہوگا، اور اللہ ہی کے پاس بہتر ثواب ہے۔

پس تمام عقل کی عقل اور ساری دانائی کی دانائی یہ ہے کہ بندۂ عاقل اللہ کی یاد میں سرشار ہو، مخلوقِ الٰہی میں غور وفکر کرے اور اس راستے سے حکمت الٰہی تک اس کی رسائی ہو، اللہ کے رسول سے وہ عقیدۂ وعمل کی رہنمائی حاصل کرے، اللہ کی بندگی میں مشغول ہو اور اس سے عفو ودرگزر کی دعا کرے، اس کی رضاء وخوشنودی چاہے، پھر اللہ کے وعدۂ قبول کی بشارت حاصل کرے، اور جس جہنم سے پناہ مانگی تھی اس سے برکنار ہوکر ابدی نعمت کے

باغوں میں لازوال زندگی کی خوشی سے بہرہ یاب ہو۔

ایمان والو! عقل کا یہ معیار اللہ نے قائم کیا ہے، جو ساری کائنات کے خالق و مالک ہیں، دنیا و آخرت سب انھیں کے قبضہ اقتدار میں ہیں، پس فکر دنیا کو اپنا محور و مقصود نہ بناؤ۔ ایک ہمت مردانہ درکار ہے، اس کی الجھنوں کو توڑ کر نکل جاؤ، اللہ کی اطاعت کرو اور ان کے وعدہ پر یقین کرو، آخرت بھی درست ہوگی اور دنیا بھی خدمت گزار ہوگی۔ دنیا والوں کی غلطی یہ ہے کہ ’’حیٰوۃ دنیا‘‘ کو اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے اور آخرت کو فراموش کردیا ہے۔ ایمان والو! تم یہ غلطی نہ کرو، نگاہ انحصار آخرت پر ہو، اس کی کامیابی پر ہو، دنیا اس کے ضمن میں ہوگی، تو بابرکت ہوگی، خادم ہوگی، اور اگر اس کو اس کے مقام سے ہٹایا تو وجودِ انسانی کو کھا جائے گی۔ ایمان کا چراغ بجھادے گی، پھر دنیا بھی اندھیری اور آخرت بھی تاریک! أَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنْهَا، رَبَّنَا آتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَفِی الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ

(اگست ۲۰۰۹ء)

* * *

مدارسِ اسلامیہ اور اقتصادیات کی تعلیم: بے جا مشورے

ایک عام تجربہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی سنگین اور مہلک مرض میں مبتلا ہوتا ہے، تو اطباء جو علاج کرتے ہیں وہ تو ہوتا ہی ہے، بیمار پُرسی کے لئے آنے والے بہت سے لوگ مریض اور مریض کے گھر والوں کو بڑی فیاضی سے مشورہ دیتے ہیں، کہ فلاں ڈاکٹر اس مرض کا بہت اچھا علاج کرتے ہیں، فلاں حکیم صاحب کے یہاں بہت سے مریض تندرست ہوئے ہیں، اس مرض میں فلاں طرح کی دوا بہت موثر ہوتی ہے وغیرہ، پھر کمزور طبیعت کا مریض موجودہ علاج سے غیر مطمئن ہو کر نئے نئے تجربے شروع کر دیتا ہے اور مرض کی گرفت شدید ہو جاتی ہے۔ اس صورتحال سے سابقہ اکثر لوگوں کو ہوا ہوگا۔

یہ حال تو انفرادی اور شخصی مریضوں کا ہے، بعض مریض اجتماعی اور قومی پیمانے کے ہوتے ہیں، ان کے ساتھ بھی یہ عمل جاری ہوتا ہے، اگر وہ مریض طاقتور اطباء اور مضبوط چارہ گروں کے انتظام میں ہوتا ہے، تو مشوروں میں قدرے احتیاط برتی جاتی ہے اور اگر اس کے تیمار دار اور چارہ گر کمزور ہوتے ہیں، تو مشوروں کی وہ چاند ماری ہوتی ہے کہ یہ خیال گذرنے لگتا ہے کہ اس مریض کی حیات وصحت منظور ہے یا اس کی بیماری وموت چاہی جا رہی ہے۔

ایک قومی مریض کا قصۂ پُر درد سنئے! یہ مریض ہندوستان کا دینی وعربی مدرسہ ہے! مان لیا گیا ہے کہ یہ بہت بیمار ہے، اس کی صحت میں بہت سے رخنے ہیں، اس کی حیات میں

نقائص بہت ہیں، اس کی افادیت کم سے کمتر ہے پس یہ بیمار ہے، اس کا علاج ضروری ہے، اس کے رخنے بند کرنے چاہئیں، اس کی زندگی نقائص سے پاک ہونی چاہئے، اس کی افادیت کو ترقی دینا چاہئے ۔ مشہور کردیا گیا کہ دینی مدرسہ بیمار ہے، پھر اطباء دوائیں لے لے کر دوڑے، عیادت کرنے والوں نے مشوروں کی جھڑی لگائی، پھر اتنے معائب، اتنے امراض اور اتنے نقائص تشخیص کئے گئے اور ان کے لئے اتنی دوائیں تجویز کی گئیں، ایک سے بڑھ کر ایک قیمتی، اور اتنی گراں بہا کہ مریض ان کی تاب نہ لا سکے!

اور یہ سب اس لئے کہ مدرسہ کے ذمہ دار اور اس کے چارہ گر سماج کے وہ افراد ہیں جنھیں کمزور سمجھا گیا ہے یا کمزور بنا کر رکھا گیا ہے، اور وہ ہیں عالمانِ دین یعنی مولوی ملاّ ۔

کوئی کہہ رہا ہے کہ مدرسوں میں انگریزی تعلیم نہیں ہے! پس اس کا ہونا ضروری ہے، کوئی پکارتا ہے کہ مدرسے سائنس کی تعلیم سے خالی ہیں، اس لئے اسے بھی داخل نصاب ہونا چاہئے، کوئی ہانک لگاتا ہے کہ صنعت وحرفت کے فنون سے مدرسہ محروم ہے، اس سے بھی اسے عزت دینی چاہئے اور اللہ جانے کتنے منہ ہیں؟ اور کتنی باتیں ہیں؟

ہر روز ایک دوا تجویز ہورہی ہے، ہر دن ایک مشورہ نازل ہوتا ہے، ہر رات ایک نئی سرگوشی ہوتی ہے، جب تک یہ آواز باہر سے آتی تھی مدرسہ کو کوئی فکر نہ تھی ۔ باہر والے اندر کا حال کیا جانیں؟ وہ کیا اور ان کے مشورے کیا؟ مدرسہ اپنی ڈگر پر چلتا رہا، اپنی کمی بیشی خود درست کرتا رہا ۔ زخم دکھائی دیا، اس پر مرہم رکھ دیا، کمی دیکھی اس کی تلافی کرلی، بہت مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ کمی دیکھی مگر اپنی کمزوری کی وجہ سے تلافی نہ کرسکا، مگر باہر والے جو صدا لگا رہے تھے، اصلاح وتلافی کی دعوت دے رہے تھے، اس پر بجز معدودے چند کے عام مدرسوں نے کان نہیں دھرا، کیونکہ پکارنے والوں میں خود بہتّر چھید دکھائی دے رہے تھے، وہ آواز چھلنی کی تھی جس میں بہتّر چھید ہیں!

باہر والوں نے محسوس کیا کہ ان کی آواز مدارس کئے کان میں نہیں جارہی ہے، تو انھوں نے اندر والوں کو تاکا، ان میں ایسے افراد تلاش کئے جن کے کان میں یہ اجنبی اور

نامانوس آوازیں داخل ہوسکیں پھر ان کے ذریعے سے وہ باتیں اندر داخل کی جاسکیں، یہ افراد مخلص ہیں، یہ نیک نیتی سے چاہتے ہیں کہ مدارس کے مرض کا علاج ہوجائے، لیکن جذبۂ ہمدردی کی شدت اور یکسوئی میں انھیں غفلت ہوجاتی ہے کہ جو علاج وہ تجویز کررہے ہیں اس سے مدرسہ، کالج تو بن جائے گا، مدرسہ نہ رہے گا۔ ظاہر اس کا شاندار تو ہوجائے گا، مگر اس کا مقصود بے جان ہوجائے گا، اس کی رفتار تیز تو ہوجائے گی مگر راستہ بدل جائے گا، منزل گم ہوجائے گی۔

میرے سامنے ایک رسالہ ہے۔

ہندوستان کے دینی مدارس میں اسلامی مالیات واقتصادیات کی تعلیم

۲۵/۲۶/اپریل ۲۰۰۹ء کو اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز اور اسلامی ریسرچ اینڈ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ (جدّہ) کے باہمی تعاون سے مذکورہ بالا موضوع پر جامعہ ہمدرد دہلی میں ایک ورکشاپ منعقد ہوا تھا، اس ورکشاپ میں اس موضوع پر غور وخوض کیا گیا کہ موجودہ عہد میں ہندوستان کے اسلامی مدارس میں اسلامی مالیات واقتصادیات کی تعلیم کی صورت کیا ہو؟ اور اس راہ میں درپیش دشواریوں کو کس طرح حل کیا جائے؟

اس کتابچہ میں اس ورکشاپ کی مختصر روداد اور اس میں کئے گئے فیصلے شائع ہوئے ہیں، اس قومی ورکشاپ میں ملک، بیرون ملک کے نامور علماء اور دانشوروں نے شرکت کی، ہندوستان کی دینی درسگاہوں کے ذمہ داران اور متعدد معروف ماہرین اقتصادیات شریک رہے۔

ان نامور علماء ودانشوروں نے اس موضوع پر غور وخوض کیا کہ مدارس کے نصاب تعلیم اور ان کے پروگرام میں باصطلاح جدید مالیات واقتصادیات کی تعلیم کا شمول وقت کا ایک اہم تقاضا ہے، اور علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ اقتصادیات کے میدان میں دنیا والوں کی امامت وقیادت کا فریضہ انجام دیں، اور ظاہر ہے کہ اس امامت کی اہلیت مدارس

اسلامیہ کے نصاب تعلیم ہی سے حاصل ہوسکتی ہے۔

اتنے علماء ودانشوروں کی رائے اور فیصلے سے کوئی اختلاف کرے؟ اس کی جرأت کس میں ہے؟ لیکن کیا مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت ملے گی کہ جن مدارس میں آپ اس موضوع کو داخل کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں، ان کے وسائل بہت محدود ہیں، وہ جتنا بوجھ لے کر چل رہے ہیں وہی ان کے لئے بھاری پڑ رہا ہے، پھر ان سے یہ فرمائش کرنا کہ ایک نیا نصاب بنے گا، اس کے لئے ماہر اساتذہ کی ضرورت ہوگی، اس کے لئے جدید اور تازہ تر کتابیں تیار ہوں گی، انھیں مہیا کرنا ہوگا، یہ کہاں تک قرین انصاف ہے۔

پھر یہ بھی سوچئے کہ مدارس کا موضوع قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کی تعلیم ہے، اس کے لئے جن مبادی کی ضرورت ہے انھیں بقدر ضرورت نصاب میں رکھا گیا ہے، فقہ اسلامی کی تعلیم اس قدر ضروری ہے کہ انسانوں کو جن احوال ووقائع میں ابتلاء ہوتا ہے ان کا شرعی حکم دریافت ہو سکے۔ عبادات ہوں، معاملات ہوں، نکاح وطلاق اور معاشرات ہوں، تجارتی معاملات ہوں، کرایہ داری کے مسائل ہوں، شرعی اصولوں کی بنیاد پر ان کا حکم دریافت ہوجائے کہ جائز ہیں، مکروہ ہیں، حرام ہیں، اس قدر تو فقہ تو مدارس کے نصاب میں داخل ہے ہی! اب رہی یہ بات کہ اقتصادیات ومالیات کی تحصیل، ان کی ترقی، اور ان کے فروغ کی کیا کیا شکلیں ہوسکتی ہیں، اقتصادیات کی دوڑ میں آدمی کس طرح آگے بڑھ سکتا ہے، یہ فقہ اسلامی کا موضوع نہیں ہے، یہ تو دنیاداری اور حرصِ مال کا موضوع ہے، آج کل قوموں نے جن چیزوں کو اقتصادیات ومالیات، کامرس، فائنانس، بینک کاری، انشورنس اور دوسری بھاری بھرکم اصطلاحات کے ذریعے انسانی زندگی کی اہم ضرورت بنا رکھا ہے، وہ درحقیقت حرصِ مال اور حب دنیا کی نجاستوں پر جدید الفاظ کا پردہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دنیاداروں کے بارے میں فرمایا ہے: بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّأَبْقٰى (سورہ اعلیٰ: ۱۶/۱۷) بلکہ تمہارے نزدیک دنیوی زندگی کو ترجیح حاصل ہے، حالانکہ آخرت بہتر بھی ہے اور اسی کیلئے بقاء بھی ہے۔ دوسری جگہ ارشاد

فرماتے ہیں: كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْآخِرَةَ (القیامۃ: ۲۰/۲۱) نہیں، بلکہ تم لوگ دنیا سے محبت کرتے ہو، اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔

غور کیجئے، دورِ حاضر میں اقتصادیات کی جو تعلیم ہے، وبجز ترجیح دنیا اور حب عاجلہ کے اور کیا ہے؟ وہ بینکنگ ہو، انشورنس ہو، تجارت کے مختلف خوشنما طریقے ہوں، سب کا حاصل حب عاجلہ، فریب، خودغرضی اور اللہ ورسول سے جنگ کے علاوہ اور کیا ہے؟ ان سب کا محل مدارسِ اسلامیہ کب ہیں جن میں ترجیحِ آخرت اور زہد فی الدنیا کا سبق پڑھایا جاتا ہے۔

اگر کسی کا خیال یہ ہو کہ دورِ حاضر کی اقتصادی اصطلاحات سے طلبہ کو واقف کرایا جائے، تو گزارش ہے کہ جس گاؤں میں ہم کو جانا نہیں اس کا راستہ کیوں پوچھیں، ہمارے سامنے جب کسی مالی معاملہ کی صورت آئے گی، قرآن وسنت کے قواعد کی روشنی میں اس کا حکم بیان کر دیا جائے گا۔

ایک بات اور قابل غور ہے، آج کی دنیا میں جو لوگ تجارت کی منڈیوں اور کاروبار کے دروبست پر قابض ہیں، ان کی عقل وذہانت کا خلاصہ یہ ہے کہ حرصِ مال کو زیادہ سے زیادہ سے ترقی دی جائے، وہ اس کے لئے ہر روز نئے نئے طریقے گھڑتے رہتے ہیں، ان کے سامنے نہ حسابِ آخرت ہے، نہ اللہ ورسول کا فرمان ہے، ان کا ایک نظریہ ہے، وہ یہ کہ مال بڑھتا رہے، اس کے لئے وہ ہر طریقہ اختیار کر سکتے ہیں، خواہ اس سے کسی کا نفع ہو یا نقصان! اس معیشت کی بنیاد خودغرضی پر ہے، وہ جہاں تک ساتھ دیتی ہے، آدمی بے تکلف چلا جاتا ہے، کوئی اقتصادی طریقہ وجود میں آتا ہے تو اسے سرے سے اس کا خیال ہی نہیں ہوتا کہ اسلامی اصول وقواعد کیا ہیں؟ اور ان سے کتنی ہم آہنگی ہے، پھر جب وہ طریقہ رائج الوقت ہو جاتا ہے اور بظاہر اس میں نفع دکھائی دینے لگتا ہے، تو ہماری ذہانت اس پر اسلامی اصولوں کو منطبق کرنے یا قدرے ترمیم کر کے اسے اسلامی سانچے میں فٹ کرنے کی کوشش کرنے لگتی ہے، جبکہ اس کے موجدین اب بھی نگاہِ التفات نہیں کرتے، اسی انطباق وترمیم

کے عمل پر اسلامی معاشیات، اسلامی مالیات اور اسلامی اقتصادیات کا لیبل لگا کر خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے بڑا تیر مار لیا ہے، آخر ہم کب تک دوسروں کے پیچھے دوڑتے پھریں گے؟

مدارس اور علماء کا کام نہ تجارت کا عمل سکھانا ہے، نہ مالیات کی تحصیل کا طریقہ سکھانا ہے، انھیں تو حلال کو حرام سے ممتاز کرنا ہے، خواہ اس سے بظاہر دنیا کا نقصان ہوتا ہو، لیکن اولاً آخرت کو پیش نظر رکھنا ہے، یہ علم، اس علم کے حاملین، اس علم کی درسگاہیں، دوسروں کی نقالی کرنے کے لئے نہیں ہیں ان کا احتساب کرنے کے لئے ہیں۔ اس امت کو اللہ تعالیٰ نے **لتکونوا شھداء علی الناس** (البقرۃ:۱۴۳) قرار دیا ہے کہ دوسروں پر تمہاری گواہی نافذ ہوگی۔

مدرسے جو کر رہے ہیں انھیں کرنے دیجئے، الٹے سیدھے مشورے دے کر انھیں پریشان نہ کیجئے، جتنا کچھ یہ پڑھ پڑھا رہے ہیں، اس میں رسوخ اور ثبات کا مشورہ دیجئے، دنیاوی ترغیبات اور مال وجاہ کی حرصیات میں انھیں نہ پھنسایئے، مال ان کا معبود نہیں ہے، اس کے محور پر مدرسوں کو نہ گھمایئے، نہ مدرسے والوں کو! یہ جتنا اس میں مبتلا ہیں وہی بہت ہے، اسی کا حساب مشکل ہوگا، آگے اور کس کس چیز میں پھنسایئے گا۔

آج کی اقتصادیات کا حاصل ہے، مال جمع کیجئے، اس کی گنتی کرتے رہئے، بخل کیجئے، بخل کی تعلیم دیتے رہئے۔ اس اقتصادیات کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ملاحظہ ہو: **وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۙ ۝ الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ** (الھمزۃ:۲/۱) ویل (جہنم) ہے ہر طعنہ دینے والے، عیب چینی کرنے والے کیلئے، جس نے مال سمیٹا اور اسے گنتا رہا۔ مال جمع کرنا، اسے گنتے رہنا یہ اہل جہنم کی صفت ہے، مومن تو وہ ہے: **فَأَمَّا مَنْ أَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى** (اللیل:۵/۶/۷) پس جس نے عطا و بخشش کی اور ڈرتا رہا، اور بھلی بات کو دل وجان سے سچ مانا، تو ہم اس کو بتدریج آسانی میں پہونچا دیں گے۔

بخل وامساک نہیں، بخشش وعطا، بے تحاشا مال جمع کرنے کی فکر نہیں، خشیت اور

تقویٰ، فقر وغربت کے اندیشے نہیں، وعدۂ الٰہی کی تصدیق، ایک صاحب ایمان کی شان ہے، پھر اس کے لئے سہولتیں ہیں، راحتیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: **وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَیَامُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَمَنْ یَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ** (الحدید: ۲۳/۲۴) اللہ تعالیٰ کسی اترانے والے، ڈینگ ہانکنے والے کو پسند نہیں کرتے، وہ جو کہ خود بھی بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی بخل کا حکم دیتے ہیں، اور جو کوئی منہ موڑتا ہے تو اللہ بے نیاز اور تمام خوبیوں کے ساتھ متصف ہے۔

اگر غور کریں گے تو موجودہ دور کا نظام مالیات اور علم اقتصاد بخل اور بخل کی تاکید پر مبنی ہے، بینکنگ ہو، انشورنس ہو، یا فائنانس کے مختلف رنگ ہوں، سب حرص وبخل کے معلم ہیں، اس سے اللہ تعالیٰ مدارس کو تو بطور خاص اور تمام مسلمانوں کو بطور عام محفوظ رکھیں۔

کاش یہ عمل وہ دنیاوی اداروں، کالجوں، یونیورسٹیوں پر کرتے، یہ ادارے تو بالکل ہی خدا فراموش اور آخرت سے غافل ہیں، ان کا ہر شعبہ قرآن وسنت کی تعلیم سے بے بہرہ ہے، ان میں جو علوم پڑھائے جاتے ہیں، انھیں خدا کی معرفت سے، خدا کے احکام کے علم سے روشناس کراتے، تو جہنم کی طرف بڑھتے قدم پر کچھ تو لرزہ طاری ہوتا، مگر وہاں اس لئے ہمت کام نہیں کرتی اور حوصلہ شکست کھا جاتا ہے کہ ظاہری اعتبار سے ان پر حکومت کی، عوام کی، حرص مال وجاہ کی حکمرانی ہے، اس سے کون لڑائی مول لے، ورنہ جہاں تک اعتراف واقرار کا تعلق ہے، تمام دنیا ان کالجوں اور یونیورسٹیوں کی بیماریوں، ان کے کھوکھلے پن کو تسلیم کرتی ہے، مگر انھیں کون ٹوکے، بے چارے ملا، مولوی کے پاس کوئی دنیاوی طاقت تو ہے نہیں، اس لئے سب اسے ہی مشق ستم بناتے ہیں۔ **فإلی اللہ المشتکیٰ وھو المستعان۔**

(ستمبر ۲۰۰۹ء)

* * *

بسم الله الرحمن الرحيم

مسلمانوں کے نام ایک اہم پیغام

تمام مسلمانوں کی خدمت میں گزارش ہے کہ زمانۂ نبوت سے دوری ہوجانے کی وجہ سے ہدایت کی راہ دھندلی ہوتی جارہی ہے، گمراہی کی یلغار ہر طرف بڑھتی جارہی ہے، کتابوں پر کتابیں چھپ رہی ہیں، تقریر وخطابت کا دروازہ وسیع ہوتا جارہا ہے، ہر شخص مدعی ہے کہ وہ ہدایت کے چراغ روشن کررہا ہے، مگر اندھیرا ہے کہ اس کے سائے لمبے ہی ہوتے جارہے ہیں۔ ہر دو حرف جاننے والا اس پندار میں مبتلا ہے کہ دین ومذہب کی ترجمانی اور اس میں رائے زنی کا اسے حق حاصل ہے، خواہش نفس کو دین الٰہی کا عنوان دینے میں کوئی جھجھک نہیں محسوس کی جاتی، اور عام مسلمانوں کا بھی یہ حال ہے جہاں کسی زبان وقلم کے دھنی نے ادعائی انداز میں کوئی بات زور اور قوت کے ساتھ کہی یا کوئی کتاب کروفر سے لکھی، بس اسی پر پھسل پڑے، اور یہ سوچنے لگے کہ لکھنے یا بولنے والا یقیناً حق پر ہوگا جبھی تو اس کی بات میں اس درجہ قوت اور شوکت پائی جاتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ روز بروز مسلمانوں کے معاشرہ میں اختلاف ونزاع کی شاخیں بڑھتی جارہی ہیں، اور ہر فرد اور ہر گروہ کو یہ اصرار ہے کہ حق اسی کے دائرہ میں محدود ومنحصر ہے، اس سلسلے میں عام اہل اسلام کی خدمت میں نہایت خیر خواہی اور دلسوزی کے ساتھ گزارش ہے کہ ہر لکھنے والے اور بولنے والے کی بات پر دھیان نہ دیں بلکہ چند اصولی باتیں محفوظ رکھ لیں اور خوب جانچ پرکھ کر کسی شخص کی بات پر اعتنا کریں۔

اہل سنت والجماعت:

سب سے پہلے اس بات کا خیال رکھیں کہ دین اسلام کے تمام عقائد واعمال رسول

اللہ ﷺ کے عہد مبارک ہی میں مرتب ومکمل ہو چکے ہیں، اوران پر عمل درآمد بھی ہو چکا ہے، کیا عقیدہ ہونا چاہئے؟ کیا فرض ہے؟ کیا واجب ہے؟ کیا سنت ہے؟ کیا مستحب ومباح ہے؟ اور کیا چیزیں حرام وناجائز ہیں؟ اصولی طور پر یہ تمام اُمور خیر القرون (عہد رسالت وصحابہ) میں طے ہو چکے ہیں اور اہل اسلام کی راہ متعین ہو چکی ہے، اسی راہ پر چلنے کا ہر مسلمان ذمہ دار ہے، اس راہ کو اختیار کرنے والی جماعت اور افراد ''اہلسنت والجماعت'' کہلاتے ہیں۔ اہل سنت کے تمام عقائد واعمال وہی ہیں جو آنخضرت ﷺ اور صحابۂ کرام **رضی اللہ عنہم اجمعین** سے ثابت ہیں، اس راہ سے انحراف کرنا اور باہر نکلنا بالکل درست نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَاتَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَسَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَاتَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيْرًا۔ (سورۃ النساء: ۱۱۵)

اور جو کوئی مخالفت کرے رسول کی جبکہ کھل چکی اس پر سیدھی راہ اور چلے سب مسلمانوں کے رستہ کے خلاف تو ہم حوالہ کر دیں گے اس کو وہی طرف جو اس نے اختیار کی اور ڈالیں گے ہم اس کو جہنم میں اور وہ بہت بری جگہ پہونچا۔

اس آیت کو بنظر غور دیکھئے، رسول کی مخالفت کرنے والا تو خیر جہنم میں جائے گا ہی، اس کے ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں سے الگ راستہ اختیار کرنے والا بھی اسی انجام میں گرفتار ہوگا، اس لئے بہت اہتمام سے اہل سنت والجماعت کے عقائد کو دریافت کر کے انھیں پختگی اور استقامت کے ساتھ تھامے رہنا چاہئے، خالص حق وہی ہے جسے آنخضرت ﷺ نے **ماأنا علیہ وأصحابی** کی بلیغ تعبیر میں واضح فرمایا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ جس طریقہ پر آپ اور آپ کے اصحاب رہے ہیں وہی حق اور پسندیدۂ خداوندی ہے۔

سوادِ اعظم: رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: **إتبعوا السواد الاعظم فانہ من شذ شذ فی النار** (ابن ماجہ) سوادِ اعظم کی راہ چلو، جو اس سے علیٰحدہ ہوا وہ جہنم میں گیا۔

سوادِ اعظم امت کا وہ باعظمت اور جلیل القدر طبقہ ہے جو صحابۂ کرام، ائمہ مجتہدین، محدثین وفقہاء اور اہل حق مشائخ وصوفیہ کی عظیم جماعت پر مشتمل ہے، جس کی اصولِ دین

میں ایک راہ متعین ہے، اور عددی لحاظ سے بھی نیز علم وفضل، زہد وتقویٰ، خشیت وللّٰہیت کے اعتبار سے بھی امت کا کوئی فرقہ اس کا ہم پلہ نہیں۔ اور اسی مجموعہ کو ہم ’’اہل سنت والجماعت‘‘ سے تعبیر کرتے ہیں۔ سوادِ اعظم کی راہ سے الگ نہیں ہونا چاہئے۔

امت کسی غلط مسئلہ پر متفق نہیں ہوسکتی:

رسول اللہ ﷺ نے ایک اور جگہ ارشاد فرمایا ہے کہ:

إن الله لايجمع أمتی أوقال أمة محمدٍ	اللہ تعالیٰ میری امت کو کسی غلط مسئلہ پر متفق
علیٰ ضلالة ويدالله على الجماعة	نہیں کرے گا، اور اللہ تعالیٰ کی مدد جماعت
ومن شذ شذ فی النار۔ (ترمذی)	کے اوپر ہے اور جو اس سے ہٹا وہ جہنم میں گیا۔

آپ کا ارشاد برحق ہے، اور خدا کی جانب سے ہے۔ آج ہم چودہ سو سال کا تاریخی تجربہ رکھتے ہیں کہ کسی دور میں بھی امت کے اجتماعی مزاج نے کسی غلط مسئلے کو کبھی قبول نہیں کیا ہے، جب بھی کسی نے کوئی غلط مسئلہ اٹھایا اہل حق نے ٹوکا بالآخر گمراہی حرفِ غلط بن کر مٹ گئی اور حق کا اجالا پھیل کر رہا۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کا ارشاد:

امام ربّانی حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہٗ ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

> ’’دینداری کا حصول اہل سنت والجماعت کے طریق حق کو اختیار کرنے پر موقوف ہے، اسلام کے تمام فرقوں میں یہی جماعت نجات یافتہ ہے، بزرگواران اہل سنت کی پیروی کے بغیر نجات محال ہے، اور ان کی رائے تسلیم کئے بغیر فلاح ناممکن۔ اس مضمون پر عقلی، نقلی اور کشفی دلائل شاہد ہیں، اگر یہ معلوم ہو کہ کوئی شخص ان اکابر کی راہِ اُستوار سے رائی بھر بھی ہٹا ہوا ہے تو اس کی صحبت کو سمِ قاتل سمجھنا چاہئے اور اس کی ہمنشینی کو زہر افعیٰ۔ (مکتوب: ۲۱۳، دفتر اوّل)

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:

> ”مکلفین کے ذمہ سب سے پہلے ضروری ہے کہ علماء اہل سنت والجماعت کی رائے کے موافق اپنے عقائد کی تصحیح کریں، نجاتِ آخرت کا مدار انھیں حضرات کی رہنمائی وہدایت پر ہے، یہی حضرات اور ان کے متبعین نجات یافتہ ہیں اور یہی بزرگوار نبی ﷺ اور صحابہ کرام کے طریقہ پر ہیں۔ کتاب وسنت سے جو علوم مستنبط و ماخوذ ہیں وہ وہی ہیں جنھیں ان اکابر نے قرآن وسنت سے سمجھا ہے، کیونکہ تمام اہل باطل اور گم کردگان راہ بھی اپنے فاسد عقائد کو بزعم خویش کتاب وسنت ہی سے اخذ کرتے ہیں، لیکن (خوب سمجھ لینا چاہئے کہ) اہل سنت کے بتائے ہوئے مفہوم ومعانی کے ماسوا کچھ معتبر نہیں ہے۔

آگے چل کر حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کا ایک قول نقل کرتے ہیں کہ:

> ”اگر ہمیں تمام احوال ومواجید عطا ہوں لیکن اہل سنت والجماعت کے عقائد سے ہمارا باطن آراستہ نہ ہو تو بجز خرابی کے کچھ حاصل نہیں، اور اگر تمام خرابیاں ہماری جانب منسوب ہوں لیکن اہل سنت کے عقائد کا دامن ہاتھ میں ہو تو کچھ اندیشہ نہیں۔
> (مکتوب: ۱۹۳، دفتر اول)

ان تصریحات سے یہ بات بخوبی واضح ہوگئی کہ عقائد واعمال کی وہی راہ معتبر ہے جو علماء اہلسنت کی متعین کردہ ہے، قرآن وسنت کا وہی مفہوم ومطلب درست ہے جس کی وضاحت علماء اہل سنت نے کی ہے، اگر ان حضرات کے خلاف کوئی شخص قرآن وحدیث کا کوئی اور مفہوم امت کے سامنے پیش کرے یا دین کی ایسی تصویر بنائے جس سے علماء اہلسنت واقف نہ ہوں، اس کو بجز گمراہی کے اور کچھ نہ سمجھنا چاہئے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

آج کل ایک خاص فرقہ کے افراد اپنے لئے اہل سنت کا لقب خصوصی طور پر استعمال کرتے ہیں، ناظرین اس سے غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں، یہ گروہ اہل سنت سے علیحدہ

ایک فرقہ ہے، اس نے بہت سی بدعات کو سنت بلکہ مدارِ ایمان ٹھہرا رکھا ہے، ان کا شمار اہل سنت میں نہیں ہے۔ اہل سنت وہی ہیں جو آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام کے طریقہ پر اعتقاد وعمل کی بنیاد رکھتے ہیں خواہ وہ تنظیمی و جماعتی لحاظ سے اکٹھا کہیں نہ پائے جاتے ہوں۔ طریق اہل سنت پر ایک شخص اگر مشرق میں ہے اور دوسرا مغرب میں، تو دونوں اس جماعت حقہ کے فرد ہیں، خواہ دونوں کی ملاقات عمر بھر نہ ہو۔

گمراہوں کی شناخت:

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر غلط کاروں اور گمراہوں کی اصولی شناخت ذکر کردی جائے، تاکہ مسلمانوں کو ان سے اجتناب کرنا آسان ہوجائے۔ رسول اللہ ﷺ نے جہاں ہر باب میں امت کی رہنمائی فرمائی ہے، وہیں اس عنوان کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔ آپ نے اس قسم کے افراد کی واضح علامات ارشاد فرمادی ہیں جن کی روشنی میں ہر ایک گمراہ کو پہچانا جاسکتا ہے۔ فرماتے ہیں:

إن الشيطان ذئب الانسان كذئب الغنم ياخذ الشاذة والقاصية والناحية، إياكم والشعاب وعليكم بالجماعة والعامة۔ (احمد)

شیطان، انسان کا بھیڑیا ہے، جیسے بکریوں کا بھیڑیا جو ’’شاذہ‘‘ ’’قاصیہ‘‘ اور ’’ناحیہ‘‘ کو اچک لیتا ہے، مختلف گھاٹیوں میں منتشر ہونے سے بچو اور جماعت نیز عامۃ المسلمین کے طریقے کو تھامے رہو۔

’’شاذہ‘‘ وہ بکری ہے جو ریوڑ سے الگ تھلگ رہتی ہے اور اس میں مل جل کر رہنا پسند نہیں کرتی۔ ’’قاصیہ‘‘ وہ ہے جو چرنے کے انہماک میں ریوڑ کا کچھ خیال نہیں رکھتی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے، حتیٰ کہ گلہ سے الگ جا پڑتی ہے۔ اور ’’ناحیہ‘‘ وہ بکری ہے جو غفلت میں کاہل بیٹھی رہ گئی، اور ریوڑ آگے نکل گیا۔ یہ تینوں قسم کی بکریاں بھیڑیئے کا لقمہ بن جاتی ہیں، بکریوں کی حفاظت اسی میں ہے کہ وہ گلہ کے ساتھ لگی لپٹی رہیں۔ گلہ بان سب کی حفاظت کرتا رہے گا، ٹھیک یہی حال عام انسانوں اور مسلمانوں کا ہے، ان کے ذمے ضروری ہے کہ

جس راستے پر امت کا سوادِ اعظم جا رہا ہے اسی راہ پر لگے رہیں، اس سے ذرا اِدھر اُدھر ہوئے کہ شیطان کا لقمہ بن جائیں گے۔

انفرادیت پسندی:

بعض لوگ اپنی امتیازی شان اور انفرادی حیثیت منوانا چاہتے ہیں، انھیں یہ خبط ہوتا ہے کہ سب لوگ جس راہ پر چل رہے ہیں اگر وہ بھی اسی راہ پر بھیڑ میں چلے تو انھیں کون پہچانے گا، ان کی انفرادیت پسندی انھیں عام راستے سے الگ لے جاتی ہے، بہت سے مسائل میں وہ تفرد اختیار کرتے ہیں، امت میں جو رائے کسی نے پیش نہیں کی ہے اس پر اصرار کرتے ہیں، تجدد کے شوق میں اصطلاحات کے مفہوم تبدیل کر ڈالتے ہیں، قرآن وحدیث میں جدید معانی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور جب عام اہل علم سے اس کی تائید نہیں پاتے تو بجائے اس کے کہ اپنی غلطی محسوس کریں انھیں کوتاہ بیں بدفہم اور غبی کہنے لگ جاتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ عام علماء پر سے اعتماد اٹھ جائے۔ یہ لوگ ''شاذ'' کے مثل ہیں، ہمارے زمانہ میں اکثر تیز ذہن افراد جو فتنے لے کر اٹھے اور اہل سنت سے الگ انھوں نے راہ بنائی، ان میں سے بیشتر کے پیچھے یہی انفرادیت پسندی اور شوقِ تجدد کارفرما رہا ہے۔ ہند وپاک میں پائے جانے والے نومولود فرقوں سے جو لوگ آگاہ ہیں ان کے لئے شناخت مشکل نہیں ہے۔

غلو پسندی: بعض لوگوں کو انفرادیت اور تجدد کا شوق نہیں ہوتا، لیکن وہ کسی خاص مسئلہ پر اتنا زور دینے لگ جاتے ہیں اور اس درجہ اصرار کرتے ہیں کہ ان کی اہمیت اصل حیثیت سے آگے بڑھ جاتی ہے۔ دین کے مختلف شعبے اور اجزاء ہیں اور ہر ایک کی حیثیت متعین ہے، اپنی حیثیت سے کسی مسئلہ کو نکالنا درحقیقت پورے دین کا حلیہ بگاڑنا ہے، انسانی جسم میں ہر عضو کی ایک حیثیت اور مقدار متعین ہے، اگر کسی عضو کی مقدار عام مقدار سے بڑھ جائے تو پورا جسم بدصورت ہو کر رہ جاتا ہے، ٹھیک یہی حال دین کے مختلف شعبوں اور اجزاء کا ہے، بعض گروہوں نے تو سیاست وحکومت کو اس درجہ اہمیت دی کہ دین کا ہر شعبہ اس کا خادم محسوس ہونے لگا، بعض لوگ کسی مستحب یا مباح امر پر اس درجہ اصرار کرنے لگتے

ہیں کہ وہ فریضہ کے درجہ میں جا پہونچتا ہے، بعض لوگ طہارت وغیرہ کے مسائل میں اتنا غلو کرتے ہیں کہ واجبات تک متروک ہونے لگتے ہیں، بعض افراد کسی باطل فرقہ کی تردید میں اس درجہ انہماک رکھتے ہیں کہ پس وپیش نظر انداز ہوجاتا ہے، روافض کی تردید میں جو لوگ غلو کی حد تک پہونچ جاتے ہیں ان کا دل سیّدنا حضرت علی اور سیّدنا حضرت حسنین رضی اللہ عنہما کی جانب سے صاف نہیں رہ جاتا، یہ سب لوگ ''قاصیہ'' کے زمرہ میں ہیں۔ یہ افراد اپنی ذہنی رَو میں چند خاص مسائل کو لے کر اتنی دور نکل جاتے ہیں کہ بہت سے دوسرے مسائل پس پشت ہوکر رہ جاتے ہیں، یہ لوگ بھی اغواء شیطانی کے شکار ہوجاتے ہیں۔

غفلت کوشی:

بعض لوگ اپنی کاہلی سستی کی وجہ سے احکام اسلام کی پابندی میں ڈھیلے ہوتے ہیں، اگر یہ مرض دور نہ کیا جائے تو رفتہ رفتہ ان کے ہاتھ سے بیشتر اسلامی تعلیمات کا دامن چھوٹ جاتا ہے، ان لوگوں کو دیکھ کر دوسرے افراد بھی سست اور درماندہ ہوجاتے ہیں، یہ ''ناحیہ'' کی صف میں ہیں، انھیں بھی شیطان اپنا شکار بنالیتا ہے۔

مذکورہ بالا تینوں قسم کے افراد اگر اپنی حد تک محدود رہیں تو خرابی انھیں کے دائرۂ اثر تک رہ جاتی ہے، لیکن مصیبت اس وقت عام ہوتی ہے جب وہ اپنی ان کمزوریوں کو عام مسلمانوں میں پھیلانے کی ٹھان لیتے ہیں، پھر گمراہی پھیلتی چلی جاتی ہے، اور علماء اہل حق کے لئے تدارک مشکل ہوجاتا ہے۔

جامع نصیحت:

اخیر میں رسول اللہ ﷺ نے ایک جامع نصیحت فرمائی کہ عام مسلمانوں کو چھوڑ کر اِدھر اُدھر، اِس گھاٹی اور اُس گھاٹی میں مت جھانکو، ورنہ گمراہی کا بھیڑیا تمہیں دبوچ لے گا، وہی راہ جو متعین ہوچکی، جس پر صحابہ کرام، ائمۂ مجتہدین، فقہاء ومحدثین اور مشائخ وصوفیہ کا قافلہ گذرا ہے، اور جس پر آج بھی صالحین کے قدم چل رہے ہیں اسی راہ پر لگے رہو، اس سے

سرموانحراف نہ کرو، یہی ہدایت ہے۔

متشابہات میں انہماک:

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے دو طرح کے مضامین بیان فرمائے ہیں، بعض مضامین وہ ہیں جن کا واضح اور روشن مطلب بیان کردیا گیا ہے، ان کے مفہوم میں کوئی ابہام نہیں ہے مثلاً ایمان، نماز، روزہ وغیرہ اور جنت ودوزخ، حشر ونشر وغیرہ، انھیں محکم کہتے ہیں، اور بعض مضامین ایسے ہیں جن پر ایمان لانا تو ضروری ہے مگر ان کے مطالب کی تفصیل نہیں بیان کی گئی ہے، مثلاً تقدیر وغیرہ، انھیں متشابہ کہتے ہیں، حکم یہ دیا گیا ہے کہ متشابہات پر ایمان لاؤ، اور ان کی حقیقت واقعی کا علم خدا کے سپرد کردو، ان کی چھان بین اور کھود کرید میں نہ پڑو، جب ان کی تفصیلات اللہ نے اور رسول نے نہیں ارشاد فرمائی تو ان کے علم کا دروازہ بند ہو چکا ہے، البتہ محکمات کا خاص دھیان رکھو، ڈرنے کی چیزوں سے ڈرو، امید کی چیزوں سے امید رکھو، اعمال کا اہتمام کرو، عقائد کو مضبوطی سے تھامو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ مِنْهُ آیٰتٌ مُحْکَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰت فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِی قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَاوِیْلِهٖ وَمَایَعْلَمُ تَاوِیْلَهٗ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ کُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّا اُوْلُوا الْاَلْبَابِ۔

وہی ہے جس نے اتاری تم پر کتاب، اس میں بعض آیتیں محکم ہیں (یعنی ان کے معنی واضح ہیں) وہ اصل ہیں کتاب کی، اور دوسری متشابہ (یعنی جن کے معنی معلوم یا متعین نہیں) سو جن کے دلوں میں کجی ہے، وہ پیچھے پڑ جاتے ہیں متشابہات کے، گمراہی پھیلانے کی غرض سے اور مطلب معلوم کرنے کے لئے، اور ان کا مطلب کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ کے، اور مضبوط علم والے کہتے ہیں کہ ہم اس پر یقین لائے، سب ہمارے رب کی طرف سے اتری ہیں اور سمجھانے سے وہی سمجھتے ہیں جن کو عقل ہے۔ (سورہ آل عمران:)

اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ سلیم الفطرت لوگ تو محکمات کا اہتمام کرتے ہیں کیونکہ

کتاب اللہ کی بنیادی باتیں محکمات ہی ہیں، لیکن جو لوگ محکمات سے آنکھیں بند کر کے متشابہات کے چکر میں پڑ جاتے ہیں اور اپنی خواہش کے مطابق معانی نکال کر لوگوں کو مغالطہ میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں ایسے لوگ قرآن کی خبر کے مطابق گمراہ ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ مجھے اپنی امت پر تین باتوں کا خوف ہے، اوّل یہ کہ مال بہت مل جائے جس کی وجہ سے باہمی حسد میں مبتلا ہو جائیں اور کشت وخون کرنے لگ جائیں۔ دوسری یہ کہ کتاب اللہ سامنے کھل جائے (یعنی ترجمہ کے ذریعہ ہر عامی اور جاہل بھی اس کے سمجھنے کا مدعی ہو جائے) اور اس میں جو باتیں سمجھنے کی نہیں ہیں یعنی متشابہات اُن کے معنی سمجھنے کی کوشش کریں، حالانکہ ان کا مطلب اللہ ہی جانتا ہے۔ تیسرے یہ کہ ان کا علم بڑھ جائے گا تو اسے ضائع کر دیں، اور علم بڑھانے کی جستجو چھوڑ دیں۔ (معارف القرآن بحوالہ ابن کثیر)

آج ہمارے دور میں کتنی جماعتیں اور افراد ایسے ہیں کہ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصولی باتوں سے غافل ہیں، دین کے ظاہری اور باطنی کتنے احکام کو پامال کر رہے ہیں، لیکن جن باتوں کو شریعت نے مجمل اور متشابہ رکھا ہے ان کے خودساختہ معانی کی بنیاد پر تکفیر وتضلیل تک کرتے رہتے ہیں، قادیانی کی گمراہی بیشتر متشابہات کی خودساختہ تاویل پر ہے۔

انکارِ حدیث: بعض لوگ ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو صرف قرآن کے ماننے کے مدعی ہیں اور احادیث کا انکار کرتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ احادیث سب گھڑی ہوئی ہیں، یہ بھی گمراہی کی ایک علامت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ مجھے قرآن عطا ہوا ہے، اور اسی کے بقدر اور بھی علم مرحمت کیا گیا ہے، ایسا نہ ہو کہ کوئی آسودہ شکم آدمی مسہری پر لیٹا ہوا یہ کہے کہ صرف قرآن کو پکڑو، جو اس میں حلال دیکھو اسے حلال سمجھو، اور جس کو اس میں حرام پاؤ بس اسی کو حرام سمجھو۔ سن لو کہ جس چیز کو اللہ کے رسول نے حرام کیا وہ بھی ایسا ہی ہے جیسے اللہ نے حرام قرار دیا۔ (ابوداؤد)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ گمراہی کا ایک دروازہ انکار حدیث بھی ہے، اور

حقیقت یہ ہے کہ صحیح احادیث کے انکار کے بعد قرآن پر ایمان رکھنے کی بات محض مغالطہ ہے، منکر حدیث قرآن مجید نہیں بلکہ قرآن کے خودساختہ مطلب پر جو اپنی خواہش نفس کے تقاضے سے اخذ کرتا ہے، ایمان رکھتا ہے، اور اسی پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے، اس طرح وہ قرآن کی طرف نہیں بلکہ اپنے بیان کئے ہوئے مطلب پر ایمان لانے کی دعوت دے رہا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ کھلی ہوئی گمراہی ہے۔

جہالت کے ساتھ ادعاء علم:

مذکورہ گمراہیوں کے علاوہ ہمارے زمانہ میں گمراہی کی ایک اور نئی مگر قابل شرم قسم بھی پیدا ہوگئی ہے وہ ہے علم نہ رکھنے کے باوجود دعوئ علم۔ قاعدہ ہے اور سارے عالم کا مسلّمہ اصول ہے کہ علم خواہ کتنا ہی معمولی ہو، کسی استاذ کی خدمت میں رہ کر سیکھنا پڑتا ہے، اسی اصول کی بناء پر قدیم زمانے سے مکاتب و مدارس کا رواج ہے، اور آج بھی تمام تر بے اصولی اور بے تکے پن کے باوجود اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا نظام اہتمام کے ساتھ چلایا جارہا ہے۔ دنیاوی علوم میں کسی کو یہ خبط نہیں ہوتا کہ محض مطالعہ کے زور پر ان علوم کے ماہرین پر نقد وتبصرہ شروع کردے، اور اگر کسی نے اپنے مطالعہ کے بل پر کسی علم کو کچھ سمجھ بھی لیا تو ماہرین کے سامنے زبان کھولنے کی ہمت نہیں کرتا۔ یہ دنیا کا اتنا مسلم قاعدہ ہے کہ کوئی احمق سے احمق انسان بھی اس سے اختلاف نہیں رکھتا، ان تعلیم گاہوں پر قوم کا، حکومت کا کتنا بڑا سرمایہ خرچ ہوتا ہے اس کا اندازہ بھی نہیں لگایا جاسکتا، لیکن آج تک کسی نے یہ مشورہ نہیں دیا کہ ان دانش گاہوں کو بند کردو سرمایہ ضائع نہ کرو، ذہین افراد خود مطالعہ کے زور پر ان علوم کو حاصل کرلیں گے۔

لیکن مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا بھی پیدا ہوگیا جس کو دینی علوم میں یہ قاعدہ تسلیم نہیں ہے اس کا خیال ہے کہ اگر کسی نے باقاعدہ کسی تعلیم گاہ میں وقت، عمر اور مال خرچ کرکے علوم کی تحصیل کی ہے، اساتذہ سے پڑھا ہے، یکسو ہوکر اپنے کو محض علم کے حوالے ایک مدت تک کررکھا ہے اسے دین کی سمجھ حاصل نہیں، وہ قرآن وسنت کا مفہوم نہیں سمجھتا لیکن

ایک ایسا شخص جس نے دینی مدارس کا رخ نہیں کیا، علم کے ماحول میں نہیں رہا، اساتذہ سے نہیں پڑھا، محض مطالعہ کیا ہے اسے دین کی صحیح سمجھ حاصل ہے، اور ظلم تو یہاں تک بڑھ گیا ہے کہ ایک شخص قرآن وسنت کی بنیادی زبان سے بھی ناواقف ہے لیکن اس کا دعویٰ ہے کہ میں ان لوگوں سے بہتر دین سمجھتا ہوں جنھوں نے دین ہی کے لئے اپنی عمریں کھپا ڈالی ہیں۔ گمراہوں کی یہ سب سے بدترین قسم ہے جو صرف علم ہی سے تہی مایہ نہیں ہے بلکہ ضروری انسانی عقل وخرد سے بھی یکسر عاری ہے، مسلمانوں کو ایسے ناخلف افراد سے بہت ہوشیار رہنا چاہئے۔

یاد رکھئے! ہمیشہ ایسے علماء پر اعتماد کیجئے جنھوں نے باقاعدہ اساتذہ کی خدمت میں رہ کر دینی علوم کو حاصل کیا ہو، اور ان میں للّٰہیت، خداترسی، ورع وتقویٰ کی صفات موجود ہوں، دینی مدارس میں ایسے علماء کرام اور مفتیان ذی احترام موجود ہیں جن سے علمی رہنمائی حاصل ہوسکتی ہے۔

مرادِ ما نصیحت بود کردیم

(نومبر، دسمبر ۲۰۰۹ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور ان کی تعلیمات

پچھلے شمارے (۱) میں ''عیدمیلادالنبی'' کے رسوم وبدعات کا تذکرہ کیا تھا۔ ربیع الاول کے بعد ربیع الآخر کا مہینہ ہے، اس مہینے کو ستم ظریفوں نے امت کی ایک بزرگ ہستی سے منسوب کر رکھا ہے، اور محض اپنی رائے سے، اللہ ورسول کی ہدایت وتلقین کے بغیر اسے اہمیت دے رکھی ہے۔ دین اسلام کی تعلیمات کی تکمیل زمانۂ رسالت میں ہی ہو چکی ہے، اب اس میں کسی طرح کے اضافے کی گنجائش نہیں، کوئی ایسی چیز یا کوئی ایسا کام جس کی اصل زمانۂ نبوت میں نہ ہو، اسے دین سمجھ کر اور دینی عمل بنا کر دین اسلام میں شامل کرنا درست نہیں ہے، اس طریقۂ عمل کا صاف مطلب یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ایک حکم الٰہی کو چھپا لیا تھا، اس کو آپ کے بعد کسی نے ظاہر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات رسول اللہ ﷺ کی جناب میں کس درجہ سنگین گستاخی ہے، دین کی ہر بات وحی الٰہی پر موقوف ہے، اور وحی الٰہی کا خاتمہ حضرت خاتم النبیین ﷺ پر ہو چکا ہے، آپ کے بعد اگر کوئی شخص دین کی کوئی ایسی بات بتانے یا ظاہر کرنے کا مدعی ہے، تو اول تو وہ حضرت پر کتمانِ شریعت کی تہمت لگاتا ہے، دوسرے وہ در پردہ وحی الٰہی کے اپنے اوپر نزول کا دعویٰ کرتا ہے، یعنی یہ کہ وہ بھی سرکار رسالتمآب ﷺ کی بنوت ورسالت میں شریک ہے، یہ شرک فی النبوۃ ہے! اسی لئے بدعت کا گناہ شرک کے قریب تر ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ علماء ومشائخ ہی سے دین کے باب میں رہنمائی ملتی ہے، ان کی اقتداء وپیروی سے اللہ کا قرب نصیب ہوتا ہے، دینی علوم اور دینی اعمال کے تحفظ وبقاء

---

(۱) دیکھئے صفحہ: ۶۹، بارہ ربیع الاول کے ہنگامے

کے لئے سب سے بڑا ذریعہ انھیں علماء ومشائخ کا وجود مسعود ہوتا ہے۔ کسی بھی مذہب وملت کے علماء اگر ناپید ہوجائیں، تو اس مذہب کا وجود ہی مٹ جاتا ہے، لیکن انسانی طبیعت کی پیچیدگی، اور اس کی کجروی دیکھئے، انھیں علماء اور انھیں مشائخ کا نام لے کر، انھیں سے عقیدت ومحبت کا اظہار کرکے، انھیں کے دامن سے وابستگی کا نعرہ لگا کر بر خود غلط افراد بدعات وخرافات کو ایجاد کرتے ہیں، ان بزرگوں نے شرک سے سختی سے منع کیا ہوتا ہے، مگر ستم ظریفی دیکھئے کہ انھیں بزرگوں کو خدا کا شریک قرار دے دیا جاتا ہے، ان حضرات نے توحید واتباع سنت کی ندا پوری قوت سے لگائی ہوتی ہے، مگر انھیں کا نام لے کر توحید کا مذاق اڑایا جاتا ہے، اور بجائے سنت کے بدعات کو معیار محبت قرار دیا جاتا ہے۔

امت کے متعدد بزرگوں کے حق میں یہ کجروی اختیار کی گئی ہے، بلکہ خود توحید کے سب سے عظیم منادی، حضور سرور عالم ﷺ کی ذاتِ گرامی کو بھی ظالموں نے شرک وبدعت کے لئے تختۂ مشق بنالیا ہے، چنانچہ کتنے لوگ ہیں جو حق تعالیٰ کی صفاتِ خاصہ کو حضور اکرم ﷺ کی طرف منسوب کرکے شرک کے عقائد واعمال میں گرفتار ہیں۔

آپ کے بعد حضراتِ صحابہ میں سیّدنا علی کرم اللہ وجہہ اور نواسۂ رسول سیّدنا حسین رضی اللہ عنہ کا نام لے کر کتنے گمراہی کی دلدل میں پھنس رہے ہیں، اسی طرح اولیاء امت میں متعدد حضرات کو لوگوں نے عبدیت کے مرتبۂ بلند سے ہٹا کر ربوبیت والوہیت کے حدودِ ممنوعہ میں لے جانے کی کوشش کی ہے۔

ان اولیاءِ الٰہی میں سب سے زیادہ جن پر ستم ڈھایا گیا ہے، وہ ہیں سیّدنا شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہٗ! جنھیں ''بڑے پیر صاحب'' اور ''غوث الاعظم'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ربیع الاول کے معاً بعد آنے والا مہینہ ربیع الآخر ان کے نام کے ساتھ موسوم ہے، میں نے اپنے بچپن میں بڑی بوڑھی عورتوں سے بارہا عربی مہینوں کے نام اس طرح سنے ہیں۔ محرم کے بجائے داہا، صفر کے بجائے تیرہ تیزی، ربیع الاول کے بجائے بارہ وفات، ربیع الآخر کے بجائے بڑے پیر صاحب، اس کے بعد دو ماہ جمادی الاولیٰ وجمادی الاخریٰ کے

بجائے مدار اور خج مدّین (یعنی خواجہ معین الدین) ترتیب یاد نہیں، اس طرح اصل ناموں کے بجائے انھیں بزرگوں کے ساتھ منسوب کر دیا گیا تھا۔

ربیع الآخر کو بڑے پیر حضرت سیّدنا شیخ عبدالقادر کے ساتھ منسوب کرتے ہیں، اور اس ماہ کی جو خصوصی رسم ہے وہ گیارہویں شریف ہے، ربیع الآخر کی گیارہ تاریخ کو زردہ پکا کر اس پر بڑے پیر صاحب کی نیاز دی جاتی ہے، اور اس رسم کا بڑا اہتمام ہوتا ہے، خیال ہوتا ہے کہ ۱۱؍ربیع الآخر کو حضرت کا انتقال ہوا ہے، لیکن مشہور مورخ ومحدث علامہ شمس الدین ذہبی نے **تاریخ الاسلام** اور **سیر اعلام النبلاء** میں ان کی تاریخ وفات ۱۰؍ربیع الآخر لکھی ہے۔

لیکن گیارہ کی اہمیت اتنی بڑھی کہ وہ ایک خاص نماز کا جز بن گئی ہے، بعض لوگوں نے عقیدت کے غلو میں ایک نماز ایجاد کر ڈالی ہے، جس کا نام ''صلوٰۃ غوثیہ'' ہے، اس کا طریقہ اس طرح دیکھنے میں آیا ہے کہ دو رکعت قبلہ رو پڑھتے ہیں، پھر بغداد کی طرف جہاں حضرت شیخ کی قبر ہے رخ کر کے اس طرف گیارہ قدم چلتے ہیں، اور پھر نماز کی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو کر اللہ جانے کیا پڑھتے ہیں۔ ایک وظیفہ بھی ان کے نام پر ایجاد کر رکھا ہے، وہ ہے **یاشیخ عبد القادر شیئاً لله**، اے شیخ عبدالقادر اللہ کے واسطے کچھ عطا ہو، یہ وظیفہ خالص شرک ہے، جو ان کے نام پر گڑھا گیا ہے، اور اس کے علاوہ ان کی طرف ایسے ایسے واقعات وحالات منسوب کر رکھے ہیں جن کو نہ عقل روا رکھتی ہے اور نہ شریعت!

یہ بدعات وشرکیات اس ذات کے ساتھ منسوب ہیں جو علم وعمل کا مظہر اور بندگی وتواضع کا خوبصورت پیکر تھا، وہ ایک زبردست عالم اور فقیہ تھے، توحید میں ان کا قدم نہایت راسخ تھا، اتباع سنت ان کا خاص شعار تھا، علامہ ذہبی نے انھیں **الشیخ الامام ، العالم ، الزاھد، العارف ، القدوۃ، شیخ الاسلام، علم الاولیاء** کے القاب سے یاد کیا ہے۔

ان کے مواعظ اور ان کے مقالات پڑھئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ علم وفضل اور دین

ودیانت کے کس مقام بلند پر وہ فائز تھے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کی وحدانیت اور قدرت وجلال اور مخلوق کی کمزوری اور بے بسی ان کے سامنے کتنی واضح ہے، لیکن یہ کس قدر ستم ہے کہ وہی جو مخلوق کی بے بسی اور بے چارگی کو اس شدومد کے ساتھ بیان کرتے ہیں، انھیں کے اختیار وقدرت کو لوگ حق تعالیٰ کی قدرت وطاقت کے مرتبہ تک پہونچا دیتے ہیں، ذرا حضرت شیخ کا یہ کلام ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں:

> ’’کل مخلوقات کو اس طرح سمجھو کہ بادشاہ نے، جس کا ملک بہت بڑا اور حکم سخت اور رعب داب دل کو ہلا دینے والا ہے، ایک شخص کو گرفتار کر کے اس کے گلے میں طوق اور پیروں میں کڑا ڈال کر ایک صنوبر کے درخت میں، ایک دریا کے کنارے جس کی موجیں زبردست، پاٹ بہت بڑا، گہرائی بہت زیادہ، بہاؤ بہت زوروں پر ہے، لٹکا دیا ہے اور خود ایک نفیس اور بلند کرسی پر کہ اس تک پہونچنا مشکل ہے، تشریف فرما ہے اور اس کے پہلو میں تیر و پیکان، نیزۂ وکمان اور ہر طرح کے اسلحوں کا انبار ہے، جن کی مقدار خود بادشاہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور ان میں جو چاہتا ہے اٹھا کر اس لٹکے ہوئے قیدی پر چلاتا ہے، تو کیا دیکھنے والے کیلئے جائز ہوگا کہ وہ بادشاہ کی طرف سے نظر ہٹالے، اور اس سے خوف وامید ترک کردے، اور لٹکے ہوئے قیدی سے امید اور خوف رکھے، کیا جو شخص ایسا کرے عقل کے نزدیک بے عقل، بے وقوف، دیوانہ، چوپایہ اور انسانیت سے گرا ہوا نہیں ہے، خدا کی پناہ، بینائی کے بعد نابینائی، اور وصول کے بعد جدائی اور قرب وترقی کے بعد تنزل، ہدایت کے بعد گمراہی اور ایمان کے بعد کفر سے۔ (فتوح الغیب، مقالہ: ۱۷)

جس مخلوق کو لوگ حق تعالیٰ کی قدرت وتصرف میں شریک ودخیل قرار دیتے ہیں، اس کی حیثیت حضرت شیخ کے اس کلام میں بغور ملاحظہ فرمائیے، اور دیکھئے کہ غیر اللہ کی بے چارگی کا کیا عالم ہے؟ اور اس کو مرکز نگاہ بنانے والا کس پستی میں گرا ہوا ہے۔

اپنے ایک وعظ میں توحید کے مضمون کو اس طرح بیان فرماتے ہیں:

> ’’ساری مخلوق عاجز ہے، نہ کوئی تجھے نفع پہونچا سکتا ہے نہ نقصان، بس صرف اتنا ہے کہ حق تعالیٰ اس کو ان کے ہاتھوں کرا دیتا ہے، اسی کا فعل تیرے اندر اور مخلوق کے اندر تصرف فرماتا ہے، جو کچھ تیرے لئے مفید ہے یا مضر ہے، اس کے متعلق اللہ کا قلم چل چکا ہے، اس کے خلاف نہیں ہوسکتا، جو موحد اور نیکوکار ہیں، وہ باقی مخلوق پر اللہ کی حجت ہیں، بعض ان میں سے ایسے ہیں جو ظاہر اور باطن دونوں اعتبار سے دنیا سے برہنہ ہیں، گو دولت مند ہیں، مگر ان کے اندرون پر دنیا کا کوئی اثر نہیں پاتا۔ یہی قلوب ہیں جو صاف ہیں، جو شخص اس پر قادر ہوا، اس کو مخلوقات کی بادشاہت مل گئی، وہی بہادر پہلوان ہے، جس نے اپنے قلب کو ماسوی اللہ سے پاک بنایا اور قلب کے دروازہ پر توحید کی تلوار اور شریعت کی شمشیر لے کر کھڑا ہوگیا کہ مخلوقات میں سے کسی بھی اس میں داخل نہیں ہونے دیتا، اپنے قلب کو مقلب القلوب سے وابستہ کرتا ہے، شریعت اس کے ظاہر کو تہذیب سکھاتی ہے، اور توحید و معرفت باطن کو مہذب بناتی ہے۔
>
> (فیوض یزدانی ترجمہ الفتح الربانی، مجلس:۱۳)

ایک دوسرے موقع پر خدا کی غیرت، شرکا سے نفرت اور انسان کی محبوب چیزوں کے سلب اور ضائع ہونے کی حکمت اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ’’تم اکثر کہتے ہوگے کہ میں جس سے محبت کرتا ہوں، اس سے میری محبت رہنے نہیں پاتی اور رخنہ پڑ جاتا ہے، یا تو جدائی ہو جاتی ہے، یا وہ مر جاتا ہے، یا رنجش ہو جاتی ہے، اور مال سے اگر محبت کرتا ہوں تو وہ ضائع ہو جاتا ہے اور ہاتھ سے نکل جاتا ہے، تب تم سے کہا جائے گا کہ اے خدا کے محبوب! اے وہ کہ جس پر خدا کی عنایت ہے! اے وہ جو خدا کا منظور نظر ہے، اے وہ جس پر خدا کی غیرت آتی ہے! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ غیور ہے، اس نے تم کو اپنے لئے پیدا کیا اور تم غیر کے ہو رہنا چاہتے ہو، کیا تم نے خدا کا یہ ارشاد نہیں سنا، **یحبهم ویحبونه**، وہ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے، اور وہ اسے۔ اور یہ ارشاد ہے کہ **وما خلقت الانس والجن إلا ليعبدون**، میں

> نے جن وانس کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔
>
> کیا تم نے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ خدا جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے، تو اسے مبتلا کرتا ہے، پھر اگر وہ صبر کرتا ہے تو اسے رکھ چھوڑتا ہے، عرض کیا گیا یا رسول اللہ! رکھ چھوڑنے سے کیا مراد ہے؟ فرمایا اس کے مال اور اولاد کو باقی نہیں رکھتا، اور یہ معاملہ اس لئے ہے کہ جب مال واولاد ہوں گے تو اس کو ان سے بھی محبت رہے گی اور خدا سے اسے جو محبت ہے متفرق اور ناقص ہو جائے گی، اور تقسیم ہو کر حق اور غیر حق کے درمیان مشترک ہو جائے گی، اور خدا شریک کو قبول نہیں کرتا، وہ غیور ہے اور ہر چیز پر غالب وزبردست ہے، تو وہ اپنے شریک کو ہلاک ومعدوم کر دیتا ہے، تا کہ وہ بندہ کے دل کو خالص کر لے خاص اپنے لئے، بغیر شریک کے، اس وقت اس کا یہ ارشاد صادق آجاتا ہے کہ **یحبهم ویحبونه** ، وہ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے، اور وہ اسے، یہاں تک کہ دل جب شریکوں اور برابری کرنے والوں سے، جو اہل وعیال، دولت ولذت اور خواہشیں ہیں، نیز ولایت وریاست، کرامات وحالات، منازل ومقامات، جنتوں اور درجات اور قرب ونزدیکی کی طلب سے پاک وصاف ہو جاتا ہے، تو اس میں کوئی ارادہ باقی نہیں رہتا، اور نہ کوئی آرزو رہتی، اور مثل سوراخ دار برتن کے ہو جاتا ہے، جس میں کوئی چیز نہیں ٹھہرتی، کیونکہ وہ خدا کے فضل سے ٹوٹ چکا ہوتا ہے، جب اس میں کوئی ارادہ پیدا ہوتا ہے خدا کا فعل اور اس کی غیرت اسے توڑ دیتی ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ بندہ کے دل میں دنیا کی کوئی مخلوق مقصودیت اور محبوبیت کا درجہ نہ حاصل کر لے، دل کا مرکز نگاہ محض ذات خداوندی اور رضاء الٰہی رہے، جو لوگ خدا کے قریب ہیں، ان کے دل میں بجز حق تعالیٰ کے کسی اور کی گنجائش نہیں ہوتی، اگر ان کا دل کسی اور میں اٹکتا ہے تو حق تعالیٰ اسے دور کر دیتے ہیں، تا کہ بندے کا دل خالص حق تعالیٰ کے لئے ہو جائے۔

حضرت شیخ کا یہ کلام دیکھئے، اور اس کا زور دیکھئے، کیا انھیں منظور ہوگا کہ لوگ حق

تعالیٰ کو چھوڑ کر انھیں کو معبود و مقصود اور شریک الوہیت و ربوبیت بنالیں، حاشا وکلا

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَاداً لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبَّانِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (سورہ آل عمران: ۷۹)

کسی آدمی کے لئے مناسب نہیں ہے کہ اللہ اسے کتاب اور حکمت عطا فرمائیں، پھر وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم لوگ اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ، لیکن وہ یہ کہتا ہے کہ تم لوگ اللہ والے بن کر رہو، کیونکہ تم کتاب کی تعلیم دیتے رہے ہو اور اسے خود بھی پڑھتے رہے ہو۔

جس بزرگ کے سامنے اللہ کا یہ فرمان ہو، بھلا وہ اپنی جانب اُلوہیت و ربوبیت کے انتساب کو کبھی گوارا کرسکتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ حضرت شیخ سیّدنا عبدالقادر جیلانی نور اللہ مرقدہٗ امت کے بڑے مصلحین اور اصحاب تجدید میں ہیں، حق تعالیٰ کی توفیق سے بے شمار لوگ حضرت کے ہاتھوں پر کفر و شرک اور بدعت و معاصی سے تائب ہوئے ہیں۔

تصوف و سلوک کے چار سلسلے معروف ہیں، ان میں سب سے قدیم طریقہ وہ ہے، جو سیّدنا شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمہ کی تعلیمات پر مبنی ہے اور ان کی طرف منسوب ہو کر ''قادریہ'' کہلاتا ہے، مگر مقامِ حیرت ہے کہ ہمارے ملک میں جو لوگ اپنے آپ کو قادری کہتے اور لکھتے ہیں، وہ سب سے زیادہ ان کی تعلیمات سے دور اور شرک و بدعت کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ پاکستان میں البتہ اس سلسلے کے مشائخ حقہ موجود ہیں، اللہ تعالیٰ حضرت شیخ کی تعلیمات اور ان کے مطابق عقیدۂ و عمل کو عام فرمائیں۔

(مارچ ۲۰۱۰ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ملت کے نوجوانوں سے خطاب

مسلمان نوجوانو! ایک شخص جو نوجوانی اور جوانی کے مرحلوں کو گزار کر بڑھاپے کی حد میں داخل ہو چکا، کاغذ کے ان صفحات پر تم سے کچھ خطاب کرنا چاہتا ہے، اس کا بوڑھا دل بے قرار ہے، کمزور ہڈیاں درد سے بے تاب ہیں، وقت کی گردش نے تجربات کی بھٹی میں خوب پکایا ہے، اس کا جی چاہتا ہے کہ تم سے کچھ باتیں! جن کا تعلق اس کے نفع، نقصان سے نہیں، خود تمہارے نفع اور نقصان سے ہے، اور وہ بات اس کی نہ ہوگی، اس کی کیا حیثیت کہ وہ ملت کے قیمتی سرمایہ میں تصرف کرے، وہ باتیں تمہارے اور ساری کائنات کے خالق و مالک کی ہوں گی، جو ان کے برگزیدہ پیغمبر، جو ہمارے، تمہارے سب سے بڑے مرکز اطاعت ومحبت ہیں بلکہ مرکز ایمان ہیں، اور جن کے تعلق سے بڑھ کر ہمارے پاس کوئی سرمایہ نہیں، ان کے لئے ہر سرمایہ، ہر عزت ومرتبہ، ہر دولت وحکومت قربان! خاندان بھی، خویش واقارب بھی، بلکہ دل وجان بھی! سب ان کی بارگاہ میں نذر! جن کی صداقت وحقانیت میں نہ کسی دوست نے شبہ کیا اور نہ کسی دشمن نے! دنیا ادھر سے ادھر ہو سکتی ہے مگر ان کے قول وعمل کی سچائی پر آنچ نہیں آسکتی، ہر زمانے میں ملت اسلامیہ کو جو سربلندی حاصل ہوئی ہے، انھیں کی نسبت کی برکت سے ہوئی ہے، اور جو انحطاط وزوال آیا، اسی تعلق ونسبت کے ضعف واضمحلال سے آیا ہے، یہ بات بالکل حق ہے، اسی طرح حق ہے، جیسے تمہارا نوجوان ہونا حق ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر!

حق کی باتیں، دنیا بھر کے انھیں سب سے سچے بزرگ نے دنیا کو سنائی، تم اللہ کو بھی مانتے ہو، ان کے سچے رسول کو بھی مانتے ہو، دونوں پر پختہ ایمان رکھتے ہو، تو کیا ایسا نہ ہوگا

کہ ان کی باتیں تمہارے قلب کی گہرائیوں میں اتر کر تمہارے دماغ، تمہارے کردار واعمال کو مسخر کرلیں! بے شک ایسا ہی ہوگا۔

پھر تم سے کہتا ہوں کہ ایک لمحہ ٹھہر کر اپنے دل ودماغ، اپنے فکر وخیال کا جائزہ لو، اپنے مقاصد، اپنی خواہشوں اور اپنے میلانات کو دیکھو، پھر اپنے سب سے بڑے مرکز محبت واطاعت کی باتیں سنو! اور دونوں کا موازنہ کرو کہ ان کے ارشاد اور ان کے احکام سے کوئی مناسبت پاتے ہو، اگر پاتے ہو تو اس عظیم نعمت پر اللہ کا بہت شکر ادا کرو، اور اگر نہ پاؤ تو ذرا فکر کرو اور سنجیدگی سے غور کرو۔ بس اس ایک بات کو اپنے دل میں اچھی طرح جماؤ، اگر معتبر ہے تو انھیں کی بات! اگر قابل یقین ہے تو انھیں کا کلام! اگر مستحق اطاعت ہے تو انھیں کا فرمان! ان سے الگ نہ کسی کی بات معتبر، نہ کسی کا کلام لائق یقین، اور نہ کس کا حکم قابل اطاعت!

اب سنو! انھیں سب سے سچے بزرگ، اللہ کے آخری نمائندے سیّدنا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا ایک فرمان سناتا ہوں، اسے آپ سے براہ راست سننے والے اور ہم سے بیان کرنے والے مشہور برگزیدہ صحابی حضرت ابو ہریرہ ؓ ہیں، امام بخاری علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب میں اسے کم از کم چار جگہ درج کیا ہے، میں اس حدیث کو تمہیں سناتا ہوں:

عن ابی هریره ؓ عن النبی ﷺ قال: سبعة یظلهم الله فی ظله یوم لاظل الا ظله، الامام العادل وشاب نشاء فی عبادة ربه ورجل قلبه معلق بالمساجد ورجلان تحابافی الله اجتمعا علیٰ ذٰلک وتفرقاعلیه ورجل طلبته امرأة ذات منصب وجمال فقال: انی اخاف الله ورجل تصدق اخفی حتی لایعلم شماله ماتنفق یمینه ورجل ذکر الله خالیاً ففاضت عیناه۔ حدیث: ۶۶۰، ۱۴۲۳، ۶۴۷۹، ۶۸۰۱

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سات آدمیوں کو اللہ تعالیٰ اپنے خاص سائے میں پناہ دیں گے، اس روز جبکہ اللہ کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا۔ (۱) انصاف ور حاکم (۲)

وہ جوان جس کی نشو ونما اس کے رب کی عبادت میں ہوئی ہو (۳) وہ آدمی جس کا دل مسجدوں میں اٹکا ہوا ہو (۴) وہ دو آدمی جنھیں آپس میں محض اللہ کے لئے محبت ہو، اسی محبت کے ساتھ دونوں ملیں، اور اسی پر دونوں الگ ہوں (۵) وہ آدمی جسے کوئی خوبصورت اور صاحب منصب عورت نے چاہا، مگر وہ یہ کہہ کر ہٹ جائے کہ مجھے اللہ کا خوف ہے (٦) وہ آدمی جس نے اس پوشیدہ طور پر صدقہ کیا کہ بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو سکی کہ دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا ہے (۷) وہ آدمی جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا، اور اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

ملت اسلامیہ کے نوجوانو! رسول اکرم ﷺ کے فدائیو! دین اسلام کے شیدائیو! ذرا اس فرمان کو غور سے پڑھو، اور دیکھو کہ اس میں تمہارا کتنا حصہ ہے؟

عرشِ الٰہی کے سایہ میں جگہ پانے والوں میں ایک نام تو خاص اس گروہ کا ہے جس سے تمہارا تعلق ہے، یعنی **شاب نشاء فی عبادة ربه**، وہ جوان جس کی نشو ونما ہی اس کے رب کی عبادت وبندگی کی مشغولیت میں ہوئی۔ جوانی دیوانی ہوتی ہے، خواہشوں کا طوفان اس میں اٹھتا رہتا ہے، ہر لذت پر نوجوانی ٹوٹ کر گرتی ہے، پوری دنیا رنگین دکھائی دیتی ہے، رگوں میں گرم گرم خون دوڑتا ہے، تو آدمی کو آوارگی کی راہیں ہر طرف کھلی دکھائی دیتی ہیں، اور کھیل کود کی طرف طبیعت لپکتی ہے، ہر بظاہر خوبصورت چیز پر دل مچلتا ہے، لہو ولعب میں رات آنکھوں میں کٹ جاتی ہے اور پتہ نہیں چلتا، نفس کی ہر لذت پر ایسی دیوانگی ہوتی ہے کہ ماضی ومستقبل سب سے آدمی کٹ کر رہ جاتا ہے، طاقت کا نشہ چھاتا ہے تو ظلم وستم کا ہر کام اپنی ضرورت بن جاتا ہے، دولت ہاتھ آتی ہے تو نہ جانے کتنے لوگوں کے حقوق پامال ہو جاتے ہیں، واقعی نظر بظاہر جوانی دیوانی ہوتی ہے۔

لیکن وہ جوان کتنا مبارک ہے، اللہ کی نگاہ میں کتنا پیارا ہے، رسول اللہ (ﷺ) کی آنکھوں کا کیسا تارا ہے، جس کی جوانی کی قوت کام آتی ہے، تو اس کے پروردگار کی بندگی میں! وہ بھی لذت کا جویا ہے، مگر اپنے مالک کی رضا جوئی میں! اس کے سامنے بھی عمل کی ہر راہ کھلی ہوتی ہے، مگر وہ اس راہ پر دوڑتا ہے جس کی لذتیں اور راحتیں ابدی اور لافانی ہیں، اس کی رگوں

میں بھی گرم خون دوڑتا ہے، اور اس کی راتیں آنکھوں میں کٹ جاتی ہیں، مگر لہو ولعب میں نہیں، بلکہ عبادت وبندگی میں، تضرع وزاری میں، جذبۂ محبت واطاعت میں! اسے جب دولت حاصل ہوتی ہے، تو اس کی نظر غریبوں، کمزوروں اور پریشان حالوں پر پڑتی ہے، وہ روتے ہوؤں کے آنسو پونچھتا ہے، وہ غریبوں کے زخمی دلوں پر مرہم رکھتا ہے، وہ کمزوروں کی مدد کرتا ہے، تو وہ ذات جو تمام دولت وطاقت کا سرچشمہ ہے، اسے اپنی خاص مہربانی سے، ہر غم سے سبکدوش، ہر مصیبت سے آزاد، اور اس کے ہر درد کا مداوا کرتی ہے، اور اس کا آخری نقطۂ عروج یہ ہوتا ہے کہ جس دن تمام کائنات اپنے اپنے نامۂ اعمال میں بدحال ہوگی اور ایسی دھوپ ہوگی جس میں کہیں سایہ نہ ہوگا، صرف ایک سایہ ہوگا ٹھنڈا اور راحت بخش، اور وہ عرش الٰہی کا سایہ ہوگا، اس میں جوانی کا یہ صاحب کردار اعزاز واکرام اور خوشی وآرام کی لذت میں ہر غم سے بے نیاز ہوگا۔

تم دیکھو اور بتاؤ کہ جوانی کو کس راہ پر ڈال رہے ہو، اور اس کی طاقت اور اس کے جوش کو کس کام میں لا رہے ہو، کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہاری یہ طاقت اور تمہارا یہ جوش محض فضول اور جھوٹی لذتوں میں برباد ہو رہا ہے؟ تمہاری راتیں کہیں صرف لہو ولعب میں تاریک سے تاریک تر تو نہیں ہو رہی ہیں؟ تمہاری آنکھیں محض عارضی اور چند دنوں میں ختم ہو جانے والے یا پردوں پر تھرکتے ناچتے بے جان حسن وجمال کے نظارے میں تباہ تو نہیں ہو رہی ہیں؟ ذرا اپنے کانوں کا خیال کرو، ان میں کس طرح کی آوازیں گھس رہی ہیں، کہیں ایسا تو نہیں کہ صرف گانے بجانے کی حرام اور نجس آوازیں کان کو گندہ کر رہی ہیں؟ اپنی زبان پر توجہ دو، اللہ کی عظیم نعمت، جس نے تمہیں جانوروں کی صف سے نکال کر انسانوں کے زمرے میں پہونچایا ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کا استعمال صرف شیطانی الفاظ وکلمات کیلئے ہو رہا ہے، گالیاں، فحش کلامیاں، جھوٹ اور دوسری آفات اور بلاؤں میں تو مبتلا نہیں؟ جوانی یہ سب راستہ دکھاتی ہے، کہیں تمہاری جماعت اس پر تو نہیں دوڑ رہی ہے، یاد رکھو یہ راستہ جہنم کو جاتا ہے، اگر اس پر دوڑو گے تو یہ دوڑ تم کو وہاں پہونچا دے گی جس سے تم کو بچانے کے لئے پیغمبر

علیہ السلام نے اپنی ساری طاقت اور تمامتر صلاحیت صرف کی تھی، کیا ان کی محبت، ان کی دلسوزی، ان کی راتوں کی آہ وزاری کا تم یہی حق ادا کر رہے ہو۔

بچو! بچو! پلٹو! اور اس راہ پر دوڑو، جو اللہ کی رضامندی، مغفرت اور جنت کی طرف جارہی ہے۔

نوجوانانِ ملت! تم نے اپنے سب سے بڑے ہمدرد ومخلص اور انسانیت کے سچے بہی خواہ کی سچی بات جو ہر شبہ سے بالاتر ہے سنی، اور سب سے بڑھ کر بہی خواہی اور ہمدردی سے بھرا ہوا کلام پڑھا۔ کیا یہ کلام تمہارے دلوں پر دستک نہیں دے رہا ہے، انسانیت کے یہ نجات دہندہ بزرگ تمہیں کس مقام ومرتبہ پر دیکھنا چاہتے ہیں، اس پر اچھی طرح غور کرو، وہ تمہیں عرشِ الٰہی کی پناہ میں دیکھنا چاہتے ہیں، اس دن جبکہ ہر پناہ فنا ہوچکی ہوگی، اور وہی ایک پناہ باقی ہوگی، اور جہاں وہ خود بھی تشریف فرما ہوں گے، وہ پناہ تمہیں کیونکر حاصل ہوگی، اس کی تدبیریں بتارہے ہیں، اور تم پڑھ چکے ہو کہ وہ سات تدبیریں ہیں، اب یہ تمہارے حوصلہ کی بات ہے کہ ان تدبیروں میں سے کوئی ایک تم اپنی حوصلہ مند طبیعت میں داخل کرو، یا یہ کوشش کرو کہ وہ ساری تدابیر تمہارے دائرۂ اعمال میں آجائیں تاکہ تمہیں عرش کے ہر چہار جانب سے صدا دی جائے کہ اے خوش نصیب! ادھر آؤ! تمہارا مقام یہ ہے، پس ضروری ہے کہ تمہاری جوانی شہواتِ فاسدہ سے پاک ہو، بدکرداری نے اسے گندہ نہ کیا ہو، تمہارا قلب ودماغ اطاعت الٰہی اور عبادت خداوندی کی فکر میں نکھر رہا ہو، تمہاری اٹھان محبت وعبادت الٰہی میں ہورہی ہو۔

(۱) **الامام العادل** اگر تمہیں کسی قوم کی، کسی ملک کی، کسی خطۂ زمین کی سربراہی مل گئی، تم صاحب اختیار ہو، صاحب اقتدار ہو، تو تمہارا دماغ اس کے نشہ میں سرمست وسرشار نہ ہو، ظلم وطغیان تمہارے دامن اقتدار کو آلودہ نہ کرے، بلکہ ہر ایک کے ساتھ انصاف تمہارا شعار ہو، اور انصاف کیا ہے؟ اپنے نفس اور خواہش کو دبا کر احکام خداوندی کی بغیر کسی جانبداری کے تعمیل! وہ اپنا ہو یا غیر، دولت مند ہو یا فقیر، جہاں جو حکم الٰہی ہو اس کا ٹھیک ٹھیک نفاذ! نہ کوئی

جانبداری! نہ کسی اجنبیت کا کوئی تاثر!

(۲) **شاب نشأ فی عبادة ربه** عبادت الٰہی میں نوجوانی کے حوصلوں کو صرف کرنا، اس کی قدرے تفصیل گزر چکی۔

(۳) **رجل قلبه معلق بالمسجد** مسجد میں دل اٹکا رہے، اس کا مصداق اول نوجوان ہی ہے، معلوم ہے کہ نابالغ پر نماز فرض نہیں، اس دور میں وہ بچہ ہے، پھر جب بلوغ کی عمر کو پہونچا تو اب نوجوان ہے، اب اس پر نماز فرض ہے۔ نوجوانی کی امنگیں اسے اِدھر اُدھر آوارہ رکھنا چاہتی ہیں، کھیل کود کے میدانوں میں، فسق وفجور کی لذت گاہوں میں، معصیت کی خلوتوں میں، گناہ کی جلوتوں میں اسے کھینچتی اور بلاتی ہیں، مگر وہ مرد باحوصلہ سب کو شکست دے کر اپنے قلب کو مسجد کے ساتھ باندھ کر رکھتا ہے۔

نوجوانو! کبھی تم نے غور کیا، آج دنیا نے گناہوں کے جال پھیلا رکھے ہیں جن میں پھنس کر آدمی اپنے دین وایمان اور اپنی صحت وعزت کو داؤ پر لگا دیتا ہے، کھیل کود نے نت نئی دلچسپیاں بڑھا دی ہیں، جن میں منہمک ہو کر آدمی نماز اور مسجد تو کیا اپنا وجود بھی فراموش کر دیتا ہے۔ بارہا دیکھنے میں آیا ہے کہ مسجد قریب ہے، لاؤڈ اسپیکر سے اذان کی آواز پھیل رہی ہے، مگر کھیل کود جاری ہے، کھیل کی کیفیات کو نشر کرنے والا حسب معمول اپنی ہانک پکار میں لگا ہوا ہے، کھیل دیکھنے والے آوازِ اذان سے غافل کھیل کے نظارے میں محو ہیں، پھر نماز بھی ہوتی ہے، نمازی اضطراب میں ہوتے ہیں، اور کھیل کا میدان کھیل کی سرمستی میں سب کچھ بھولا رہتا ہے۔

یہ سنیما ہال ہے، ذرا دیکھو کہ اس کے آس پاس کون سی قوم منڈلا رہی ہے، یہ نوجوان ہی ہیں، اور پھر غور سے دیکھو ان میں مسلمان کتنے ہیں؟ جس مسلمان کا دل مسجد میں اٹکا ہوا ہونا چاہئے، وہ غول در غول کہاں موجود ہے، وقت بھی برباد کرتا ہے اور پھر اپنے ماں باپ کی گاڑھی کمائی دے کر اپنا دین وایمان بھی ضائع کرتا ہے، اپنی صحت وقوت بھی تباہ کرتا ہے، اپنے اخلاق وآداب کو بھی بیچ دیتا ہے۔

کون سا گناہ ہے؟ اور کون سی لغویت ہے؟ جس میں مسلم نوجوانوں کی بڑی تعداد اپنے اخلاق واعمال کو برباد کرنے پر تلی ہوئی نہیں ہے؟ بدنامی کا کون سا سامان ہے جو مسلمان نوجوان نے اکٹھا نہیں کر رکھا ہے؟ جس مسلمان نوجوان کا دل مسجد میں اٹکا ہوا ہونا چاہئے تھا، آج وہ رسوا سر بازار ہو رہا ہے، اور ایسا نہیں ہے کہ وہ بے قصور ہو، اس نے مسجد سے منہ موڑا تو تباہی کے ہراڈے پر پہونچا۔ بے موقع جنگ وجدال، بے تحاشا گالی گلوج، اپنوں کے حق میں سخت گیر، غیروں کے سامنے بھیگی بلی! پولیس اسٹیشن ان کے جرائم سے آباد، کچہریاں ان کے فتنہ وفساد سے معمور، آپس میں سر پھٹول، ایک دوسرے کی ایذا رسانی! بس کیا کہا جائے، ایک مسجد سے منہ موڑا، اور ایک اللہ سے رشتہ توڑا، تو کہاں کہاں س کو سر پھوڑنا پڑا؟ کہاں کہاں بھٹکنا پڑا؟

اے نوجوانو! مسجد کی عظمت پہچانو، اس کے آباد کرنے کی تدبیر کرو، مسجدیں تم سے خالی ہو رہی ہیں، اپنے وجود سے انھیں لبریز کرو، تمہارے دل میں مسجد کا خیال ہمہ وقت بسا ہوا ہو، تب اسے سلامتی حاصل ہوگی، اللہ کے حضور اگر کوئی چیز نافع ہے، تو قلب سلیم ہے، تم نے غلط جگہیں آباد کیں، جو ویرانی کی مستحق تھیں، تم نے مسجد کو ویران کیا، پس تمہارا قلب بھی ویران ہو گیا جسے آباد ہونا تھا۔

اگر آج تمہارے قلب میں مسجد کا اہتمام بس گیا، تو عرش الٰہی کے سایہ کی ٹھنڈی ہوائیں ابھی سے تم کو حاصل ہونے لگیں گی، پھر جو کوئی تمہارے آس پاس ہوگا وہ بھی راحت کی سانس لے گا، کاش تم اس بات کو سمجھتے۔

(۴) **ورجلان تحابا فی اللہ اجتمعا علیٰ ذلک وتفرقا علیہ**: عرش الٰہی کے جاں آفریں سایہ میں جگہ پانے والوں میں وہ لوگ بھی ہیں جو محض اللہ کیلئے باہم محبت کرتے ہیں، اسی بنیاد پر ایک دوسرے سے ملتے ہیں، اور جب جدا ہوتے ہیں تو اسی للہ فی اللہ محبت سے معمور ہوتے ہیں۔

عزیزو! محبت تو ہر کوئی کرتا ہے، انسان کا دل بنا ہی ایسا ہے کہ وہ محبت سے خالی نہیں

ہوسکتا، اسے بھوک پیاس سے پہلے محبت کا جوہر حاصل ہوتا ہے، بچہ ماں کے پیٹ سے جو پہلی چیز لے کر آتا ہے وہ محبت ہے، اسے ماں سے محبت ہوتی ہے، باپ سے محبت ہوتی ہے، خود اپنی ذات سے محبت ہوتی ہے، پھر جوں جوں وقت گزرتا ہے، اس کا جسم نشو ونما پاتا ہے، اس کی محبت کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے، لیکن اس کی محبت کا منشا خود اس کی ذات، اس کی اغراض، اس کے فوائد ومنافع ہوتے ہیں، وہ اپنے گردوپیش میں بہت کچھ پاتا ہے، پھر جس میں اپنا نفع دیکھتا ہے، اس سے محبت کرتا ہے، کچھ اس کے جسم کے تقاضے ہوتے ہیں، کچھ اس کے قلب وروح کے تقاضے ہوتے ہیں، کچھ جسمانی ونفسانی لذات کے تقاضے ہوتے ہیں، جہاں جہاں سے ان تقاضوں کو پورا ہوتے دیکھتا ہے وہاں وہاں محبت ٹوٹی پڑتی ہے، لیکن ان سب تقاضوں سے بالاتر تقاضا اس کے خالق ومالک کی طرف سے ہوتا ہے، کیونکہ اس کی تمام ضروریات بلکہ وجود اور وجود کے تمام لوازم کی بخشش اس ذات عالی کی جانب سے ہے، پس اسے اصلاً اسی کی محبت حاصل ہے، پھر جہاں تک اس کا حکم پہونچتا ہے، محض اسی کے واسطے سے محبت کا سلسلہ بڑھتا جاتا ہے۔

دنیا کی ہر چیز فانی ہے، اس کے تقاضے بھی فانی ہیں، پس اس نسبت کی ہر محبت فنا وزوال کے داغ سے داغدار ہے، اللہ کی ذات باقی ہے، اس کی محبت، اور اس کی نسبت سے ہر محبت باقی رہنے والی ہے، فنا ہوجانے والی چیز سخت باعث تکلیف ہے، کیونکہ محبت میں محبوب کا چھوٹ جانا سخت ناگوار ہوتا ہے، اور فانی کو آخر چھوٹنا ہے، پس اس کی ایذا رسانی یقینی ہے، اللہ باقی ہے، اس کی نسبت باقی ہے، پس یہ محبت دائمی اور ابدی ہے، اس کا لطف اور اس کی لذت بھی دائمی اور ابدی ہے، تو جو محبت اللہ کے لئے کی گئی وہ انسان کو عرش الٰہی کے سایہ میں کھڑا کردیتی ہے۔

پس تم اپنی محبت کا جائزہ لو، کہ جس کسی سے محبت کرتے ہو اس کی بنیاد کیا ہے؟ اگر خداوند تعالیٰ کی محبت کے علاوہ اس کی کوئی اور بنیاد ہے تو اسے پہلی فرصت میں جلا دو، پھونک دو، دل میں صرف وہی محبت رہے جو محض اللہ کے لئے ہے، اس سے دل کو زندگی ملتی ہے،

عزت ملتی ہے، اور ہر وہ چیز ملتی ہے جسے تم چاہتے ہو، یا آئندہ چاہو گے۔

اگر تمہیں سمجھ میں نہ آئے کہ اللہ کے لئے محبت کا کیا مطلب ہے؟ تو ان لوگوں کو تلاش کرو، جو اللہ کے لئے محبت کرنا جانتے ہیں، تمہارے گرد و پیش میں ایسے لوگ مل جائیں گے، گوکہ کم ملیں گے، تلاش اور فکر پیدا کرو، پھر اگر ایسے لوگ دنیا کے کسی گوشے میں ہوں گے تو اللہ تعالیٰ یا تو تمہیں وہاں پہونچا دیں گے، یا انھیں تمہارے پاس بھیج دیں گے۔

لیکن ہاں خبردار! تم اس مستی اور حماقت کو محبت نہ سمجھ لینا، جو فلمی گانوں میں سنتے رہتے ہو، یا جسے فسق و فجور میں ڈوبے ہوئے شعرا گاتے پھرتے ہیں، وہ نفس کی شرارت ہے، بقول مولانا روم ’’فسادِ گندم‘‘ ہے، یعنی کھانے کی بے اعتدالی سے شہوت کی بے اعتدالی ہے، یہ جس کا نام محبت لیا جاتا ہے، محبت نہیں شیطان کا مکر اور نفس کی شرارت ہے، اس سے بچتے رہنا، کتنوں کی جوانیاں اس بلا نے تباہ اور کتنوں کی زندگیاں اس معصیت نے برباد کی ہے۔

دل جو سارے بدن کا پاور ہاؤس ہے، یہ غلط محبت اس کا سب سے بڑا روگ ہے، دل کی شفا محبت الٰہی ہے اور وہ محبت جو اللہ کیلئے ہو، پھر انسان پر عرش الٰہی کے نیچے سے روح پرور ہوائیں چلنے لگتی ہیں، کسی شخص کو اس سے بڑھ کر اور کیا دولت چاہئے کہ عرش اعظم سے اس کا تعلق براہ راست جڑ جائے۔

عزیز نوجوانو! یہ دل کا بڑا گھٹیا استعمال ہے کہ اس میں دنیا کی محبت ہو اور دنیا کے لئے محبت ہو۔ اس گھٹیا استعمال کو بند کرو اور اللہ والوں سے، اللہ کی محبت اور اللہ کیلئے محبت کو سیکھو اور حاصل کرو۔

(۵) **ورجل طلبته امرأة ذات منصب وجمال فقال: انی اخاف اللہ**۔ یہ ایمان کا معراجِ کمال ہے، آدمی کے اندر ایک نہایت طاقتور جذبہ، شہوانی جذبہ ہے، یہ جذبہ دل میں محبت بلکہ عشق بن کر اترتا ہے اور مکمل اپنے قبضہ میں کر لیتا ہے، پھر اس کی عقل ماری جاتی ہے، آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں، ہوش ٹھکانے نہیں رہتے، پھر آدمی ہرنا کردنی کر ڈالتا ہے، ایک جوان یا نوجوان آدمی ہے، طاقت اور صحت سے معمور، اسے

ایک عورت، ایسی عورت جو جاہ ومنصب کا دبدبہ بھی رکھتی ہے، اور بہت حسین وپُرکشش بھی ہے، وہ اسے اپنے بدن کی جانب بلاتی ہے، بتاؤ کہ اس نوجوان کے بچ جانے کا کوئی امکان دکھائی دیتا ہے، وہ نہ بھی بلاتی تو خود اس نوجوان کا جذبہ اس کے پاس لے جاتا، مگر وہ یہ کہہ کر ہٹ جاتا ہے کہ ’’میں اللہ سے ڈرتا ہوں‘‘ اس کا یہ کہہ کر ہٹ جانا **رب العرش العظیم** کے نزدیک اتنا محبوب اور عظیم عمل ہے کہ یہ عمل اسے براہ راست اس عرش عظیم کے سائے میں پہونچا دیتا ہے، جس کے سائے سے بڑھ کر کوئی سایہ نہیں!

عزیزو! اس بات کو خوب یاد رکھو، ہر ایسے موقع اور جگہ سے بچو، جہاں اس قسم کی آزمائش ہوسکتی ہے، ہر امت کا ایک فتنہ ہوتا ہے، اس امت کا فتنہ عورت اور مال ہے۔ مال کا ذکر ابھی نمبر (۶) پر آئے گا، یہ عورت کے فتنہ کا ذکر ہے، عورتوں کو شیطان اپنے جال کے طور پر استعمال کرتا ہے، جس سے وہ نوجوانوں کو اور ان کے ایمان کو شکار کرتا ہے، معلوم ہے کہ مچھلی پر جال پھینکا جاتا ہے، اور پرندوں کے لئے گھات لگایا جاتا ہے، اسی طرح اگر مومن متقی نہ ہو، تو شیطان اسے نوجوان عورتوں کی راہ میں لگا دیتا ہے، وہ اپنے ناز وادا سے انھیں شکار کرتی ہیں، اس وقت نوجوانوں کا ایمان وتقویٰ ڈھال بن جاتا ہے۔

رسول اکرم ﷺ کی اس ترغیب صادق کے بعد کون ہے جو ایمان وتقویٰ کی پناہ میں نہ آجائے۔ نوجوانوں میں جہاں یہ جذبہ شہوانی ہوتا ہے، وہیں ان کے حوصلے بھی بلند اور قوی ہوتے ہیں، اگر اس کا عزم صادق ہو، تو شیطان کی ہر چال ناکام اور بے کار ہو کر رہ جاتی ہے۔

نوجوانو! کیا تم اپنے اندر یہ حوصلۂ عظیم پاتے ہو؟

(۶) **ورجل تصدق اخفی حتی لایعلم شماله ماتنفق یمینه** ۔ آدمی کے دل کو یا تو عورت پکڑتی ہے، اس کا حال تم نے سن لیا، یا مال پکڑتا ہے، اور مال کی گرفت بھی کچھ کم نہیں ہوتی، مال ہی کی طرح شہرت ونیک نامی کی خواہش بھی دل پر پنجہ گاڑتی ہے، آدمی مال کی اور جاہ وشہرت کی خواہش میں کیا کیا نہیں کرڈالتا، مگر عرش کے سائے میں وہ پہونچے گا جو مال کی محبت سے بے نیاز ہے، اور شہرت کی خواہش سے بھی پاک ہے۔ وہ

غریب اپنی کمائی کا مال دیتا ہے، اور اس طرح دیتا ہے کہ اس کے سب سے قریبی فرد کو بھی احساس نہیں ہوتا ہے کہ اس نے کسی کو کچھ دیا ہے، آخر بایاں ہاتھ داہنے ہاتھ کے کتنے قریب ہے، مگر اسے بھی پتہ نہیں ہوتا کہ داہنے ہاتھ نے کیا عمل کیا۔ مال کو اپنے پاس سے ہٹانا یہ دلیل ہے کہ مال کی محبت نے اس کے دل کو نہیں پکڑا ہے، اور اس خاموشی سے دیتا ہے کہ کسی کو خبر تک نہیں ہوتی، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ شہرت و نیک نامی کی محبت سے بھی خالی ہے۔

اس کا یہ جذبہ اور عمل اتنا بڑا ہے کہ وہ سیدھا عرش الٰہی کے سایہ میں جا پہونچتا ہے، اور خدا کا انتہائی قریبی ہو جاتا ہے، **وفی ذٰلک فلیتنافس المتنافسون**، مقابلے میں سبقت کرنے والے آئیں، اور اس میں مسابقہ کریں۔

(۷) **ورجل ذکر اللہ خالیاً ففاضت عیناہ** اوپر جو کچھ بیان کیا گیا، اس کی روح یہ ہے کہ ایک مرد مومن کا دل اللہ کی محبت اور جذبۂ اطاعت سے معمور ہے، دنیا کے ہزار تقاضے ہوں، نفس چاہے جتنا زور لگا رہا ہو، شیطان خواہ کتنی ہی سازشیں کر رہا ہو، دنیا والے چاہے جتنا دباؤ ڈال رہے ہوں، مگر اللہ کے حضور اس کا جذبۂ محبت و فرمانبرداری سب کو شکست دے کر سرخروئی کا سامان فراہم کرتا ہے، وہ دنیا میں بھی سرخ رو ہوتا ہے، اور آخرت میں بھی سب سے عزت اور راحت کے مقام تک پہونچتا ہے، دل کی یہ محبت اتنی طاقتور ہے کہ اس کے سامنے تمام تقاضے ماند اور تمام محبتیں بجھ کر رہ گئیں، اب اس کے سامنے کوئی بھی اس کی نظر کو گرفتار کرنے والا نہیں رہا

وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

اس جذبۂ محبت و اطاعت کے آ جانے کے بعد دل اس میں ڈوب گیا، اب وہ اکیلا بیٹھا ہے، ساری دنیا میں یکسو ہو گیا ہے، اس کے پاس کوئی نہیں، لیکن محبت الٰہی کی شورش اٹھتی ہے اور آنکھوں سے پانی بن کر بہنے لگتی ہے، وہ آنسو بڑا قیمتی ہے، جسے محبت نے دل سے اچھالا، اور آنکھ کی راہ سے بہہ پڑا، لیکن اسے بجز پروردگار کے کسی اور نے نہیں دیکھا، وہ یہ آنسو ہے جس سے جہنم کی آگ ٹھنڈی ہو جاتی ہے، یہ گویا پچھلے تمام کی روح ہے۔

ملت کے نوجوانو! اللہ نے تمہیں طاقت دی ہے، حوصلہ دیا ہے، یہ عطیۂ خداوندی ہے، اسے تم کیوں سفلی کاموں اور گھٹیا چیزوں میں صرف کر رہے ہو، ہمت وحوصلہ کا تقاضا تو یہ ہے کہ تم بلندیوں پر پہونچنے کا عزم کرو، نیچے گرنا کیا مشکل ہے، اوپر چڑھنا کار بلند ہے۔

تم گھٹیا کاموں میں گھس کر اپنی جوانی کی توہین کیوں کرتے ہو، تمہارے عزم وحوصلہ کی تاب تو نفس وشیطان کا کوئی حملہ نہیں لاسکتا، اس کے سامنے تو ہر چٹان چور ہوجائے گی۔

جوانو! یہ صدائیں آرہی ہیں آبشاروں سے
چٹانیں چور ہوجائیں جو ہو عزم سفر پیدا

اللہ کا منادی پکار رہا ہے کہ دنیا کا ہر تقاضا موڑ دو، اور خالص اللہ کے ہو رہو، تمہارا کلام تو یہ ہونا چاہئے کہ **رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیاً یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ آمِنُوْا بِرَبِّکُمْ فَـاٰمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَ کَفِّرْ عَنَّا سَیِّآتِنَاوَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ** ۔ اے ہمارے رب! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا، وہ ایمان کے لئے پکار رہا تھا، کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ، تو ہم ایمان لائے ، اے ہمارے پروردگار! آپ ہمارے گناہوں کی مغفرت فرمادیجئے، اور ہماری برائیوں کو محو فرمادیجئے، اور ہمیں نیکوں کے زمرے میں وفات دیجئے۔

ملت اسلامیہ کے نوجوانو! تم اپنی خواہش نفس کو پیشوا نہ بناؤ، اللہ کو، رسول کو، اللہ کے سچے بندوں کو، مخلص نائبین رسول کو اپنا رہبر بناؤ، خواہ تم عصری درسگاہوں اور کالجوں میں پڑھتے ہو، خواہ دینی مدرسوں میں زیر تعلیم ہو، یا اپنے کاروبار میں مشغول ہو، ہر نظریہ اور ہر خواہش باطل ہے، سوائے اس کے جس کو تائید کلام خدایا کلام رسول سے حاصل ہو۔

اگر مالک ومولیٰ کی خوشنودی چاہئے، دنیا کی زندگی خوشگوار چاہئے، موت اور قبر کا معاملہ آسان چاہئے، حشر میں عرش الٰہی کا سایہ چاہئے، حساب اور میزان کا مرحلہ سہل چاہئے، رسول اکرم ﷺ کے دست مبارک سے جام کوثر چاہئے، یہ سب عظیم نعمتیں چاہئیں، تو دنیا کی زندگی میں اپنی خواہشوں کی قربانی کر کے محبت الٰہی کو دل میں بسانا ہوگا، نوجوانوں کو دعوت عمل ہے، **فهل من مستمع؟ وهل من مجيب؟** (کیا ہے کوئی گوش قبول سے سننے والا، اور کیا ہے کوئی اس پر لبیک کہنے والا؟) ☆☆☆☆☆ (اپریل ومئی وجون ۲۰۱۰ء)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عہدۂ ومنصب کی تفویض!

ایک نازک مرحلہ

دار العلوم دیوبند کے سابق مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب علیہ الرحمہ کے بعد منصب اہتمام کے لئے انتخاب کا جو طریقۂ کار اختیار کیا گیا، وہ دورِ حاضر کے جمہوری الیکشنوں کے طریقۂ کار کے قریب تر تھا، اس کی وجہ سے انتخاب میں جھول پیدا ہوگیا۔ اس سے متاثر ہوکر یہ اداریہ تحریر میں آیا۔

نحمده ونصلی علیٰ رسوله الکریم، اما بعد!

عن ابی هریرة ؓ قال: بینما النبی ﷺ فی مجلس یحدث القوم جاء ه اعرابی فقال: متی الساعة؟ فمضی رسول الله ﷺ یحدث فقال بعض القوم سمع ما قال فکره ما قال وقال بعضهم: بل لم یسمع حتیٰ اذا قضی حدیثه قال: این ... اراه... السائل عن الساعة؟ قال: هاأنا یارسول الله قال: فإذا ضیعت الامانة فانتظر الساعة، قال: کیف اضاعتها؟ قال: إذا وسد الامر الیٰ غیر اهله فانتظر الساعة

(بخاری شریف، کتاب العلم، باب ۲، حدیث: ۵۹)

حضرت ابو ہریرہ ؓ فرماتے ہیں، کہ ایک بار ایسا ہوا کہ نبی کریم ﷺ ایک مجلس میں تشریف فرما تھے، اور لوگوں سے کچھ فرما رہے تھے، اسی دوران دیہات کے ایک صاحب آئے، اور پوچھا کہ قیامت کب آئے گی؟ آپ نے اس پر توجہ نہ فرمائی، اور باتوں کا جو

سلسلہ چل رہا تھا اسی میں مصروف رہے، اس پر بعض لوگوں نے کہا کہ آپ نے اس کا سوال سن تو لیا ہے، مگر آپ کو اس کی بات پسند نہ آئی، بعض نے کہا کہ نہیں آپ نے سنا ہی نہیں، پھر جب بات پوری ہو چکی تو آپ نے فرمایا کہ قیامت کے متعلق جو پوچھ رہا تھا وہ کہاں ہے؟ اس نے کہا حضرت! میں یہ موجود ہوں، آپ نے فرمایا کہ جب امانت ضائع کر دی جائے، تو قیامت کا انتظار کرو، انھوں نے کہا کہ اس کا ضائع کیا جانا کیونکر ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ذمہ داری جب نا اہل کے سپرد کر دی جائے، تو قیامت کا انتظار کرو۔

اس حدیث میں رسول اکرم ﷺ نے کی قربِ قیامت کی ایک اہم علامت ارشاد فرمائی ہے، یہ بات معلوم ہے کہ قیامت اس وقت آئے گی جب دنیا میں برائیاں عام ہو جائیں گی، نیکیاں سمٹ کر معدوم ہو جائیں گی، ہر خیر اور نیکی قیامت کو روکنے والی ہے، اور ہر شر اور معصیت اسے قریب کرنے والی ہے، تو وہ بڑی برائیاں جو قیامت کو دعوت دینے والی ہیں، قربِ قیامت کی علامتیں ہیں، پوچھنے والے نے پوچھا کہ قیامت کب آئے گی؟ آپ نے کچھ توقف کے بعد جواب دیا کہ جب امانت ضائع کر دی جائے، تو بس سمجھو کہ قیامت قریب ہے، اب اس کا انتظار کرو، پوچھنے والے کو معلوم نہ تھا کہ امانت کا ضائع کرنا کیونکر ہے؟ آپ نے بتایا کہ کاموں کی ذمہ داری جب نا اہلوں کے سپرد کر دی جائے تو بس اس کا انتظار کرو۔

مشہور محدث اور عالم علامہ عبدالرؤف مناوی نے إذا وسد الامر کی تشریح میں فرمایا کہ:

> ”جب دینی ذمہ داریاں اور مناصب، مثلاً عہدۂ خلافت اور اس کے متعلق امور، یعنی امارت منصب قضاء، منصب افتاء اور منصب تدریس وغیرہ، ایسے لوگوں کے حوالے کر دئے جائیں جن میں اہلیت نہیں ہے، مطلب یہ ہے کہ جو لوگ شرافت اور سیادت کے مستحق نہیں ہیں انھیں سرداری اور امارت دیدی جائے، تو سمجھو کہ قیامت قریب ہے۔
>
> کیونکہ اس سے شریعت کے اوامر ونواہی مختل ہو کر رہ جائیں گے، دین کمزور

> ہو جائے گا، اسلام میں اضمحلال آ جائے گا، جہل کا غلبہ ہوگا، علم فنا ہو جائے گا، اہل حق، حق کو قائم کرنے سے بے بس ہو جائیں گے۔ (فیض القدیر، ج ! ص: ۴۵۱)

اس حدیث کو بہت اہتمام اور غور وفکر کے ساتھ پڑھنا چاہئے، اور رسول اللہ ﷺ کے فرمان اور آپ کی منشا کی تعمیل کیلئے آپ کی امت کو پوری سعی کرنی چاہئے۔

ہم جس ملک اور جن حالات میں رہتے ہیں، ان میں ذہن ودماغ پر طرزِ جمہوریت کا تسلط ہے، جمہوریت کا حاصل یہ ہے کہ مدار کار رایوں کی گنتی پر ہے، عقل ودرایت کے وزن پر نہیں، جس کو جو منصب حاصل کرنا ہوتا ہے، وہ اپنے حق میں زیادہ سے زیادہ رائے اور دوسرے رائج الوقت لفظ میں ''ووٹ'' جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے، ووٹ جمع کرنے کے لئے جو تدبیریں استعمال کی جاتی ہیں، ان سے ناظرین ناواقف نہیں۔ ''زور'' ''زر'' اور ''زاری'' سب طاقتیں بروئے کار لائی جاتی ہیں، یعنی رائے خریدی بھی جاتی ہے، اس کی بڑی سے بڑی قیمت لگتی ہے، خریدنے والا اپنی مالی حیثیت کے مطابق خریدتا، یا حاصل ہونے والے نفع کو سامنے رکھ کر اس کی قیمت لگاتا ہے، اس کے ساتھ اپنی اور اپنے جتھے کی طاقت بھی استعمال کرتا ہے، دھمکیاں، ڈراوا اور اللہ جانے کیا کیا ''ہتھ کنڈے'' عمل میں لائے جاتے ہیں، پھر جہاں ضرورت ہوتی ہے، عاجزی ونیاز مندی، خوشامد وغیرہ کے ہتھیار آزمائے جاتے ہیں، اس صورت حال میں کیا یہ امید کی جاسکتی ہے کہ ذمہ دارانہ عہدوں پر اہل اور مستحق افراد آسکیں گے؟ جو اہل ہوگا وہ تو اپنا دامن دور رکھنے کی کوشش کرے گا، اور نا اہل عناصر اچھل اچھل کر خود کو مسلط کرنا چاہیں گے، چنانچہ ہم اپنے جمہوری ملک میں ہر تھوڑے وقفہ پر ووٹ کے ہنگاموں کا تماشہ دیکھتے ہیں، پارلیمنٹ کی سطح سے لے کر چھوٹے چھوٹے دیہاتوں تک رایوں اور ووٹوں کی کشمکش اور دولت وطاقت اور عاجزی ونیاز مندی کے چھوٹے بڑے مناظر ہر طرف نظر آتے رہتے ہیں، پھر جب الیکشن اور انتخابات کا طوفان تھمتا ہے تو ہر جگہ نا اہلوں کی بھیڑ دکھائی دیتی ہے، ووٹ دینے والے عام لوگ حیران ہوتے ہیں کہ اندازوں کے برخلاف نتائج کیونکر آ گئے؟

دین بیزار حلقوں میں یہ منظر کچھ قابل تعجب نہیں ہے، کیونکہ ان کے پاس کوئی خدائی ہدایت نامہ نہیں ہے، ان کی اپنی سوچ ہے، اپنی عقل ہے، اپنا تجربہ ہے، اور یہ سب ناتمام ہے، ان میں الجھاؤ ہو، تضاد ہو، انتشار ہو، ٹکراؤ ہو۔ سب عین قیاس ہے، لیکن اس سے اس ملت کا متاثر ہوجانا، اور اس ناتمام طریقہ کو اختیار کرلینا سخت قابل حیرت اور باعث تاسف ہے، جس کے پاس ایک مکمل خدائی ہدایت نامہ موجود ہے، اور ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ گم اور مضمحل ہوچکا ہو، بلکہ اپنی پوری تابانی کے ساتھ تروتازہ ہے، لیکن اسے چھوڑ کر جمہوریت کا ناقص اور ناتمام طریقہ آزمایا جاتا ہے، اس طریقے سے کیا امید کی جاسکتی ہے کہ عہدوں اور مناصب پر اہل افراد آسکیں گے؟

جس ملت کو یہ احساس ہے کہ کل اسے حق تعالیٰ کے حضور اپنے تمام اعمال، اپنی ہر ایک نیت، اپنے ہر ایک ارادے کے ساتھ حاضر ہونا ہے، اور وہاں ہر بات کا حساب دینا ہوگا، وہ ملت اپنے طریقہ کو چھوڑ کر غیروں کا طرز عمل دہرانے لگ جائے، تو اس کا کیا حشر ہوگا؟ اللہ کی نظر سے گرے گی، دنیا میں جگ ہنسائی ہوگی، آپس میں انتشار ہوگا، آخرت میں شرمندگی ہوگی۔

مدارس کے علماء ومدرسین اور ارباب انتظام کے لئے یہ بڑا لمحۂ فکریہ ہے، کیونکہ دین کے ترجمان یہی لوگ ہیں، رسول اللہ ﷺ کی وراثت انھیں کے پاس ہے، قرآن وسنت کی روشنی ان کے سینے میں ہے، راستہ ان کے سامنے واضح اور صاف کھلا ہوا ہے، ان کا ہر قدم قرآن وسنت کے راستے میں احتیاط سے اٹھنا چاہئے، تاکہ حق تعالیٰ کی رحمتیں ان کا استقبال کریں۔ نہ یہ کہ اسے چھوڑ کر، اس سے منہ موڑ کر ان لوگوں کی راہ اختیار کریں، جو ہر قدم پر منہ کے بل گرتے ہیں، ان کی کل کائنات تو یہی دنیا ہے، آگے کیا ہوگا؟ اس سے وہ بے خبر ہیں، اور اسی بے خبری میں جس کا جدھر منہ اٹھتا ہے، جدھر سبز باغ دکھائی دیتا ہے، جدھر مال وجاہ کی فراوانی نظر آتی ہے، ادھر ہی بگٹٹ دوڑ پڑتا ہے، چاہے نظام عالم درہم برہم ہوجائے۔

لیکن مسلمان! ملت اسلامیہ کا ممبر! علم نبوت کی وراثت رکھنے والا! وہ تو بے خبر نہیں ہے، اس کی پوری کائنات یہی دنیا نہیں ہے، بلکہ یہ ایک مختصر سا دار العمل ہے، اس کے سامنے تو آخرت کی وسیع وعریض کائنات ہے؟ وہ اسے کیوں نظر انداز کر دیتا ہے، اور دینی وملی امانتوں کے حق میں وہ طریقہ کیوں اختیار کرتا ہے جس کا براحشر سب کے سامنے ہے۔

دار العلوم دیوبند ہمارے دینی وعربی مدارس کا نقطۂ آغاز ہے، اس میں شوریٰ اور مشورہ کو ہمیشہ اہمیت دی گئی ہے، شورائیت کے نظام پر اس کی بنیاد ہے، لیکن رائے شماری اور ووٹوں کی کثرت کا اس میں کبھی اعتبار نہیں کیا گیا ہے۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کے دور سرپرستی میں ایک نازک موقع ایسا آگیا کہ ایک صاحب کو ان کے عہدے پر اگر برقرار نہ رکھا گیا تو سخت فساد کا اندیشہ ہے، ان سے

> ’’ اربابِ مشورہ نے عرض کیا، کہ ان کے موقوف ہونے سے کوتہ اندیشوں کو دراندازی کا موقع ملے گا؛‘‘

مولانا نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا:

> ’’ گو تمام عالم مخالف ہو جائے، جب تک مدرسہ کا تعلق ہم لوگوں سے ہے، اس کے ہم ذمہ دار ہیں کہ کسی بے جا کارروائی کو ہم چھپا نہیں سکتے،‘‘

ارباب شوریٰ نے عرض کیا، ان کو موقوف کرنے پر جو نزاع برپا ہوگی، اس سے مدرسہ کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے، بلکہ عجب نہیں مدرسہ کو ٹوٹنے کا خطرہ ہو، مولانا نے فرمایا، اور حضرت کا یہ ارشاد آبِ زر سے لکھنے بلکہ لوحِ دل پر نقش کرنے کا مستحق ہے، فرمایا:

> ’’ مدرسہ خدا کی رضامندی کے واسطے کیا گیا ہے، اور جو کچھ ہم کر رہے ہیں اسی کے واسطے ہے، اگر اسی کے ہم گناہ گار ہو کر اس کو انجام دیں تو کون سے ثواب کی بات ہے، جب تک اس کی رضامندی کے موافق کام ہو سکے، اس وقت تک کریں گے، ورنہ چھوڑ دیں گے،‘‘

پھر اسی کے مطابق فیصلہ ہوا۔ کثرت رائے کا ذکر ہی درمیان میں نہیں آیا، اور وہ صاحب مدرسے کے عہدے سے برطرف کردئے گئے۔ یہ تفصیل مولانا عبدالحی صاحب

علیہ الرحمہ سابق ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے اپنے ''دلی اور اس کے اطراف'' کے سفر نامہ میں درج کی ہے، جو پہلے ''ارمغان احباب'' کے نام سے، اور پھر ''دلی اور اس کے اطراف'' کے نام سے طبع ہوا۔ اس میں پوری تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مدارس دینیہ کے انتظام و بقاء کا شرعی ضابطہ یہی ہے، اس کو دنیاوی جمہوریت کے طرز پر لے جانا، اس کو فاسد کرنا ہے، مدارس کے اربابِ شوریٰ کو ہمیشہ یہ بات پیش نظر رکھنی چاہئے۔

اللھم الھمنا مراشد امورنا واعذنا من شرور انفسنا

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دارالعلوم دیوبند کا منصبِ اہتمام

دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب کے انتقال کے بعد ایک مرتبہ ایسا محسوس ہوا، جیسے مسلمانوں کی یہ متاعِ عزیز اور ملت کا یہ سرمایۂ علم و دین آفات کی آندھیوں کی زد میں آ گیا ہے، ہواؤں کا رخ اس انداز پر چلنے لگ گیا تھا، کہ اہل قلوب کو یہ اندیشہ ہو چلا تھا کہ خدانخواستہ اس خرمن علم و دین کو دشمنوں کی آتشیں نگاہِ بد تو نہیں لگ گئی؟ کشمکش کی ایک لہر ملت اسلامیہ میں چلنے لگی تھی، اور اخبارات اسے مزید خوفناک اور بھیانک بناتے جا رہے تھے، جو لوگ اس کشمکش کی زہرناکی اور اس کے نتائج کو محسوس کر رہے تھے وہ دم بخود تھے، وہ حیران تھے کہ کچھ بولیں یا خاموشی اختیار کریں؟ کچھ بولیں تو اسے میڈیا کس شکل میں پھیلائے؟ خود دارالعلوم دیوبند کے اربابِ بست و کشاد کس مشکل اور پیچیدگی میں پڑیں؟ اور اگر خاموشی اختیار کریں تو فتنہ کس کس رنگ میں ظاہر ہو اور بزرگوں کی

اس امانت کا کیا حشر ہو؟

بس ایک ہی چارہ نظر آیا کہ اسی قادر مطلق اور حکیم وعلیم کے دربار میں التجا کی جائے کہ اس نے اپنے اس بزرگ اور مقدس دین کی حفاظت کا خود ہی ذمہ لیا ہے، تو اس کی حفاظت اور ترویج واشاعت کے اس اہم ذریعہ اور دین اور علم دین کے اس عظیم ادارہ کے تحفظ وبقاء کے لئے اسی بارگاہِ عالی سے کوئی فیصلہ صادر ہو۔

بظاہر نظر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے یہ دعائیں اور یہ آہ وزاریاں سن لیں اور انھیں قبولیت سے نوازا۔ آندھی اتر گئی، طوفان تھم گیا۔ بڑی خوش اُسلوبی سے دارالعلوم دیوبند کے اہتمام کے لئے ایک ایسی شخصیت کا انتخاب ہوگیا جس کے بارے میں عموماً حسن ظن ہے، کہ یہ انتخاب ایک اچھا انتخاب ہے۔ دارالعلوم دیوبند کی تعلیمی اور علمی ودینی روح کی حامل ایک اہم شخصیت کو یہ منصب سپرد کیا گیا، جس کے بارے میں یہ بجا امید ہے کہ حق تعالیٰ اس سے اس سرمایۂ ملت کی نگہبانی کی خدمت لیں گے۔

دارالعلوم دیوبند صرف ایک تعلیمی ادارہ نہیں، جہاں تعلیم دی جائے اور بس! بلکہ یہ دین وملت کا قلب ہے جہاں سے ملت اسلامیہ کو زندگی کا تازہ اور گرم خونِ حیات حاصل ہوتا ہے، یہاں ملت کے جیالوں کی پرورش ہوتی ہے، یہاں دین ومذہب کے وفاداروں کی تربیت ہوتی ہے، گمرہی کا جب کوئی طوفان اٹھتا ہے تو یہیں سے اس کا رخ موڑنے والے اور اسے دبانے والے اٹھتے ہیں، یہ صرف درس وتدریس کا مرکز نہیں بلکہ صحیح علم اور صحیح عمل کا ایک زندہ اور متحرک ادارہ ہے، اس کا ایک خاص مقصد ہے، اس مقصد کے حصول کا ایک خاص منضبط ومنظم لائحۂ عمل ہے، دورِ حاضر کے دنیوی تعلیمی اداروں کے جو مقاصد اور ان کے جو طریقہائے عمل ہیں، ان سے جداگانہ اوصاف وخصائص پر مشتمل یہ ادارہ ہے، اگر اس ادارہ کو دنیوی تعلیم گاہوں پر قیاس کیا گیا اور ان کی دوڑ میں اسے شامل کیا گیا تو یہ اس ادارہ کی ترقی اور زندگی نہیں، بلکہ اس کا زوال وسقوط اور اس کی موت ہے۔

اس مرکز علم ودانش کی سربراہی کے لئے ایسا شخص ہرگز موزوں نہیں ہوسکتا جو آج

کل کی اصطلاح میں تقاضائے زمانہ سے باخبر ہو اور اس کے مطابق چلنا جانتا ہو، وہ ہوا کا رخ پہچانتا ہو، اور اسی رخ پر قافلہ کو ڈال دینے کی صلاحیت رکھتا ہو، اس کے پاس حطامِ دنیا کا انبوہ ہو اور اسے عصر حاضر کے نو بنو مطالبوں کے پورا کرنے میں لٹاتا ہو، ایسے افراد کے ہاتھ میں اگر ملت کا یہ سرمایۂ بیش قیمت چلا گیا تو یہ دین کا نہیں حصولِ دنیا کا مرکز بن کر رہے گا، دارالعلوم دیوبند کو دنیاوی صنعتوں اور ٹیکنکوں کا مرکز نہیں بننا ہے، یہ دنیا کے طوفان عالم آشوب میں دین و مذہب کا سفینۂ نجات ہے، اگر اسے بھی دنیاوی بہاؤ میں ڈال دیا جائے تو وہ طوفان کا ایک حصہ بن جائے گا۔

اس کے لئے ایسا سربراہ اور منتظم چاہئے جو صرف دنیا کے تقاضوں سے ہی باخبر نہ ہو، بلکہ ان کے ان برے اثرات سے بھی واقف ہو، جو دین اور علم دین کے تقاضوں سے متصادم ہیں، پھر ان سے بچنے اور بچانے کے طریقوں کو بھی جانتا ہو، اور انھیں بروئے کار لانے کا حوصلہ بھی رکھتا ہو، اور اسی کے ساتھ علم و فضل، تقویٰ وطہارت اور نسبت مع اللہ کی دولت سے مالا مال ہو۔

زمانہ خواہ جس طرف جا رہا ہو اور چاہے جس رفتار سے جا رہا ہو، دارالعلوم کا رخ اس کی طرف نہیں ہو سکتا، اس کا اپنا ایک سمت سفر ہے، اس کو اسی پر قائم رہنا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے بانیٔ محترم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی علیہ الرحمہ نے اس کے انتظام وانصرام کے چند اصول آغازِ کار ہی میں رقم فرما دئے تھے، وہ اصول آج بھی وہی اہمیت رکھتے ہیں جو اہمیت ان کی روز اول تھی، اس خاکسار نے ان اصولوں کی قدرے تشریح وافادیت اپنے ایک مضمون میں کی ہے، جو میرے مجموعۂ مضامین ”مدارس اسلامیہ مشورے اور گزارشیں“ کے دوسرے ایڈیشن میں شامل ہے۔

اس اہمیت کے پیش نظر یہ بات ضروری ہے کہ دارالعلوم کا سربراہ وہی ہونا چاہئے جو ان اصولوں پر مضبوطی سے قائم ہو اور اسے اس باب میں خاصی بصیرت حاصل ہو۔ پھر ایک صدی سے زائد عرصہ دارالعلوم پر گزر چکا ہے، اس کے مہتمم اور ذمہ داروں کی ایک روشن

تاریخ رہی ہے، تاریخ کا یہ تسلسل آج بھی باقی رہنا چاہئے، ورنہ تسلسل کا انقطاع اس ادارہ کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دے گا۔

مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب علیہ الرحمہ کے انتقال کے بعد جو ایک بھونچال کی سی کیفیت پیدا ہوئی تھی، اور دورِ حاضر کی فتنہ پرور میڈیا نے اس بھونچال کو مزید آگے بڑھانے کا عمل شروع کر دیا تھا، اندیشہ ہو چلا تھا کہ کہیں اس پناگاہ دین و مذہب میں دراڑیں نہ پڑ جائیں، شکر ہے حق تعالیٰ کی مدد شامل ہوئی، اب حالات میں درستگی آچلی ہے اور ٹھہراؤ پیدا ہو گیا ہے۔ دارالعلوم کے اہتمام کے لئے جیسی بزرگ شخصیت درکار تھی حق تعالیٰ کی مہربانی سے امید ہے کہ حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی مدظلہ کے ذریعے وہ ضرورت باحسن وجوہ پوری ہوگی، مفتی صاحب طالب علمی کے دور میں دارالعلوم کے ممتاز ترین طالب تھے، اساتذہ کی نگاہ میں بااعتماد تھے، فراغت کے بعد مسلسل علمی و دینی اور اصلاحی مساعی میں سرگرم رہے، درس و تدریس کا سلسلہ بغیر انقطاع کے قائم رہا، ایک عرصہ سے دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ اور مجلس تعلیمی کے معتمد رکن ہیں۔ ان کا انتخاب ہم لوگوں، دارالعلوم کے بہی خواہوں کے خیال میں ''حسنِ انتخاب'' ہے۔

حق تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا ہے کہ حسن توفیق اور نصرتِ الٰہی ہر قدم پر رفیق و رہبر رہے، اور بزرگوں کی یہ امانت اسی طرح حق خدمت ادا کرتی رہے جو اس کا سرمایۂ امتیاز ہے۔

ایں دعا از من از جملہ جہاں آمین باد

(مارچ، اپریل ۲۰۱۱ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نمازوں کا اہتمام اور باہمی اتحاد کی اہمیت

مسلمانوں کی ایک تاریخ ہے، جسے ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں، جس کے آثار و علائم یادگاروں اور تاریخی عمارتوں میں کبھی کبھی دیکھتے ہیں، لیکن ہماری نسل جس نے بیسویں صدی کے نصف کے بعد آنکھیں کھولی ہیں، اس نے وہ دور نہیں دیکھا ہے، نہ اس دور کے احوال دیکھے ہیں، جب مسلمان غالب نہ تھے تو مغلوب بھی نہ تھے۔ مغل حکومت، مسلمانوں کے دور کا ایک تاریخی زمانہ ہے، اس وقت غیر مسلموں کی اکثریت کے باوجود ہندوستان ایک اسلامی ملک تھا، دارالاسلام تھا، اسلام کا غلبہ تھا، مسلمانوں کا دبدبہ تھا۔ علم، عمل، سیاست ہر اعتبار سے ہندوستانی معاشرہ مسلمانوں کا دست نگر تھا۔ پھر حالات نے پلٹا کھایا، ایک بدیسی قوم سمندر پار، دور سے یہاں تاجر بن کر آئی، قسمت نے یاوری کی، مسلمانوں کا ستارہ گردش میں آیا، اس نے مسلمانوں کو دبالیا، حکومت کے مراکز پر اس کا قبضہ ہوتا چلا گیا۔ تقریباً دوسو سال کے عرصہ تک اس تاجر قوم نے اس ملک کو اپنی تجارت اور سوداگری کا میدان بنائے رکھا، اس دور میں ملت مسلمہ گوکہ شکست خوردہ ہو چکی تھی، مگر پھر بھی ملک کی دوسری غیر مسلم اقوام کے مقابلے میں سر بلند تھی، ملک کے بہت سے حصوں میں اس کی اکثریت تھی، اور جہاں عددی اعتبار سے اکثریت میں نہ تھی وہاں بھی قوت و شوکت کے لحاظ سے، اور علم و اقتصاد کے لحاظ سے غالب نہ سہی مساوی ضرور تھی، مگر جب انگریز یہاں سے رخصت ہونے پر مجبور ہوا، تو اس کی عیارانہ عقل و ذہانت نے ایک نیا گل کھلایا، کہ ہندوستان کی دو بڑی اکثریت کو باہم ٹکرادیا، اور دونوں کو یہ سبق پڑھایا کہ تم دونوں یعنی ہندو اور مسلمان باہم مل کر نہیں رہ سکتے، ہر ایک دوسرے کا دشمن ہوگا، لہٰذا تم دونوں کو ملک کے الگ الگ خطے دئے

جاتے ہیں، ایک خطے پر مسلمان حکومت کریں اور ایک خطے پر ہندو!

یہ ایک سازش تھی جس کو مسلمانوں میں سے بھی بہت سے لوگوں نے سمجھا، اور ہندوؤں میں سے بھی بہت سے افراد نے سمجھا، اور دونوں طرف سے اس کی مخالفت ہوئی، لیکن انگریزوں نے اس موضوع پر دونوں قوموں کو اس طرح ٹکرایا اور اتنی جذباتیت اور سطحیت پیدا کر دی اور اس قدر سر پھٹول کرایا، کہ سنجیدہ اور سمجھدار افراد بھی یہ سوچنے لگے کہ شاید باہم ساتھ نباہ نہ ہو۔ بالآخر ایک خونیں ہنگامہ اور طوفانی جھٹکے کے ساتھ ملک کے تین ٹکڑے کر کے انگریز نے یہاں سے اپنی بساطِ سیاست لپیٹ لی، اب پورب بھی خاک وخون کی ہولی کھیلی جارہی ہے، اور پچھّم بھی آگ کے شعلے اٹھ رہے ہیں۔

اس سے ایک مدت کے بعد قدرے سکون ہوا، تو ملک کے تینوں ٹکڑے باہم دست وگریباں رہنے لگے، چین اور اطمینان کسی طرف نہیں۔

اس تقسیم شدہ ملک کا وہ حصہ، جو بھارت اور ہندوستان کہلایا، یہ رقبہ اور آبادی کے لحاظ سے بڑا ہے، لیکن مسلمان اس میں قومی لحاظ سے پچھلی صف میں چلا گیا۔ تقسیم کے ہنگاموں کے بعد ملت اسلامیہ یہاں واقعی اور محسوس طور پر اقلیت میں آگئی، تعداد کے لحاظ سے، تجارت اور اقتصادیات کے لحاظ سے، اور آخری حد یہ ہے کہ احساس وفکر کے لحاظ سے بھی! یہ ملت پیچھے سے پیچھے چلی گئی۔

ہندوستان میں بسنے والی ملت سلامیہ کا کوئی فرد گھر کے باہر نکلتا ہے، سفر کرتا ہے، سرکاری دفاتر میں جاتا ہے، بازار میں داخل ہوتا ہے، علاج کے مراکز اور ہسپتالوں میں جاتا ہے، اسکولوں اور کالجوں میں قدم رکھتا ہے، تو ہر جگہ اپنی ملت والوں کو تقریباً صفر کے درجے میں پاتا ہے، ہر جگہ دوسری اقوام کا غلبہ اور عمل دخل نظر آتا ہے، اس وقت طبیعت پر ایک ہراس اور شکست ویاس کی کیفیت چھانے لگتی ہے۔

اس صورت حال میں کبھی ملک سے باہر کسی اسلامی ملک میں جانے کا اتفاق ہوتا ہے، اور ہر طرف مسلمان ہی مسلمان دکھائی دیتے ہیں، تو قلب کا حال بدل جاتا ہے،

بالخصوص کبھی سفر حج یا سفر عمرہ کی توفیق ہوتی ہے اور حرمین شریفین میں حاضری نصیب ہو جاتی ہے تو ہر بندہ خدائے وحدہ کا پرستار اور نبی کریم ﷺ کی عقیدت میں سرشار نظر آتا ہے، تو خوشی ومسرت کی ہوائیں دل کی وسعتوں میں چلنے لگتی ہیں، وہاں کوئی دوسرا نہیں ہوتا، سب ایک مرکز ایمان پر جمے ہوئے اور ایک ہی مرکز عقیدت سے بندھے ہوئے!

ہمارے ملک میں خال خال بعض خطے ایسے نظر آجاتے ہیں، جہاں عددی اعتبار سے مسلمانوں کی بڑی اکثریت مل جاتی ہے، ایسے خطے یہاں کم اور بہت کم ہیں، مگر تقسیم کرنے والوں کا شاید بس نہیں چلا کچھ خطوں میں مسلمانوں کی اکثریت باقی رہ گئی، لیکن تقسیم کرنیوالوں نے انھیں بے اثر بنا کر رکھ دیا ہے۔

مارچ کے مہینے میں ایک ایسے ہی علاقے میں اس بندۂ حقیر کے جانے کا اتفاق ہوا تھا، ایسی جگہ طبعی اور فطری طور سے بڑی مسرت ہوتی ہے، جہاں ہر طرف مسلمان ہی مسلمان نظر آتے ہیں۔

صوبہ بہار میں کچھ عرصہ پہلے ایک بڑا ضلع پورنیہ تھا، یہ پورا علاقہ مسلمانوں کی اکثریت کا تھا، لیکن تقسیم کی حکمت عملی نے اسے چار پانچ حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، اس ایک ضلع سے غالباً پانچ ضلعے بنا دئے گئے ہیں۔ ۱، پورنیہ۔ ۲، ارریہ۔ ۳، کشن گنج۔ ۴، کٹیہار۔ ۵، مدھے پورہ۔ اور اس کا کچھ حصہ بنگال کے دیناج پور میں ڈال دیا گیا ہے۔ ان اضلاع کے طلبہ بکثرت یوپی کے مدارس اسلامیہ میں تعلیم حاصل کرنے آتے ہیں، کبھی کبھی کسی تقریب سے ان علاقوں میں جانا ہوتا ہے، سڑک سے گزرتے ہوئے مسجدیں، مدرسے، مکاتب، مسلمانوں کی شکلیں بکثرت نظر آتی رہتی ہیں، یہ اور بات ہے کہ پسماندگی، غربت، کمزوری اور مفلوک الحالی کے مناظر بھی نگاہ سے گزرتے رہتے ہیں، لیکن یہی خوشی کیا کم ہے، کہ سب کلمہ گو ہیں، نبی کریم ﷺ کے عقیدت کیش اور انھیں کے امتی ہیں۔

اب سے پانچ چھ سال پہلے ایک مرتبہ ضلع ارریہ سے گزر ہو رہا تھا، عصر کا وقت ہو گیا، میں نے رفقاء سفر سے کہا کہ سڑک کے کنارے دیکھتے جاؤ کوئی مسجد یا مدرسہ ملے تو نماز

پڑھ لی جائے ، مسلمانوں کی اکثریت کا علاقہ ، ادھر بڑی آسانی ہے ، ہر تھوڑے فاصلے پر کوئی مسجد یا دینی مکتب و مدرسہ نظر آ جاتا ہے ، چنانچہ تھوڑی ہی دور چل کر ایک مسجد نظر آئی ، ساتھ میں ایک دینی مکتب کی بھی عمارت تھی ۔ گاڑی روکی گئی ، اتر کر عصر کی نماز دا کی گئی ، اور تھوڑی دیر وہیں ٹھہر کر مغرب بھی پڑھی گئی ، اتنی دیر میں گاؤں کے کچھ مسلمان آ گئے ، انھوں نے اسلامی مزاج کے موافق چائے وغیرہ سے ضیافت کی ۔

دورانِ گفتگو ایک صاحب نے کہا کہ اس چھوٹی سی جگہ میں یہ مدرسہ چل رہا ہے ، اس کی تعمیر و ترقی کے لئے آپ دعا کر دیں ۔ ہمارے رفقاء نے اس کے لئے دعا کی اور وہاں سے روانہ ہو گئے ، وہ دعا غالباً ان صاحب کو لگ گئی ، جنھوں نے درخواست کی تھی ، رفقائے سفر میں اعظم گڈھ کے جناب حاجی عرفان احمد اعظمی بھی تھے ، جو دہلی میں کاروبار کرتے ہیں ، ان کا وہاں اعظمی ہاسٹل ہے ، انھیں مساجد اور مدارس سے بہت دلچسپی ہے ، انھوں نے اس جگہ پر خصوصی توجہ کی ، مدرسہ کے منتظم جناب محمد صدیق صاحب نے مجھ سے بھی برابر رابطہ برقرار رکھا ۔ یہ مدرسہ کی تعمیری اور تعلیمی ترقیات کی خبر فون سے برابر دیتے ، پھر دو سال پہلے ایک جلسہ کر ڈالا ، مجھے بھی حاضری کی دعوت دی ، مجھے جلسوں سے نہ مناسبت ہے ، نہ ان کی رغبت ، لیکن ان کی محبت میں گیا ۔ میں نے وہاں عرض کیا تھا کہ اس علاقہ میں آ کر اور مسلمانوں کی اکثریت کو دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے ، مگر آپس کے اختلافات ، لڑائی جھگڑوں کو دیکھ کر بہت رنج ہوتا ہے ، آپس کی لڑائیوں سے طاقت ختم ہو جاتی ہے ، حق تعالیٰ کی ناراضگی آتی ہے ، بڑی تعداد سے جو قوت و شوکت حاصل ہو سکتی ہے اس کی ہوا نکل جاتی ہے ، اس موضوع پر تفصیل سے کلام کیا ۔ مگر ہوا وہی جس کا اندیشہ تھا ، جلسے کے کچھ دنوں کے بعد وہ مدرسہ باہمی اختلاف کا اس طرح شکار ہو گیا کہ محمد صدیق صاحب نے دل برداشتہ ہو کر اس کے انتظام سے کنارہ کشی اختیار کر لی ، اور سڑک کے دوسری جانب اپنی ذاتی زمین پر مدرسہ اور مسجد کی بنیاد ڈال دی ، مکتب تو وہاں شروع کر دیا ، مسجد کی زمین متعین کر دی ، انھوں نے مجھے دوبارہ دعوت دی ، ان دنوں میں بیمار تھا ، مگر ان کی محبت نے مجبور کیا ، اور میں نے وہاں کا

سفر کیا۔ وہاں مسجد کی بنیاد رکھی، مدرسہ خیر وخوبی سے چل رہا ہے، انھوں نے اپنا مکان بھی وہیں مدرسہ کے متصل بنالیا ہے، اور از راہ محبت اس خاکسار کے لئے بھی ایک جھونپڑا تعمیر کردیا ہے، کہ میں وہاں پہونچوں تو اسی میں قیام کروں۔ اللہ تعالیٰ ان کی محبت کو قبول فرمائے اور دارین کی سعادت سے نوازے۔ آمین

یہ جگہ ضلع ارریہ میں شہر ارریہ کوٹ سے بجانب مغرب ۷/۸ کلومیٹر پر واقع ہے۔ اس سفر میں اہل محبت مجھے کئی جگہ لے گئے۔ ضلع پورنیہ کے دو ایک گاؤں میں جانا ہوا، میرے پرانے دوست مفتی تبارک حسین صاحب جنھوں نے مدرسہ دینیہ غازی پور میں مجھ سے تعلیم حاصل کی ہے اور بہادر گنج ضلع کشن گنج کے مدرسہ دار العلوم میں استاذ حدیث ہیں، اور دینی خدمات میں اور فقہ وفتاویٰ میں ممتاز ہیں، وہ اپنے گاؤں میں لے گئے، ان کے اور میرے احباب میں ایک مولوی عبد الرحمٰن صاحب اور ایک مولوی مجاہد صاحب ہیں، ایک روز ان کے گاؤں کدواہا میں قیام ہوا۔

ہر جگہ مسلمانوں کی بڑی تعداد ملاقات کے لئے اور وعظ سننے کے لئے جمع ہوتی رہی، لوگ بڑی محبت سے ملتے رہے اور سمع وطاعت کا اظہار کرتے رہے۔ ان جگہوں پر میں نے بطور خاص عام مجلسوں میں یہ بات عرض کی، کہ مسلمانوں کی کثرت تعداد دیکھ کر بے حد خوشی ہوتی ہے، لیکن دو باتوں سے رنج ہوتا ہے، ایک تو یہ مسلمانوں میں نمازوں کا اہتمام نہیں ہے، جتنی تعداد پائی جاتی ہے اگر اس کا تھوڑا سا حصہ بھی مسجد میں حاضری دے تو کسی مسجد میں گنجائش باقی نہ رہے گی، مگر دیکھئے تو ساری مسجد خالی پڑی نمازیوں کی منتظر رہتی ہے، اس لئے جو حضرات میرے پاس ہیں وہ نمازوں کا اہتمام کریں، اور اپنے گھر والوں اور معاشرہ میں اس کی کوشش کریں۔

دوسری چیز جو گھن کی طرح معاشرے کو کھا رہی ہے، وہ آپسی اختلافات ونزاعات ہیں، عقلوں اور رایوں میں اختلاف نہ کوئی انہونی چیز ہے نہ کوئی برائی ہے، مگر اس اختلاف کے ساتھ باہمی محبت، خدا ورسول پر ایمان کی بنیاد قائم رہ سکتی ہے، بڑی خرابی یہ ہے کہ فطری

وطبعی اختلاف کی بنیاد پر ہم جھگڑے کھڑے کر لیتے ہیں مگر محبت واتحاد کی جو بنیاد ہے، یعنی ایمان اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔

ایک تیسری چیز اور بہت قابل لحاظ ہے، اسلام نے اور اللہ اور اس کے رسول نے مسلمانوں کو ایک خاص امتیازی تشخص عطا فرمایا ہے، یہ تشخص جیسے سیرت وکردار اور طبیعت ومزاج سے تعلق رکھتا ہے، اسی طرح شکل وصورت اور وضع قطع سے بھی متعلق ہے، چہرے پر خدا کا نور یعنی ڈاڑھی بڑھی ہوئی، مونچھیں ترشی ہوئی، لباس ایسا ہو جو اعضاء مستورہ کو چھپائے رکھنے میں کامیاب بھی ہو اور ٹخنوں سے نمایاں اوپر بھی ہو، سر پر کلاہِ عظمت ہو، خواہ وہ عمامہ ہو یا کم از کم ٹوپی ہو، ننگے سر پھرنا تہذیب اسلامی کے منافی ہے، دھوتی ہندوؤں کا لباس ہے، جو ستر کے پوشیدہ رکھنے میں ناکام ہے، پتلون انگریزوں کا خاصہ ہے، جو قابل شرم اعضاء کو چھپانے کے بجائے ان کی مزید نمائش کرتا ہے، اور اس کا ایک لازمہ یہ بھی ہے کہ وہ ٹخنوں سے نیچے لٹکتا ہے، جو کسی صورت میں جائز نہیں۔

اگر مسلمان انگریزوں اور ہندوؤں کی وضع وقطع سے اجتناب کریں اور اس شکل وصورت اور وضع وہیئت کو اختیار کرلیں جو ان کے محبوب ومطاع مطلق حضرت خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مقرر کی ہے، اور وہی اللہ کی اور صالحین کی پسندیدہ ہیئت ہے، تو یہ جہاں کہیں ہوں گے ان کی ہیبت چھائی ہوئی ہوگی۔

اب تو حال یہ ہے کہ آپ محض شکل وصورت کو دیکھ کر یہ فیصلہ کر ہی نہیں سکتے کہ سامنے والا مسلم ہے کہ اس کو **السلام علیکم** کہیں، یا غیر مسلم ہے کہ اس کے ساتھ استقبال وملاقات کے دوسرے آداب بجالائیں، اگر مسلمان اپنے تشخص پر قائم ہو جائے تو نہ کہیں اشتباہ ہو اور نہ کسی کو جرأت توہین ہو، داڑھی ٹوپی کی ہیبت ایسی نہیں ہے جس کا انکار کیا جائے۔

یہ ایک پیغام ہے کہ مسلمان اپنے نبی کی سنت کی طرف پلٹیں، سیرت وکردار میں بھی اور وضع وہیئت میں بھی!

حق تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان رکھتے ہیں، اور دنیا کی تمام قوموں کے برخلاف شرک اور اعمال شرک سے بیزار ہیں، تو اس کی جو واقعی عبادت ہے، جس سے ابتداء انسانیت سے آخری پیغمبر تک کسی نبی ورسول کی ملت خالی نہیں ہے، اور جس کے بغیر کسی بھی دین وملت میں کوئی خیر نہیں یعنی نماز! اس کا اہتمام کریں، اسے اپنی زندگی اور روز وشب کا سب سے زیادہ اہم اور لازمی پروگرام بنالیں، جو نماز کا پابند ہوگا، اس کا چہرہ نور الٰہی سے دمک اٹھے گا، اور ہر شخص محسوس کرے گا، کہ یہ چہرہ تمام چہروں سے مختلف ہے۔

دوسرے یہ کہ حق تعالیٰ کے ارشاد رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ کا نمونہ بن کر رہیں، اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ (ﷺ) کی معیت میں رہنے والوں کی جن صفات کی مدح کی ہے، اور ان کو ان کی شناخت بتایا ہے، ان میں ایک صفت **اشداء علی الکفار** ہے، یعنی کفار اور اہل شرک کے مقابلے میں وہ فولاد ہیں، ان کے طور طریقے سے اجتناب رکھتے اور ان کے اعمال وکردار سے دور رہتے ہیں، اور ایک صفت رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ ہے، یعنی آپس میں مہربان، نرم خو اور ہمدرد وغم گسار ہیں، یہ صفت جب پیدا ہوتی ہے تو آپس کے نزاعات اور جھگڑوں کا خاتمہ ہوجاتا ہے، اور غیروں پر دھاک بیٹھ جاتی ہے۔

تیسرے یہ کہ اپنے ظاہری تشخص کو برقرار رکھیں، یہ شکل وصورت اور یہ وضع قطع چونکہ شرعاً واجب ہے، اس لئے اس میں ایک برکت اور نورانیت ہے، اس سے اللہ راضی ہیں، اللہ کے رسول راضی ہیں، پھر دنیا والے چاہے ناراض ہوں، مگر وہ گھٹنا ٹیکنے پر مجبور ہوں گے۔

کاش مسلمان اس پیغام کو سنتے اور سمجھتے!

واللہ ولی الامر وھو الموفق والمستعان

(مئی ۲۰۱۱ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سنت کی اہمیت

> حدیث پاک کی حفاظت وصیانت اور اس کی نشر واشاعت کے متعلق لکھی گئی یہ سطریں حضرت اقدس مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی مدظلہ مہتمم دار العلوم دیو بند کی کتاب ''اسباق حدیث'' حصہ دوم کا مقدمہ ہیں۔ (ادارہ)

الحمدللہ نحمدہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیاتنا اعمالنا، من یھدہ للہ فلا مضل لہ و من یضلل فلا ھادی لہ و اشھد ان لا الہ وحدہ شریک لہ و اشھد ان محمدا عبدہ و رسولہ (ﷺ) و علی آلہ و ازواجہ و اصحابہ اجمعین. اما بعد

اہل اسلام کا یہ اجماعی عقیدہ ہے کہ ہمارے رسول سیدنا محمد (ﷺ) خاتم الانبیاء ہیں، تمام رسولوں کے امام ہیں اور تمام مخلوق کے حق میں اللہ کی وحدانیت کیلئے حجت بالغہ ہیں۔ اللہ تعالی نے انہیں دین قویم اور صراط مستقیم عطا فرما کر مبعوث فرمایا اور ان کی رسالت کو قیامت تک کیلئے سارے عالم میں عام فرمایا۔

حق تعالی نے ان کو مبعوث فرما کر بگڑی ملت کو درستی بخشی، ان کی سیرت وسنت کو داروئے شفا بنایا، بے نور آنکھوں کو نور بخشا، بہروں کو شنوائی عطا کی، بند دلوں کو کھول دیا، اور بھٹکی ہوئی انسایت کو سیدھی راہ، کشادہ رہ گزار اور بہترین شاہراہ کی ہدایت دی

اللہ تعالی نے اپنے بندوں پر رسول اکرم (ﷺ) کی اطاعت فرض قرار دی ان کی تعظیم ومحبت کو لازم کیا، ان کی سنت کی پیروی اور سیرت کی اقتداء کو ضروری قرار دیا، نیز عزت وشوکت کو آپ کی اقتدا سے وابستہ فرمایا اور آپ کی نافرمانی اور مخالفت کا انجام ذلت ونکبت

اور بدبختی وشقاوت کو بنایا۔

پھر ظاہر ہے کہ حق تعالی کی عبادت و بندگی کے طریقوں کی معرفت اور دین اسلام کی عملی تشکیل رسول اللہ (ﷺ) کی سیرت اور آپ کے طریقۂ عمل کے جاننے پر موقوف ہے وہ طریقۂ عمل جس پر آپ نزول وحی کے آغاز سے تکمیل دین کے اختتام تک کاربند رہے۔

اور اس کی اصل یہ ہے کہ قرآن پاک میں حق تعالی نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

و ما خلقت الجن و الانس الا ليعبدون ما اريد منهم من رزق و ما اريد ان يطعمون (الذريات ۵۶۔۵۷) میں نے جناتوں اور انسانوں کو محض اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں میں ان سے نہ روزی کا مطالبہ کرتا ہوں اور نہ یہ کہ وہ میرے لئے روزی کا سامان فراہم کریں۔

یعنی ان سے میرا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے لئے یا دوسروں کیلئے روزی کمائیں اور نہ یہ کہ وہ روزی حاصل کر کے مجھے دیں کہ میں اپنے بندوں میں تقسیم کرسکوں تمام بندوں کو روزی دینا اور ساری مخلوق کیلئے غذا اور ضرورت کا ہر سامان مہیا کرنا، یہ میرا کام ہے، بندے اس لئے یکسو ہو کر میری عبادت اور میرے احکام کی اطاعت میں لگے رہیں۔

یہ آیت اس باب میں صریح ہے کہ انسان اور جنات کی تخلیق صرف اللہ کی عبادت کیلئے ہوئی ہے، اس لئے ان پر لازم ہے کہ وہ جس کام کیلئے پیدا کئے گئے، اس کا پورا اہتمام کریں اور دنیا اور لذات دنیا کو اپنا مطمح نظر ہرگز نہ بنائیں کیوں کی یہ دنیا فانی ہے یہاں کسی کو ٹھہراؤ نہیں ہے یہ محض ایک گذرگاہ ہے منزل قیام وقرار نہیں، یہ ایک ختم ہو جانے والی راہ ہے کوئی دائمی وطن نہیں ہے پس بیدار وفہیم وہی ہے جو عبادت گذار ہے، اور عاقل ترین انسان وہ ہے، جو دنیا کی رغبت نہیں رکھتا۔

حق تعالی کا ارشاد ہے:

انما مثل الحيوة الدنيا كماء انزلناه من السماء فاختلط به نبات الارض مما ياكل الناس و الانعام حتى اذا اخذت الارض زخرفهاو زينت و ظن اهلها انهم قادرون عليها اتاها امرنا ليلا او نها را فجعلناها حصيدا

کان لم تغن بالامس کذلک نفصل الآیات لقوم یتفکرون (سورہ یونس ۲۴)

دنیا کی زندگی کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے بارش ہوئی اور اس کی وجہ سے زمین کی ہریالی ملی جلی پیدا ہوئی، جس سے آدمی بھی غذا حاصل کرتے ہیں اور جانور بھی اسے کھاتے ہیں پھر جب زمین رونق حاصل کر کے اچھی طرح مزین ہو جاتی ہے اور زمین والے سمجھتے ہیں کہ انہیں اس رونق وزینت پر قابو حاصل ہو گیا ہے تو ناگاہ ہمارا حکم رات یا دن میں کسی وقت آپہونچتا ہے پھر اس تمام تر زینت ورونق کو تہس نہس کر کے رکھ دیتے ہیں ایسا کہ گویا یہ سب کچھ تھا ہی نہیں، اسی طرح ہم غور وفکر کرنے والوں کیلئے نشانیاں بیان کرتے ہیں۔

جب دنیا کی زندگی کی مثال یہ ہے، تو یہ بات واضح ہے کہ عقل مند کون ہوگا؟ وہ جو دنیا اور لذت دنیا میں مرے؟ یا وہ جو اس فنا ہو جانے والی گذرگاہ سے احتراز کرتا ہوا گذر جائے

إن لله عباداً فطنا　　طلقوا الدنيا وخافوا الفتنا
نظروا فيها فلما علموا　　انها ليست لحيٍّ وطنا
جعلوها لجّةً واتخذوا　　صالح الاعمال فيها سفنا

☆ کچھ بندے اللہ کے بہت سمجھدار ہیں، انھوں نے دنیا کو طلاق دے دی، اور فتنوں سے احتراز کیا۔

☆ انھوں نے دنیا میں غور کیا، پھر جب وہ سمجھ گئے کہ یہ کسی زندہ کے لئے وطن نہیں ہے۔

☆ تو انھوں نے اسے دریا قرار دے کر، اعمال صالحہ کو اس کے لئے کشتی بنالیا، اور نجات حاصل کر لی۔

جب بندوں کا حال یہ ہے کہ اللہ کی بندگی بجالانا، ان کی غایت زندگی ہے، اور دنیا کا حال یہ ہے کہ کبھی وہ بارونق اور ہری بھری دکھائی دیتی ہے، اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سوکھ کر ریزہ ریزہ اور فنا ہو جاتی ہے، تو پھر بندوں کو غور کرنا چاہئے کہ انھیں کیا کرنا ہے؟ اسی زوال آمادہ دنیا اور لذاتِ دنیا کے پیچھے دیوانہ رہیں؟ یا اس گزرگاہ سے اسی طرح گزریں جس طرح اللہ کے نیک بندے چلتے ہیں؟ عقل کی بات تو یہی ہے کہ وہ عقل والوں کی راہ اختیار کریں۔

عقل وخرد کی یہ روشن راہ اور فتنوں سے بچ کر نکلنے کی گزرگاہ کہاں اور کیونکر ملے گی؟ وہ ایک ہی جگہ متعین ہے اور ایک ہی طریقہ ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے؟ اور وہ ہے ہادی مطلق، نمونۂ رضائے الٰہی، دانائے طریق، ختم المرسلین، سیّدنا ومولانا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی بارگاہ عالم پناہ ہے، جس راہ پر وہ چلے ہیں، جس راہ پر چلنے کا انھوں نے حکم دیا ہے، اور جس راہ کو انھوں نے پسند فرمایا ہے، بس تلاش کرنے والے اسی راہ کو تلاش کریں، اور پیش کرنے والے اسی راہ کو پیش کریں، دوسری ہر راہ کانٹوں بھری ہے، غلط رخ پر گئی ہے، سب کو نظر انداز کر کے، سب سے یکسو ہو کر، اور سب کی نفی کر کے بس اسی راہ پر خود کو ڈال دینا قطعی ہدایت ہے۔

ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیثِ یار کہ تکرار می کنیم

ہم نے جو کچھ پڑھا تھا اسے بھلا دیا، بس ایک یاد رہ گئی ہے، اور وہ ہے دوست کی بات! اسے ہی ہم دہرائے جا رہے ہیں۔

یہ دوست کون ہے؟ یہ مرکز محبت کون ہے ایک مومن کے لئے، اللہ اور اس کے رسول کے علاوہ اور کیا جواب ہوسکتا ہے؟ اللہ کا کلام قرآن کریم ہے، اور رسول کا کلام حدیث وسنت ہے، ایک مسلمان کی زندگی، انفرادی بھی اور اجتماعی بھی، اس کا پورا ماحول اور معاشرہ انھیں دونوں سے مستفید ہوتا ہے، قرآن کریم متن ہے، حدیثِ رسول اس کی شرح ہے، قرآن پاک کتاب ہے، اور حدیث رسول حکمت ہے۔

حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۔

بلاشبہ اہل ایمان کے اوپر اللہ کا احسان ہوا کہ ان میں خود انھیں کے زمرے سے ایک رسول کو مبعوث فرمایا، جو انھیں اللہ کی آیتوں کو پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے،

اور انھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے وہ کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔ (سورہ نساء:)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کتاب کے ساتھ حکمت کو بھی ذکر فرمایا ہے، یہ حکمت کیا ہے؟ حضرات علماء ومفسرین فرماتے ہیں کہ حکمت سے مراد سنت ہے، پس رسول اکرم ﷺ کی حدیثیں اور آپ کی ہدایتیں سب سنت میں داخل ہیں۔

دین اسلام کا مدار انھیں دونوں پر ہے، قرآن پر اور سنت پر! اللہ نے ان دونوں کی حفاظت کا وعدہ فرمایا، اور آج تقریباً ڈیڑھ صدی کی تاریخ اس پر گواہ ہے کہ حق تعالیٰ کا یہ وعدہ اس طرح سے پورا ہوا ہے کہ یہ دنیا کی سب سے بڑی صداقت بن گیا ہے۔ قرآن کریم کا حرف حرف اس طرح محفوظ ہے کہ لاکھوں انسانوں کے سینے اور لاتعداد کاغذوں کے سفینے اس کے لفظ اور زیروزبر تک کے امین صادق ہیں۔

اسی طرح رسول اکرم ﷺ کی حدیثوں، سنتوں اور آپ کے خصائل وشمائل اور اخلاق وسیرت کے نقل وروایات کا وہ عدیم النظیر خزانہ دنیا کے سامنے ہے کہ علم وتحقیق کی دنیا آج تک حیرت زدہ ہے، کہ عرب کے صحراؤں میں، امیوں کے درمیان پیدا ہونے والا رسول، ایسی جگہ پیدا ہونے والا، جہاں پڑھنے لکھنے والوں کی تعداد ایک ہاتھ کی پانچ انگلیوں کے پوروں سے زائد نہ تھی، آج وہ عالم ہے کہ اس کے منہ سے نکلا ہوا کوئی کلمہ ایسا نہیں ہے جو معتبر راویوں کے بلا انقطاع تسلسل کے حوالے سے موجود نہ ہو، اور اس کے کردار وعمل کی کوئی روشنی ایسی نہیں ہے جسے لیل ونہار کی طویل گردشوں نے مضمحل اور مدھم کر دیا ہو، بلکہ جیسے جیسے وقت گزرجاتا ہے اس کی تابناکی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

دیکھنے والے حیرت زدہ ہیں کہ ایک وقت جبکہ آپ کے صاحبزادے کا بچپن میں ہی انتقال ہوگیا تھا، کہنے والے مخالف نے کہا تھا کہ: **دعوہ فانہ رجل ابتر لاعقب لہ فإذا ھلک انقطع ذکرہ** (تفسیر ابن کثیر سورۃ الکوثر) اسے چھوڑو، یہ ایسا آدمی ہے جس کی نسل منطع ہوگئی ہے، اس کی اولاد باقی نہیں، جب یہ دنیا سے چلا جائے گا تو اس کا ذکر

وتذکرہ بھی فنا ہو جائے گا۔

نادان کہنے والا یہ کہہ رہا تھا اور قدرت سامان کر رہی تھی کہ روئے زمین پر اس سے بڑھ کر کسی کا تذکرہ نہ ہو، خالق تعالیٰ کا ذکر سب سے بلند ہے، پھر ان کے بعد اگر کسی کا ذکر ہو تو اسی نبی امی کا ہو، **ورفعنا لک ذکرک** (انشراح:) ہم نے تمہارے ذکر کو بلندی بخشی۔ یہ وعدہ نہیں، خبر ہے، اور اس خبر کی صداقت ہر آنے والا دن مزید یقینی بناتا جا رہا ہے۔

پڑھنے والے پڑھیں، یہ حدیث کی بے شمار کتابیں ہیں، یہ مغازی کے دفتر ہیں، یہ تاریخ کے صفحات ہیں، یہ شمائل کے مجموعے ہیں، ان میں پڑھنے والوں کو رسول اللہ ﷺ کے ارشادات ملیں گے، آپ کے افعال وصفات ملیں گے، نبوت کی تیس سالہ زندگی کا ہر ہر لمحہ محفوظ ملے گا، آپ کے اقوال وافعال اور صفات واحوال میں کوئی جلی اور خفی ایسی شان نہ ہوگی، جو علم وتحقیق کے اس خزانے میں بعینہٖ محفوظ نہ ہو، صرف محفوظ ہی نہیں سورج کی طرح روشن نہ ہو، آپ کے کھڑے ہونے اور بیٹھنے کا انداز کیا تھا؟ آپ سونے سے کیونکر اٹھے؟ اور اٹھنے کی کیفیت کیا تھی؟ آپ کی ہنسی، آپ کا تبسم، آپ کی عبادت، دن میں اور رات میں کس طرز پر ہوتی تھی؟ آپ کے کھانے، پینے، پہننے اوڑھنے اور وضو وغسل کی کیا شان تھی؟ لوگوں سے گفتگو آپ کیونکر کرتے تھے، ملاقات کے وقت کیا کیفیت ہوتی تھی؟ کون کون سے رنگ آپ کو پسند تھے؟ ان میں سے کون سی بات ایسی ہے جو ان کتابوں کے اوراق میں آپ کو بالتفصیل نہیں ملے گی۔

اگر کوئی یہ کہے تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ دنیا میں تاریخ کی کتابوں نے کسی بھی انسان کے احوال وشمائل اور عادات وخصائل کو اس تفصیل، اس شرح وبسط، اس تحقیق وتدقیق اور اس احصاء واحاطہ کے ساتھ جمع نہیں کیا ہے، جیسے ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی زندگی کے جزئیات وکلیات کو جمع کیا ہے۔

پھر معاملہ صرف کتابوں کے اوراق پر محدود نہیں ہے، اللہ نے اپنے اس برگزیدہ نبی کے گرد عقیدت ومحبت کا وہ ہالہ قائم کر دیا ہے، اور شیفتگی ووالہیت کی وہ شمع روشن کر دی ہے

کہ ہر دور میں پروانے اپنے دلوں میں اس کی کشش کی بیتابی محسوس کرتے ہیں، اور ساری دنیا سے منہ موڑ کر، یکسو ہو کر آپ کی بنائی راہ پر بے تکان چلتے رہتے ہیں، آپ کی باتوں کو یاد کرتے ہیں، آپ کے عادات وشمائل کو اختیار کرتے ہیں، آپ کی سنتوں کی ہو بہو پیروی کرتے ہیں، خود کو آپ کی سیرت میں جذب کرتے ہیں، اپنے ارادے، اپنے نظریے، اپنے خواہشات کو فنا کر کے رسول کی لائی ہوئی شریعت وسنت میں ڈھل جاتے ہیں، اگر وہ کاغذی بے جان کتابیں ہیں تو یہ گوشت پوست سے بنی ہوئی جاندار کتابیں ہیں، ان کتابوں کے حروف ونقوش میں آپ کی سنت وسیرت محفوظ ہے، تو ان زندہ وجودوں کی زبان اور اعضاء وجوارح میں آپ کی حدیثیں اور سنتیں جگمگا رہی ہیں۔

میرے شیخ ومرشد حضرت مولانا حافظ عبدالواحد صاحب مدظلہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ سے احادیث رسول پڑھتے تھے، اور آپ کے وجود وعمل میں ان احادیث کی تشکیل وتعمیل دیکھتے تھے، کتاب کے اندر جو کچھ حروف ونقوش پڑھتے، آپ کی زندگی کے قول وعمل میں بھی وہی سب کچھ پڑھتے تھے۔

یہ دونوں کی طرح کی کتابیں —— کاغذی کتابیں اور زندہ وجود کی کتابیں —— قرون اولیٰ سے اب تک ایک دوسرے کے شانہ بشانہ چل رہی ہیں، تعداد کے کم وبیش ہونے کا فرق ہوسکتا ہے، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا ہے کہ ان میں خلا پیدا ہوا ہو۔

انھیں دونوں سے اسلامی معاشرہ زندہ وتابندہ ہے، انھیں کتابوں، حدیث وسنت کے مجموعوں کی برکت سے اسلامی تعلیم، ہر طرح کی تحریف سے محفوظ ہے، سر کھپانے والے تحریف کے لئے سر کھپاتے ہیں، مگر دونوں طرح کی معتبر کتابوں کی تیز روشنی میں باطل کی روسیاہی نمایاں ہوجاتی ہے۔

جس طرح قرآن کریم کے کلمات وحروف سفینوں اور سینوں میں محفوظ ہیں، اسی طرح احادیثِ رسول اور سیرت رسول سفینوں میں بھی اور زندہ انسانی وجود اور شمائل وخصائل میں بھی محفوظ ہیں، یہ حق تعالیٰ کی طرف سے وہ غیبی مستحکم انتظام ہے جس کی وجہ سے

اسلامی شریعت ہر تحریف وتبدیل سے محفوظ ہے۔

امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا یہ وہ محیر العقول اور عظیم کارنامہ ہے جس کی توفیق انھیں حق تعالیٰ کی جانب سے بخشی گئی، اور اس کی کوئی نظیر دنیا کی کسی امت میں موجود نہیں۔

احادیث، اس حیثیت سے بھی بہت اہمیت کی حامل ہیں، کہ ان کا سرچشمہ وہ ذات عالی ہے جو مہبط وحی الٰہی ہے، جس کا شرح صدر بارگاہ الٰہی کی عنایت خصوصی ہے، جس کے سراپا نور ہونے کی بشارت قرآن کریم نے دی، کلام اور کام کی قدر وقیمت اس کے مصدر ومنشا کے لحاظ سے گھٹتی بڑھتی ہے، نور مبین اور رسول معصوم کی زبان سے نکلا ہوا کلام خود نور ہے، اور ہر خطا سے معصوم ہے، پھر اس کے سراپا خیر وبرکت ہونے میں کیا کلام ہوسکتا ہے؟ اس کلام کی زندگی اور نورانیت میں کوئی فرق نہیں آسکتا خواہ زمانہ جتنا بھی گزر جائے، ایک مدت گزر جانے کے بعد اب بھی حق وہدایت کی توسیع واشاعت کا کام اگر کرنا ہے، تو قرآن کے ساتھ حدیث سے بھی استفادہ کرنا ہوگا۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں کہ:

> ’’حدیث نبوی، زندگی، قوت اور اثر انگیزی سے بھرپور ہے، اور ہمیشہ اصلاح وتجدید کے کام، فساد اور خرابیوں اور بدعتوں کے خلاف صف آراء اور برسر جنگ ہونے اور معاشرہ کا احتساب کرنے پر ابھارتی رہی ہے، اور اس کے اثر سے ہر دور اور ہر ملک میں ایسے افراد پیدا ہوتے رہے ہیں جنھوں نے اصلاح وتجدید کا جھنڈا بلند کیا، کفن بردوش ہوکر میدان میں آئے، اور بدعتوں وخرافات اور جاہلی عادتوں سے کھلی جنگ کی اور دین خالص اور صحیح اسلام کی دعوت دی، اسی لئے حدیث نبوی، امت اسلامیہ کے لئے ایک ناگزیر ضرورت اور اس کے وجود کے لئے ایک لازمی شرط ہے، اس کی حفاظت، ترتیب وتدوین، حفظ اور نشر واشاعت کے بغیر امت کا یہ دینی وذہنی، عملی واخلاقی دوام وتسلسل برقرار نہیں رہ سکتا۔ (تاریخ ودعوت وعزیمت، ج: ۵ ص: ۱۷۱)

(جون ۲۰۱۱ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دینی شعائر کا ادب

الحمدللہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدالانبیاء والمرسلین وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ اجمعین.

اسلام دین الٰہی ہے، جسے حق تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ رسول خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرما کر تمام دنیا کے لئے عام فرمایا ہے، اور اس پر اپنی رضامندی اور خوشنودی کا اعلان فرمایا ہے، اور یہ کہ جو کوئی، اس کے علاوہ کسی اور دین وملت کا طالب ہوگا، وہ قبولیت سے برکنار ہوگا، اب قیامت تک جو بھی رضائے مولیٰ کا طلبگار ہوگا، اس کے لئے لازم ہے کہ وہ اس دین حق کے کلیات وجزئیات کا اپنے عقیدہ وعمل اور نظریہ وفکر کے اعتبار سے احاطہ کرے۔

یہ دین حق ظاہر وباطن ہر لحاظ سے کمالِ ادب کا نام ہے، اللہ کا ادب، رسول کا ادب، احکام الٰہی کا ادب، حرمات کا ادب، قرآن وسنت کا ادب، شعائر اسلام کا ادب۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِکَ وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰہِ فَاِنَّہَا مِنْ تَقْوَیٰ الْقُلُوْب. (سورۃ الحج: ۳۲) یعنی حج کے جو خاص خاص احکام تھے، وہ تو بیان ہو چکے، اب ایک عام بات بتائی جاتی ہے، کہ جو کوئی اللہ کے شعائر کا ادب کرے گا، وہ دل کے تقویٰ اور پرہیزگاری کی بات ہے۔

یعنی جب دل میں تقویٰ ہوگا، اللہ کا احترام ہوگا، تو وہ سب باتیں، جس کا حق تعالیٰ سے تعلق نمایاں ہے، آدمی ہر ایک کا احترام کرے گا۔

اللہ کے شعائر میں، اس کے وہ خصوصی احکام بھی ہیں، جن کا اللہ کے ساتھ تعلق

عام طور سے معلوم ہے، مثلاً سب جانتے ہیں کہ نماز اللہ تعالیٰ کی خصوصی عبادت ہے، اس کا تعلق بجز خدا کے اور کسی سے نہیں ہے، پھر نماز کے ساتھ اس کے خصوصی شرائط، مثلاً طہارت، وضو وغسل کا تعلق روز روشن کی طرح واضح ہے، نیز نماز قائم کرنے کی جگہیں یعنی مساجد کا خصوصی تعلق بارگاہ الٰہی کے ساتھ ہر شخص جانتا ہے، آدمی کے دل کے تقویٰ کا تقاضا ہے کہ اللہ کے دربار سے براہ راست تعلق رکھنے والی ان چیزوں کا ظاہر وباطن ہر لحاظ سے ادب واحترام بجالایا جائے۔

ان سب شعائر کی ایک روح ہے، اور ایک ان کی ظاہری شکل وصورت اور ڈھانچہ ہے، جس طرح کسی شے کے کامل وجود کے لئے اس کی روح کا اہتمام ضروری ہے، اسی طرح اس کا ڈھانچہ بھی ٹھیک ٹھیک حکم کے مطابق ہونا چاہئے، ورنہ اگر جسم عیب دار ہوگا تو اس کا حسن متاثر ہوگا، اور اس کی خوبی نگاہ سے گر جائے گی، نماز کی روح اس کا خشوع وخضوع اور اس میں ذکر الٰہی ہے، مگر ڈھانچہ قیام وقرأت اور رکوع وسجود سے مرکب ہے، یہی حال دوسرے شعائر کا بھی ہے، دین کا حکم ہے کہ جہاں ان کے مغز وروح کا اہتمام کیا جائے، وہیں، ان کے ظاہری ڈھانچے اور شکل وصورت کے آداب کا بھی پورا اہتمام کیا جائے۔

صرف ذکر الٰہی اور خشوع وخضوع کیف ما اتفق مطلوب نہیں ہے، بلکہ نماز کا خصوصی ڈھانچہ بھی مطلوب ہے، طہارت، وقت، قیام وقعود اور رکوع وسجود کی ظاہری شکل بھی مقصود ومطلوب ہے، اس لئے ان سب کے احکام وحدود کا علم ضروری ہے تاکہ عبادات کو بجالانے والا افراط وتفریط کی بے ادبی میں نہ پڑے۔

ہمارے زمانے میں، دین سے اور دینی حقائق وآداب سے بے رغبتی بلکہ بے نیازی، جس طرح عام ہوتی جارہی ہے، اہل احساس پر مخفی نہیں، کتنے لوگ ایسے ہیں جنھیں شعائر الٰہی کی پرواہ ہی نہیں، وہ اپنے طور طریقوں کو چھوڑ کر اغیار کے طریقۂ عمل کو اختیار کرتے ہیں، اور کتنے ایسے ہیں جو دینی احکام تو بجالاتے ہیں، مگر ایک رسم ورواج کی طرح، ان کے حدود واحکام اور مسائل وارکان سے بے پروا ہوکر۔ حالانکہ ان سب کا ادب واحترام اور نظم

واہتمام ایک شرعی حکم ہے، تاکہ اللہ کی عبادت، حسن عبادت بن کر قابل تحسین وقبول بنے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو دعاء کے پیرائے میں، حسن عبادت کے اہتمام کی تلقین فرمائی ہے، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو تاکید فرماتے ہیں کہ ہر نماز کے بعد یہ دعا کرلیا کرو، اور اسے ترک نہ کرو، اَللّٰھُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی ذِکْرِکَ وَشُکْرِکَ وَحُسْنِ عِبَادَتِکَ ۔ اے اللہ! آپ اپنے ذکر، اپنے شکر اور اپنی عبادت کی عمدگی پر میری مدد فرمائیے۔

اس دعاء سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ صرف عبادت نہیں، بلکہ حسن عبادت مطلوب ومقصود ہے، عبادت کرنے والا جب حسن عبادت سے غافل ہوتا ہے، تو اپنی عبادت خراب کرلیتا ہے، اسی لئے علمائے اسلام نے اپنی توجہ کا مرکز عبادات کے ظاہری آداب ومسائل کو بھی بنایا ہے، ظاہر درست ہوگا تو باطنی روح کی استعداد اس میں بدرجۂ کامل ہوگی اور اگر ظاہری ڈھانچہ بدنما اور خراب بنالیا تو اس کی روح میں بھی بدنمائی آسکتی ہے۔

عبادت کی اس صورت اور ڈھانچے کو خوبصورت بنانا، اور اسے ظاہری خوبیوں سے آراستہ کرنا بھی ایک کار اہم ہے، یہی وجہ ہے کہ نماز جو کہ عبادات میں سب سے بڑھ کر ہے اس کے ظاہری حسن وجمال کے لئے متعدد شرطیں ضروری قرار دی گئی ہیں، بدن پاک ہو، جگہ پاک ہو، کپڑے پاک ہوں، بدن کی پاکی ظاہری بھی کہ واقعی نجاست سے بدن آلودہ نہ ہو، اور باطنی پاکی بھی کہ وضو اور غسل سے بدن آراستہ ہو، بلکہ صرف طہارت ونظافت پر ہی معاملہ بس نہیں ہے، حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ ، ہر نماز کے وقت ظاہری زینت کا اہتمام کرو۔ بدن کی وضع قطع ڈھنگ کی اور شریفانہ ہو، کپڑے ایسے ہوں، جن سے آدمی کو جمال حاصل ہو، بال بے ڈھنگے نہ ہوں، کپڑے ایسے نہ ہوں جن سے ستر پوشی کے بجائے ستر کی نمائش ہو، یہ وہ آداب ہیں جن سے نماز کا ظاہر آراستہ ہوتا ہے۔

مسجدیں بھی اللہ کے شعائر میں ہیں، ان کی بے حرمتی اور بے ادبی درست نہیں، یہ

جگہ عام گھروں جیسی نہیں ہے کہ جس طرح چاہیں آئیں جائیں، یہ تفریح گاہ نہیں، عبادت گاہ ہیں، ان میں آدمی داخل ہو تو باوضو داخل ہو، داخل ہوتے ہی دو رکعت نماز ادا کرے تاکہ مسجد کی وضع کا حق ادا ہوجائے، مسجد میں نجاست نہ لیجائی جائے، خود نجس آدمی نہ جائے، دنیا کی بات نہ کی جائے، خرید وفروخت کا کاروبار نہ کیا جائے، یہ سب آداب مسجد کے خلاف ہے۔

اسی قیاس پر ہر اس چیز کا لحاظ کرلیا جائے جس کی نسبت اللہ اور اس کے رسول اور اس کے دین کے ساتھ وابستہ ہے، دینداری کی روح یہ ہے کہ ان میں سے کسی کی بے حرمتی نہ ہو۔

جب تک ان عبادات وشعائر کو آدمی اس نظر سے دیکھے گا کہ حق تعالیٰ وتقدس کی بارگاہ عظیم سے خصوصی تعلق رکھنے والی یہ چیزیں ہیں، ان کے خصوصی ادب واحترام کی پوری کوشش کرے گا، اور اگر ان کو محض رسوم کا درجہ دیدے گا، تو الٹے سیدھے، اونے پونے جس طرح ادا ہوجائے کافی سمجھے گا، چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض لوگ بس نماز ادا کرلیتے ہیں، نہ تہذیب وشائستگی کا لحاظ رکھتے ہیں، نہ شرم وحیا کا پاس ولحاظ رکھتے، ننگے سر ہیں تو اسی حالت میں نماز میں داخل ہوجاتے ہیں، لباس ایسا پہنیں کہ دیکھ کر شرم وحیا کی آنکھیں نیچے ہوجائیں، نہ کھڑے ہونے کا سلیقہ نہ رکوع وسجود کا ڈھنگ اور نہ اٹھنے بیٹھنے کی ہیئت درست، بس ٹھونگیں ماریں اور خوش کہ نماز ادا کرلی۔

ان ظاہری آداب کو معمولی ہرگز نہ سمجھیں، ظاہر درست ہوگا تو باطن کی درستگی آسان ہوگی۔

غرض دین کے ہر حکم کے ظاہر کو درست رکھنا، شریعت میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، اس سے غفلت کسی طرح روا نہیں۔ علماء وفقہاء نے ظاہری احکام وآداب کو تفصیل سے بیان کیا ہے، نوجوانوں کو اس کا خاص طور سے دھیان دینا چاہئے، ورنہ شروع کی عادت کا بگاڑ، بعد میں اس کا اصلاح پذیر ہونا مشکل ہے۔ (جولائی ۲۰۱۱ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مدارس اسلامیہ: دورِ حاضر کی نعمت عظمیٰ

ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت کے زوال کے بعد، نہ صرف مسلمانوں کے خلاف بلکہ خود مذہب اسلام کے خلاف فتنوں کی یلغار شروع ہوگئی، اس وقت اس ملک میں سمندر پار کی ایک اجنبی سفید فام اور سیاہ قلب قوم تجارت کی راہ سے سیاست میں قدم جمارہی تھی، یہ قوم وہ تھی جس نے چند صدی پیشتر مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگوں کا خونیں معرکہ چھیڑ رکھا تھا، اور آخر میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے فولادی ہاتھوں سے اس نے وہ شکست کھائی تھی، کہ اس کا زخم ناسور بن کر صدیوں اس قوم کی تکلیف اور دشمنی کا سبب بنا رہا۔ اس قوم کو اسلام سے اور مسلمانوں سے گہری عداوت تھی، یہ قوم جب ہندوستان کے ساحل پر اتری تو یہاں اس کو انھیں مسلمانوں سے سابقہ پڑا جن کے ہاتھوں اسے صلیبی جنگوں میں تاریخی شکست ہوئی تھی، اس نے اپنی دشمنی کا لاوا نکالنے کے لئے ہتھیاروں کا استعمال نہیں کیا، بلکہ مکر وفن، سازش اور دسیسہ کاریوں کے ہتھیار آزمائے، حکومت سے تجارت کی اجازت لی، ایک تجارتی کمپنی بنائی اور پھر آہستہ آہستہ اپنی فوجوں کو یہاں اتارنا شروع کیا، اس قوم کی دراندازی کے بعد اس ملک میں سیاسی، تعلیمی، مذہبی، اخلاقی اور معاشی اتھل پتھل شروع ہوئی، اس کا ہر قدم اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اٹھتا تھا، کبھی برنگ ہمدردی، کبھی برنگ سازش وفریب! مگر رخ یہ تھا کہ مسلمانوں کو پست وذلیل بھی کیا جائے اور اسلام کا اعتماد ان کے دلوں سے نکال بھی دیا جائے۔ اس کے لئے علم وہنر کے نئے نئے زاویے، نئے نئے انداز پیش کئے، اور اس کے لئے صلیبی پادریوں کی ٹیمیں بھی اس نے ملک کے طول

وعرض میں اتاریں اوراس نے خود مسلمانوں میں ایسے افراد کومنتخب کرنے کی مہم چلائی جونام اور خاندان کے لحاظ سے تو مسلمان ہوں، لیکن مسلمانوں کے علوم وفنون اوراسلامی نظریات واعتقادات پر انھیں اعتماد نہ ہو، نبی کا نام اور تعلق تو چھینا مشکل تھا، اس لئے اس نام کو باقی رکھتے ہوئے ان کی تعلیمات کے صحیح مفہوم ومطلب سے انحراف کوفروغ دینے کی کوشش کی، الفاظ وہی رہیں جوقرآن وحدیث میں آئے ہیں، مگران کا مطلب ومعنی کچھ سے کچھ کردیا جائے، تفسیر میں تحریف، حدیث کے مفہوم میں تحریف، فقہی مسائل میں تحریف وتاویل، تاریخ میں تحریف، تہذیب وتمدن میں تشکیک! اس قوم نے ایسی صورت حال پیدا کردی کہ دین اسلام باقی ہی نہ رہے، اوراگر باقی رہے تو کچھ سے کچھ ہوکر! نام مسلمان کا باقی رہے مگر وفاداری صلیبی اقوام کے ساتھ ہو، مغلوں کی حکومت کے کمزور ہوجانے اورسمٹ کرلال قلعہ میں محدود ہوجانے کے بعد اس قوم کوکھل کھیلنے کا موقع ملا۔ حکومت گئی تو طاقت ٹوٹ گئی، علم کمزور پڑ گیا، جہالت نے سر ابھارا، صلیبی پادریوں نے اسلام کے خلاف آندھی چلائی، ملحدوں اور دہریوں نے علمی انداز میں شکوک وشبہات کے گردوغبار اڑائے، جس کی وجہ سے خود مسلمانوں میں متعدد فرقے ایسے وجود میں آگئے جو بجائے اسلامی تعلیمات پر کاربند ہونے کے اسلام ہی کی جڑ کھوکھلی کرنے لگے، جھوٹے نبی پیدا کئے گئے، بدعات وخرافات کی سرپرستی کرنے والے، انھیں عبادت وتقرب الٰہی کی سند دینے والے ڈھونڈھے گئے، حدیثوں کے انکار اور فقہ اسلامی سے انحراف کی راہیں ہموار کی گئیں، غرض ہر وہ تدبیر اختیار کی گئی جس سے مسلمان کا نام رکھتے ہوئے اسلام سے آدمی منحرف ہوجائے، تاریخ اسلام پر اعتماد باقی نہ رہے، ایسے حالات پیدا کردئے گئے تھے کہ اسلام اوراسلامی تعلیم فنا کے گھاٹ اتر جائے۔

لیکن حکمت الٰہی کومنظور نہ تھا کہ جس سرزمین سے میر عرب (ﷺ) کوٹھنڈی ہوا آئی تھی، جہاں اسلامی مجاہدین نے دین ودیانت کا علم نصب کیا تھا، جس سرزمین پر حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہ نے قدم جمائے تھے، اوران کی برکت سے ملک کے بیشتر

حصے میں مذہب اسلام کے قدم جمے تھے، جس کے مرکز میں بیٹھ کر خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی علیہ الرحمہ نے یہاں کے ہر ہر چپے کو اپنے خلفاء ومتوسلین کو بھیج کر دیانت وروحانیت کی دولت سے مالا مال فرمایا تھا، جس کے ایک گوشے میں رہ کر مجدد الف ثانی حضرت امام شیخ احمد سرہندی علیہ الرحمہ نے دین اسلام کی تعلیمات اوراس کی روحانیت کواس طاقت وقوت سے پھیلایا کہ خانقاہوں، زاویوں اور مدارس سے آگے بڑھ کر مغل بادشاہوں کے بام ودراس کے نور سے روشن اوراس کی تاثیر سے سرشار ہوگئے، جس ملک کی راجدھانی میں بیٹھ کر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب علیہ الرحمہ نے علم حدیث اورسلوک وروحانیت کا وہ مرکز قائم کیا، جہاں سے علم وعمل کی ایک عدیم المثال کہکشاں تیار ہوئی، جس کی روشنی سے سارا ہندوستان جگمگا اٹھا، جس سرزمین کے ایک خطے سے اٹھ کر امیر المومنین وامام المجاہدین سیّدنا سیّد احمد شہید قدس سرہ نے اپنے بزرگ خلفاء ورفقاء کے ساتھ اصلاح وتجدید اور جہاد فی سبیل اللہ کا وہ نعرہ بلند کیا کہ اس کی گونج آج تک مسلمانوں کے قلوب کوگرما رہی ہے، حق تعالیٰ کومنظور نہ ہوا کہ اس ملک سے دین اسلام کے قدم اکھڑیں، اللہ نے احسان فرمایا، اس کی حکمت کا تقاضا ہوا کہ یہاں دین اسلام کے قدم جمے رہیں اوراس روشنی کی تب وتاب باقی رہے۔

اللہ نے اصحاب توفیق کو الہام فرمایا، غیبی قوتوں نے ظہور فرمایا، اہل اللہ کے سینے سے نکلی ہوئی آہوں نے بارگاہِ الٰہی میں قبولیت پائی، اور یہاں مدارس اسلامیہ کے قیام کی طرح ڈالی گئی۔ اول سرزمین دیوبند اس سعادتِ کبریٰ اور نعمتِ عظمیٰ سے سرفراز ہوئی، حق تعالیٰ نے نظر عنایت فرمائی، زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ہندوستان کے بہت علاقوں میں مدارس اسلامیہ کی بنیادیں قائم ہوتی چلی گئیں۔ یہ مدارس ہندوستان میں دین اسلام کی بقا اور تحفظ کے مضبوط قلعے اور اہل اسلام کے لئے نعمت عظمیٰ اور غنیمت کبریٰ ہیں، آج جہاں کہیں اس ملک میں حق وہدایت کی شمع روشن ہے انھیں مدارس کا فیض ہے۔

اسلامیان ہند بلکہ مسلمانان عالم اس نعمت عظمیٰ پر اللہ کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے، ان مدارس نے علوم دینیہ کو زندہ رکھا، اخلاص وللہیت کو باقی رکھا، کردار وعمل کی صحیح شکل و

صورت کو محفوظ رکھا، اور حق یہ ہے کہ دین کی ہمہ جہتی حفاظت میں ان کا اہم کردار رہا ہے۔ چاہنے والوں نے بہت چاہا کہ مدارس کو ان کی اس ڈگر سے ہٹادیں جس پر چلتے رہنے کے لئے ان کا وجود و قیام ہوا تھا، کچھ ایسے لوگوں نے بھی چاہا جن کی نگاہوں میں یہ مدارس خار بن کر کھٹکتے ہیں، وہ اسے دُنیوی ترقی اور عیش و عشرت یا یوں کہئے کہ نفسانی خواہشوں کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے ہیں، انھوں نے چاہا کہ اسے فنا کردیں، ایسا ان کے بس میں نہیں ہوا تو انھوں نے دوسرا داؤ کھیلا کہ ان مدارس کے نصاب میں، ان کے طریقۂ کار میں ایسی چیزیں داخل کردیں جو بظاہر دیکھنے میں خوشنما ہوں، لیکن انجام یہ ہوگا کہ یہ دین کی ڈگر سے منحرف ہوکر محض دنیا کی راہ اختیار کرلیں گے، یہ بات بڑی وضاحت سے سمجھ لینی چاہئے کہ دنیا طلبی، جاہ پرستی اور دولت و ثروت کی دیوانہ وار عشق و وارفتگی کے سمندر میں یہ مدارس دین و ملت کے محفوظ جزیرے ہیں جہاں مذہب اسلام کے سرمایہ کی حفاظت کی جاتی ہے، اگر ان میں وہ چیزیں داخل کردی گئیں، یا انھیں داخل ہونے کا راستہ دے دیا گیا جن کو دین سے مناسبت کم اور دنیا سے مناسبت زیادہ ہے، تو دیر نہیں گزرے گی کہ دین و ملت کے جزیرے دنیا پرستی کے سمندر میں غرقاب ہوجائیں گے، ہم دیکھتے ہیں کہ جن مدارس نے دنیا کی ان ہواؤں کو اپنے حصار میں آنے کی اجازت دی، وہاں دین مغلوب ہوچکا ہے، اور دنیا پرستی غالب ہوگئی ہے۔ **والعاقل تکفیه الاشارة**

مدارس اسلامیہ کے لئے وہی ڈگر ضروری ہے جو دارالعلوم دیوبند کے لئے اس کے مقدس اور زیرک بانیوں نے متعین کی ہے، جہاں قال اللہ وقال الرسول کی صدائیں گونجتی ہوں اور جہاں رات کے آخری حصے میں ذکر الٰہی کے زمزمے دلنواز ہوتے ہوں، جہاں دنیا طلبی پر دینداری کی حکومت ہو، جہاں اللہ و رسول کی وفاداری میں دنیا کے ہر تقاضے کو ٹھکرا دیا گیا ہو، جس میں رہنے بسنے والے دور حاضر کے اپٹوڈیٹ نہ ہوں، بلکہ قرون اولیٰ کے نمونے اور یادگاریں ہوں، دور حاضر چاہے جتنا ان پر ہنسے، انھیں بنیاد پرست سمجھے، انھیں ارذل اور بادی الرای (چھوٹا اور بیوقوف) قرار دے، انھیں کوئی پرواہ نہ ہو، کیونکہ دنیا پرستوں کی یہ

پرانی رسم رہی ہے کہ وہ اللہ ورسول کے ماننے والوں پر چھینٹے اڑاتے ہیں، ان کا حال یہ ہے کہ: وَاِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ (البقرۃ:۱۳) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جس طرح یہ لوگ ایمان لا چکے ہیں، تم بھی ایمان لاؤ، تو یہ دنیا پرست کہتے ہیں کہ کیا ہم اس طرح ایمان لائیں جیسے بیوقوف لوگ ایمان لائے ہیں۔ جس کی نظر دنیا سے اوپر اٹھ کر آخرت پر جم چکی ہے، اسے یہ دنیا دار بیوقوف کہتے ہیں۔

اس طرح کے لوگ چاہتے تو یہ ہیں کہ یہ مدارس فنا ہو جائیں اور جس چیز کو یہ مدارس زندہ رکھنا چاہتے ہیں وہ موت کے گھاٹ اتر جائے، مگر مسلمانوں کو دین ومذہب سے جو مضبوط اور گہرا تعلق ہے اسے دیکھ کر یہ ڈرتے ہیں کہ ان کا یہ ارادہ پورا نہ ہوگا تو وہ انھیں ایسی راہ پر لگانا چاہتے ہیں اور انھیں ایسا نصاب تعلیم قبول کرنے کی تلقین کرتے ہیں جو بظاہر خوش نما اور دلآویز ہے، لیکن اس پر چلنے اور اسے قبول کرنے سے مدارس کا ڈھانچہ تو رہ جائے مگر اندر سے اس کی روح اور طاقت فنا ہو جائے، جیسے انگریزوں کے نظام ونصاب تعلیم نے مسلمانوں کا نام تو باقی رکھا، مگر اندر سے بہتوں کی اسلامی روح کو نکال باہر کر دیا ہے۔ اکبر مرحوم نے کس قدر سچی بات کہی ہے ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اور کچھ ایسے لوگ بھی دنیا کی ملمع کاری کے فریب میں آ گئے، جو دل سے مخلص ہیں وہ اسلام اور مسلمانوں کو تازہ دم دیکھنا چاہتے ہیں، لیکن دنیاداری کے غوغا سے وہ متاثر ہوئے، اور انھوں نے اپنی سادگی یا کم علمی کی وجہ سے اسی راہ کو اختیار کرنا پسند کیا جو بظاہر خوشنما مگر حقیقت میں تباہ کن ہے، دنیادار حکومتوں نے شکار کا ایک جال بچھایا، اور اس میں معاشی سہولیات کے پُرفریب دانے ڈال دئے، اور ان دانوں کی افادیت اس طرح ظاہر کی، کہ شکار کا جال نگاہوں سے اوجھل ہو گیا، معاشی آسانیوں کی لالچ نے جال کو بھی اوجھل کیا اور

اصل دینی تعلیمات سے بھی غافل کر دیا، پھر کتنے لوگ جو مدارس کے مخلص ذمہ دار تھے اس جال میں پھنس گئے، اب اس جال کے جو نتائج سامنے آ رہے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ کچھ سے کچھ ہو گیا ہے۔

حضرت امام مالک **علیہ الرحمہ** کا ارشاد ہے کہ: **لن یصلح آخر هذه الامة إلا بما صلحت به أولها** ، اس امت کا پچھلا دور کسی اور طریقے سے نہیں اسی طریقے سے درست ہو سکتا ہے جس طریقے سے پہلا دور درست ہوا تھا۔

نئے نئے طریقے، نئے نئے نصاب، نئے نئے نظام، خواہ بظاہر وہ کتنے ہی دل فریب اور خوش نما ہوں، مدارس کے لئے کچھ مفید نہیں، مفید وہی طریقہ ہے، وہی نظام ہے جسے فرسودہ اور آثار قدیمہ کہا جاتا ہے خواہ لوگوں کو یہ بات کتنی ہی گراں گزرے۔

(اگست، ستمبر ۲۰۱۱ء)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صدمات کی یورش اور پروردگار کی مہربانیاں

سلسلۂ قادریہ کے ایک بڑے شیخ حضرت حافظ محمد صدیق صاحب علیہ الرحمہ (متوفی: ۸ جمادی الآخر ۱۳۰۸ھ) ہیں، جن کی خدمت میں حضرت مولانا عبید اللہ سندھی علیہ الرحمہ نے اسلام قبول کیا تھا اور انھیں کی دعاء سے وہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب علیہ الرحمہ کی خدمت میں پہونچے تھے۔ وہ بزرگ درد گردہ کی تکلیف میں عرصہ تک بیمار رہے، انھیں بہت شدت کا درد ہوتا تھا، اس وقت انھیں بڑی بے چینی ہوتی تھی، اس بے قراری میں جو کچھ ان کی زبان پر جاری ہوتا تھا، وہ سننے کے لائق ہے، فرماتے تھے

لطف سجن دم بدم　　قہر سجن گاہ گاہ
اوں بھی سجن واہ واہ، ایں بھی سجن واہ واہ

سجن کے معنی محبوب کے ہیں، مطلب یہ ہوا کہ محبوب کی مہربانیاں تو بار بار ہیں، البتہ کبھی کبھی وہ مہربانیاں بشکل قہر وجلال بھی ظاہر ہوتی ہیں، تو ہمارا حال یہ ہے کہ مہربانیاں ہوں تو وہ بھی محبوب اور بہت خوب ہے، اور قہر وجلال ہو، تو وہ بھی محبوب ہے اور واہ واہ ہے۔

حق تعالیٰ معبود بھی ہیں اور محبوب بھی ہیں، عبادت کا نذرانہ بھی انھیں کی بارگاہ میں ہے اور محبت کی سوغات بھی انھیں کیلئے ہے، بندگی اور محبت دونوں جمع ہوں تو انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو انسانیت کے اسی کمال کی تعلیم دی ہے، ے

ہر چہ رسد از دوست نیکوست

محبوب اور دوست کی بارگاہ سے جو کچھ ملے سب بہتر ہے، البتہ عنایت ومہربانی مختلف رنگوں میں آتی ہے، کبھی لطف وکرم کی شکل میں آتی ہے تو آدمی خوش ہوتا ہے، مطمئن ہوتا ہے، کبھی برنگ قہر وجلال آتی ہے تو آدمی گھبراتا اور فریاد کرتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بھی فضل وکرم ہی کا ایک انداز ہوتا ہے۔

حق تعالیٰ کی مہربانیوں کے یہ دونوں رنگ باہم دگر ہم آغوش ہوکر آتے رہتے ہیں، کبھی آدمی خوش وخرمی سے نہال ہوتا ہے، کبھی پریشانی وبے قراری سے بدحال ہوتا ہے، لیکن ایمان کی دولت اسے مطمئن رکھتی ہے، وہ ہر حال کو حق تعالیٰ کا انعام وافضال سمجھتا ہے۔

ابھی دوتین ماہ پہلے یہ خاکسار اور اس خاکسار کا چھوٹا سا خاندان حالات کی ناسازگاری کے تھپیڑوں کی زد میں آ گیا تھا، ایسا لگتا تھا کہ متاع صبر وقرار لٹ کر رہے گی، اور خرمن سکون واطمینان جل کر رہے گا، مگر اللہ کی مہربانی تھی جس نے سہارا دے دیا۔

ذوقعدہ ۱۴۳۲ھ کی تین تاریخ تھی اور اکتوبر ۲۰۱۱ء کی دوسری تاریخ، اتوار کا دن تھا۔ ان سطور کا راقم درس قرآن کے لئے اعظم گڈھ شہر جا رہا تھا، راستہ میں تھا کہ غازی پور سے فون آیا کہ میرے فرزند عزیز مولوی محمد عابد سلّمہٗ کا لخت جگر برخوردار زاہد جو گھر بھر کی آنکھوں کا نور تھا، سب کا پیارا تھا، ننہال میں بیمار ہے، اس کے لئے دعا کیجئے، پھر مغرب کی نماز کے بعد درس سے فراغت ہوئی، اطلاع آئی کہ یہ چار سالہ بچہ دنیا سے منہ موڑ کر چلا گیا اور گھر کا نور غائب ہوگیا، انا اللہ وانا الیہ راجعون

مجھے دہرا صدمہ ہوا۔ ایک تو پوتے کی موت کا غم، دوسرے اپنے لخت جگر کے صدمے کا غم! لیکن اب کیا ہوسکتا ہے، پیدا ہونے سے پہلے ہی موت کا وقت متعین ہو چکا ہوتا ہے، غم تو بہت دل گداز تھا بلکہ جاں گداز تھا، مگر اللہ نے صبر ورضا کی توفیق بخشی۔ مولوی محمد عابد سلّمہٗ مدرسہ شیخ الہند انجان شہید میں تھے، ان سے ملنا، اس صدمہ پر صبر کی تلقین کرنا بڑا صبر آزما مرحلہ تھا، مگر بہر حال اس سے دوچار ہونا تھا، انجان شہید گیا، انھیں اور ان کے

چھوٹے بھائی مولوی محمد عامر سلّمہٗ کو گھر لایا، پھر رات ہی میں انھیں غازی پور بھیجا، صبح اپنے گھر والوں کو لے کر غازی پور گیا، عزیزم حاجی عبداللہ سلّمہٗ جو بچے کے نانا تھے، سراپا تصویرِ غم بنے ہوئے، پورا گھرانا سوگوار تھا۔ ساڑھے دس بجے نماز جنازہ ہوئی، کانپتی آواز میں اس خاکسار نے نماز جنازہ ادا کی۔

صدمے سے دل زخمی تھا، مگر حق تعالیٰ نے دستگیری فرمائی، چندروز کے بعد اطلاع آئی کہ حج کی درخواست جو التوا میں پڑی ہوئی تھی قبولیت سے سرفراز ہوئی۔ میں اور میرے دو بیٹے عزیزم مولوی حافظ محمد راشد سلّمہٗ اور عزیزم مولوی حافظ محمد عرفات سلّمہٗ کی ہمراہی میں حج کی منظوری آگئی، ساتھ میں پورہ معروف کے بہت ہی عزیز وقریب حاجی محمد نعمان سلّمہٗ اور ان کی اہلیہ کی بھی منظوری تھی، سفرِ حج کی منظوری نے صدمہ کے بوجھ کو ہلکا کردیا۔

۱۶/اکتوبر کو لکھنؤ سے فلائٹ تھی، ہمارا قافلہ ۱۵/اکتوبر کو کیفیات اکسپریس سے لکھنؤ کے لئے روانہ ہوا، لکھنؤ میں ہمارے میزبان ابرار احمد صاحب اور ان کے دونوں فرزند محمد عامر اور محمد عارف سلمہما تھے، ان لوگوں نے بہت خدمت کی، اللہ تعالیٰ انھیں دنیا وآخرت کی عافیت سے نوازے۔ آمین

ہماری پہلی منزل دربارِ رسالت کی حاضری تھی، بحمد اللہ اطمینان وعافیت سے مدینہ شریف پہونچے، مدینہ شریف میں اہل محبت بہت ملے۔ مولانا حافظ محمد مسعود صاحب اور نسیم بھائی پاکستان کے ملے، عزیزم محمد نعیم، حافظ دلشاد احمد اور جہانا گنج کے انظر سلّمہٗ سے ملاقاتیں رہیں، ان سب بزرگوں اور عزیزوں نے حق محبت اور حق خدمت خوب ادا کیا۔ آٹھ روز مدینہ شریف میں قیام کی سعادت حاصل ہوئی، مفتی عاشق الٰہی مہراج گنجی مدظلہ اور مولانا ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صاحب اعظمی مدظلہ سے ملاقاتیں رہیں۔

۲۶/اکتوبر کو مکہ شریف حاضری ہوئی، عزیزیہ میں اقامت گاہ ملی، ۵/نومبر، ۹/ذی الحجہ کو حج کا دن تھا، ۸/کی رات میں منیٰ حاضری ہوئی، ۹/کو عرفات میں حج کی سعادت حاصل ہوئی۔

مدینہ شریف میں سفر کی تکان نے دبایا تو بخار بدن پر چھا گیا، اپریل کے اواخر میں میری طبیعت بہت خراب ہوگئی تھی۔ جونپور کے ماہر اور بزرگ طبیب حکیم رئیس عالم صاحب کو دکھایا، تو انھوں نے میعادی بخار تشخیص کیا، اور یہ کہ یہ بخار بہت عرصہ سے ہے، اس وقت غذا بالکل بند ہوگئی، کھانا دیکھتے ہی طبیعت بگڑنے لگتی اور متلی کی سی کیفیت چھا جاتی، عرصہ سے صرف چائے میں تھوڑی سی روٹی توڑ کر کھا پاتا تھا، حکیم صاحب نے متواتر تین ماہ تک علاج کیا، اللہ نے شفا بخشی، کھانا کھانے لگا، رمضان بخیر گزرا۔ حج کے سفر میں تکان ہوئی تو بخار پلٹ پڑا اور کھانے کی سابقہ کیفیت لوٹ آئی، غذا بند ہوگئی، کچھ انگریزی دوائیں استعمال میں رہیں، مگر ضعف واضمحلال بڑھتا ہی رہا، حج سے پہلے نوبت یہ تھی کہ بخار ہمہ دم رہتا، غذا ساقط ہوگئی، طاقت نام کی کوئی چیز بدن میں نہ رہی، چلنا پھرنا دوبھر ہوگیا، حرم کی حاضری سے محرومی طویل ہوگئی۔ میرے بچے اور رفقاء پریشان تھے، ایک ویل چیر کا انتظام کیا گیا، منیٰ کی حاضری میں کوئی اسے اٹھالے گیا، مفتی عبدالرحمٰن صاحب غازی پوری سلّمہٗ نے دوسری ویل چیر کا انتظام کیا، عرفات سے مزدلفہ، مزدلفہ سے منیٰ کی حاضری ویل چیر پر ہوئی، مفتی صاحب نے راحت رسانی اور خدمت کا حق اس طرح ادا کیا کہ میں شرمندہ ہو ہو کر رہا، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے دنیا وآخرت کی تمام راحتیں اور خوشیاں انھیں عطا فرمائیں۔

۱۰؍ ذی الحجہ کو شام کے وقت منیٰ میں میری طبیعت زیادہ خراب ہوگئی، بخار اور الٹی کی شکایت بڑھ گئی، مجبوراً میں اپنی قیام گاہ عزیزیہ پر آ گیا اور پھر مسلسل طبیعت خراب ہی رہی، اللہ نے رمی اور طواف زیارت کا مرحلہ محض اپنے فضل وکرم سے آسان فرمادیا۔

حج کے معاً بعد گھر سے اطلاع ملی کہ برخوردار مولوی حافظ محمد عابد سلّمہٗ کا دوسرا بیٹا محمد ساجد جس کی عمر سال بھر ہے، بہت بیمار ہوگیا، اسے اعظم گڈھ بچوں کے ایک معالج کے یہاں ہسپتال میں بھجوایا، معلوم ہوا کہ نمونیہ بہت شدید ہے، کافی توجہ اور اہتمام سے علاج ہوا، پانچ چھ روز میں اللہ نے صحت عطا فرمائی، ۱۵؍ نومبر کو لے کر گھر آ گئے۔ شام کے وقت گھر سے فون پہونچا کہ محمد ساجد کا انتقال ہوگیا، طبیعت دھک سے ہو کر رہ گئی، دل تو پہلے ہی زخمی

تھا، اب یہ زخم شدید ہوگیا، بڑی مشکل سے محمد عابد سلّمہٗ کو چند کلمات تعزیت اور صبر و تسلی کے کہے، ناظم مدرسہ مولانا انتخاب عالم قاسمی سلّمہٗ نے تجہیز و تکفین نیز مولوی محمد عابد سلّمہٗ کے صبر و تسلی کا اہتمام کیا۔ ہم لوگ دور تھے، حق تعالیٰ سے دعائیں کرتے رہے، برخوردار محمد عرفات سلّمہٗ نے یہ پوری رات مسجد حرام میں دعا و مناجات میں گزاری۔

حج کے ارکان کی ادائیگی اور تکمیل کے بعد ایک اور مریض مل گئے، ان کے اصرار پر یہ طے ہوا کہ ہم لوگ وقت سے پہلے وطن کے لئے روانہ ہوجائیں، میری واپسی کی تاریخ ۳۰؍نومبر متعین تھی، مگر دوسرا ٹکٹ ۱۷؍نومبر کا لے لیا گیا، میں اور میرے دونوں برخوردار ۱۷؍نومبر کی فلائٹ سے دلی آگئے۔ ۱۸؍کو بنارس پہونچے، بنارس میں ہمارے میزبان حاجی منظور احمد صاحب نے میری علالت کی جو کیفیت دیکھی تو مشورہ دیا کہ یہیں سے پہلے جون پور چلا جائے، حکیم صاحب کو دکھایا جائے، پھر شیخوپور واپسی ہو، چنانچہ ہمارا قافلہ اولاً جونپور گیا، حکیم صاحب نے کرم کیا، وہ ساتھ میں شیخوپور آئے، دوائیں تجویز کیں، ان کا استعمال شروع ہوا۔

یہ جمعہ کا دن تھا، سنیچر اور اتوار کا دن کافی کمزوری اور بیماری میں گذرا، اتوار کا دن گزار کر رات جو آئی تو آنکھوں سے نیند غائب تھی، ڈیڑھ بجے کے بعد کچھ آنکھ لگی۔

۲۴؍ذوالحجہ ۲۰؍نومبر سوموار کو علی الصباح آنکھ کھلی، وضو کرنے بیٹھا تو زبردست متلی شروع ہوگئی، بہت دیر تک خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا، طبیعت بالکل نڈھال ہوگئی، بڑی دیر کے بعد سکون ہوا، تو مصلیٰ بچھا کر نماز کے لئے ہاتھ اٹھا رہا تھا کہ کمرے میں میرے دو بیٹے مولوی حافظ محمد عارف اور مولوی محمد حافظ محمد راشد سلّمہما داخل ہوئے، میں چونکا کہ اتنے سویرے یہ دونوں بھائی کہاں؟ عارف نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا کہ ولی الحق سالم کا انتقال ہوگیا، سالم عزیزم محمد راشد سلّمہٗ کا بیٹا تھا جو ابھی رمضان شریف میں پیدا ہوا تھا۔ اس ناگہانی اطلاع سے خرمن صبر و قرار پر بجلی سی گری اور میں نماز میں مشغول ہوگیا۔ کوئی بیماری تھی؟ کوئی تکلیف تھی؟ کچھ نہ تھا، بس مشیتِ الٰہی تھی، عمر پوری ہوچکی تھی، جہاں سے آیا اور جیسا

آیا تھا، وہیں اور ویسا ہی پاک صاف بے حساب چلا گیا۔

اس تیسرے حادثہ نے پچھلے دونوں حادثوں کی یاد پھر تازہ کر دی، طبیعت نڈھال ہوگئی، دس بجے اس کا جنازہ اٹھا، مولانا انتخاب عالم صاحب قاسمی نے نماز جنازہ پڑھائی، اس موقع پر بھی تمام انتظامات انھیں کی نگرانی میں انجام پائے۔

ان تینوں حادثوں نے طبیعت کو چور چور کر کے رکھ دیا، مگر بندہ کو بجز تسلیم ورضا کے اور کچھ چارہ نہیں، جو کچھ ہمارے پاس تھا وہ اللہ ہی کا تھا، اور جو کچھ ہے وہ اللہ ہی کا ہے، انھیں اپنے بندوں میں ہر تصرف کا اختیار اور حق ہے، اور وہی عین حکمت وفضل ہے، وہ کچھ لیتے ہیں تو بہت کچھ دیتے ہیں۔

نیم جاں بستاند وصد جاں دہد　　آنچہ در وہمت نیاید آں دہد

وہ آدھی جان لیتے ہیں اور سو جان عطا کرتے ہیں، وہ کچھ دیتے ہیں جس کا تمہیں تصور بھی نہیں ہوگا۔

چنانچہ حق تعالیٰ کی رحمت ومہربانی کی یہ بڑی جلوہ گاہ تھی، تین پوتے گئے، صحت کو نقصان پہونچا، لیکن بے شمار اہل محبت ملے، ان کی ہمدردیاں ملیں، ان کی دعائیں ملیں، ان کی طرف سے تسلیاں ملیں، وہ وہ انعامات ملے جن کا تصور بھی نہیں ہوسکتا تھا، پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ تین معصوم جانیں، پاک صاف خدا کے حضور پہونچ کر اپنے ماں باپ کے لئے سفارش کرنے والی ہوگئیں، اللہ تعالیٰ ان معصوم اور بے گناہ جانوں کو اپنے آباء واجداد کے مغفرت ونجات کا سامان بنائیں۔

مکہ شریف سے واپسی کے بعد برخوردار عزیزم مولوی حافظ محمد راشد سلّمہٗ نے مجھ سے کہا تھا کہ بھائی مولوی محمد عابد پر دو بیٹوں کے انتقال کا صدمہ اور اثر شدید ہے، چند کلمات تعزیت اور تسلی کے ان کیلئے لکھ دیں، چنانچہ جمعہ کی واپسی کے معاً بعد سنیچر کو میں نے ایک مفصل خط عابد سلّمہٗ کے نام لکھا، پھر اتوار کو راشد سلّمہٗ کے فرزند کا انتقال ہوگیا۔ وہ خط بھی ذیل میں درج کیا جارہا ہے۔

☆☆☆☆☆

فرزند عزیز! **عافاک اللہ وأعاذک من الشرور والبلایا**

السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ

رات کے بارہ بج رہے ہیں، میں سونے کی کوشش کررہا تھا مگر تمہارا صدمہ یاد آتا ہے اور نیند آنکھوں سے اُڑ گئی ہے، اپنے آپ کو تسلی دے رہا ہوں، تمہارے لئے دعائیں کررہا ہوں مگر کلیجہ ہے کہ چھلنی ہوا جارہا ہے، بڑی دیر سے کشمکش میں ہوں، تمہارے دل کا، دل کے حال کا خیال اس قدر بے چین کئے ہوئے ہے کہ بے اختیار اٹھ کر یہ سطریں لکھ رہا ہوں، اللہ کرے تمہارے لئے یہ حروف باعث تسکین وتسلی ہوں۔

میرے بیٹے! صدمہ بڑا ہے مگر یہ سوچو کہ جس پاک پروردگار نے یہ امانت تمہیں سپرد کی تھی، اب اسی نے یہ امانت جیسی سونپی تھی ویسی ہی واپس لے لی، اس پر کسی طرح کے گناہ کا داغ دھبہ نہیں لگا، اب یہ تمہاری امانت ہے جو سب سے بڑے امانت دار کے پاس پہونچ گئی ہے، وہ اس امانت کو سنبھال کر رکھیں گے، اس کی پرورش کریں گے اور ایسے وقت میں تمہارے حوالے کریں گے جب سب سے زیادہ ضرورت کا وقت ہوگا، اس وقت یہ امانت تمہیں اس درجہ کام آئے گی جس کی کوئی حد وانتہا نہیں، تمہاری تین امانتیں وہاں محفوظ ہیں، حافظ مسعود صاحب کہہ رہے تھے کہ یہ تینوں بحکم حدیث نبوی ماں اور باپ کو سیدھے جنت میں پہونچا کر رہیں گی، آج کا صدمہ بہت بڑا صدمہ، کل کی عظیم سعادت ثابت ہوگی۔ ان شاء اللہ

میرے بیٹے! ہم سب کے آقا ومولیٰ رسول کریم ﷺ جو سرچشمۂ محبت ورحمت ہیں، بڑھاپے میں انھیں ایک بیٹا ملا، ۱۷/ ماہ کا ہوا، اور حق تعالیٰ نے واپس لے لیا، بڑھاپے کی اولاد تھی، صدمہ ہونا تھا ہوا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے، دل زخمی ہوا، لیکن فرماتے ہیں: **لا نقول إلا بما یرضیٰ ربنا وإنا بفراقک یا ابراھیم لمحزونون**، صدمے کا انکار نہیں، مگر حق تعالیٰ کی مشیّت پر راضی رہنا حقِ بندگی ہے۔

خدا کی مہربانی تو دیکھو! بندہ اپنے بیٹے کی، اپنے ثمرۂ قلب کی اور اپنے جگر گوشے کی

موت پر صبر کرتا ہے، اللہ کی حمد کرتا ہے، اس کے فیصلے پر راضی رہتا ہے تو حق تعالیٰ جنت میں ایک گھر صرف اس تقریب میں اس کے لئے تعمیر کرتے ہیں، جس کا نام ''**بیت الحمد**'' رکھتے ہیں، زہے نصیب کہ ''**بیت الحمد**'' نصیب ہوا۔

حضرت کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا بچہ آخری وقت میں ہے، آپ فرماتے ہیں **إن للہ ما اعطیٰ وله ما اخذ فلتصبر ولتحتسب**، جو کچھ دیا وہ بھی اللہ کا اور جو کچھ لیا وہ بھی اللہ کا، پس صبر کرنا چاہئے اور ثواب کا امیدوار رہنا چاہئے، یہی بات رسول نے اپنے ہر امتی سے فرمائی ہے، تم بھی انھیں کے امتی ہو، بس صبر کرلو اور اجر کی امید رکھو۔

اور سنو! حضرت نے فرمایا ہے کہ صدمہ کے وقت اس طرح رضا کا اظہار کرو اور دعا کرو، ''**إِنَّاللّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ** ''، ''**أَللّٰهُمَّ أُجُرْنِيْ فِيْ مَصِيْبَتِيْ وَاخْلُفْ لِيْ خَيْراً مِّنْهَا**''۔ پھر دیکھو کہ حق تعالیٰ کی جانب سے کیا کیا نعمتیں ملتی ہیں۔

میرے عزیز بیٹے! اللہ کی مہربانی بہت بڑی ہے، اسے ہر وقت دھیان میں رکھو، بلاشبہ تمہیں اس وقت بڑا بھاری خلا محسوس ہو رہا ہے، میں سوچتا ہوں تو تڑپ جاتا ہے، مجھے تمہاری محبت بے چین کئے ہوئے ہے، مگر اس خلا کو اللہ کی محبت سے، اللہ کی یاد سے، اللہ سے امید رکھنے سے، اللہ کی مہربانی سے پُر کرلو، دنیا کی ہر چیز فانی ہے، ہر تعلق کے لئے زوال ہے، سب کچھ مٹ جانے والا ہے، ایک اللہ کا تعلق ہے جو لازوال ہے، یہ ہمہ دم کا رفیق ہے، دنیا کی ہر دولت ختم ہونے والی ہے، ایک تعلق مع اللہ ہے جس کے لئے فنا نہیں ہے، دل جتنا زخمی ہو چکا، ہو چکا، اب اس پر صبر و رضا کا مرہم لگا دو، تمہارے لئے بہت دعائیں ہوئی ہیں، تمہارے کمزور باپ نے بھی کی ہیں، بزرگوں سے کرائی ہیں، حضرت شیخ نے کی ہیں، حافظ مسعود صاحب اور مفتی عبدالرحمٰن صاحب نے کی ہیں، اور مکہ اور مدینہ میں بہتوں نے کی ہیں، اللہ تمہیں صبر و سکون عطا فرمائیں۔

اس دن جب خبر ملی تو عرفات حرم میں تھا، اسے جب خبر ہوئی تو وہ رات میں قیام

گاہ پر آیا ہی نہیں، پوری رات آغوش کعبہ میں رہا، طواف کرتا رہا، دعائیں کرتا رہا، فجر کی نماز کے بعد آیا۔

میرے بیٹے! تمہارے اس حادثے نے سب کو ہلا ڈالا، راشد سخت پریشان اور مضطرب رہا، اس وقت تمہارے لئے اتنی دعائیں ہوئیں کہ بس اللہ ہی جانتا ہے۔

یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور میرا دل رحمت خداوندی کے دریا میں ڈوب رہا ہے، ہاتھ تھرتھرا رہا ہے، دل ہل رہا ہے، میں تمہیں یقین دلا رہا ہوں کہ حق تعالیٰ کی رحمت نے تمہارا احاطہ کرلیا ہے۔

آگے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ہر صدمے سے محفوظ رکھیں، اپنی لامتناہی رحمتیں عطا فرمائیں، جانے والے کا نعم البدل روزی فرمائیں، اور جنت میں لے جانے کے لئے ان تینوں بچوں کو مضبوط سفارشی بنادیں، تمہارے لئے بھی اور تمہاری اہلیہ کے لئے بھی یہ سطریں لکھ دی ہیں، حق تعالیٰ قلب کو خوب صبر وضبط عطا فرمائیں۔

والسلام

سوگوار وضعیف باپ
اعجاز احمد اعظمی

۲۲/ذوالحجہ ۱۴۳۲ھ

(ماہنامہ ضیاء اسلام: دسمبر ۲۰۱۱ء)

☆☆☆☆☆

بسم الله الرحمن الرحيم

منیٰ کا حادثہ

(سفر حج ۱۴۱۷ھ / ۱۹۹۷ء)

۸؍ ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ کو (سعودی تقویم سے) منیٰ میں زبردست آگ لگی، مناسک حج کی ادائیگی کا آغاز اسی تاریخ سے ہوتا ہے۔ ۸؍ کی صبح ہوتے ہی حجاج کے قافلے **لَبَّیْکَ أَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ** کی صدا لگاتے ہوئے مکہ مکرمہ سے منیٰ کی طرف روانہ ہوجاتے ہیں۔ منیٰ ایک طویل وعریض میدان ہے جس میں لاکھوں خیمے نصب ہوتے ہیں، یہاں مجموعی اعتبار سے حجاج کا قیام چار دن ہوتا ہے، ۸؍ کو فجر کے بعد پہونچتے ہیں۔ ۹؍ کو طلوعِ آفتاب کے بعد عرفات کے لئے روانہ ہوتے ہیں، ۱۰؍ کو طلوعِ آفتاب کے بعد پھر منیٰ میں آجاتے ہیں، پھر ۱۰؍۱۱؍۱۲؍ کا قیام منیٰ میں ہوتا ہے، اس لئے منیٰ میں قیام اور دوسری ضروریات کا انتظام بہت اعلیٰ پیمانے پر کیا جاتا ہے۔ حجاج کے قیام کے لئے پورے منیٰ کو خیموں کا شہر بنادیا جاتا ہے، سرزمین عرب کی شدید گرمی، پھر کپڑوں کے خیمے، گنجان آبادی، تمام خیمے ایک دوسرے سے متصل، پھر کھانا پکانے کے انتظامات، آگ لگنے کا مکمل سامان موجود ہوتا ہے لیکن جیسے وہاں کی ہر چیز بلکہ ہر انتظام معجزہ معلوم ہوتا ہے، یونہی تمام اسباب وحوادث کے ہوتے ہوئے کوئی حادثہ نہ ہونا بھی حق تعالیٰ کا خاص فضل وکرم اور ہمارے حق میں معجزہ ہی ہے، تاہم منیٰ میں کبھی کبھی آگ لگنے کی واردات ہو ہی جاتی ہے مگر اس سال جو آگ لگی، اس کی نوعیت پچھلے حادثات سے قدرے جداگانہ ہے۔

پچھلے برسوں میں جو کبھی آگ لگی ہے، وہ عموماً عرفات ومزدلفہ سے واپسی کے بعد ۱۰؍۱۱؍ کو لگی ہے۔ ۸؍ ذی الحجہ کو عرفات میں جانے سے قبل آگ لگنے کا شاید یہ شاذ واقعہ ہے۔

دوسرے یہ کہ جب کبھی آگ لگی ہے، ہلکی پھلکی لگی ہے، جس میں اگر خیمے جلے ہیں تو سیکڑوں کی تعداد میں، اور اس پر فوراً قابو پالیا گیا۔ معمولی طور پر کچھ لوگ زخمی ہوجاتے تھے، لیکن یہ آگ بہت ہمہ گیر تھی۔ آگ کہاں سے لگی؟ اور کیسے لگی؟ اس کو متعین طور سے کوئی نہیں بتا پاتا، بس یہ ہے کہ آگ لگی اور ہوا تیز ہوئی، اس سے آگ دوسرے خیموں تک لپکتی چلی گئی۔ خیموں کے مختلف حلقے ہوتے ہیں، ایک حلقے میں سیکڑوں خیمے ہوتے ہیں، ہر حلقے کے ایک کنارے پر شیڈوں سے گھرا ہوا، باورچی خانہ ہوتے ہیں، اس میں پکانے کے لئے اسٹوپ اور گیس سلنڈر اور چولہے وغیرہ ہوتے ہیں۔ آگ جب پھیلی ہے تو گیس سلنڈر گرم ہوہوکر پھٹنے لگے، ان کے پھٹنے سے بم جیسی آواز ہوتی تھی، اور اس کے شرارے فضا میں بلند ہوکر دور دور گرتے تھے، ہوا اتنی تیز اور پھر شراروں کی ہلاکت خیزی ہے، دوہری قیامت کا منظر تھا، اب کی خیمے سینکڑوں کی تعداد میں نہیں ہزاروں کی گنتی میں جلے، اور وہ بھی صرف چند ہزار نہیں، بلکہ اندازہ یہ ہے کہ تقریباً ستّر ہزار خیمے جلے، اتنی بڑی آگ سے شاید اب تک کی تاریخ خالی ہے۔

جتنی زبردست یہ آگ تھی، حقیقت یہ ہے کہ اس میں جانی نقصان بہت ہونا چاہئے تھا، لیکن آگ کی ہولناکی کے تناسب سے واقعہ یہ ہے کہ جانی نقصان کچھ بھی نہیں ہوا، ہر خیمے میں دس بارہ آدمی ہوتے ہیں، سات آٹھ لاکھ آبادی کے خیمے جلے اور جانی نقصان کتنا ہوا؟ ہزار یا چند ہزار! بس اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت تھی، جو لوگ اس میں شہید ہوگئے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ وہ لوگ اپنی قسمت پر ناز اور دوسرے لوگ رشک اس وقت کریں گے جب وہ لبیک پکارتے ہوئے میدانِ قیامت میں اٹھیں گے، اور جو لوگ زخمی ہوئے اور انھوں نے صبر کیا، ان کے اجر وثواب کا کوئی اندازہ ہی نہیں۔ محفوظ رہ جانے والوں نے گویا دوسری زندگی پائی۔

لوگ آگ لگنے کا سبب تلاش کرتے ہیں، یعنی یہ کہ آگ لگنے کی ابتداء کیونکر ہوئی؟ لیکن اس سوال کا متعین جواب مشکل ہے، کیونکہ آگ لگنے اور اس کے پھیلنے میں اتنی تیزی تھی کہ اس کے آغاز کا پتہ لگانا ممکن نہیں۔ ایک مومن کا یقین ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی

مشیّت سے ہوتا ہے، اور مصائب کفارۂ ذنوب بن کر آتے ہیں، یا اس سے درجات بلند ہوتے ہیں، یا اس سے صدق دل کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ کرنا منظور ہوتا ہے۔

حج کا اجتماع ہوتا تو محض اللہ کی عبادت کے لئے اور عمومی طور پر لوگ اللہ کی بندگی میں لگے ہوئے ہوتے ہیں، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ حاجیوں کے اس جم غفیر میں غفلت وسرمستی کے مظاہر بھی بہت ہوتے ہیں۔ ساری دنیا کے لوگ مجتمع ہوتے ہیں، مسائل سے ناواقفی عام ہوتی ہے، پھر عموماً اس کی پرواہ بھی نہیں کی جاتی، نہ مسائل سیکھنے کا اہتمام ہوتا ہے، مکہ مکرمہ کے بازار مختلف قسم کے دلفریب سامانوں سے پٹے ہوتے ہیں، ایک بڑا مجمع ہر وقت اسی اہتمام میں رہتا ہے کہ کیا کیا خریدیں۔ اتنے متبرک مقامات اور اتنے مقدس اوقات میں اتنی زیادہ غفلت کیا نتائج پیدا کرے گی؟ آگ لگی، ظاہری طور پر خیمے جلے، سامان جلے، کچھ لوگ بھی جلے، مگر غفلت کی خس وخاشاک بھی جل گئی، آگ لگنے کے بعد سے پورے ایام حج میں حاجیوں پر اِنابت، شکستگی، رجوع الی اللہ کی کیفیت، دعا میں گریہ وزاری اور اللہ تعالیٰ سے استعانت اور ایک دوسرے کی ہمدردی وغمخواری کا جو منظر سامنے آیا، عام حالات میں اس کی توقع ہرگز نہیں ہوسکتی تھی، حج کی جو روح ہے یعنی سب سے کٹ کر اللہ کی طرف متوجہ ہونا، ان کے حضور گریۂ وزاری کرنا، توبہ واستغفار میں مشغول ہونا، یہ روح آگ کی اس شدید لہر نے تمام حاجیوں کے دل میں پیدا کردی۔

تاہم قلوب پر غفلت کا اتنا شدید تسلط ہے کہ عرفات ومنیٰ میں کچھ ایسے لوگ بھی نظر آتے رہے، جنھیں بجز کھانے پینے اور لایعنی کاموں کے جیسے اور کچھ مشغلہ نہیں رہتا۔ عرفات میں زوال آفتاب سے وقوف کا وقت شروع ہوتا ہے، حج کا سب سے بیش قیمت وقت یہی ہے، اور اس کی مدت بھی کچھ زیادہ طویل نہیں ہے، عرفات کا قیام محض غروب آفتاب تک ہوتا ہے، گوکہ وقت صبح صادق تک ہے، لیکن غروب آفتاب کے بعد نکل جانے کا حکم ہے، اتنے قلیل لمحات کو عبادت اور یاد الٰہی میں گزار دینا کچھ مشکل نہیں، لیکن دیکھا جاتا ہے کہ اس قلیل وقت کو بھی بہت سے لوگ کھانے پینے اور سونے کی نذر کردیتے ہیں۔ دودھ اور چھاچھ وغیرہ

تقسیم کرنے والی گاڑیاں آجاتی ہیں، تو لوگ بے تحاشا دوڑتے ہیں جیسے اسی کے لئے آئے ہوں، اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ یہ سب غفلت کے آثار ومظاہر ہیں۔

آگ لگنے کے تکوینی اسباب جو بھی ہوں، بعض لوگ ظاہری اعتبار سے سعودی حکومت کو اس کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں، بلکہ اس کے سلسلے میں کچھ ناروا باتیں بھی کہہ جاتے ہیں، لیکن یہ ایک ایسی غلط بات ہے جس کی تصدیق نہیں کی جاسکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اتنے بڑے مجمع کے لئے جو ہر سال دو تین ماہ کے لئے پابندی کے ساتھ اکٹھا ہوتا ہے، جس میں دنیا کے ہر ملک کے لوگ مختلف المزاج لوگ جمع ہوتے ہیں، ان کی ضروریات اور ان کی سہولیات کا انتظام دوسرے لوگ شاید سوچ بھی نہیں سکتے جتنا سعودی گورنمنٹ انجام دیتی ہیں، حج کو سہل اور پُر امن بنانے کے لئے اس حکومت کی کاوشیں قابل داد ہی نہیں قابل احترام وتعظیم ہیں۔ منیٰ ہو یا جمرات، مزدلفہ ہو یا عرفات، مسجد حرام ہو یا مسجد نبوی، انتظامات دیکھ کر انسانی عقل حیران رہ جاتی ہے، یہ انتظام نہیں، معجزہ ہے، بے شک اس انتظام میں اللہ تعالیٰ کی خاص تائید اور نصرت شامل ہے۔ ورنہ دوسرے ملکوں میں اس سے بہت چھوٹے چھوٹے مجمعوں میں ہزاروں ناگفتنی باتیں ہوجاتی ہیں، اس انتظام کے تحت ہر شخص باطمینان حج کے مناسک ادا کرتا ہے، اور جہاں دشواری محسوس ہوتی ہے وہ انتظام کی کمی نہیں بلکہ مختلف ملکوں سے آئے ہوئے لوگوں کی ناتربیت یافتگی، بے ترتیبی اور کشمکش کی وجہ سے ہوتی ہے۔

اور جہاں تک اندازہ ہے، سعودی حکومت آگ کے اس حادثہ کے بعد ازسرنو اس سے تحفظ کا کوئی انتظام کرے گی، لیکن کمال انتظام اور انتہائی مستعدی کا عالم دیکھئے کہ منیٰ میں پونے بارہ بجے دن میں آگ لگی، آناً فاناً ہزاروں خیمے اس کی زد میں آگئے، اس اطلاع کے ملتے ہیں حکومت کی پوری مشنری حرکت میں آگئی، اور اتنی بڑی آگ کو صرف تین چار گھنٹوں میں بجھا دیا گیا۔ ہم اور ملکوں کی بات نہیں کرتے، خود ہمارا ملک ہوتا تو شاید اتنی دیر کے بعد ’’ہنوز روز اول‘‘ ہوتا۔

۱۰؍ تاریخ کو جب مزدلفہ سے حاجی منیٰ کی طرف لوٹ رہے تھے تو سب کے دل

میں یہ خدشہ تھا کہ خیمے تو سب جل گئے، اب کھلے میدان میں دھوپ میں رہنا ہوگا، لوگ آپس میں پروگرام بنا رہے تھے کہ اس طرح چادر تان لی جائے گی، فلاں پُل کے نیچے رہ لیں گے وغیرہ، مگر قربان جایئے رحمتِ خداوندی کے، دعا دیجئے حکومت کے انتظام کو، کہ منیٰ میں داخل ہونے کے بعد نگاہیں چکراتی رہ گئیں کہ کہاں آگ لگی تھی، جلے ہوئے خیموں کی راکھ کہاں ہے؟ وہ لکڑیاں اور وہ بانس کہاں ہیں جن کا کچھ حصہ آگ نے کھا کر چھوڑ دیا ہے۔ اللہ اکبر! کچھ تو نظر نہیں آیا، ہر جگہ خیمے حسب سابق نصب تھے، جلی ہوئی راکھ بھی نہیں مل رہی تھی، صرف دو ایک جگہ کچھ جلے ہوئے پنکھے، کچھ لکڑیاں دکھائی دیں، ہر حاجی کا خیمہ موجود تھا اور منیٰ کا میدان حسب معمول خیموں کا شہر بنا ہوا تھا، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، کیا یہ انتظام قدرتِ حق کا معجزہ نہیں ہے؟

اس حقیر بندہ کی رائے یہ ہے کہ سعودی حکومت اور معلمین کو کوسنے اور طعنہ دینے کے بجائے ہر ملک کے لوگ اپنے لوگوں کی تربیت کا انتظام کریں، مناسک حج سکھائیں، حرم کا احترام سکھائیں، دیکھنے میں یہی آتا ہے کہ جہل و نادانی کی وجہ سے بے شمار غلطیاں ہوتی ہیں، صرف غلطیاں ہی نہیں معصیتوں اور گناہوں سے بھی پاک نہیں ہوتا، یہ تو بہت آسان ہے کہ معلم اور حکومت کے سر الزام تھوپ کر خود کو بری کر لیا جائے، لیکن یہ حقیقت واقعہ سے صرفِ نظر کرنا ہے، کتنی پریشانیاں اور بدحواسیاں خود حجاج کی بے ترتیبی کی وجہ سے ظاہر ہوتی ہیں، موقع ہوا تو بعض اہم چیزوں کو آئندہ شمارہ میں ذکر کیا جائے گا۔

بہر حال حکومت کا رویہ اس سلسلے میں بہت ہی عمدہ اور قابل ستائش تھا، صفحات میں گنجائش نہیں ہے ورنہ انتظامات کی کچھ تفصیل ذکر کی جاتی، تو ناواقفوں کی آنکھیں کھل جاتیں اور وہ لوگ بھی شاید سوچنے پر مجبور ہوتے جن کی نگاہ صرف معائب اور خرابیوں ہی پر پڑتی ہیں، اور انھیں غلط اندیشی سے حکومت کے سر منڈھ دیتے ہیں۔

(''مجلّہ المآثر'' شوال تا ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ/اپریل تا جون ۱۹۹۷ء)

☆☆☆☆☆

تصانیف حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی مدظلہ

(۱) **تسہیل الجلالین** ''شرح اردو جلالین شریف'' (جلد اول)

(سورہ بقرہ تا سورہ نساء، سوا پانچ پارے)، صفحات:648 قیمت:400

(۲) **حدیث دوستاں**

دینی واصلاحی اور علمی وادبی مکاتیب کا مجموعہ، صفحات:730 قیمت:350

(۳) **کھوئے ہوؤں کی جستجو**

مختلف شخصیات پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ، صفحات:616 قیمت:200

(۴) **حیاتِ مصلح الامت**

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب اعظمی کی مفصل سوانح، صفحات:528 قیمت:150

(۵) **مدارسِ اسلامیہ، مشورے اور گزارشیں** (جدید اضافہ شدہ ایڈیشن)

مدارس سے متعلق مضامین کا مجموعہ، صفحات:312 قیمت:150

(۶) **بطوافِ کعبہ رفتم** ۔۔۔ (سفرنامۂ حج)

حرمین شریفین (مکہ مکرمہ ومدینہ منورہ) کے سفر کی روداد، صفحات:360 قیمت:100

(۷) **تہجد گزار بندے**

تہجد کی اہمیت وفضیلت اور تہجد گزار بندوں کا تفصیلی تذکرہ، صفحات: 320 قیمت 110

(۸) **ذکرِ جامی**

ترجمان مصلح الامتؒ مولانا عبدالرحمٰن جامی کے حالاتِ زندگی، صفحات:216 قیمت:90

(۹) حضرت چاندشاہ صاحب اوران کا خانوادۂ تصوف

حضرت چاندشاہ صاحب ٹانڈوی اوران کے خلفاء کے حالات، صفحات:180 قیمت:70

(۱۰) **تذکرہ شیخ ہالیجویؒ**: سندھ کے معروف شیخ طریقت وعالم اور مجاہد فی سبیل اللہ

حضرت مولانا حماداللہ صاحب ہالیجوی کا مفصل تذکرہ۔ صفحات: 224، قیمت: 56

(۱۱) مودودی صاحب اپنے افکارونظریات کے آئینہ میں

مولانا بنوریؒ کی عربی کتاب الاستاذ المودودی کا ترجمہ۔ صفحات: 184، قیمت: 95

(۱۲) **حکایت ہستی**: (حصہ اول)

خودنوشت سوانح، ابتداء حیات سے اختتام طالب علمی تک۔ صفحات: 304، قیمت: 150

(۱۳) **کثرتِ عبادت** عزیمت یا بدعت؟ قیمت ۲۸/روپے

(۱۴) **قتل ناحق** قرآن وحدیث کی روشنی میں قیمت ۱۶/روپے

(۱۵) تعویذات وعملیات کی حقیقت وشرعی حیثیت قیمت ۲۰/روپے

(۱۶) شب برأت کی شرعی حیثیت قیمت ۲۰/روپے

(۱۷) اخلاق العلماء علماء کیلئے خاص چیز قیمت ۲۰/روپے

(۱۸) دینداری کے دو دشمن حرصِ مال وحب جاہ قیمت ۱۵/روپے

(۱۹) فتنوں کی طغیانی ٹی۔ وی پر ایک فکر انگیز تحریر! قیمت ۱۵/روپے

(۲۰) اہل حق اور اہل باطل کی شناخت قیمت ۳۰/روپے

(۲۱) مالی معاملات کی کمزوریاں اور انکی اصلاح	قیمت ۲۵؍روپے
(۲۲) منصب تدریس اور حضرات مدرسین	قیمت ۴۵؍روپے
(۲۳) حج وعمرہ کے بعض مسائل میں غلو اور اس کی اصلاح	قیمت ۳۵؍روپے
(۲۴) برکات زمزم ماءِ زمزم کی فضیلت واہمیت کا بیان	قیمت ۲۵؍روپے
(۲۵) تصوف ایک تعارف!	(زیرِ طبع)
(۲۶) خواب کی شرعی حیثیت	(زیرِ طبع)
(۲۷) تکبر اور اس کا انجام	(زیرِ طبع)

اسٹاکسٹ

مکتبہ ضیاء الکتب مدرسہ شیخ الاسلام، شیخوپور، اعظم گڈھ (یوپی)
PIN:276121(MOB:9235327576)

دیوبند میں ہماری کتابیں ملنے کا پتہ
کتب خانہ نعیمیہ، جامع مسجد دیوبند (01336223294)

دہلی میں ہماری کتابیں ملنے کا پتہ
فرید بک ڈپو، پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی۲ (01123289786)